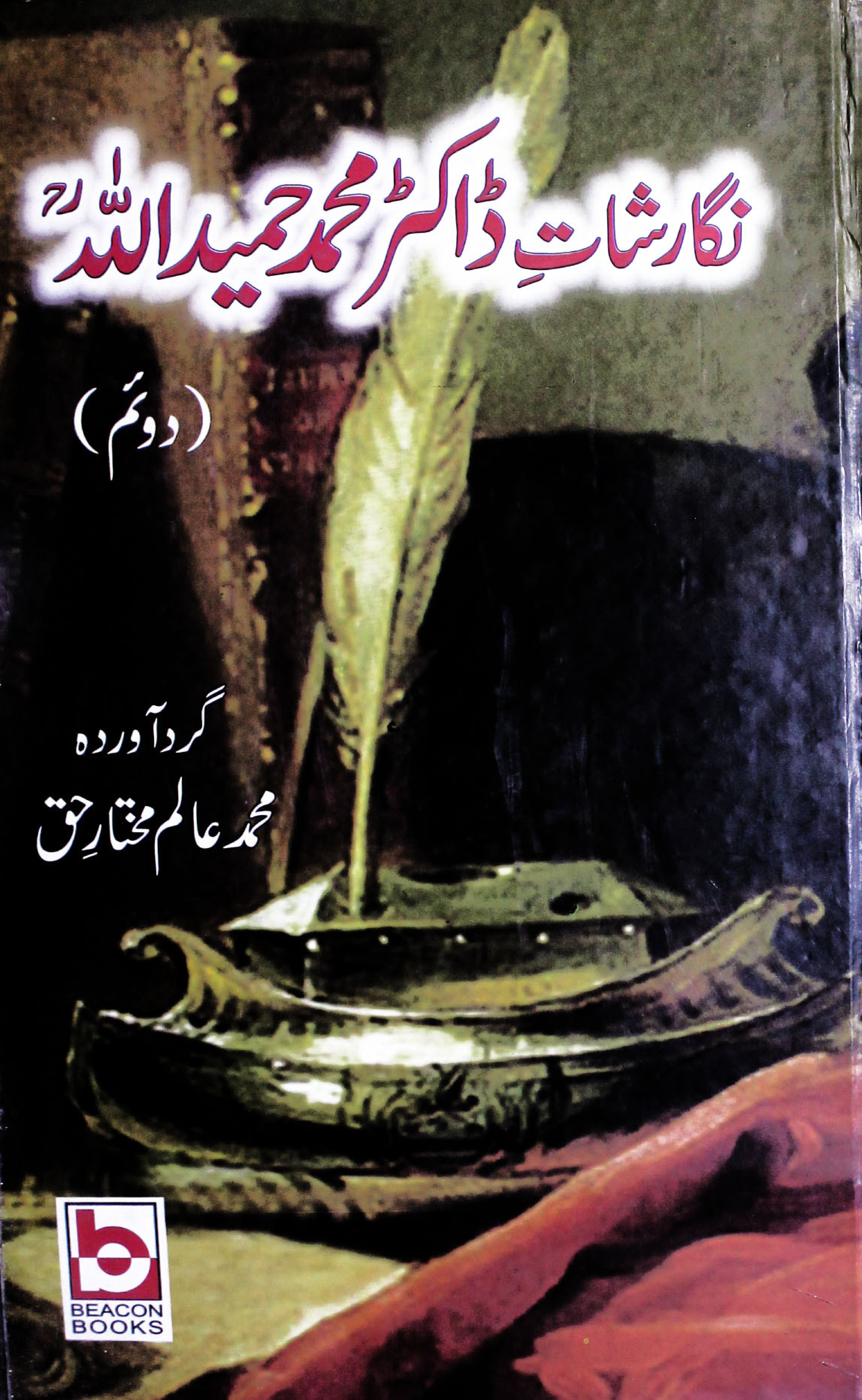

نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحہ

(دوئم)

گرد آوردہ

محمد عالم مختارِ حق

BEACON BOOKS

اللهم صل على سيدنا محمد النبي
الأمي وعلى آله وصحبه وبارك وسلم

نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

(حصہ دوم)

گردآوردہ: محمد عالم مختارِ حق

بیکن بُکس

• قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور فون 042-7351662
042-7351667

• گلگشت، ملتان فون 061-6520790, 6520791

BEACON BOOKS

E-mail:beacon books pakistan@yahoo.com
E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com

Marfat.com

131252

اشاعت : 2006ء

عبدالجبار نے

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور

سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور

سے شائع کی۔

قیمت : 480/= روپے

ISBN: 969 - 534 - 111 - X

Marfat.com

سخنِ مرتب

محمد عالم مختار حق

عالم اسلام کے ایک بطلِ جلیل ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ ایک بلند پایہ عالم دین، مایہ ناز محقق، دانشور اور مصنف تھے جن کے قلم حقیقت رقم سے علوم قرآنیہ، سیرت نبویہ اور فقہ اسلام پہ 165 وقیع کتابیں اور 937 کے قریب مقالات نکلے۔ یہ علمی سرمایہ اسلام کے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں کے لیے وقف کیے رکھی بالآخر 95 برس کی عمر پا کر یہ مردِ قلندر مورخہ 17/دسمبر 2002ء کو فلوریڈا (امریکہ) میں راہی ملک بقا ہوا۔

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هَلْكُهُ هَلْكُ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

ترجمہ: ''قیس کا مرنا صرف ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے۔''

اس سانحۂ ارتحال کے بعد اہلِ دانش و بینش نے ان کی خدمت میں گلہائے عقیدت نچھاور کیے اور موصوف کی زندگی کی مختلف جہتوں پر اپنی اپنی بساط کے مطابق دادِ تحقیق دی۔ بعض علمی اداروں کی طرف سے ان کے ترجمان جرائد نے ان کے لیے اشاعتیں پیش کیں جن میں یہ شیوع لائق توجہ ہیں:

۱۔ ششماہی مجلہ ''معارفِ اسلامی'' جولائی ۲۰۰۳ء تا جون ۲۰۰۴ء
(کلیہ عربیہ وعلوم اسلامیہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

۲۔ سہ ماہی ''فکر و نظر'' (اپریل تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

۳۔ ماہنامہ دعوۃ (مارچ ۲۰۰۳ء)
(دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)

۴۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور (۲۰۰۳ء)
(کلیہ شرقیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور)

۵۔ سہ ماہی علمی و تحقیقی مجلہ قافلہ ادب اسلامی لاہور (جنوری تا جون ۲۰۰۳ء)
(عالمی رابطہ ادب اسلامی پاکستان لاہور)

Marfat.com

۶۔ ماہنامہ شاداب حیدرآباد دکن (انڈیا) جون ۲۰۰۳ء

اسی طرح موصوف کے سوانح حیات پر بھی تین کتابیں ۲۰۰۳ء میں وجود پذیر ہوئیں جن کے کوائف درج ذیل ہیں:

۱۔ مجددِ علوم سیرت (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) از غطریف شہباز ندوی نئی دہلی۔

۲۔ آثار ڈاکٹر محمد حمید اللہ مولفہ صفدر حسین، صفا پبلی کیشنز اکبرآباد حیدرآباد دکن (انڈیا)۔

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ از محمد راشد شیخ، المیزان پبلی کیشنز فیصل آباد۔

مؤخر الذکر دونوں کتابیں ڈاکٹر صاحب پر مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین و مقالات کے انتخاب پر مشتمل ہیں۔ البتہ آثار ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو تو مجلہ عثمانیہ کراچی (شمارہ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء کے گوشۂ محمد حمید اللہ کی اشاعتِ جدید قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ اس کے بیشتر مضامین اسی رسالہ سے ماخوذ ہیں۔

جہاں تک مجموعی طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ذات بابرکات پر کام کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں بلا ریب و تردد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''بیکن بکس'' لاہور/ملتان کا پلہ بھاری ہے اور اشاعت کے معاملہ میں اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں بلکہ طبع شدہ کام کے حجم کے پیش نظر تو یوں لگتا ہے کہ ادارہ بیکن بکس نے اپنے آپ کو حمید اللہ کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ ہم اپنے اس دعوے کی دلیل میں بیکن بکس کے ''حمید اللہی'' کام کا ایک طائرانہ جائزہ ہدیۂ قارئین کرام کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں مرتبہ سید قاسم محمود ۲۰۰۳ء
(اس انتخاب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مکاتیب گرامی بنام راقم بھی شامل ہیں)

۲۔ نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ گردآوردہ محمد عالم مختار حق ۲۰۰۴ء

۳۔ پیغمبر اسلام (ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی فرانسیسی زبان میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عالمی شہرت یافتہ کتاب **Le Prophete de l'Islam** کا اردو ترجمہ از پروفیسر خالد پرویز ۲۰۰۵ء

۴۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی سیرت پر انگریزی کتاب **Muhammad Rasulullah** کا اردو ترجمہ از پروفیسر خالد پرویز ۲۰۰۵ء

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی و جانشینی (ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی
Prophet's establishing a State and His succession

Marfat.com

کا اردو ترجمہ از پروفیسر خالد پرویز ۲۰۰۵ء

۶۔ خطبات بہاولپور (طبع جدید) ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۲۰۰۵۔

۷۔ صحیفہ ہمام بن منبہ (طبع جدید) تحقیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۲۰۰۵ء۔

۸۔ مضامین ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرتبہ محمد عالم مختار حق ۲۰۰۶ء (کتابِ حاضر)۔

خدا چاہے تو مقالات حمید اللہ کی اگلی جلد بھی راقم کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز (ابراہیم)۔

بیکن بکس کے فیض محمد قریشی، عبدالجبار اور لاہور شاخ کے منتظم مظہر سلیم مجوکہ حمید اللّٰہی'' لٹریچر کی اشاعت کے لیے لائق صد مبارک باد ہیں۔

آخر میں اللہ جَلَّ شانہٗ کی بارگاہِ عالیہ میں دعا ہے کہ بیکن بکس سے وابستہ ہر کہ ومہ کو اپنی بے پایاں نعمتوں سے سرفراز فرمائے اور انہیں توفیق رفیق فرمائے کہ وہ ادارہ کی اشاعتی سرگرمیوں بالخصوص حمید اللّٰہی لٹریچر کی پیش رفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تابماند نامِ نیکت برقرار

(سعدی)

محمد عالم مختار حق

لاہور ۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ / ۱۱ اپریل ۲۰۰۶ء

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

صفحہ نمبر

قرآن

1. قرآن مجید: منزل بہ منزل 13
2. قرآن مجید کے ترجمے 94
3. زبان اور اللہ کا کلام 110

سیرت

1. ہجرت 123
2. عہدِ نبوی کا نظام تعلیم 138
3. اطلبوا العلم ولو بالصین 159

اکابرین

1. حضرت علی بن ابی طالب 165
2. مفتی محمد شفیع عثمانی 206
3. مولوی عبدالحق کی یاد میں 210

تاریخ

1. اسلامی فلاحی ریاست کا قیام 217
2. شہری مملکت مکہ 228
3. اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں 271
4. مرکزی سیاست اور قانون شخصی 300
5. تالیف قلبی 305
6. تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل 311
7. نہر سویز کا پراجیکٹ حضرت عمرؓ کے زمانے میں 333

Marfat.com

صفحہ نمبر

8. جاہلیت عرب کے معاشی نظام کا اثر 338

9. عربی حبشی تعلقات اور مکاتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 356

10. دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور 382

11. اوّلین مساجد 406

12. الاخبار الطوال از دینوری 413

13. تقویم ہجری اور مسلمانوں میں ایک دن عید منانے کا مسئلہ 494

خودنوشت

1. پچیس سال پہلے کی باتیں 505

2. میری علمی اور مطالعاتی زندگی 510

مکاتیب 515

Marfat.com

قرآن

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿و به نستعین﴾

قرآن مجید: منزل بہ منزل [1]

الحمد للّٰہ رب العلمین و الصلاۃ و السلام
علی خاتم النبیین و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین

قرآن مجید کے اُردو ترجمے اور تفسیریں کثرت سے ہیں پھر ایک نئے اضافے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلام اللہ کی خدمت ایک سعادت ہے۔ پھر کیوں نہ ہر کوئی اس میں حصہ لے؟ اصل میں قرآن مجید ایک سمندر ہے جس کی تہ میں ان گنت موتیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اول تو غوطہ لگانے کی جسارت کرنے والے کم، پھر ہر غوطہ لگانے والے کو کیا ضرور کہ کچھ لازمی طور پر مل ہی جائے۔ جب تک کہ خدا کا فضل نہ ہو۔

ایک نئی تفسیر سے اولاً خود مولف کو فائدہ ہوتا ہے کہ اسے بار بار اور غور سے کلام اللہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ اس کی کوشش سے اگر دوسرے کو بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔ تو اس سے بخل کیوں کیا جائے۔ عہد نبوی سے لے کر آج تک ہزاروں آدمیوں نے، بیسیوں زبانوں میں تفسیر لکھی ہے۔ اور تو اور خود عربوں کو بھی اس کی ضرورت رہی ہے۔ حالانکہ قرآن ان کی مادری زبان میں ہے! ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است:

اس مقدمے میں قرآن مجید کے متعلق چند ایسی چیزیں عرض کی جائیں گی جن کی

---

[1] یہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا تفسیر حبیبی مولفہ محمد حبیب اللہ پر مقدمہ ہے جو آغا پورہ حیدر آباد دکن سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی۔

Marfat.com

ضرورت تو ہے لیکن جو عام طور پر تفسیروں کے مقدموں میں نہیں ملتیں۔

قرآن کے معنے:

لفظ، قرآن، کے معنے ہیں، پڑھنا، اس سے بہتر پڑھنے کی کیا چیز ہو سکتی ہے جو ہماری دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح کا راستہ بتائے؟ اسے پڑھنا اور بار بار پڑھتے رہنا چاہیے۔

قرآن عربی زبان میں ہے۔ دنیا کی زندہ زبانیں بتدریج ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ اب سے پانچ سو برس پہلے کی انگریزی آج انگلستان میں، سوائے متخصص شخص کے کسی کو سمجھ میں نہیں آتی، اس کے الفاظ کا مفہوم اس کی صرف ونحو، اس کے الفاظ کا املا اور تلفظ، کوئی چیز بھی بدلے بغیر نہیں رہی۔ یہی حال فرانسیسی، جرمن اور ساری زندہ مشرقی و مغربی زبانوں کا ہے۔ اُردو بھی اس سے مستثنا نہیں۔ لیکن عربی کا حال یہ ہے کہ کم از کم ڈیڑھ ہزار سال سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ عہد نبوی کے الفاظ، اس زمانے کی صرف ونحو، اس زمانے کا تلفظ اور املا، آج تک خفیف ترین تبدیلی کے بغیر باقی ہیں اور یہی زبان آج اخباروں کتابوں میں پڑھی جاتی اور ریڈیو پر سنی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جسے جدید عربی آتی ہے وہ قرآن مجید کو آج بھی اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح عہدِ نبوی کا عرب۔ خدا کے آخری پیام کے لیے ایسی غیر تبدیل پذیر زبان کے سوا کون سی زبان موزوں ہو سکتی تھی؟ ایسا نہ ہوتا تو خدا کو ضرورت ہوتی کہ پھر ایک نیا نبی نئی زبان میں بھیجے۔

یہ تو صرف ایک پہلو ہے، ورنہ عربی زبان میں جو خوبیاں ہیں ان کا گنانا ممکن نہیں۔ اس کا ترنم تو ایسا ہے کہ اس کے سننے پر زبان نہ جاننے والا بھی سر دھننے لگتا ہے اس کا بارہا مشاہدہ ہوا ہے اور ہر کوئی اسے آزما سکتا ہے۔

قرآن اللہ کا کلام، ربانی وحی ہے۔

کلام اللہ کا مفہوم:

خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آتا کیوں؟ ہم ہی اندھے ہیں اور وہ محبوب حاضر و موجود ہے۔ اگر کوئی اندھا بچھڑ گیا ہو اور اپنے محبوب کے پاس پہنچنا چاہتا ہو

اور راستہ بھی دشوار گزار ہو تو اس کے سوا کیا صورت ممکن ہے کہ ہمارا محبوب ہی ہمیں دور سے بہ آواز بلند کہے کہ یوں چل، ادھر مڑ، فلاں چیز سے بچ، وغیرہ؟ غرض اندھے کی ہدایت و رہنمائی کلام ہی سے ہو سکتی ہے۔ خدا کو اپنی مخلوق سے جو محبت ہے۔ اس کے سامنے ماں کی مامتا بھی کوئی چیز نہیں (جیسا کہ ایک حدیث میں ہے)، اسی لیے خدا اپنے عاشق انسان کو، جو اندھا بھی ہے، کلام کے ذریعے سے ہدایت سناتا ہے، دکھانے کا سوال نہیں۔

یہ خدا کا کلام ہے۔ لیکن خدا زمان و مکان سے بالا، بلکہ روح سے بھی پرے ہے اور ہم ہیں مادہ، اور پانچ حواس کے سوا معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے، پھر ایسے مافوق الادراک خدا کا کلام اور اس کی ہدایت کیسے سنیں؟ اس دشواری کو بھی ہمارے محبوب تعالیٰ ہی نے حل کر دیا۔ اس کے ہاں ایک آسمانی مخلوق ہے جن کو فرشتہ کہتے ہیں (یعنی فرستادہ، بھیجا جانے والا) انسانوں میں جو سب سے بلند مرتبہ اور خدا کو جو سب سے زیادہ پسند ہو۔ اس میں خدا بہ تدریج یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فرشتوں سے تماس پیدا کر سکے۔ ایسے برگزیدہ لوگ ہر زمانے میں، اور ہر ملک میں ہوئے ہیں۔ خدا انہیں کو فرشتے کے ذریعے سے اپنا کلام سناتا ہے اور یہ انسان دوسرے انسانوں کے لیے پیغامبری کا کام انجام دیتا ہے۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اب سے کوئی ڈیڑھ ہزار برس پہلے سنہ ۶۱۰ تا ۶۳۲ء میں جبریل فرشتے کے ذریعے سے پہنچا۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ اس کے بعد کوئی نیا پیغمبر نہ ہو۔ بہرحال قرآن کی تدوین و تالیف میں کسی انسان بلکہ کسی فرشتے کو بھی دخل نہیں۔ وہ خدا کا کلام ہے۔ خدا کا ہدایت نامہ ہے۔

خدا کا کلام انسان تک وحی کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔

وحی کا مفہوم:

وحی کا مفہوم مختلف مذہبوں، سماجوں میں مختلف رہا ہے۔ اس کی دو بڑی قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ یا تو یہ کہا جاتا ہے کہ خدا اپنا حکم اور پیغام کسی فرشتے کے ذریعے سے، یا

Marfat.com

براہ راست نبی کے دل میں القاء کے ذریعے سے روانہ کرتا ہے۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ ایک برگزیدہ اور چیدہ انسان فنافی اللہ ہو جاتا ہے اور خدا اس انسان کے منہ سے بولتا، اس کے ہاتھ سے پکڑتا، اس کے پاؤں سے چلتا، اس کے دل سے چاہتا ہے۔ یعنی ایسا انسان اپنی انسانی مرضی سے کچھ نہیں کرتا، بلکہ اس کا ہر قول و فعل خدا کی مرضی اور مشیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اگر اوتار کا بھی مفہوم ہے تو ان دونوں میں کوئی تصادم ضروری نہیں۔ خدا کا پیغام نبی تک آتا ہے اور نبی فنافی اللہ بھی ہوتا ہے۔

انسان اپنی عقل سے اس کا تصور تو کرتا ہے کہ خدا کا وجود ضروری ہے اور خدا موجود بھی ہے اگرچہ اپنے حواس کی مدد سے انسان اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کے قرآن نے دو پہلو بتائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا زمان و مکان سے بالا ہر جگہ موجود ہے چنانچہ ھو معکم اینما کنتم (۴/۵۷)۔ وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید (۱۶/۵۰): ہم اس سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں، نحن اقرب الیہ منکم (۸۵/۵۶): ہم اس سے بھی زیادہ قریب ہیں جتنا تم اس سے ہو، وغیرہ دوسرے یہ کہ وہ انسانی ادراک سے بالا ہے مثلاً لاتدرکہ الابصار و ھو یدرک الابصار (۱۰۳/۶): بینائیاں اس تک نہیں پہنچتیں، وہ بینائیوں تک پہنچتا ہے۔

خدا صرف ایک ہے۔ اس کی صفتیں بے شمار ہیں:

وہ پیدا کرتا ہے، وہ مالک ہے، وہ روزی دیتا ہے، وہ احکام اور ہدایتیں دیتا ہے، وہ اطاعت پر جزا اور نافرمانی پر سزا دیتا ہے، وہ مختار کل ہے اور جو چاہے کرے وہ ظلم تو نہیں کرتا لیکن جس کا چاہے قصور معاف کر سکتا ہے، وغیرہ

خدا ماورائے ادراک بھی ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت و اطاعت کریں اور اسی کی مرضی پر چلیں۔ یہ گتھی ناقابل حل رہتی کہ خدا کی مرضی و مشیت معلوم کیسے ہو اگر خدا خود اس مشکل کو دور نہ کرے۔ اپنی رحمت و شفقت سے خدا نے ایک طرف ایک ایسی مخلوق کا انتخاب کیا جو اس کی مشیت معلوم کر سکتی اور اسے انسان تک پہنچا سکتی۔ (انہیں

Marfat.com

فرشتہ یعنی خدا کا فرستادہ اور بھیجا ہوا شخص کہتے ہیں) پھر انسانوں میں اس نے چند کو اس قابل بنایا کہ فرشتے کے ذریعے سے آئی ہوئی وحی کو وصول کر سکے نیز اسے اپنی قوم تک پہنچائے (یہ پیغمبر ہیں) اور ساتھ ہی سارے انسانوں میں عقل بھی پیدا کی کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر سکیں اور اگر کوئی اچھی بات براہ راست اور فوراً ان کی سمجھ میں نہ بھی آئے تو کسی کے بتانے اور منطقی استدلال کرنے پر سمجھ میں آ سکے۔

پیغمبر کا کام خدا کا حکم پہنچانا اور سمجھانا ہوتا ہے۔ اور بس، اس کے بعد ہر شخص اپنے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ خدا کے پاس اس کی جوابدہی انفرادی اور شخصی ہوتی ہے۔

وحی کی زبان:

خدا جس طرح زماں اور مکان سے پرے ہے، اسی طرح زبان سے بھی بالا ہے۔ اس کے باوجود وحی انسان تک ایک زبان میں پہنچتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ بجلی کی رو میں کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ جس رنگ کا بلب ہوگا۔ اس رو سے ویسے ہی رنگ کی روشنی نظر آئے گی اور جتنی قوت کا بلب ہوگا، اتنی ہی زیادہ یا کم روشنی ہوگی۔ وحی گویا برقی رو ہے بلب کا رنگ پیغمبر کی مادری زبان ہے اور بلب کی قوت پیغمبر کا شخصی درجہ یا فضیلت ہے۔

سارے پیغمبر بلب کی طرح رہے ہیں۔ وہ خود تو روشنی نہیں دیتے لیکن جب برقی رو ان میں آتی ہے تو وہ چمکنے لگتے ہیں۔ یہ بلب رنگ برنگ کے رہے ہیں اور بڑے یا چھوٹے مختلف قوتوں کے بھی۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کی وحی کبھی زنطہ زبان میں آ سکتی ہے تو کبھی سنسکرت میں تو کبھی عبرانی اور سریانی میں تو کبھی عربی میں۔ ساری ہی زبانیں وسیلہ اور ذریعہ ہیں کہ خدا کے احکام انسان تک پہنچ سکیں، لیکن خود خدا زبانوں سے بالا و برتر ہے۔

وحی کا نزول:

القاء میں کوئی بات دل میں پڑ جاتی ہے۔ الہام میں کوئی امر طبیعت کو سمجھا دیا جاتا ہے۔ آدمی ان دونوں (القاء اور الہام) کو قبول تو کر لیتا ہے لیکن ان کی صحت اور ان

کے ربانی ہونے کا ثبوت قطعی نہیں ہوتا ہے اور یہ دونوں ہر انسان کو نصیب ہو سکتے ہیں۔
ان کے برخلاف وحی میں ایک بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور ایک بہت بڑے درجے کا فرشتہ اسے پیغمبر تک لاتا ہے۔

خدا کا پیغمبر بننا انسان کا اختیاری نہیں بلکہ خدا ہی جس انسان کا چاہے انتخاب کرتا ہے اور انسانی تاریخ میں یہ نادر واقعہ ہوتا ہے اور خالص انفرادی، اسی لیے یہ سمجھنا آسان نہیں کہ وحی پیغمبر تک کس طرح پہنچتی ہے۔ نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک قرآن کی وحی کس طرح ہوئی، اس کا ذکر کچھ تو خود حضور کی زبانی، اور کچھ آپ کے صحابہ اور عینی شاہدوں کے بیان سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں:

رسول اکرم نے فرمایا ہے کہ وحی مختلف طریقوں سے ہوتی ہے کبھی جبریل (فرشتہ) انسان کی شکل میں آتا اور انسانوں کی طرح بولتا ہے کبھی وہ ایک ایسی مخلوق کی طرح نظر آتا ہے جسے اڑنے کے لیے پر ہوں اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ میں سمجھ جاتا ہوں کبھی یہ ہوتا ہے کہ کانوں میں گھنٹی بجتی ہے اور یہ چیز مجھ پر بہت گراں ہوتی ہے اور جب یہ حالت ختم ہو جاتی ہے تو جو کچھ مجھ سے کہا گیا وہ حافظے میں گویا کھدا ہوا محفوظ ہوتا ہے (صحیح بخاری، کتاب ۱، باب ۱، حدیث ۳-۲) اپنا مشاہدہ ایک صحابی یوں بیان فرماتے ہیں۔
جب رسول اللہ پر وحی نازل ہوتی تو انتہائی سخت سردی کے دن بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے (صحیح بخاری کتاب ۱، باب ۱ حدیث نمبر ۳) ایک اور صحابی یوں فرماتے ہیں کہ اس وقت حضور اس قدر وزنی اور بوجھل ہو جاتے تھے کہ اگر اتفاق سے آپ اپنی اونٹنی پر سوار رہتے تو وہ مارے بوجھ کے کھڑی نہ رہ سکتی بلکہ بیٹھ جاتی اور اگر نہ بیٹھتی تو اس کی ٹانگیں بوجھ کے مارے اس طرح اکڑ جاتیں کہ خوف ہوتا کہ وہ چٹخ جائیں گی۔ (طبقات ابن سعد، پہلی جلد، حصہ اول، صفحہ ۱۳۱) ایک اور صحابی کا بیان ہے کہ ایک دن لوگوں کا ہجوم تھا اور حضور کی مانڈی میری مانڈی کے اوپر دھری ہوئی تھی یکایک وحی نازل ہونے لگی اور وزن کے مارے میری ران کی ہڈی تھی کہ اب ٹوٹے تب ٹوٹے اور اگر رسول اللہ کا ادب ملحوظ نہ ہوتا تو میں درد سے چیخ مار کر اپنی مانڈی کھینچ لیتا۔ (صحیح بخاری کتاب ۸، باب ۱۲، کتاب ۵۶، باب ۳۱، کتاب ۶۵ تفسیر سورہ ۴، ۸، سنن ترمذی کتاب ۴۴، تفسیر سورہ ۴، ۱۸، سنن نسائی

Marfat.com

کتاب ۲۵ باب ۴)
وحی آتی تو بعض وقت حضور لیٹ جاتے اور اطراف کے لوگ آپ کا چہرہ چادر سے ڈھانک دیتے (سیرۃ ابن ہشام طبع یوروپ صفحہ ۷۳۵)۔ مگر ایسا نادر ہی ہوتا۔ عام طور پر حضور جہاں ہوں بے حرکت رہ جاتے اور لوگ دیکھتے کہ آپ پر ایک خاص حالت طاری ہوگئی ہے۔ چند لمحے بعد آپ اپنی عادتی حالت میں آجاتے (صحیح بخاری کتاب ۶۶، باب ۲۸، حدیث ۲) دیگر مختلف حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی مسجد میں منبر پر خطبہ دیتے ہوتے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ دستر خوان پر ہوتے اور بوٹی یا ہڈی ہاتھ میں ہوتی تو ہاتھ ہی میں رہ جاتی۔ غرض آپ بیہوش ہوکر گر نہ پڑتے اور نہ سدھ بدھ سے اس وقت محروم ہوجاتے بلکہ ایک استغراق کی کیفیت آپ پر غالب آجاتی۔

حضور کی جسمانی اور روحانی طہارت کی حالت میں وحی کا نزول ہوتا۔ آپ کی پہلی بیوی ام المومنین حضرت خدیجہ سے روایت ہے کہ نبوت کی ابتداء میں جب حضور نے فرشتے کے آیا کرنے کا ذکر فرمایا تو میں نے آپ سے کہا: آئندہ کبھی وہ آئے تو مجھے بتانا۔ پھر ایک دن آپ نے کہا: لو، وہ نظر آرہا ہے۔ اس پر میں نے آپ کو اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف بٹھا کر پوچھا: کیا وہ اب بھی نظر آرہا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، پھر بائیں طرف، پھر سامنے، پھر پیچھے بٹھا بٹھا کر پوچھا اور ہر وقت آپ فرماتے رہے: ہاں وہ نظر آرہا ہے۔ پھر میں نے حضور کو اپنے بازوؤں میں لپٹا کر وہی سوال کیا آپ نے جواب دیا: نہیں۔ اب وہ نظر نہیں آرہا ہے۔ اور میں سمجھ گئی وہ واقعی فرشتہ تھا کیونکہ اگر وہ شیطان ہوتا تو ہماری متاہلانہ بے تکلفی کے وقت وہ کبھی وہاں سے نہ ٹلتا بلکہ ہم کو گھورتا ہی رہتا (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۵۴، تاریخ طبری طبع یوروپ، سلسلہ اول، ص ۱۱۵۲)۔

قرآن پورے کا پورا بہ یک وقت نازل نہیں ہوا۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے تیئس سال تک (سنہ ۱۳ قبل ہجرت تا سنہ ۱۱ ہجری مطابق سنہ ۶۰۹ تا ۶۳۲ عیسوی) نازل ہوتا رہا۔ آپ کی ولادت سنہ ۵۶۹ء میں ہوئی۔ بعثت چالیس سال کی عمر میں اور وفات تریسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ وحی کے نزول کے لیے کوئی جگہ متعین نہ تھی، گھر پر، سفر میں، دن کو، رات کو، تنہائی میں، مجمع میں، جب خدا چاہتا آپ کو پیغام بھیجتا البتہ ہر وحی ٹھیک اس وقت آتی

Marfat.com

جب اس کی ضرورت ہوتی مثلاً کسی صحابی کا انتقال ہوا تو قانون وراثت کی آیتیں نازل ہوتیں۔ یہ نہیں کہ اس دن طلاق یا چوری یا کسی اور امر کے متعلق احکام آئیں۔ وحی کے ذریعے سے آئے ہوئے سارے احکام کا مجموعہ قرآن کہلاتا ہے۔

قرآن مجید کی عبارت (۱۱۴) سوروں یعنی بابوں میں مرتب ہوئی ہے۔ بعض سورے بہ یک وقت کامل طور پر نازل ہو گئے اور بعض کی جستہ جستہ آیتیں مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں۔ بعض وقت یہ بھی ہوا کہ متعدد سوروں کا نزول ایک ہی زمانے میں جاری رہا۔ ان آیتوں کو رسول اکرم خود ترتیب دیتے یہ بھی ہوتا کہ قدیم تر نازل شدہ آیتیں تدوین میں موخر ہو جائیں، اور جدید تر مقدم ہوں۔ تدوین کی تفصیل نیچے آئیگی۔ صرف یہ اور یہاں بیان کر دینا چاہیے کہ سارا موجودہ قرآن عہد نبوی کی چیز ہے بعد میں نہ اس میں کسی حرف کا اضافہ کیا گیا نہ کوئی چیز حذف کی گئی۔ بلکہ سارے کا سارا وحی ہے جس کی رسول اکرم نے تعلیم دی۔

قرآن، حدیث اور سنت:

قرآن مجید کے بعض دیگر پہلوؤں کے ذکر سے پہلے یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ قرآن اور حدیث میں (جسے سنت بھی کہتے ہیں) کیا فرق ہے؟

قرآن مجید نے (سورۂ نجم میں) خود صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے خود کچھ نہیں کہتے بلکہ جو بھی بیان فرماتے ہیں وہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی ہوتی ہے اس اور ایسی دیگر متعدد آیتوں کا نتیجہ ہے کہ رسول کی ذات اور آپ کے قول اور عمل کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے آپ کی ہر بات اور آپ کی ہر حرکت خدا کے امر اور قانون کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن خود رسول اکرم نے ایک امتیاز ملحوظ رکھا۔ کبھی یہ صراحت فرماتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ لیکن بعض وقت جب کوئی ضرورت محسوس ہوتی اور ابھی وحی نہ آئی ہوتی تو آپ خود اجتہاد کر کے کوئی معقول حکم دیتے۔ اگر آپ کا یہ ذاتی اجتہاد اور استنباط خدا کو پسند نہ آتا تو فوراً وحی آتی، تا کہ امت غلطی میں نہ پڑے اور خدا کی مرضی کے خلاف عمل نہ کرے۔ اس

Marfat.com

سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی دو حیثیتیں تھیں: ایک پبلک حیثیت یعنی خدا کا پیغمبر۔ دوسرے پرائیویٹ حیثیت یعنی محمد (علیہ السلام) نامی ایک انسان، لیکن اس امتیاز کو زیادہ اہمیت اس لیے حاصل نہیں کہ اگر حضور نے وحی کے انتظار میں خود کوئی اجتہاد فرمایا ہو اور خدا نے اسے قبول فرمالیا ہو (اور اس کی تردید واصلاح کے لیے کوئی وحی نہ آئی ہو) تو امت کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا کہ حضور کی کون سی بات شروع ہی سے وحی پر مبنی تھی اور کون سی بات حضور کا ذاتی اجتہاد تھا جسے خدا نے منظور فرمالیا ہو۔

مزید برآں، خود وحی کے متعلق بعض وقت رسول اکرم فرماتے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اسے لکھ لو اور نماز میں پڑھا کرو، (اور یہ قرآن ہوتا)، لیکن بعض وقت یہ تو کہتے کہ یہ خدا کا حکم ہے لیکن نہ اسے لکھواتے اور نہ اسے نماز میں پڑھتے۔ بلکہ یہاں تک ہوتا کہ یہ صراحت بھی نہ ہوتی کہ یہ خدا کا حکم ہے، بلکہ آپ صرف اس پر عمل کرنے اور عمل کرانے لگتے۔ اسی لیے وحی کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔

(۱) وحی متلو (جس کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے) اور

(۲) وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس دوسری قسم یعنی وحی غیر متلو ہی کو حدیث اور سنت کہتے ہیں۔

(حدیث) کے لفظی معنے ہیں قول کے اور سنت کے معنے ہیں عمل کے۔ رسول اللہ کبھی کچھ بیان فرماتے اور کبھی کچھ بولے بغیر صرف ایک عمل کرنے لگتے۔ چونکہ رسول کا قول اور عمل دونوں واجب التعمیل ہیں۔ اور چونکہ عربی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہ تھا جو قول اور فعل دونوں کا جامع ہو۔ اسی لیے رفتہ رفتہ حدیث اور سنت مترادف ہوگئے۔ اور ہر ایک کے معنے قول اور عمل دونوں کے ہوگئے۔

حدیث عام طور پر الہام اور وحی پر مبنی ہوتی ہے، چاہے روایت میں اس کی صراحت ہو یا نہ ہو۔ لیکن صراحت کی صورت میں حدیث کی ایک قسم خاص طور پر اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس میں رسول اللہ یوں فرمایا کرتے ہیں: خدا فرماتا ہے کہ میں .... (فلاں کام کرتا ہوں) اسے حدیث قدسی کہتے ہیں۔

اصولاً قرآن اور حدیث، دونوں کا مرتبہ تقریباً ایک ہی ہے۔ اس کے خلاف ہو

Marfat.com

بھی کیسے سکتا ہے جبکہ قرآن خود بارہا اور صراحت سے کہتا ہے کہ جو بھی پیغمبر دے اسے لے لو۔ اور جس سے بھی منع کرے اس سے بچو۔ کیا اس کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی صحابی حضور اکرم سے کہے یا رسول اللہ، یہ قرآن ہے، میں اسے مانتا ہوں: لیکن حدیث تیری بات ہے، اس کا میں پابند نہیں؟ اگر کوئی بد بخت ایسا کہتا تو اسے فوراً امت سے خارج سمجھ لیا جاتا۔ جب کوئی سفیر آتا ہے تو مرسل الیہ کا حق بلکہ فرض ہوتا ہے کہ اس سفیر کے بھیجنے والے کی بات اور منشا سمجھے، اور حسبہ عمل کرے۔

اگر قرآن و حدیث میں کوئی فرق ہے تو وہ صرف ایک ثبوت کا مسئلہ ہے۔ قرآن کو جس احتیاط سے مرتب اور محفوظ کیا گیا وہ بات حدیث کے لیے ممکن نہ تھی۔ اس لیے عہدِ نبوی میں قرآن و حدیث میں صحابہ کے لیے کوئی فرق نہ تھا۔ اس کے بعد کے زمانے میں ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ثابت، ہو جائے تو اس پر عمل لازم ہے۔ قرآن کی تدوین خود رسول اکرم نے فرمائی۔ اس کی تاریخ تفصیل سے نیچے آئے گی، اولاً حدیث کی تدوین کا مختصر ذکر کرتے چلیں؛

جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ قرآن کی طرح رسول اکرم کی روز مرہ بات چیت، تقریروں، خطبوں میں بھی اہم ہدایتیں اور کار آمد باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہ قرآن کی تدوین پر تو حضور توجہ فرما رہے ہیں۔ لیکن اپنے اقوال یعنی حدیث پر کوئی توجہ نہیں فرما رہے ہیں۔ تو بعض ذہین اور علمی ذوق والے، خاص کر نوجوان صحابہ کو شوق ہوا کہ حدیث کو بھی مدون کریں، مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص ہر روز جو سنتے وہ لکھ لیتے۔ ساتھیوں نے ٹوکا تو کیا کر رہا ہے۔ حضور ایک انسان ہیں کبھی خوش رہتے ہیں، کبھی خفا، آپ کی ہر چیز کو لکھنا کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟ اعتراض معقول تھا۔ لیکن آدمی تھے ذہین۔ اس لیے خود حضور ہی سے پوچھا: کیا میں آپ کی ہر بات کو لکھ سکتا ہوں؟ جواب دیا: کیوں نہیں؟ مکرر مزید اطمینان کے لیے پوچھا: کیا وہ بات بھی جو آپ خوشی کی حالت میں فرمائیں۔ اور وہ بات بھی جو خفگی کی حالت میں بیان ہو؟ فرمایا: ضرور لکھو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری زبان سے حق کے سوا کبھی کوئی بات نہیں نکلتی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو نے دلچسپ اور اپنی دانست میں اہم حدیثوں کو قلمبند کرنا جاری رکھا اور اس میں ایسی ایک ہزار

13/252

Marfat.com

مثالیں جمع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام صحیفہ صادقہ رکھا۔ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کے زمانے تک بھی اصل نسخہ باقی تھا۔ اور وہ اسی کو ہاتھ میں رکھ کر شاگردوں کو اس کی نقل کراتے (بخاری ترمذی، ابو داود، ابن سعد وغیرہ) ایک اور صحابی انس بن مالک ہیں۔ رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو ان کے والدین ایمان کے جوش میں ان کو ساتھ لے کر رسول اللہ کے ہاں آئے اور کہنے لگے: یہ ہمارا بچہ دس برس کا ہے لیکن بڑا ذہین ہے۔ چنانچہ اسے ابھی سے لکھنا پڑھنا بھی آ گیا ہے۔ ہماری عزت افزائی ہو گی اگر آپ اسے اپنی خدمت کا موقع دیں۔ وہ آپ کے گھر میں خادم کی حیثیت سے رہے گا۔ حضور نے اسے قبول فرمایا: حضرت انس فرماتے ہیں: میں پورے دس برس یعنی حضور کی وفات تک رات دن حضور کے مکان میں رہا۔ آپ کا حسن سلوک کیا بیان کروں؟ خلوت اور جلوت میں آپ کی جو باتیں سنتا، میں انہیں نہ صرف لکھ لیا کرتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً وہ حضور کو سنایا بھی کرتا تھا تاکہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو تو حضور اس کی اصلاح فرما دیں۔ پھر اپنی اس طرح لکھی ہوئی جلدیں اپنے شاگردوں کو بتایا بھی کرتے (تقیید العلم از خطیب بغدادی، المستدرک از حاکم، تدریب الراوی از سیوطی، المحدث الفاضل از رامہرمزی وغیرہ) دیکھا دیکھی، حضرت ابو ہریرہ وغیرہ دیگر صحابہ بھی حدیث لکھنے لگے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد تو بہ کثرت صحابہ نے اپنے معلومات کو قلمبند کر کے اپنے بچوں اور شاگردوں کو دیا۔ ایسے کم از کم پچاس صحابہ کا پتا چلا ہے۔ اگر کسی طالب علم کو شوق ہوتا تو وہ ایک سے زیادہ صحابہ کی شاگردی کرتا اور اس کے پاس متعدد صحابہ کی تالیفوں کی نقلیں جمع ہو جاتیں۔ رفتہ رفتہ محدثوں نے بڑی محنت اور شوق سے سارے صحابہ کی تحریری اور زبانی یادداشتیں جمع کیں اور ترتیب و تنقید کے ذریعے یہ ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کے ہاں نہیں ہے۔ ایسے مجموعوں میں بخاری، مسلم، ابو داود ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ مالک اور ابن حنبل کی کتابیں بھی بڑی اہم اور مستند ہیں اور اس طرح چالیس پچاس ہزار حدیثیں محفوظ ہو گئی ہیں امام بخاری، مسلم وغیرہ کی کتابوں کو صحیح ماننے پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی ہی نہیں، ان کے اساتذہ اور اساتذہ کے اساتذہ، صحابہ تک کی ہر دور کی حدیث کی

Marfat.com

بھی کیسے سکتا ہے جبکہ قرآن خود بار ہااور صراحت سے کہتا ہے کہ جو بھی پیغمبر دے اسے لے لو۔ اور جس سے بھی منع کرے اس سے بچو۔ کیا اس کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی صحابی حضور اکرم سے کہے یا رسول اللہ، یہ قرآن ہے، میں اسے مانتا ہوں: لیکن حدیث تیری بات ہے، اس کا میں پابند نہیں؟ اگر کوئی بد بخت ایسا کہتا تو اسے فوراً امت سے خارج سمجھ لیا جاتا۔ جب کوئی سفیر آتا ہے تو مرسل الیہ کا حق بلکہ فرض ہوتا ہے کہ اس سفیر کے بھیجنے والے کی بات اور منشا سمجھے، اور حسبہ عمل کرے۔

اگر قرآن و حدیث میں کوئی فرق ہے تو وہ صرف ایک ثبوت کا مسئلہ ہے۔ قرآن کو جس احتیاط سے مرتب اور محفوظ کیا گیا وہ بات حدیث کے لیے ممکن نہ تھی۔ اس لیے عہدِ نبوی میں قرآن و حدیث میں صحابہ کے لیے کوئی فرق نہ تھا۔ اس کے بعد کے زمانے میں ہم پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر عمل لازم ہے۔ قرآن کی تدوین خود رسول اکرم نے فرمائی۔ اس کی تاریخ تفصیل سے نیچے آئے گی، اولاً حدیث کی تدوین کا مختصر ذکر کرتے چلیں۔

جب صحابہ کرام نے دیکھا کہ قرآن کی طرح رسول اکرم کی روزمرہ بات چیت، تقریروں، خطبوں میں بھی اہم ہدایتیں اور کارآمد باتیں ہوتی ہیں۔ یہ کہ قرآن کی تدوین پر تو حضور توجہ فرما رہے ہیں۔ لیکن اپنے اقوال یعنی حدیث پر کوئی توجہ نہیں فرما رہے ہیں۔ تو بعض ذہین اور علمی ذوق والے، خاص کر نوجوان صحابہ کو شوق ہوا کہ حدیث کو بھی مدون کریں، مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص ہر روز جو سنتے وہ لکھ لیتے۔ ساتھیوں نے ٹوکا تو کیا کر رہا ہے۔ حضور ایک انسان ہیں کبھی خوش رہتے ہیں، کبھی خفا، آپ کی ہر چیز کو لکھنا کیسے مناسب ہو سکتا ہے؟ اعتراض معقول تھا۔ لیکن آدمی تھے ذہین۔ اس لیے خود حضور ہی سے پوچھا: کیا میں آپ کی ہر بات کو لکھ سکتا ہوں؟ جواب دیا: کیوں نہیں؟ مکرر مزید اطمینان کے لیے پوچھا: کیا وہ بات بھی جو آپ خوشی کی حالت میں فرمائیں۔ اور وہ بات بھی جو خفگی کی حالت میں بیان ہو؟ فرمایا: ضرور لکھو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری زبان سے حق کے سوا کبھی کوئی بات نہیں نکلتی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو نے دلچسپ اور اپنی دانست میں اہم حدیثوں کو قلمبند کرنا جاری رکھا اور اس میں ایسی ایک ہزار

131252

Marfat.com

مثالیں جمع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اس کا نام صحیفہ صادقہ رکھا۔ ان کے پوتے عمرو بن شعیب کے زمانے تک بھی اصل نسخہ باقی تھا۔ اور وہ اسی کو ہاتھ میں رکھ کر شاگردوں کو اس کی نقل کراتے (بخاری ترمذی، ابو داود، ابن سعد وغیرہ) ایک اور صحابی انس بن مالک ہیں۔ رسول اللہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو ان کے والدین ایمان کے جوش میں ان کو ساتھ لے کر رسول اللہ کے ہاں آئے اور کہنے لگے: یہ ہمارا بچہ دس برس کا ہے لیکن بڑا ذہین ہے۔ چنانچہ اسے ابھی سے لکھنا پڑھنا بھی آ گیا ہے۔ ہماری عزت افزائی ہو گی اگر آپ اسے اپنی خدمت کا موقع دیں۔ وہ آپ کے گھر میں خادم کی حیثیت سے رہے گا۔ حضور نے اسے قبول فرمایا: حضرت انس فرماتے ہیں: میں پورے دس برس یعنی حضور کی وفات تک رات دن حضور کے مکان میں رہا۔ آپ کا حسن سلوک کیا بیان کروں؟ خلوت اور جلوت میں آپ کی جو باتیں سنتا، میں انہیں نہ صرف لکھ لیا کرتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً وہ حضور کو سنایا بھی کرتا تھا تا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو تو حضور اس کی اصلاح فرما دیں۔ پھر اپنی اس طرح لکھی ہوئی جلدیں اپنے شاگردوں کو بتایا بھی کرتے (تقیید العلم از خطیب بغدادی، المستدرک از حاکم، تدریب الراوی از سیوطی، المحدث الفاضل از رامہرمزی وغیرہ) دیکھا دیکھی، حضرت ابو ہریرہ وغیرہ دیگر صحابہ بھی حدیث لکھنے لگے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد تو بہ کثرت صحابہ نے اپنے معلومات کو قلمبند کر کے اپنے بچوں اور شاگردوں کو دیا۔ ایسے کم از کم پچاس صحابہ کا پتا چلا ہے۔ اگر کسی طالب علم کو شوق ہوتا تو وہ ایک سے زیادہ صحابہ کی شاگردی کرتا اور اس کے پاس متعدد صحابہ کی تالیفوں کی نقلیں جمع ہو جاتیں۔ رفتہ رفتہ محدثوں نے بڑی محنت اور شوق سے سارے صحابہ کی تحریری اور زبانی یادداشتیں جمع کیں اور ترتیب و تنقید کے ذریعے یہ ایک ایسا ذخیرہ فراہم کیا جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب کے لوگوں کے ہاں نہیں ہے۔ ایسے مجموعوں میں بخاری، مسلم، ابو داود و ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی کتابوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ مالک اور ابن حنبل کی کتابیں بھی بڑی اہم اور مستند ہیں اور اس طرح چالیس پچاس ہزار حدیثیں محفوظ ہو گئی ہیں امام بخاری، مسلم وغیرہ کی کتابوں کو صحیح ماننے پر آدمی مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی ہی نہیں، ان کے اساتذہ اور اساتذہ کے اساتذہ، صحابہ تک کی ہر دور کی حدیث کی

Marfat.com

کتابیں محفوظ ہیں اور ان کا باہم مقابلہ کریں تو نظر آتا ہے کہ لفظ تو کیا، ایک شوشے تک کا ان میں فرق نہیں ہوا ہے۔ خدا اپنی مرحمت سے ایک نیا نبی صرف اسی وقت بھیجتا ہے جب سابق نبی کی تعلیم بگڑ گئی اور ضائع ہوگئی ہو۔ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی تعلیم خفیف ترین تبدیلی کے بغیر اب تک موجود ہے تو ظاہر ہے کہ کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں کیونکہ نیا نبی بھی مکرر وہی حکم دے گا۔ جو تحصیل حاصل ہوگا اور خدا ایسا فضول کام کر نہیں سکتا۔

قرآن کا بیان:

عام طور پر کسی مذہب کا بانی یہ کہا کرتا ہے کہ دوسرے سارے ہم عصر یا سابقہ دین غلط تھے صرف اس کا لایا ہوا دین صحیح اور نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سے دوسرے مذہب والوں کی دل شکنی ہوتی اور ان کو ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ حکیمانہ انداز اختیار کیا کہ پہلے انسان حضرت آدم سے لے کر بعد کے ہر زمانے میں خدا نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے۔ اگر وحی کے ذریعے سے آئے ہوئے احکام کسی پیغمبر نے لکھے ہی نہیں، یا اس کی لکھی ہوئی چیزیں، کسی طوفان، زلزلے آتشزدگی یا بیرونی حملہ آوروں وغیرہ کے ہاتھوں برباد اور غائب ہوگئیں تو اپنی وفور مرحمت سے خدا پھر ایک نبی بھیج کر اپنی ازلی ابدی تعلیم کی تجدید اور اعادہ کرتا ہے۔

اس حقیقت پر زور دینے سے کسی کی دل شکنی نہیں ہوتی بلکہ دین ایک ہی ہوتا ہے جو مسلسل بھی اور عالمگیر بھی ہوتا ہے اور قومی، قبائلی تعصب بھی غور وفکر میں مانع نہیں آتا۔

وحی خدائی چیز ہے رسم ورواج اور علماء کا استنباط وقیاس انسانی چیز ہیں۔ اگر انسانی چیز سے خدائی چیز کی ترمیم وتبدیلی ہو جایا کرے تو دین خداداد چیز کی جگہ انسانوں کا ساختہ وپرداختہ امر ہو جائے گا۔ اس لیے خدا ورسول کی کسی چیز کو بدلنے کا ہمیں حق نہیں۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ کسی کے حکم کو خود وہی شخص یا اس سے برتر افسر بدل سکتا ہے اس کا ماتحت نہیں۔ مثلاً کسی پولس کمشنر کے حکم کو خود وہی یا وزیر داخلہ بدل سکتا ہے۔ اسی طرح کسی فقیہ کے استنباط کو خود فقیہ بدل سکتا ہے اسی طرح اس کو قرآن وحدیث کے خلاف ہونے کی بناء پر رد کیا جا سکتا ہے۔ قرآن وحدیث کو صرف خدا ورسول ہی بدل سکتے ہیں، معمولی انسان

Marfat.com

نہیں۔

اولین انسان حضرت آدم سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ تک سیکڑوں ہزاروں نبی آ چکے ہیں۔ ان میں بہتوں کو خدا نے ایک کتاب بھی دی۔ قرآن میں پچیس تیس انبیاء کا نام آیا ہے۔ مگر کئی بار یہ صراحت بھی ہے کہ ان کے سوا اور نبی بھی ہوئے ہیں جن کے نام نہیں لیے گئے ہیں۔ اسی طرح کتابوں میں صحف ابراہیم، توراۃ موسیٰ، زبور داود، انجیل عیسیٰ اور نبی اسلام کے قرآن کا نام لیا گیا ہے۔ دیگر انبیاء کی کتابوں کا محض اشارہ ہے اور زبر اولین (پرانے لوگوں کی کتابیں) کا نام دیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ حضرت آدم اور حضرت نوح پر بھی کتابیں نازل ہوئی تھیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اولاد آدم پر واجب ہوگا کہ حضرت آدم کی کتاب پر عمل کریں لیکن جب حضرت نوح پر ایک کتاب نازل ہوئی تو سابقہ یعنی حضرت آدم کی کتاب پر عمل کرنا خدا کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی اور خدا کی مرضی کی خلاف ورزی ہوگئی۔ دونوں کتابیں خدا کی ہیں۔ لیکن عمل جدید ترین کتاب اور تازہ ترین حکم پر کرنا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم کے زمانے میں حضرت نوح کی کتاب پر، حضرت موسیٰ کے زمانے میں حضرت ابراہیم کی کتاب پر عمل کرنا درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ سب سے آخری نبی پر نازل شدہ کتاب، خدا کا تازہ ترین حکم ہے اس لیے اب اسی کی تعمیل میں نجات منحصر ہے۔

پرانے انبیاء کی کتابیں منسوخ شدہ تو ہیں لیکن ہیں خدا ہی کی نازل کردہ۔ اسی لیے ان کا ادب واحترام ضروری ہے۔ قرآن میں پرانے مذہبوں میں سے صابی لوگوں کا ذکر ہے قلیل تعداد میں یہ اب تک عراق میں ہے اور اپنے کو حضرت نوح کا متبع قرار دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایک کتاب تھی۔ لیکن اب وہ باقی نہیں البتہ اس کے مندرجات کا خلاصہ ان کے ہاں موجود ہے۔

قرآن میں مجوسیوں یعنی پارسیوں کا بھی ذکر ہے۔ ان کے مذہب کے بانی کا نام زردشت تھا اور ان کی کتاب کا نام آویستا۔ یہ زند زبان میں تھی لیکن اب باقی نہیں۔ اس کا ترجمہ پاژند زبان میں ہوا تھا۔ جس کے اب کچھ ٹکڑے باقی ہیں۔ اس مذہب میں بھی خدا کی وحدانیت، وحی، جنت دوزخ کا ذکر ہے اور آئندہ دین کو مکمل کرنے والے ایک نبی

Marfat.com

کے آنے کی پیشگوئی ہے جس کا نام، رحمۃ للعالمین، بتایا گیا ہے۔ یہ لوگ آگ کو خدا کی قدرت کا سب سے بڑا مظاہرہ سمجھ کر اس کا احترام کرتے ہیں اور خدا کی طرف برائی کا انتساب نہ کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ نیکی کا پیدا کرنے والا الگ اور برائی کا پیدا کرنے والا الگ۔ اسی طرح عملاً ایک کی جگہ دو خدا کو ماننے لگ گئے ہیں۔

قرآن میں صحف ابراہیم کا ذکر ہے اس کا ذکر یہودیوں کی دینی کتابوں میں بھی ہے لیکن حضرت ابراہیم کی یہ کتابیں اب ناپید ہیں بعض باتیں البتہ قابلِ غور ہیں۔ حضرت ابراہیم کا قصہ توراۃ میں یہ لکھا ہے کہ وہ اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے تو وہاں کے ظالم بادشاہ نے ان کی بیوی کو زبردستی اپنے گھر میں ڈال لیا۔ پھر وہاں معجزے پیش آئے اور وہ بی بی کے ساتھ بدکاری نہ کر سکا اور گھبرا کر انہیں حضرت ابراہیم کے پاس واپس کر دیا۔ اس قصے کو رام چندر جی، سیتا اور لنکا کے راجہ راون کے قصے سے بڑی مشابہت ہے۔ ہندوؤں کے ہاں وید نام کی چار الہامی کتابیں ہیں۔ جو براھما کی تالیف مانی جاتی ہیں۔ براھما اور ابراہیم میں بھی بڑی مشابہت ہے ہندو کہتے ہیں کہ عراق کے راستے سے ہندوستان آئے۔ عراق ہی حضرت ابراہیم کا وطن ہے۔ ہندوؤں کی پرانی تاریخ موجود نہیں وہ جہاں بھی جاتے شہروں کا نام بھی اپنے پرانے شہروں کے نام پر رکھتے۔ مثلاً رامائن و مہابھارت کے جو جو شہر ہیں، وہ ہندوستان میں بھی ہیں ہندچینی میں بھی، انڈونیشیا میں بھی، کیا تعجب کہ ہندستان آنے سے پہلے آریا یہ نام عراق میں پائے ہوں۔ وید اور پران وغیرہ میں بھی آئندہ ایک آخری نبی کے آنے کی خوش خبری ہے۔

قرآن میں سارے ہمعصر مذہبوں کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں بدھ مت بھی بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس کا نام نہ ہو تو حیرت کی بات ہوتی کہ ان کو اسلام کی دعوت کیوں نہ دی اسی بنا پر استاد مرحوم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کا خیال تھا کہ شاید پیغمبر ذوالکفل علیہ السلام سے گوتم بدھ مراد ہوں بعض پرانے مسلمان علماء نے بھی یہ رائے ظاہر کی تھی۔ بات یہ ہے کہ ذوالکفل کے حالات نہ قرآن میں ہیں نہ حدیث میں اور نہ تورات و انجیل میں اور یہ کوئی نام بھی نہیں بلکہ لقب ہے (جیسے ذوالنون لقب ہے اور نام یونس علیہ السلام ہے) ذوالکفل کے معنے ہیں کفل والا (ذوالنون کے معنے ہیں۔ نون یعنی مچھلی والا) گوتم

Marfat.com

بدھ کے وطن کا نام کپل وستو تھا (جو بنارس کے شمال میں کوئی دو سو میل پر واقع تھا) عربی میں حرف ،پ، نہیں پایا جاتا۔ اس لیے کپل کو معرب کر کے کفل بنا دیا جا سکتا ہے۔ ایک دوسری توجیہ یہ ہے کہ کفل کے معنے کفالت کرنے یعنی روزی دینے کے ہیں۔ گوتم بدھ کے والد کا نام سدھ دانہ (یعنی پاک روزی) تھا۔ گویا ذوالکفل کے معنے، سدھ دانہ والا، ایک دوسرا اشارہ بدھ مت کی طرف قرآن میں سورۃ والتین میں نظر آتا ہے جہاں لکھا ہے: قسم ہے انجیر کے درخت، اور زیتون کے درخت، اور سینا پہاڑ اور اسی محفوظ شہر کی کہ .... محفوظ شہر سے مراد مکہ اور پیغمبر اسلام ہوں گے۔ سینا پہاڑ (طور سینین) پر حضرت موسیٰ کو خدا کی تجلی ہوئی اور توراۃ عطا ہوئی تھی۔ زیتون کا درخت یعنی جبل زیتون حضرت عیسیٰ پر منطبق ہوتا ہے انجیر کے درخت سے کون مراد ہیں؟ بہت سے مفسر اسے حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں انجیر کے درخت کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ رہی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے یاد دلایا ہے کہ گوتم بدھ کو گولر یعنی جنگلی انجیر کے درخت کے نیچے ہی عرفان حاصل ہوا تھا اور اس کا، بودی درخت، کے نام سے بدھ مت والے اب تک بڑا احترام کرتے ہیں۔ گوتم بدھ نے بھی ایک آنے والے بڑے نبی کا مژدہ دیا ہے۔

قرآن میں صراحت کے ساتھ حضرت موسیٰ کو تورات کے دیے جانے کا ذکر ہے۔ آج کل بائبل کے نام سے جو کتاب ملتی ہے اس میں حضرت موسیٰ کی کتاب بھی ملتی ہے اور تیس چالیس دیگر کتابیں بھی (جو یہود کیتھلسکوں اور پراٹسٹنٹوں کے ہاں باعث نزاع ہے۔ بعض رسالے ایک مذہب کے لحاظ سے بائبل کا جزو ہیں اور بعض کے لحاظ سے نہیں) ان میں یوشع، اشموئیل، عزرا، نحمیا، ایوب، داود، سلیمان، یسعیا، یرمیا، حزقیل، دانیال، یونس، زکریا، (لیکن یہ وہ نہیں جن کا ذکر قرآن میں حضرت یحییٰ کے والد کے طور پر ہوا ہے۔ بلکہ ایک اور قدیم تر نبی ہیں)۔ مہ خیا وغیرہ انبیاء کی کتابیں بھی ہیں اور قصے کہانیوں کی کتابیں بھی جن کو انبیاء سے کوئی تعلق نہیں۔ ان سب کے مجموعے کو عہد قدیم کا نام دیا جاتا ہے۔

عہد قدیم (بائبل) میں حضرت موسیٰ کی طرف پانچ رسالے منسوب ہیں:

Marfat.com

(۱) کتاب پیدائش (۲) کتاب خروج (۳) کتاب تورات

(۴) کتاب اعداد (۵) کتاب تثنیہ

ان میں تیسرا رسالہ یعنی کتاب تورات سب سے اہم ہے۔تورات کے معنے ہیں قانون اور اس رسالے میں قانونی احکام ہی ہیں۔اس لیے جزو کا اطلاق کل پر کر کے پانچوں رسالوں کو یہودی،تورات، کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ان میں سے پہلی کتاب میں حضرت آدم کی پیدائش سے لے کر حضرت ابراہیم تک کے حالات ہیں۔کتاب خروج میں حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلنے کا ذکر ہے۔کتاب تورات میں عبادت،قربانی، قانون نکاح وتعزیرات وغیرہ کا ذکر ہے۔کتاب اعداد میں زیادہ تر بنی اسرائیل کی مردم شماری کا بیان ہے۔کتاب تثنیہ میں پرانی چیزوں ہی کا اعادہ اور کسی قدر ترمیم کے ساتھ دوبارہ ذکر ہے یہ کتاب شروع میں یہودیوں کے ہاں نہ تھی۔حضرت موسیٰ کے چھے سو سال بعد ایک تہ خانے میں ملی اور ایک نبی عورت نے کہا کہ یہ حضرت موسیٰ کی کتاب ہے تب سے یہ تورات کا جزو بن گئی ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کی وفات اور وفات کے بعد کے حالات بھی ہیں۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کے بعد کی چیز ہے۔

حضرت داود کی زبور بھی اسی مجموعے میں ملتی ہے۔ یہ (۱۵۰) نظموں کا مجموعہ ہے۔لیکن فرنگی خود کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض نظمیں اصلی اور بعض بعد کی الحاقی اور غیر لوگوں کی ہیں۔

حضرت موسیٰ،حضرت داود اور حضرت یسعیا کی کتابوں میں بھی ایک آنے والے نبی کا ذکر ہے۔

قرآن میں صراحت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو انجیل عطا کی گئی ہے۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنے ،خوش خبری کے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں ان کے وطن پر یونانی (بیزنطینی) لوگوں کا قبضہ تھا۔اگرچہ خود وہ آرامی زبان بولتے تھے۔وہ زبانی تقریروں وعظوں میں خدا یہ فرماتا ہے۔خدا وہ فرماتا ہے،کہا کرتے تھے لیکن اس وحی کو لکھانے پر کبھی توجہ نہ فرمائی۔ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے مختلف

Marfat.com

صحابہ اور صحابہ کے تابعین کو شوق ہوا کہ حضرت عیسیٰ کی سوانح عمری لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ان لوگوں نے انجیل کا نام دیا۔ (جو قرآن و حدیث نہیں بلکہ سیرت النبی کی کتابوں سے مشابہ ہیں۔ جن میں حضرت عیسیٰ کے احوال بھی ہیں اور اقوال بھی اور ضمناً خدا کے احکام کا انتخاب بھی) ایسی ستر سے زیادہ انجیلیں لکھی گئیں۔ ان میں سے کلیسا صرف چار کو قبول کرتا اور باقی کو غیر صحیح کہہ کر رد کرتا ہے۔ لیکن چار صحیح انجیلوں کو کب، کس نے اور کس بنیاد پر صحیح قرار دیا۔ اس سے کوئی واقف نہیں بلکہ صرف یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے تین سو سال بعد سے مسلم چلی آرہی ہیں۔

بائبل میں آج کل جو انجیل ملتی ہے اس میں مذکورہ چار، صحیح انجیلیں، بھی ہیں اور پندرہ بیس دوسرے رسالے بھی (ان کی تعداد پر سب کو اتفاق نہیں اور وہ گھٹتے بڑھتے رہے ہیں اور ان سب کے مجموعہ کو عہد جدید کہا جاتا ہے۔) انجیلیں متی، مرقس، لوقا اور یوحنہ کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سے بعض حواری یعنی حضرت عیسیٰ کے صحابہ میں سے ہیں اور بعض نہیں۔ دیگر رسائل میں پولس، پطرس، یعقوب اور یہودا کے خطوط بھی ہیں۔ پولس نے حضرت عیسیٰ کو جیتے جی کبھی نہ مانا بلکہ عیسائیوں کو تکلیف ہی دیتا رہا۔ حضرت عیسیٰ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اس نے عیسائیت کو قبول کرنے کا اعلان کیا اور اب اسی کے خیالات پر کلیسا میں عمل کیا جاتا ہے چاہے وہ حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب صریح احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب انجیل کا اب دنیا میں وجود نہیں ہے صرف آپ کی سیرت اور سوانح عمری کی کتابیں انجیل کے نام سے ملتی ہیں۔

بائبل میں عہد قدیم اور عہد جدید دونوں شامل ہوتے ہیں عہد قدیم یہودیوں کی کتاب ہے عہد جدید عیسائیوں کی۔

غرض قرآن نے یہ اصولی بات بیان کی کہ خدا ہر زمانے میں نبی بھیجتا اور انہیں وحی کے ذریعے سے کتابیں روانہ کرتا رہا اور یہ کہ اب آخری اور جدید ترین کتاب یعنی قرآن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بھیجا گیا ہے اب اسی پر عمل کرو۔ پرانے انبیاء کی کتابیں موجود ہوں یا ضائع ہو گئی ہوں۔ بعینہ باقی ہوں یا ان میں تحریف ہوئی ہو، اس کو اہمیت نہیں۔ نیا قانون، نیا حکم موجود ہے عمل اس پر کرو۔ پرانے احکام کے بھی خدائی

Marfat.com

ہونے کو مانو اور بس۔

قرآن مجید کا اسلوب:

بائبل کی ابتدائی کتابوں میں بطور تمہید انسانیت کی تاریخ ہے اور پھر صرف بنی اسرائیل کے حالات ہیں عہد جدید میں انجیلوں میں حضرت عیسیٰ کی سوانح عمری اور دیگر رسائل میں وعظ ونصیحت وغیرہ اور کلیسا کی مشکلوں کے حالات ہیں ان کو قصہ کہانی کی طرح دلچسپی سے پڑھا جاسکتا ہے۔

قرآن (سورہ ۱۵، آیت ۹۱) کا بیان ہے کہ خود عہد نبوی میں مشرکین مکہ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ بے ترتیب ٹکڑوں کا انبار ہے۔ قرآن کے اس خاص طرز بیان کے متعدد اسباب ہیں:

(۱) قرآن کے اصل اور اولین مخاطب رسول کریم ہیں پھر آپ کے وسیلے سے امت۔ دوسرے الفاظ میں بادشاہ اپنے سفیر کو کچھ ہدایتیں دے رہا ہے۔ بادشاہ عام لوگوں کی طرح بات نہیں کرتے۔ کبھی وہ صراحت کرتے ہیں تو کبھی اشارہ کنایہ اور معبود ذہنی کے ساتھ اثناء گفتگو میں وہ اپنا انداز بھی بدلتے رہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، ہم کہتے ہیں، بادشاہ کہتا ہے وغیرہ مثلاً سورہ ۵ آیت ۱۲، ایک ہی آیت میں تینوں قسم سے خدا کا ارشاد ہوا ہے۔ سفیر اور بادشاہ کے مقرب تو صریح اور کنایہ سب بخوبی سمجھ لیتے ہیں عوام الناس کو ہر چیز کا جاننا ضروری بھی نہیں۔

(۲) قرآن پورے کا پورا بہ یک وقت نازل نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تئیس سال کی طویل مدت میں رفتہ رفتہ نازل ہونے والی آیتوں کو ترتیب دے کر مدون کیا گیا ہے۔ بعض کا مقصد یہ تھا کہ نبی ان میں مندرج دلیلوں کی مدد سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دے بعض آیتیں لوگوں کے سوالات کے جواب میں نازل ہوئیں۔ بعض کا منشا یہ تھا کہ کوئی مسئلہ کوئی گتھی ہو تو رسول اکرم اسے کس طرح حل کریں۔ وغیرہ

(۳) قرآن اس طرح بولتا ہے کہ جاہل سے جاہل اور قلیل سے قلیل علم والا بھی اس

سے استفادہ کر سکے۔ اس سے عالم بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر عالمانہ انداز اختیار کرتا تو عوام اسے سمجھ نہ سکتے۔ اسی لیے عام بدویوں کے سمجھانے کے لیے ان کی نفسیات کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ اسی لیے اس میں تکرار بھی ہے، ترنم بھی مسجع مرصع عبارت سے اجڈ آدمی اسی طرح رام ہو جاتا ہے جس طرح بانسری کی آواز سے سانپ۔ اجڈ آدمی کو رام کرنے کے بعد اس کی توجہ کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل انداز اور آواز بدلنے کی ضرورت ہے ورنہ ایک ہی سر ہو تو آدمی مسحور ہو کر سو جائے اور سمجھے کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے اس میں معلوم قصوں کی طرف اشارہ اور تلمیح ہے۔ پورا قصہ دہرانے کی ضرورت نہیں تا کہ آدمی خود بھی اپنے ذہن پر کچھ بار ڈالے۔ کچھ سوچے کچھ کوشش کرے کہ انسان بے محض جانور نہ رہے کہ کھائے، پیئے، سوئے، اولاد جنے اور پھر مر جائے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ رسول اکرم اگرچہ خود ایک بڑے شہر مکہ کے باشندے تھے، لیکن قرآن زیادہ تر صحرا نشین خانہ بدوش بدوی سے تخاطب کرتا ہے۔ ہم اسے مبارکباد بھی دیں گے اور خدا کا شکر بھی کہ اس بیچارے مصیبت زدہ کی جگہ ہماری حالت بہتر رکھی ہے۔ اسی لیے جنت جیسی عالم غیب کی چیز کو اس طرح بیان کیا ہے جس کی بدوی کو تمنا اور حسرت ہو (جنت اس سے کہیں بالا ہے، لیکن اصل جنت کو ہم سمجھ کیسے سکتے ہیں) جنت میں سدا ٹھنڈا سایہ ہو گا۔ پانی کی نہریں سطح زمین پر بہتی ہوں گی، یہ پانی کبھی نہیں سوکھے گا۔ میوہ دار درخت ہوں گے، کھانے کو پرندوں کا گوشت ملے گا۔ خدمت کو سرخ وسپید اور سدا جوان رہنے والی کنیزیں ہوں گی وغیرہ۔ کسی صحرا میں یہ چیزیں نعمت ہوں گی۔ جن علاقوں میں سرسبزی زیادہ ہے وہاں والوں کو خدا کا زیادہ شکر گزار اور زیادہ اطاعت گزار ہونا چاہیے۔

قرآن میں بیان شدہ چیزیں:

قرآن میں ہر شخص، ہر ملک اور ہر زمانے کی ضرورتوں کا ذکر ہے۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک ہر شخص کو بتایا گیا ہے کہ اسے کیا کرنا، کب صبر اور کب شکر کرنا چاہیے؟ حکمرانی، انصاف، تجارت، زراعت نکاح طلاق، وراثت، جرم، اور سزا عبادت، خیرات

Marfat.com

غرض ہر چیز کا ایک ہی کتاب میں ذکر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک چیز کی تلاش کرنے والا آسانی سے راستہ نہیں پاتا۔ اسے ساری چیزیں پڑھنا اور بار بار پڑھنا ہوتا ہے۔ کبھی حکم صراحت سے ملے گا۔ کبھی ضمناً اشارے کنائے کی صورت میں، اس میں ہر شخص کی ضرورت کی چیزیں بیان ہوئی۔ اس کا ثبوت یہ واقعہ ہے کہ جب مسلمان عبارت تھے مٹھی بھر مصیبت زدہ بے خانماں لوگوں سے تو ان کے لیے بھی قرآن کافی تھا اور اس وقت بھی جب مسلمان اندلس سے چین تک یعنی بحر الظلمات سے بحر الکاحل تک تین براعظموں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ ان کے عقائد، ان کی عبادت، ان کا قانون ان کے اخلاق اور ان کے ہر شعبۂ حیات کی رہنمائی اسی میں ان کو ملتی رہی، باہر سے کسی چیز کے لینے کی ان کو حاجت نہ رہی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن صرف، مانو، نہیں کہتا بلکہ یہ بھی کہ سوچو، غور کرو، عقل لڑاؤ، بحث و تدقیق کرو، غرض یقین حاصل کرو کہ یہ ایسا ہی ہے۔ چاہے معاملہ عقائد کا ہو (جیسے خدا کی وحدانیت، قیامت کا آنا) یا عبادات کا (جیسے نماز روزہ) یا اخلاقی، سماجی چیزوں کا (قتل، زنا، چوری وغیرہ کی ممانعت) وغیرہ

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ سارے کائنات کا پیدا کرنے والا اور مالک خدائے واحد ہے جس کے نہ والدین نہ بیوی، نہ بچے اور نہ شریک یا مماثل، وہ نظر اور ادراک سے باہر ہے لیکن ہے موجود، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں۔ اس لیے اپنی مہربانی سے وہ اپنے احکام اور اپنی مرضی سے وحی کے ذریعے سے اپنے خاص بندوں (پیغمبروں) کو آگاہ کرتا ہے اور پیغمبر ہمیں اس کی اطلاع دیتے ہیں اور مخلوقات (جانور، درخت، پتھر) خدا کی مرضی کی ہمیشہ تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن انسان میں ایک خودی پیدا کی گئی ہے جو کام اسے کرنا چاہیے وہ کبھی اسے کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ اس لیے ترغیب و ترہیب کی ضرورت تھی۔ اچھے کام پر جزا، برے کام پر سزا۔ اس کے لیے دنیوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی، حساب کتاب اور جنت دوزخ معقول بات ہیں۔ اگر مرنے کے بعد ہر چیز ختم ہو جائے تو کسی کو اچھے کام کی ترغیب نہ ہو اور ہر شخص صرف اپنے فائدے کی کوشش میں رہے اور اپنے واجبات اور

Marfat.com

فرائض کی پروانہ کرے۔

خدا ایک ہے لیکن اس کی صفتیں بہت ہیں، پیدا کرنے والا، فنا کرنے والا، رزق دینے والا، سزا اور جزا دینے والا، معاف کرنے والا، رحم والا، قدرت والا، ہر چیز کو دیکھنے سننے، جاننے والا وغیرہ وغیرہ۔ ایک سوال رہ رہ کر ہر شخص کے دل میں آتا ہے کہ جب ہر چیز خدا ہی مقرر اور مقدر کرتا ہے تو پھر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی برائیوں کی سزا کیوں پائے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس بحث پر خفا ہو جایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس بحث میں پڑنے سے پرانی قومیں گمراہ ہو گئیں۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک گتھی ہے۔ اگر ہم یہ خیال کریں انسان اپنے اعمال خود کرتا ہے اور اسی لیے ان کا ذمہ دار ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خدا کی قدرت کامل نہیں، وہ انسان کا تو خالق ہے۔ لیکن انسان کے کاموں کا خالق نہیں، اس کے برخلاف اگر یہ کہیں کہ خدا ہی ہر بات کی تقدیر کرتا ہے تو پھر اس بات کی ذمہ داری ایک دوسرے شخص یعنی انسان پر کیوں؟ اصل میں یہ دو مخالف چیزیں ہیں۔ جس طرح چاند اور سورج دونوں آسمان میں گھومتے ہیں۔ لیکن اوپر تلے ہونے کی وجہ سے ٹکراتے نہیں۔ اسی طرح انسان کی مسؤلیت اور ذمہ داری دنیاوی مفہوم ہے۔ خدا کی قدرت آسمانی مفہوم ہے دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ خدا قادر بھی ہے اور انسان مسؤل بھی، ان میں کوئی تضاد اور تصادم نہیں۔ غلام کو آقا کی مرضی پر عمل کرنا ہوتا ہے، آقا سے ''کیوں'' پوچھنے کا حق نہیں۔

خدا کا پیغام انسان تک پیغمبر پہنچاتے ہیں۔ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک ہزاروں، پیغمبر ہر ملک اور ہر زمانے میں آئے۔ پیغمبری کی حد تک سب برابر ہیں۔ ان میں باہم کوئی فرق نہیں۔ رتبے میں باہم فرق ہو سکتا ہے۔ کسی کو ایک چھوٹے علاقے کے لیے بھیجا جائے۔ دوسرے کو بڑے علاقے یا ساری دنیا کے لیے۔ کسی کو ایک زمانے کے لیے، دوسرے کو آخری نبی ہونے کے باعث ہمیشہ کے لیے۔

پہلے پیغمبر آتے رہے اور اب نہیں۔ اس کی وجہ یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ خدا کی مرضی اور حکم بدلتے نہیں لیکن اگر خدا کا حکم انسان ضائع کر دے تو اس کے اعادے کی ضرورت ہوگی۔ پرانے انبیاء کی کتابیں یا تو لکھی ہی نہ گئیں یا ضائع ہو گئیں یا ان میں حذف و اضافہ

لوگوں نے اتنا کیا کہ وہ مسخ ہو گئیں۔ صرف قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو اصلی زبان (عربی) میں اب تک باقی ہے اور یہ زبان اب تک زندہ بھی ہے اور کتاب کامل ہے۔ اس میں پیغمبر کے زمانے سے اب تک نہ ایک حرف کا اضافہ ہوا اور نہ اس میں سے ایک حرف حذف۔ خدا نیا پیغمبر بھیجنے پر قادر ضرور ہے۔ لیکن ایسا نیا پیغمبر وہی بات دہرائے گا جو پہلے سے موجود اور معلوم ہے یعنی اللہ کو ایک مانو، اس کی عبادت کرو، وغیرہ۔ اس لیے ایک نیا پیغمبر تحصیل حاصل ہوگا، جو خدائے حکیم کے لیے لائق نہیں۔

بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کا بہ کثرت ذکر:

قرآن جس زمانے میں نازل ہوا، اس وقت دنیا میں کئی قسم کے مذہب موجود تھے، خدا کے وجود سے انکار کرنے والے بھی، بت پرست بھی، خدا کو مانتے ہوئے اس کی خدائی میں اوروں کو شریک کرنے والے (مشرک) بھی اور خدا کو ایک ماننے والے بھی تھے۔ ایسے مذہب بھی تھے جو کسی نئے شخص کو اپنے میں داخل نہیں کرتے تھے اور ایسے بھی جو تبلیغ میں مشغول تھے۔ ایسے بھی تھے جو صرف روح پر توجہ کرتے اور دنیا سے غافل تھے۔ ایسے بھی تھے جو مادہ پسند اور روحانی پہلو کو نظر انداز کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو چاہے اصولی عقائد میں ٹھیک ہوں لیکن اباحیت پر کار بند تھے اور اخلاقی نقطہ نظر سے انتہائی گندہ سمجھے جا سکتے تھے۔

توحید کے مخالف مذہبوں (مثلاً الحاد، شرک، بت پرستی وغیرہ) کے خلاف قرآن کا جہاد وجدال کسی توضیح یا توجیہ کا محتاج نہیں۔ لیکن جو مذہب توحید کی تعلیم دیتے ہوں اور الہامی کتابوں ہی پر مبنی ہوں ان کی مخالفت اگر قرآن نے کی ہے تو ان مذہبوں کی اصلی شکل کی نہیں۔ بلکہ اس حالت کی جس پر وہ قرآن کے نزول کے زمانے میں پہنچ گئے تھے اور توحید کے ساتھ اس میں خرافات کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مزید براں قرآن نے ایسے لوگوں کو یاد دلایا کہ تمہاری مذہبی کتاب میں ایک آخری نبی کی پیشگوئی ہے اور تم اس کے انتظار میں رہے ہو۔ اب وہ نبی آ گیا۔ اس سے انکار نہ کرو۔ اس سلسلے میں خاص کر بنی اسرائیل کا قرآن میں بہت ذکر ہے۔

اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ مٹھی بھر ہونے کے باوجود یہودیوں میں غیر معمولی عملی

Marfat.com

صلاحیتیں تھیں۔ تجارت وحرفت میں، فہم وفراست میں، تنظیمی قابلیت میں، مشکل سے کوئی انسانی گروہ ان کا مقابلہ کرسکتا تھا اور مذاہب کے مقابلے میں ان کا مذہب کم بگڑا تھا اور اسلام سے قریب تھا۔ عربوں کی طرح وہ بھی حضرت ابراہیم کی اولاد سے تھے، اس لیے عرب نبی کے خلاف انہیں تعصب بھی نہ ہونا چاہیے تھا۔

اسلام کی امتیازی خصوصیتیں:

سارے ہی مذہب اور فلسفے نیکی اور اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ مگر صرف اخلاق کافی نہیں۔ انسان کی اور بھی جسمانی اور روحانی ضرورتیں ہیں۔ جب تک ان ساری ضرورتوں کو کوئی مذہب پورا نہ کرے وہ مذہب کامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسلام یعنی قرآنی تعلیم کی چند خصوصیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) وہ زندگی کے سارے پہلوؤں کی جامع ہے۔ وہ سارے انسانوں کے لیے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ وہ دین اور دنیا دونوں کی رہنمائی کرتی ہے وہ حکمران سے لے کر فقیر تک ہر کسی کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صحیح طریقہ بتاتی ہے۔ لفظ، امام، سے مراد اسلام میں وہ شخص بھی ہوتا ہے جو مسجد میں نماز پڑھاتا ہے اور وہ بھی جو رئیس حکومت وسلطنت ہوتا ہے۔ دین ودنیا دونوں کی باگ ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہونے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دین نظر انداز ہوتا ہے اور نہ دنیا۔ ورنہ مثلاً اگر دنیوی خزانہ کسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ دینی انتظام سے الگ رہے تو دین کی مالی ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں گی۔ غرض قرآن دین ودنیا دونوں پر حاوی ہے اور ساتھ ہی روادار بھی جو لوگ اسلام قبول نہیں کرنا چاہتے ان پر جبر نہیں کرتا۔

(۲) قرآن کے ہمہ گیر ہونے کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ اس سے انسان کی ترقی اور پیشروی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو قرآن، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے۔ یعنی معروف کا حکم دیتا اور منکر سے روکتا ہے "معروف" کے معنے ہیں وہ چیز جس کا اچھا ہونا ہر شخص جانتا اور مانتا ہے۔ منکر کے معنے ہیں وہ چیز جس کے اچھے ہونے کا کوئی قائل نہیں ہوتا بلکہ جس کی برائی پر سب ہی متفق ہوتے ہیں۔ چونکہ بھلائی

اور برائی، خیر اور شر ایک اضافی بات ہیں اور کسی میں خیر زیادہ اور کسی میں خیر کم ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی کاموں کی پانچ قسمیں کی جا سکتی ہیں:

(الف) جن کاموں میں صرف بھلائی ہی ہو۔ یہ فرض اور واجب ہوں گے۔

(ب) جن میں صرف برائی ہی ہو۔ یہ ممنوع اور حرام ہوں گے۔

(ج) جن میں بھلائی زیادہ ہو۔ یہ مستحب یعنی پسندیدہ ہوں گے اور ان کی سفارش کی جائے گی۔

(د) جن میں برائی زیادہ ہو۔ یہ مکروہ ہوں گے اور ناپسندیدہ سمجھے جائیں گے۔

(ہ) جن میں نہ برائی ہو نہ بھلائی، یا دونوں برابر ہوں۔ یہ مباح ہوں گے اور ان کا کرنا نہ کرنا ہر شخص کی مرضی پر رہے گا۔

کسی چیز کا قرآن یا حدیث میں ذکر ہو تو وہ خود بخود واجب یا حرام نہیں ہو جاتی بلکہ شارع نے ان میں لچک رکھی ہے۔ قرآن خیرات کی بھی تاکید کرتا ہے۔ زکات دینے کی بھی۔ لیکن دونوں کی اہمیت یکساں نہیں۔ قتل و زنا بھی ممنوع ہیں۔ مرد کو زنانہ پن اور عورت کو مردانہ انداز بھی، دونوں کی حرمت یکساں نہیں۔ سزائیں بھی یکساں نہیں۔ بعض پر صرف آخرت میں سزا ہے تو بعض پر دنیا اور آخرت دونوں جگہ اور خود جن میں دنیوی سزا ہے۔ وہ بھی یکساں نہیں۔ چنانچہ قتل پر قصاص یا خون بہا کا حکم ہے تو غیر شادی شدہ کے زنا پر سو کوڑے۔ شراب کی سزا حکومت کی صوابدید پر نظر آتی ہے کیونکہ رسول اکرم چالیس مرتبہ جوتا مارتے تھے تو حضرت عمر نے سو درے لگانے شروع کیے تھے مزید برآں پیغمبر کی وفات پر نئی وحی کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ لیکن نئے واقعات کا انسانی سماج میں پیدا ہونا بند نہیں ہوتا۔ اس کا علاج خود رسول اکرم نے فرما دیا ہے اور حکم دیا ہے۔ اسلامی قانون سے واقف خداترس مسلمان اجتہاد سے نئے معاملات کا حکم معلوم کریں۔ چونکہ سارے فقہاء کو قدیم ہوں یا جدید رائے کی یکساں آزادی حاصل ہے اس لیے ایک کے قیاس سے دوسرا فقیہ اختلاف کر سکتا ہے۔ ایک زمانے کے اجماع کو ایک بعد کے زمانے کے اجماع سے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ جو زبان زد ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس سے مراد دو باتیں ہوتی ہیں۔

Marfat.com

(الف) یا یہ کہ نئی بات ناممکن ہوتی ہے۔ ہزاروں برس پہلے از یاد رفتہ زمانے کے انسان نے معلوم کیا تھا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس میں ہم آج بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔

(ب) یا یہ کہ فن نہ جاننے والے، ناواقف اور جاہل لوگوں کو اس کا حق نہیں کہ فنی چیزوں میں اپنی مرضی سے حکم لگائیں۔ بیماری پر آدمی طبیب یا طب کے طالبعلم سے مشورہ کرتا ہے۔ کسی شاعر سے نہیں۔ چاہے نوبیل پرائز کا انعام یافتہ ہی کیوں نہ ہو مکان کی تعمیر و ترمیم میں انجینئر سے مدد لی جاتی ہے کسی فلسفی سے نہیں۔ اگر طب، تعمیرات، طبیعیات وغیرہ فنی چیزیں ہیں۔ جن میں تخصص پیدا کرنے کے لیے طویل تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے تو مذہب اور قانون بھی مستقل فن ہیں۔ جاہلوں کو اٹکل پچو سے اس میں رائے زنی کی اجازت ہو تو فائدے کی جگہ نقصان ہی ہوگا۔

(۳) قرآن و حدیث میں انسانی زندگی کی سہ گانہ ضرورت وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔

(الف) ایمان، یعنی ماننے اور یقین رکھنے کی چیزیں کہ اللہ ایک ہے۔ اس نے اپنے احکام مقدس کتابوں کی صورت میں بھیجے ہیں۔ اس کے احکام آسمانی پیام رساں (فرشتے) لاتے اور انسانی پیام رساں (پیغمبروں) تک پہنچاتے ہیں۔ مرنے کے بعد خدا کو حساب دینا ہوگا تاکہ حسبِ سزا یا جزا ملے۔ ہر چیز کی بھلائی اور برائی خدا مقرر فرماتا ہے۔

(ب) اسلام، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ چنانچہ اس کا حکم ہے کہ روز پانچ بار نماز پڑھیں۔ رمضان میں مہینہ بھر روزے رکھیں۔ عمر میں کم از کم ایک بار اللہ کے گھر کا حج کریں، اور مال کی زکات دیں۔ پیسہ ہو کہ تجارتی سرمایہ، زراعت ہو کہ معدنیات، جانوروں کے ریوڑ وغیرہ۔ اس سے نظر آئے گا کہ نماز اور زکات دونوں کو ایک ہی زمرے میں رکھا گیا ہے تاکہ نہ بدن کی خاطر روح قربان ہو، نہ روح کی خاطر بدن، بلکہ انسان کی روح اور بدن جان اور مال

Marfat.com

دونوں ہی خدا کے احکام بجا لائیں۔

(ج) احسان، یعنی ایمان اور اسلام میں حسن پیدا کرنا، کام صرف ظاہری اور اوپری دل سے نہ ہو۔ اس کا معیار رسول اکرم نے بہترین اور دلنشین انداز میں یوں بتایا ہے کہ خدا کی عبادت اور اس کے احکام کی تعمیل اس طرح کر کہ گویا کہ (وہ سامنے موجود ہے اور) تو اسے دیکھ رہا ہے: اگرچہ تو اسے نہیں دیکھتا لیکن وہ تجھے دیکھتا ہے۔

(۴) اوروں کا بھی اتنا ہی خیال رکھو جتنا خود اپنے آپ کا، اس اصول ہی کے تحت ٹیکس لگائے جاتے ہیں، اور ہر فرد کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ کفر اور جہالت کے خلاف کی جانے والی دائمی جدوجہد میں حصہ لے۔ اور اسی کی بناء پر بار بار پرزور سفارش کی جاتی ہے کہ خیرات کیا کرو، اسلام کے اصول چاہے جتنے بھی شدید ہوں۔ اس کے ہاں مذہبی رواداری بے انتہا ہے۔ اور اس نے صراحت سے کہہ رکھا ہے کہ دین میں جبر اور اکراہ نہیں، خدا نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے ہیں، حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد تک اور آخری پیغمبر کا فریضہ بھی یہی رہا کہ خدا کا ازلی وابدی پیغام انسان کو پھر سے یاد دلائے۔ زبانوں اور رنگوں کے فرق سے خدا کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایک کی دوسرے پر برتری نہیں خدا کی نظر میں سب سے محترم اور مکرم صرف وہ شخص ہوتا ہے۔ جو متقی اور خدا ترس ہو۔ حسب ونسب یا مال و منال کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں۔

(۵) قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ انسان الگ چیز ہے اور خدا بالکل الگ، ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتے، انسان کو خدا کی طرف عروج ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان خدا نہیں بن جاتا۔ اسی لیے انسانی اور خدا کی چیزوں میں تفریق کرنی ہوتی ہے۔ ایک طرف خدا ہے کہ اس کے اچھے اچھے نام ہیں، اچھی اچھی صفتیں ہیں، وہ ہمیں پیدا کرتا ہے، ہمیں روزی دیتا ہے، وہ ہر چیز جانتا ہے، ہر چیز کو دیکھتا ہے، ہر کام کی قدرت رکھتا ہے، ہر چیز کو پیشگی بھی معین کر سکتا ہے۔ دوسری طرف انسان ہے کہ خدا نے اس کو نوازا ہے، زمان و آسمان اس کے لیے مسخر کر دیے ہیں اور یہ انسان

Marfat.com

کے ہاتھ میں ہے کہ کوشش کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقے معلوم کرے۔ غرض ہر چیز انسان کے لیے ہے اور انسان اپنے آپ کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے۔ مسلمان جبر و قدر کے فضول جھگڑے میں پڑتا ہی نہیں، اور وہ اپنے مولا سے ''کیوں'' کبھی نہیں پوچھتا، ساری چیزیں خدا ہی کی مخلوق ہیں، پھر انسان کو اوروں پر ترجیح کیوں ملی، اس کا جواب سورۂ احزاب (۳۳) کی آخری دو آیتوں میں ملتا ہے۔ خدا نے روز ازل میں کائنات کی ساری طاقتور اور قوی چیزوں سے پوچھا: کیا تم قبول کرتے ہو کہ ہر چیز کو میں مقدر کروں لیکن جوابدہ تم سمجھے جاؤ؟ نہ آسمان و زمین نے نہ پہاڑوں نے یہ ہمت کی کہ اس خدا کی امانت کو اپنے سر لیں، وہ گھبرائے اور کہا پیارے مولا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس دو ٹانگوں والی ظالم و جاہل مخلوق یعنی انسان نے کہا: ہاں مولا، مجھے منظور ہے، کرے گا تو تو اور ذمہ دار رہوں گا میں۔ خدا کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اس نے اور تو اور فرشتوں تک کو حکم دیا کہ اس انسان کے سامنے سجدے میں گر پڑو (سورۃ ۲، آیت ۳۴)۔ شاید انسان نے سوچا ہوگا کہ ماں اپنے ننھے بچے سے جتنی محبت کرتی خدا اس سے سو گنا زیادہ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ ایسا بامحبت (ودود) خدا اگر میری بچگانی نافرمانی پر مجھے سزا دے بھی تو وہ میری تربیت اور میرے فائدے ہی کے لیے ہو گا۔ بہرحال انسانی اور خدا کی چیزوں میں اس فرق ہی کا نتیجہ ہے کہ اولیں مسلمانوں نے اپنے کارناموں سے دنیا کو دنگ کر دیا: رسول اکرم کی وفات پر پندرہ برس بھی نہ گزرے تھے کہ وہ ایشیاء یوروپ اور افریقا کے تینوں براعظموں میں حکمرانی کرنے لگے تھے اور بعد میں اس میں مزید علاقوں کے اضافے بھی کرتے رہے، اور اسی فرق اور خدائی تقدیر پر ایمان کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیوی زندگی کو سفر میں ایک شبانہ منزل اور زادِ راہ حاصل کرنے کا مقام سمجھتے رہے، جان کو اہمیت دینا تو کیا، وہ خدا کی راہ میں مرنے اور جلد سے جلد خدا سے جا ملنے کے دل و جان سے شائق بن گئے تھے۔

(۶) قرآن نے کوشش کی ہے کہ آدم و حواء کی اولاد کو پھر سے ملا کر ایک کر دے، وہ

Marfat.com

ایک بنیادی مذہب پیش کرتا ہے، وہ اقل ترین چیز جو ہر کسی کے لیے لابد اور ضروری ہے اور ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ جس اچھی چیز کو چاہے، بطور نفل کے زیادہ بھی کرے، انسان بدلا نہیں، لیکن اسے نئی راہ پر لگانے سے ہر اختلاف دور، اور ہر اتفاق ممکن ہو گیا۔ مثلاً یہودیوں کا مذہب الگ تھا مگر قرآن نے کہا خدا نے ان کو ساری دنیاؤں پر فضیلت دی تھی۔ اور یہ ایک خدائی فریضے کی انجام دہی کے لیے تھا۔ کسی کی نسل میں ہونے کی وجہ سے نہیں، (حتیٰ کہ پیغمبروں کی بیویاں اور بچے بھی اگر خدا کے نافرمان ہوں تو جہنم کے مستحق قرار دیے گئے)۔ عیسائیت بھی ایک الگ مذہب تھا، مگر قرآن نے کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کا کلمہ اور خدا کی روح ہیں (خدا کا بیٹا، بہت زیادہ حیوانی ہونے کی وجہ سے یہ اصطلاح ترک کردی گئی اور کہا گیا کہ خدا یگانہ ہے اس کے نہ ماں باپ، نہ بچے نہ بیوی) حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے مگر اس سے وہ خدا نہیں بن جاتے۔ حضرت آدم کا باپ ہی نہیں، ماں بھی نہ تھی۔

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اس سے زیادہ معجزا نہ ہے کہ انسان کی تخلیق۔ کائنات کے اندر انسان ایک نقطے سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبروں کی پوجا عبادت نہ کرو، اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں کو بھی معبود نہ بنالو، عبادت کرو تو خدا کی اور خدا کی عبادت اس طرح کرو جس طرح پیغمبر کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی کو اس میں شرم نہیں محسوس ہوتی تھی کہ اپنے کو خدا کا غلام کہیں۔ دنیا میں اپنی روزی اور اپنے حصے کو نہ بھولو اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو حقیر نہ سمجھو۔

قرآن میں عورت:

قرآن میں عورت کی بہت قدر افزائی کی ہے، اس نے علاوہ دیگر چیزوں کے اسے ذیل کے حقوق عطا کیے ہیں:

وہ بھی مرد ہی کی طرح ایک مستقل فرد ہے، عورت کو جو جائداد حاصل ہوتی ہے، وہ اسی کی ہوتی ہے۔ اس میں نہ اس کے باپ کو، نہ شوہر کو، نہ بچے بھائی یا دیگر رشتہ دار کو کوئی

Marfat.com

حق یا قابو ہے، بلکہ جو چیز عورت کو وراثت، تحفہ، ہدیہ، خریدی یا کسی اور طرح حاصل ہوتی ہے وہ بالکلیہ اسی کی ہوتی ہے وہ جیسا چاہے اس سے استفادہ کر سکتی ہے کہ خود استعمال کرے یا کسی اور کو خود ہو کر دے یا بیچ دے وغیرہ۔ نکاح اصل میں ایک معاہدہ ہے، اور فریق معاہدہ کی حیثیت سے وہ اپنی مرضی اور آزادی سے اس کو قبول یا رد کر سکتی ہے۔ عورت کی رضامندی کے بغیر کسی نے اس کا نکاح کیا ہو۔ چاہے وہ اس عورت کا باپ ہی کیوں نہ ہو، تو وہ نکاح گویا ہوا ہی نہیں نکاح چونکہ ایک معاہدہ ہے اس لیے دیگر معاہدوں کی طرح نکاح میں فریقین کی باہمی رضامندی سے شرطیں بھی لگائی جا سکتی ہیں۔ یہی نہیں کہ بیوی کو اتنا مہر دیا جائے گا، بلکہ یہ بھی کہ دوران نکاح میں شوہر تعدد ازدواج پر عمل نہ کرے گا۔ یہ بھی عورت کو بھی طلاق کا حق ہوگا (جسے تفویضِ طلاق کہتے ہیں) طلاق کی کئی صورتیں تسلیم کی گئی ہیں: شوہر اپنی مرضی سے، بیوی (تفویض طلاق میں) اپنی مرضی سے، میاں بیوی (خلع میں) باہمی رضامندی سے، فریقین کے نامزد کردہ ثالث کے حکم سے فریقین کے اختلاف کی صورت میں عدالت کے حکم سے، وغیرہ

عورت کو یہ حق ہیں، وہ ان سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو اس کی مرضی، کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا۔

عام مسلمان مرد کو نکاح کے بارے میں جو حق ہیں، رسول اکرم کو اس سے زیادہ حق نہیں اور آپ نے قرآنی احکام کی کوئی خلاف ورزی کبھی نہ فرمائی، (دیکھو سورہ ۳۳، آیت ۵۰ تا ۵۲ مع شرح)

غلامی:

انسانی سماج میں غلامی ایک بہت قدیم ادارہ ہے، قرآن وہ واحد دینی کتاب ہے جس نے اس بات کے موثر وسائل مہیا کیے کہ اسلامی ملک کے سارے غلام آزاد بھی ہو جائیں اور کسی کا جائز حق بھی مارا نہ جائے۔ چنانچہ ایک طرف حکومت کا سالانہ موازنہ (بجٹ) اس کے لیے رقم متعین کرنے پر مجبور ہے تو فیاض مسلمانوں کو بطور خیرات غلام آزاد کرانے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ کفارہ (پرائیچت) میں بھی ان کو آزاد کرنا ہوتا ہے اور

Marfat.com

عملاً ہر غلام کو حق ہے کہ اپنی قیمت کما کر یا جمع کر کے آقا کو دے اور آزاد ہو جائے۔

حضرت محمد کی قرآن میں بیان شدہ سوانح عمری:

پیغمبر اسلام کا نام محمد تھا۔ ۵۶۹ء میں ولادت اور ۶۳۲ء میں وفات، والد کا نام عبداللہ، والدہ کا آمنہ تھا۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے جسے آپ کے اجداد حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم نے آباد کیا تھا (قرآن ۱۴/ ۲۷)۔ خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنایا ہوا۔ دنیا میں سب سے قدیم بیت اللہ (اللہ کا گھر) یعنی کعبہ یہیں ہے (قرآن ۳/ ۹۶)۔ بیت المقدس میں حضرت سلیمان نے جو ہیکل تعمیر کی وہ اس کے کوئی ہزار سال بعد بنائی گئی تھی۔ تقریباً ۴۶۳ء میں آنحضرت کے پڑ دادا ہاشم نے رومی (بیزنطینی) ایرانی، حبشی اور حمیری (یمنی) حکمرانوں سے یہ اجازت حاصل کی کہ مکہ والے ان کے ملکوں سے تجارتی کاروبار کریں۔ اس سے اہل مکہ کو معاشی فارغ البالی بھی حاصل ہوئی اور سیاسی امن چین بھی، جیسا کہ سورۂ ایلاف (نمبر ۱۰۶) میں اشارہ ہوا ہے۔

ایک یہودی نے، جس نے یمن میں حکمرانی غصب کی تھی، ۵۲۳ء میں مقامی عیسائیوں پر مذہب کی بناء پر سخت اور وحشیانہ ظلم کیا اور ان کا زندہ آگ میں جھونک کر قتل عام کیا (قرآن ۸۵/ ۴، اصحاب الاخدود)۔ اس پر انتقام کے لیے حبش کے عیسائیوں نے حملہ کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ پھر ایک حبشی گورنر ابرھہ نے ۵۶۹ء میں مکہ معظمہ پر حملہ کیا کہ کعبے کو ڈھا دے اور عیسائیت کو پھیلائے، پرندوں کے جھرمٹ آئے اور حملہ آور (اصحاب الفیل) پسپا اور تباہ و برباد ہو گئے (سورۃ ۱۰۵)۔ اس واقعے کے دو ماہ بعد حضرت محمد کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس سے چند ماہ پہلے، اور ایک روایت میں چند ماہ بعد آپ کے والد کی وفات ہو گئی۔ یتیم بچے کی پرورش ماں نے کی پھر جب جلدی ہی وہ بھی چل بسی تو بوڑھے دادا کے پاس رہے، آخر میں چچا ابو طالب کے یہاں آٹھ ہی برس کی عمر میں روزگار کمانا پڑا اور ایک ہمسائے کے لیے چرواہا بنے۔ چند سال بعد چچا کی دکان میں ہاتھ بٹانے لگے، دس گیارہ سال کی عمر میں چچا کے ساتھ کاروان میں فلسطین گئے۔ تقریباً بیس برس کی عمر میں ایک ہموطن خاتون حضرت خدیجہ کا مال لے کر تجارت کے لیے مکرر تنہا

Marfat.com

فلسطین گئے۔ بعد میں کئی بار یمن اور کم از کم ایک بار جنوب مشرق عرب میں دَبا (عمان) بھی تشریف لے گئے، کاروبار کے لیے امکان ہے کہ حبشہ بھی گئے ہوں۔ دیانت اور ذہانت کے باعث زبانِ خلق نے آپ کو الامین کا لقب دلا دیا تھا۔ اسی زمانے میں ملک میں ایک جنگ ہوئی، اس میں شریک رہنا پڑا، پھر جنگ کے اسباب یعنی ظلم اور بدمعاملگی کو روکنے کے لیے ایک رضا کارانہ انجمن بنی تو اس، خلف الفضول، میں آپ ذوق وشوق سے شریک ہوئے، پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ کو نکاح سے شرف بخشا اور غریبوں مسکینوں کی روز افزوں خدمت کرنے لگے۔

۶۰۴ء میں جب آپ پینتیس سال کے تھے تو اتفاقاً کعبے کی عمارت میں آگ لگی۔ اسی زمانے میں طوفان اور موسلا دھار بارش ہوئی تو کعبے کی عمارت بیٹھ گئی۔ تعمیر جدید کے وقت خود غرضانہ ہنگامے بھی ہوئے اور حضور کی مداخلت اور منصفانہ مشوروں پر خون خرابہ ہونے سے رکا، لیکن جب بیت اللہ کی آرائش وزیبائش کے لیے وہاں (۳۶۰) بُت نصب ہوئے اور خدا واحد کا معبد دیوستھان بن گیا تو طبیعت اتنی منغض ہوئی کہ گھر بار چھوڑ کر شہر کے باہر غار حرا میں جا رہے۔ مہینہ بھر اعتکاف کیا تو طبیعت کو کچھ سکون آیا، گھر واپس آئے لیکن اس عبادت وریاضت میں ایسا لطف آیا کہ ہر سال رمضان میں مہینہ بھر وہاں جا کر اعتکاف کرنے لگے۔

اعتکاف کا پانچواں سال تھا۔ دسمبر کے آخری دن ایک رات غار میں سو رہے تھے کہ فرشتہ جبرئیل آیا اور کہا کہ خدا نے تمہیں اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ عبادت اسی کی کرو۔ وضو اور نماز کا طریقہ بتا کر واپس ہو گئے (سورۃ ۹۶)۔ گھبراتے اور جھجکتے گھر آئے، پھر تین سال تک جبرئیل نے صورت نہ دکھائی۔ اس اثنا میں شروع دہشت، پھر سکون اور لطف، پھر وحی کے مکرر آنے کی لگن اور تڑپ اور آخر میں روز افزوں مایوسی ہونے لگی۔ بعض بدطینت لوگوں کے طعن وطنز پر دل کو اتنی چوٹ لگی کہ ایک پہاڑ پر چڑھ کر چاہا کہ کود کر خودکشی کر لیں۔ عین اس لمحے جبرئیل دوبارہ آئے اور کہا کہ خدا نے تجھے ناراضی سے بھلایا نہیں۔ اس کی عنایتیں تو تجھ پر بے شمار ہیں۔ نیکی کر اور خدا کی نعمتیں سب سے بیان کر (سورۃ ۹۳)، اسلام سے بڑی خدا کی نعمت کیا ہو سکتی ہے؟ آپ توحید کی دعوت کرنے لگے۔

ملک کے بت پرستوں کو اچنبھا بھی ہوا اور برا بھی لگا، صاف باطن، خاص کر نوجوان لوگ اگر کھنچے کھنچے آئے تو بدطینت اور بیہودہ لوگ طرح طرح سے تکلیف بھی دینے لگے۔ یہ ایذا رسانی اتنی بڑھی کہ ایک طرف آپ ایک دوست، الارقم کے مکان میں مخفی طور پر جا رہنے پر مجبور ہوئے تو دوسری طرف نومسلموں کو وطن چھوڑنا پڑا اور حضور کے مشورے سے سمندر پار یہ لوگ حبشہ میں جا پناہ گزین ہوئے۔ حضور نے وہاں کے نجاشی (یعنی بادشاہ) کو خط لکھا کہ میرا چچازاد بھائی اور چند مسلمان وہاں آ رہے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی کرو (ممکن ہے اس سے کوئی سابقہ واقفیت رہی ہو) مکے والوں نے سفارت بھیجی اور چاہا کہ پناہ گزینوں کو تحویل مجرمین کے طور پر نجاشی ان کے سپرد کر دے۔ نجاشی کی منصف مزاجی سے اس میں ناکامی ہوئی تو مکے کے باقی مسلمانوں پر کھسیانے ہو کر وہ ظلم میں اضافہ کرنے لگے۔ آنحضرت اور آپ کے سارے قبیلے سے مکمل قطع تعلق کا اعلان کیا کہ کوئی نہ ان سے بات چیت کرے، نہ ان سے خرید فروخت، نہ ان سے شادی بیاہ، اس کا سلسلہ تین سال تک جاری رہا اور یہ بڑی شدید مصیبت کا زمانہ تھا، غیر مسلموں میں سے چند نیک دل لوگوں کی کوشش سے آخر یہ بائیکاٹ ختم ہوا تو آپ کے چچا ابو طالب اور بیوی خدیجہ کی وفات سے آخری دنیوی سہارا بھی ختم ہو گیا۔

قبیلے کے نئے سردار ابولہب نے آپ کو عاق کر دیا کہ جو چاہے آپ کو مار بھی ڈالے، وہ دخل نہ دے گا۔ رسول اکرم مجبوراً وطن چھوڑ کر کالے کوسوں دور طائف گئے۔ وہاں کچھ دور کے رشتہ دار تھے، خیال کیا کہ شاید ان کے ہاں امن ملے، لیکن وہاں والے اہل مکہ سے زیادہ چھچھورے نکلے، پتھر مار کر اور زخمی کر کے آپ کو شہر سے نکالا، مگر استقلال کا کیا ٹھکانا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر دعا کی: پروردگار تیرے کام میں ہر چیز برداشت ہے بشرطیکہ تو مجھ سے ناراض نہ ہو، تو ہی بتا کہ اب میں کیا کروں۔ رات کا وقت تھا۔ سنسان صحرا میں اٹھ کر نماز میں لگ گئے اور قرآن کی تلاوت فرمانے لگے۔ وہ اس شان کی تھی کہ چند جن جو بہ ظاہر یہودی مذہب کے تھے، ادھر سے گزرے تو تلاوت سن کر مسلمان ہو گئے۔ (سورۂ ۴۶/ ۲۹ تا ۳۰، نیز ۷۲/ او مابعد)۔ پھر پاپیادہ مکہ آئے اور ایک نیک طبیعت غیر مسلم نے منظور کیا کہ آپ کو اپنی پناہ میں لے۔ دنیوی مایوسی اور خدا پر اعتماد کے اس

زمانے میں حضور کو معراج ہوا، جبرائیل آئے اور آپ کو آسمان پر لے گئے۔ خدا نے آپ کو اور آپ کی امت کو نوازا اور نماز بطور تحفہ عطا فرمائی کہ جو بھی اسے ادا کرے اسے بھی حسب مرتبہ معراج ملے (کہ الصلاۃ معراج المؤمن) یہ ماہ رجب کا واقعہ ہے، ذی حجہ میں حج کے زمانے میں حضور نے کوشش کی۔ باہر سے حج کو آنے والے لوگ آپ کو اپنے ساتھ لے چلیں، ایک دو نہیں، آپ پندرہ قبیلوں کے پڑاو میں گئے۔ ہر کسی نے انکار ہی کیا، آخر مدینے والوں کی ایک چھوٹی ٹولی ملی، اس میں پانچ چھ آدمی تھے۔ انہوں نے فوراً اسلام قبول کیا اور وطن جا کر وہاں اس کا چرچا کیا۔ کئی لوگ وہاں مسلمان ہوئے اور سال بھر بعد حج کے زمانے میں مکہ آ کر حضور سے ملے اور فرمائش کی کہ کوئی مبلغ بھیجا جائے۔ اس مبلغ کی کوشش سے وہاں اسلام خوب پھیلا اور مزید ایک سال بعد حج ہی کے زمانے میں بہتر نو مسلم مکہ آئے اور عرض کیا کہ حضور بھی مدینہ آ جائیں اور جو دوسرے مسلمان چاہیں وہ بھی۔ آپ نے قبول فرمایا اور ان لوگوں نے مہاجر مہمانوں سے ایسا اچھا سلوک کیا کہ خدا نے بھی قرآن (۹/۵۹) میں ان کی تعریف کی ہے۔ جب سارے مسلمان رفتہ رفتہ چلے گئے تو کافروں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے کہ حضور ہی کو قتل کر ڈالیں۔ اس وقت آپ اور حضرت ابوبکر چھپ کر مدینہ روانہ ہوئے مگر کس شان سے؟ خون کے پیاسے دشمنوں کی جو امانتیں گھر میں تھیں، ان کی واپسی کا بندوبست کیا؛ گھر کا محاصرہ ہو چکا ہے لیکن اپنے چچازاد بھائی اور منہ بولے بیٹے حضرت علی کو ساتھ لے کر رات کو کعبے کی چھت پر سے ہبل بُت کو زمین پر لڑھکا دیتے ہیں (جیسا کہ مسند احمد بن حنبل میں مذکور ہے)۔ بارہ دن کا سفر تھا کہ مدینہ دور ہے، راستے میں درجنوں لوگ مسلمان ہوتے ہیں، آخر خیر و خوبی سے مدینہ پہنچ جاتے ہیں۔

مکے والوں نے نہ صرف مہاجر مسلمانوں کی جائدادیں ضبط کر لیں بلکہ مدینہ ایک ایلچی بھیجا کہ اب مدینہ والو، یا تو اس شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار ڈالو، یا اپنے ہاں سے نکال دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں، اس دھمکی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ:

(الف) مدینے میں جہاں قبیلہ داری بدنظمی تھی، ایک عام جلسہ کر کے لوگوں کو بتایا کہ ذاتی حفاظت کے لیے ایک شہر ہی پر مشتمل سہی ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کرو،

Marfat.com

مسلمان اور غیر مسلم تقریباً سب کو یہ بات پسند آئی اور شہری مملکت قائم کی گئی، جس کا دستور بھی لکھا گیا اور سبھوں نے فرمائش کی کہ حضور ہی اس کی سرداری فرمائیں۔

(ب) مدینے کے آس پاس کے علاقوں کا سفر فرمایا اور وہاں کے قبیلوں سے دفاعی حلیفی کہ تم پر کوئی حملہ کرے تو ہم تمہاری مدد کو آئیں گے، ہم پر حملہ ہو تو تم بھی مدد کرنا۔

(ج) مدینے میں آئے ہوئے بے گھرے مسلمانوں کا مدینہ والوں سے بھائی چارہ کرایا کہ حقیقی بھائیوں سے زیادہ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔

(د) دینی اور دنیوی تعلیم ایسی دی کہ دین اور دنیا کو سمو کر رکھ دیا۔ علم اور عمل دونوں پر بہ یک وقت اتنا زور دیا کہ ہر شخص اسلام کا نمونہ بن گیا۔ مسجد میں نماز بھی ہوتی تھی اور اسی کے ایک گوشے میں اصحاب صفہ کی اقامتی جامعہ بھی سعادت دارین کی تعلیم میں منہمک ہو گئی۔

ان ابتدائی انتظاموں سے فارغ ہوتے ہی مکے والوں کی دھمکی کا زبانی نہیں عملی جواب دیا کہ اب اِدھر سے تم گزر نہیں سکتے۔ مکے والوں کا روزگار زیادہ تر شام، عراق اور مصر سے تجارت پر منحصر تھا اور وہاں جانے کا راستہ مدینے کے پاس سے گزرتا تھا۔ راستے کی بندش صرف زبانی نہیں رہی۔ ایک طرف خبر رسانی کا انتظام کیا کہ دشمن کی ہر حرکت کی اطلاع ملے۔ اور جب ان کا کوئی قافلہ بہ زور گزرنا چاہتا تو فوجی دستہ بھیجا جاتا تا کہ ان کو اچھا سبق دے، نتیجے میں لڑائیاں ہوئیں، پہلے بدر میں (۳۱۳ مسلمانوں نے ۹۵۰ کو) فاش شکست دی، پھر احد میں (سات سو نے تین ہزار کا) مقابلہ کیا، آخر خندق میں (بلند سو نے بارہ ہزار کی) چلنے نہ دی۔ دشمن معاشی اور فوجی نقطۂ نظر سے بے بس ہو گیا تو حضور نے اسلامی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ قحط زدہ مکے میں غرباء کی امداد کے لیے پانچ سو اشرفیاں بھیجیں، دشمن کے مالدار تاجروں سے کہا کہ اپنا سارا تجارتی سامان ہمیں بیچ دو اور معاوضے میں غذائی چیزیں کھجور وغیرہ لے لو۔ اور کہا: ہم تمہارا تجارتی راستہ کھول دیتے ہیں صرف ایک شرط پر کہ ہمارے دشمنوں کی مدد نہ کرو بلکہ غیر جانبدار رہو۔ دنیوی نقطۂ نظر سے دیکھو تو دل

موہ لینے کا اس سے زیادہ بہتر نفسیاتی طریقہ کیا ہوگا کہ دشمن سے کہا جائے کہ تمہارا معبد کعبہ نہ صرف ہماری نمازوں کا قبلہ ہے بلکہ ہم حج بھی اسی کا کریں گے اور پندرہ سو مسلمان نہتے حج کو روانہ بھی ہو گئے۔ دشمن پھر بھی ہچکچاتا رہا بلکہ خلاف آئین مسلمان سفیر کو قید بھی کر دیا اور اس کے قتل کی خبر بھی اڑی۔ رسول اکرم نے فرمایا ہم صلح جو ضرور ہیں لیکن یہ نہیں کہ ذلت برداشت کریں۔ حدیبیہ کے پڑاو میں ایک درخت کے نیچے (قرآن ۴۸/۱۸) سارے مسلمانوں نے بیعت کی کہ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اس ایمانی عزم کے سامنے پہاڑ بھی ہوتا تو تاب نہ لا سکتا۔ آخر دشمن نے گھبرا کر صلح کی لیکن دل میں کچھ چور ہی رہا۔ سال بھر بعد صلح کی خلاف ورزی کی۔ اس پر رسول اکرم نے اپنے بہ یک وقت نبی الرحمۃ و نبی الملحمۃ (رحمت کا نبی اور جنگ کا نبی) ہونے کا ایسا مظاہرہ کیا جو تاریخ عالم میں لاثانی بھی ہے اور جس کے بعد مکے میں اسلام کے خلاف کوئی تعصب رہ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ نے اتنی فوج اکٹھی فرمائی جو مکے کی ساری آبادی سے زیادہ تھی اس کو اس طرح مکہ پہنچایا کہ وہاں والوں کو آخری لمحے تک کانوں کان خبر نہ ہوئی رات کو اتنے چولہے سلگھائے کہ پہاڑ پر سے دیکھنے والے اہل مکہ کو گمان ہوا کہ دس ہزار نہیں پچاس ہزار کی فوج دھاوا مارنے آئی ہے۔ صبح کو شہر پر انتہائی پُرامن قبضہ کیا پھر مقامی لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر نماز شروع ہوئی۔ جب حضرت بلال حبشی نے کعبے پر چڑھ کر اذان دی تو حاضرین میں سے ایک غیر مسلم عتاب نے اپنے ایک ہم عمر ہی سے کانا پھوسی کی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ورنہ کعبے کی چھت پر سے اس کالے گدھے کی ڈھینچوں کو برداشت نہ کر سکتا۔ نماز کے بعد حضور نے اہل مکہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ تم نے بیس سال سے میرے ساتھ کیا نہ کیا، اب مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ (چاہتے تو قتل عام کا حکم دے سکتے، ساری جائداد لٹوا دیتے، سب کو غلام بنا ڈالتے) جب مخاطبین نے شرم سے سر جھکالیا تو فرمایا: آج تم پر کوئی سرزنش نہیں، جاؤ تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے، اس ایک جملے نے کایا پلٹ کر دی، اسی عتاب کو تو، اتنا آپے سے باہر ہوا کہ کود کر سب سے پہلے سامنے حاضر ہوا اور اپنا تعارف کرا کے کہا، اشھد اَن لا اِلہ اِلا اللہ اشھدُ اَن محمداً رسول اللہ، نبوت کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو اس کے ردعمل میں بھی دیکھ سکتے ہیں: حضور نے جھٹ سے یہ فرمایا: اچھا

Marfat.com

تو میں بھی تجھے مکے کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ پانچ منٹ پہلے کے دشمن پر یہ نوازش ہوتی ہے اور اس میں کبھی پچھتانے کی ضرورت نہیں ہوتی، دلداری کا یہ عالم ہے کہ اور تو اور مسلمان مہاجرین کی جو جائدادیں مکان مکے میں ضبط ہوئے تھے ان کو بھی واپس نہ مانگا۔ مفتوحہ شہر میں اپنا ایک سپاہی بھی چھوڑے بغیر جلدی ہی آپ مدینہ واپس ہو جاتے ہیں مکہ دل سے مسلمان ہو گیا تھا اس پر اتنا ہی اعتماد کیا جا سکتا تھا جتنا مدینے پر۔

مکے کے سقوط پر طائف میں ہل چل ہوئی، اسے خوف ہوا کہ ان کا پتھراؤ کیا ہوا دشمن اب انتقام لے گا، حنین میں مڈ بھیڑ ہوئی (قرآن ۹/۲۵-۲۶)۔ پھر طائف کا محاصرہ بھی کرنا پڑا مگر آنحضرت نے مناسب سمجھا کہ اس تجارتی اور ثقافتی مرکز کو بھی نرمی سے سمجھائیں اور سوچنے کی مہلت دیں، چنانچہ ایک سال بعد اسی نے مدینہ وفد بھیجا اور اسلام قبول کر لیا۔

یہ تو باہر کا قصہ تھا۔ مدینے کے اندر عرب بھی تھے اور ان کے حوالی موالی یہودی بھی جو علمی اور تجارتی میدانوں میں عربوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ ہجرت پر جب حضور مدینے آئے اور شہری مملکت قائم فرمائی تو مقامی یہودی بھی اس میں شریک ہوئے مگر شہر میں جو اخلاقی انقلاب ہوا تھا اسے وہ سمجھ نہ سکے، اور اپنی سابقہ بداخلاقیوں کو جاری رکھا۔ مثلاً ان کے ایک سنار نے ایک مسلمان گاہک عورت آئی تو اسے مذاق کے لیے ننگا کر دیا۔ رسول اکرم نے متعلقہ قبیلے (بنی قینقاع) کو حکم دیا کہ شہر سے چلے جائیں۔ کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے قبیلے (بنی النضیر) نے حضور کے خلاف اقدام قتل کیا، ان سے بھی نرمی برتی گئی اپنی جائداد بیچنے اور اپنے قرضے تک واپس حاصل کرنے کی اجازت دی بشرطیکہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں (قرآن ۵۹/۲) مگر نرمی کا اثر الٹا ہوا، وہ خیبر جا بسے اور مسلمانوں پر فوجی حملے کراتے رہے، خندق کی جنگ بھی انہیں کے اہتمام سے ہوئی تھی جس میں مسلمانوں کے کلیجے منہ کو آ گئے تھے، (قرآن ۳۳/۱) شہر میں ابھی ایک بڑا یہودی قبیلہ (بنی قریظہ) باقی تھا۔ یہ یہودیوں میں سب سے ذلیل تھا حتیٰ کہ مقتول دوسروں کے مقابلے میں آدھے خون بہا کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ رسول اکرم نے ان لوگوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا تھا۔ ان کا سماجی رتبہ بھی بلند کر کے سب کے برابر کیا۔ اس سب کے باوجود خندق کی جنگ

Marfat.com

میں انہوں نے بھی غداری کی اور چاہا کہ مدینے کے اندر سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں۔ خندق سے فراغت ہوئی تو ان کی خبر لینی پڑی اور انہیں کے نامزد کردہ (مسلمان) ثالث کو اجازت دی کہ ان کے متعلق فیصلہ کرے، ثالث نے حکم دیا کہ ان سے وہی سلوک کیا جائے جس کا تورات میں حکم ہے اور جس پر وہ خود عمل کرتے۔ اگر وہ جنگ میں جیتتے، ان کے بعد مدینے میں چھوٹے یہودی کنبے رہے۔ حضور ان کی دلجوئی کرتے رہے، مثلاً بنی عُریض کو (شاید ان کے حسن خدمات کے باعث) سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا وغیرہ۔ مدینے کے بعد خیبر پر توجہ کرنی ناگزیر تھی۔ پندرہ سو مسلمان وہاں گئے اور بیس ہزار دشمن سپاہی بھی کچھ نہ کر سکے اور یہ علاقہ بھی اسلامی امن وانصاف سے متمتع ہونے لگا۔

حدیبیہ کی صلح کے بعد رسولِ اکرم نے بیرون عرب کے حکمرانوں پر بھی توجہ فرمائی۔ قسطنطنیہ کے رومی حکمران ہرقل، حبش کے نجاشی، ایران کے کسریٰ، مصر کے مقوقس وغیرہ کو خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی، رومی اور ایرانی حکمرانوں کے انکاری جواب پر مایوس ہونے کی جگہ آں حضرت نے ان کے ماتحت گورنروں وغیرہ کو خط لکھے اور اس میں زیادہ کامیابی ہوئی لیکن مشکلوں میں اضافہ بھی ہو گیا۔ معان (فلسطین) کے گورنر نے اسلام قبول کیا تو شہنشاہ ہرقل نے اسے سزائے موت دے کر سولی پر چڑھایا۔ بُصریٰ (فلسطین) کے حاکم نے مسلمان سفیر کو قتل کر ڈالا اور ہرقل نے مجرم کی سرزنش کی جگہ اس کی حمایت کی اور مجبوراً جب رسول اکرم نے تین ہزار آدمیوں کا ایک انتقامی دستہ بھیجا تو ہرقل نے مقابلے کے لیے ایک لاکھ کی فوج بھیجی اور ۸ ھ میں مؤتہ (فلسطین) میں مقابلہ ہوا۔ جب بات یوں طے نہ ہو سکی تو تیس ہزار کی فوج اکٹھی کر کے رسولِ اکرم ۹ ھ میں خود ادھر روانہ ہوئے۔ تبوک میں پڑاؤ ڈالا اور شمالی مشرق میں دومۃ الجندل اور شمالی مغرب میں مقنا، ایلہ، جربا، اَذرح وغیرہ کو رومی ظلم سے نجات دلائی اور یہ علاقے خوشی سے اسلامی مملکت میں شریک ہو گئے۔ معلوم نہیں کیوں، اب کے ہرقل صرف دور سے تاکتا رہا اور کوئی حرکت نہ کی، قیصر روم سے اس کامیاب مقابلے نے عرب میں بڑا نفسیاتی اثر ڈالا، اور سارے اطراف و اکناف سے بیسیوں قبائل کے وفد جوق جوق مدینے آئے اور اللہ کے دین میں داخل ہوتے گئے (سورۃ ۱۱۰) جن افراد یا قبائل نے مسلمان نہ ہونا چاہا، انہیں بھی مناسب معلوم

Marfat.com

ہوا باجگزار بن کر اسلامی حمایت حاصل کریں، ان میں نجران قابل ذکر ہے۔ یہ علاقہ (شمالی یمن میں) نصرانی تھا اس کا وفد مدینہ آیا۔ اول مذہبی بحث کی۔ معقول بات بھی آدمی بعض وقت عقائد کے باعث قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس پر رسولِ اکرم نے ان کو مباہلے کی دعوت دی (قرآن ۳/۶۱) یعنی یہ کہا کہ ہم دونوں خدا سے خشوع وخضوع اور خلوص سے دعا کریں اور کہیں کہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے اس پر اور اسکے بال بچوں پر خدا کی لعنت ہو حضور کے چہرے پر انوار نبوت کا جلال دیکھا تو گھبرائے اور مباہلہ قبول نہ کیا۔ اور ماتحت اور باجگزار بننا چاہا۔ اسلام، دین کے بارے میں کسی پر جبر و اکراہ نہیں کرتا (قرآن ۲/۲۵۶، ۶/۱۰۹)، اس لیے حضور نے اسے منظور فرمالیا اور انہیں کامل اندرونی آزادی دے دی، اس پر خود انہوں نے ایک اسلامی گورنر اور حاکمِ عدالت مانگا اور حضور نے یہ بھی منظور فرمالیا۔

ایک سال بعد ۱۰ھ میں آپ حج کے لیے مکہ روانہ ہوئے، اس سال سارے عرب سے ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان حج کو آئے ان کے سامنے عرفات میں رسولِ اکرم نے ایک خطبہ دیا جو اسلام کا خلاصہ اور انسانیت کے طرزِ عمل کا نچوڑ ہے۔ جب آپ اس فریضے سے فارغ ہوئے تو خدا نے (قرآن ۵/۵) وہ مژدہ دیا جس سے بڑی کوئی نعمت تصور میں آ بھی نہیں سکتی کہ: آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو منظور کر لیا۔

حضور خوشی خوشی مدینہ واپس تشریف لائے، اب دنیائے دُون میں آپ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ نے تعلیم کی تعمیل کر کے اسوۂ حسنہ چھوڑ دیا تھا۔ تین ماہ بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں آسمان والے مولیٰ کی رفاقت کے لیے تشریف لے گئے اللھم صل علی محمد۔

آپ کے صحابہ انسان تھے لیکن مسلمان تھے۔ انسانیت کے اقتضاء سے باہم اختلاف رائے کیا، لیکن جو بات اکثریت نے طے کی اسے سبھوں نے خوش دلی سے قبول کیا۔ اس کے جو شاندار نتیجے نکلے اس پر مورخ آج بھی انگشت بدندان ہے۔ اس چودہ سو سالہ تاریخ سے ہمیں یہاں بحث نہیں، صرف قرآن کی سرگزشت معلوم کرنا چاہیے۔

Marfat.com

تدوین قرآن کی تاریخ:

قرآن مجید کی سب سے پہلی وحی سورۂ اقراء (نمبر ۹۶) کی ابتدائی پانچ مختصر آیتوں پر مشتمل تھی یہ رسول اکرم کے ذہن میں منقش ہو کر رہ گئیں۔ لوگوں کی دریافت پر بھی آپ وہ آیتیں دہراتے رہے ہوں گے اور نماز میں بھی۔ اس کے بعد تین سال تک فترت یعنی وقفہ ہوا کہ ان میں کوئی نئی وحی نازل نہ ہوئی۔ اس وقفہ کے بعد وحی کا نزول دوبارہ شروع ہوا اور ہر دفعہ کچھ آیتیں نازل ہوتی رہیں۔ اس کا سلسلہ مزید بیس سال (جملہ تیئیس سال) جاری رہا ان میں سے آخری دس سال مدینے میں گزرے۔

ہجرت مدینہ سے پہلے ہی قرآن مجید کو تحریری طور پر محفوظ رکھنا شروع کر دیا گیا تھا جیسا کہ خود قرآن (سورۃ ۲۵/۵، ۵۶/۷۹، ۹۸/۲ وغیرہ) ہی نے شہادت دی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ رسول اکرم نے آنے والی وحیوں کو لکھوانا ٹھیک کس تاریخ شروع فرمایا تھا۔ نبوت کے پانچویں سال (سنہ قبل ہجرت) سے تحریری سوروں کا ذکر ملتا ہے اور کہتے ہیں کہ سورۂ نمبر (۲۰) کا، جو سلسلہ نزول میں نمبر (۵۴) ہے تحریری نسخہ حضرت عمر کی بہن کے پاس تھا اور اس کو پڑھ کر حضرت عمر بن الخطاب مسلمان ہوئے۔ ابن اسحاق نے جہاں اس روایت کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی لکھا کہ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عمر کا اسلام سے رغبت پیدا کرنا ایک دوسری وجہ سے ہوا تھا (دیکھو سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۹) لیکن یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دوسری روایت میں یہ نہیں ہے کہ قرآن لکھا نہیں گیا تھا مزید برآں پہلی روایت اور مورخوں نے بھی بیان کی ہے (جن کی تفصیل سہیلی کی الروض الانف، ج ۱/ ۲۱۷ تا ۲۱۸ میں ہے) اور ان میں ذکر ہے کہ حضرت فاطمہ بنت الخطاب کے ہاں کے قرآن میں کم از کم ایک مزید سورہ بھی تھا یعنی سورہ (۸۱، سلسلہ نزول میں ۷) یہ بات نہ بھلانی چاہیے کہ سب سے پہلی وحی (سورۂ اقراء) میں قلم کی تعریف اور اسے انسانی علوم کے سیکھنے کا ذریعہ بنایا گیا تھا، آنحضرت کو قرآن کے لکھوانے کا خیال اسی سے پیدا ہوا ہوگا اور سورۂ (۸۰، سلسلہ نزول میں ۲۴) کی آیت (۱۱ تا ۱۶) میں بھی قرآن مجید کے تحریری نسخوں کا ذکر ہے۔

Marfat.com

ہمارے مآخذ (مثلاً صحیح بخاری کتاب ٦٦ باب ۴ حدیث ۲ وغیرہ) یہ بیان کرنے میں متفق ہیں کہ جب کبھی قرآن کا کوئی حصہ وحی کے ذریعے سے نازل ہوتا تو رسول اکرم اپنے کسی کاتب صحابی کو بلا کر وہ اسے لکھوا دیتے اور ساتھ ہی یہ صراحت بھی فرما دیتے کہ اس جدید وحی کو سابقہ مجموعے میں کس جگہ درج کریں (یاد رہے کہ قرآن کے سورے اور آیتیں تاریخ وار مرتب نہیں کی گئی ہیں بلکہ اس طور پر کہ مفہوم میں ربط ہو اور بیان کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ اس بارے میں قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے اور ربط آیات پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں، صرف مثال کے طور پر یاد دلانا ہے کہ سب سے پہلی وحی سورۃ ٩٦ میں درج کی گئی ہے)۔ روایتوں میں اس کی بھی صراحت ہے (دیکھو مجمع الزوائد، ج ۱/٦٠) کہ املاء کرانے کے بعد رسول اللہ کاتب سے فرماتے کہ جو لکھا ہے وہ سناؤ، اور اس طرح اطمینان فرما لیتے کہ اس سے کوئی سہو یا غلطی نہیں ہوئی ہے۔ ابن اسحاق کی کتاب المبعث والمغازی، مخطوطہ فاس میں یہ اہم اور دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی نئی وحی آئی تو رسول اللہ اسے پہلے مرد لوگوں کے مجمع میں سناتے، پھر زنانہ مجمع میں، زنانہ تعلیم کا آپ کو جو خیال تھا، اس کا اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

ایک اور مشہور حدیث میں (جس کا صحیح بخاری کتاب ۱ باب ٦ اور کتاب ٦٦ باب ۷، نیز ابن کثیر کی ذیل التفسیر صفحہ ۲۰ تا ۲٦ میں ذکر ہے) بیان ہوا ہے کہ رسول اکرم ہر سال رمضان میں جبرئیل فرشتے کے سامنے اس وقت تک نازل شدہ سارا قرآن سناتے اور یہ کہ اس وقت حضور بارش سے لبریز بادل سے زیادہ فیض رساں ہو جاتے تھے، اور یہ کہ جس سال وفات ہوئی اور اس سے پہلے کے رمضان میں جبرئیل نے آپ سے دو مرتبہ پڑھوا کر سنا، جس سے حضور نے یہ استنباط کیا کہ اب آپ کی وفات کا زمانہ آ گیا ہے۔ اس روایت میں صرف اس کا ذکر ہے کہ رسول اکرم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ دوسری روایتوں میں یہ بھی اضافہ ہے کہ اس وقت بہت سے صحابہ اپنے نسخہ ہائے قرآن کے ساتھ حاضر رہتے اور اس قراءت سماعت کے وقت اپنے نسخوں کی تصحیح کر لیتے۔ اسے عرضہ یعنی مقابلہ کا نام دیا گیا ہے۔ اور عرضہ اخیرہ، بہت مشہور ہے اور اس وقت حضرت زید بن ثابت کاتب

Marfat.com

وحی بھی موجود تھے (ابن کثیر، ذیل التفسیر صفحہ ۱۴)۔ موجودہ قرآن مجید اسی عرصہ اخیرہ پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی۔

بعض مورخ ذکر کرتے ہیں کہ اس ابتدائی زمانے میں قرآن کے اجزاء شانے کی ہڈیوں بلغم کے پتھر کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھتے تھے۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ ملک میں کاغذ نہ ملتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم (صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ) نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ جب تک پورا سورہ نازل نہ ہو جاتا، اس کے نازل شدہ اجزاء ان مختلف چیزوں پر عارضی طور پر لکھ کر محفوظ رکھے جاتے۔ مسودے کی تکمیل پر رسول اکرم کی نگرانی میں ان کو مرتب کر کے کاغذ جھلی وغیرہ پر مبیضہ کیا جاتا اور یہ توجیہ معقول اور قرینِ قیاس ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سارے صحابہ پڑھے لکھے نہ تھے سب کا علمی ذوق بھی یکساں نہ تھا۔ بعض کاروبارِ تجارت یا زراعت میں مشغول رہتے، بعض مدینے سے دور رہتے تھے، رسول اکرم وقتاً فوقتاً سفر پر بھی چلے جاتے اور وحی سفر کے اثناء میں بھی نازل ہوتی، انہیں وجوہ سے کسی صحابی کے پاس سارا قرآن لکھا ہوا نہ تھا۔ کسی کے پاس کچھ اجزاء تو کسی کے پاس کچھ اور۔

لیکن تحریر سے زیادہ زور زبانی یاد کرنے پر دیا گیا۔ نماز میں لکھی ہوئی چیز نہیں پڑھی جاتی بلکہ زبانی یاد کیے ہوئے سورے پڑھنے ہوتے ہیں اور اس میں عالم جاہل کسی میں فرق نہیں۔ ظاہر ہے کہ بعض لوگ زیادہ مقدار میں سورے یاد کرتے تو دوسرے کم مقدار میں۔ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے عہدِ نبوی ہی میں سارا قرآن حفظ کیا تھا۔ ایسے دس بارہ مرد تھے (ذیل ابن کثیر، صفحہ ۲۸) تو ایک خاتون ام ورقہ بھی تھیں، بی بی کی اس قابلیت کی بنا پر رسول اکرم نے انہیں استثنائی طور پر ان کے محلے کی مسجد کا امام مقرر کیا تھا اور وہ مرد عورت اپنے سارے اہل خاندان کی امامت کیا کرتی تھیں (مسند احمد بن حنبل ۶/ ۴۰۵، سنن ابی داود کتاب ۲، باب ۶۲، استیعاب ابن عبدالبر، باب کنی النساء ۱۰۷) اور وہاں کے بوڑھے موذن کا بہت دنوں تک ذکر ملتا ہے اور بی بی جو حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں فوت ہوئیں۔ آخری دم تک یہ فرائض انجام دیتی رہیں۔

غرض لکھ رکھنے اور ساتھ ہی زبانی یاد کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہر ایک کی امکانی

کوتاہی کی دوسرے سے تلافی ہو جاتی ہے۔ لکھنے میں کاتب سے سہو ہو جایا کرتی ہے۔ متن زبانی یاد ہو تو کتابت کی غلطی فوراً معلوم ہو جاتی اور آسانی سے اصلاح پا سکتی ہے۔ حفظ میں آدمی سے بھول ہو سکتی ہے اور بعض وقت یاد نہیں آتا کہ عبارت کیا ہے۔ یا غلط عبارت ذہن میں آتی اور غلط ملط ہو جاتا ہے (جیسا کہ تراویح کی نماز پڑھانے والے سے عام طور پر مشاہدہ ہوتا ہے)۔ ایسے وقت لقمہ دینے سے فوراً صحیح عبارت دوبارہ یاد آ جاتی ہے یا حافظ تحریری دستاویز یعنی قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو حافظہ دوبارہ تازہ ہو جاتا ہے۔ غلط تحریر کی کوتاہی حفظ سے، اور حفظ کی کوتاہی تحریراً منضبط کی ہوئی عبارت سے دور ہو جاتی ہے۔ اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے تحفظ کے لیے شروع ہی سے بوقت واحد دونوں وسیلے اختیار فرمائے اور اسی پر اکتفا نہ فرمایا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ ماہر استاد کے پاس پڑھ کر صحت کا صداقت نامہ بھی حاصل کریں، جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

رسول اللہ کی وفات پر قرآن کے متعلق خصوصی توجہ کی کوئی فوری ضرورت محسوس نہ ہوئی، خاص کر اس لیے کہ بعض کچے ایمان والے اور ادھورے مسلمان نہ صرف مرتد ہو گئے بلکہ فوجی بغاوت بھی کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی جس کا آغاز ہوا تو رسول اکرم کی زندگی کے آخری مہینوں ہی سے لیکن جس میں شدت حضرت ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں پیدا ہوئی جب کہ سرکاری فوج کا بہت بڑا حصہ حضرت اُسامہ کی سرکردگی میں بیزنطینی حکومت کو اسلامی سفیر کے قتل کی سزا دینے کے لیے فلسطین جیسے دور دراز ملک کو چلا گیا تھا۔ مرتدوں میں مسیلمہ کذاب خاص کر طاقتور تھا۔ اس سے جو جنگ یمامہ (نجد) میں ہوئی وہ بہت خونریز رہی۔ تیرہ ہزار مسلمانوں کو ایک لاکھ مرتدوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ دشمن کے دباؤ کی سختی سے جب مسلمانوں کو پسپائی ہونے لگی تو مسلمانوں کے سابقین اولین کو جوش آیا، خاص کر ان لوگوں کو جو قرآن کے حافظ تھے یا بہت ماہر۔ ایسے لوگ تین ہزار تھے یہ باقی فوج سے الگ ہو گئے اور ایک بہت بڑے حافظ حضرت سالم کی سرکردگی میں اللہ کے

---

(۱) ایسا واقعہ ایک بار خود رسول اللہ کو مدینے میں پیش آیا تھا (ذیل تفسیر لابن کثیر صفحہ ۴۴ بحوالہ بخاری ۶۴/ ۶۴،۲۶/ ۲۷، ۳ مسلم)

Marfat.com

آخری پیغام کی حفاظت کا عہد کر کے نکلے کہ تخت یا تختہ۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ان کے بے پناہ عزم کے سامنے پہاڑ بھی ہوتے تو پس جاتے ان میں سے سات سو شہید ہوئے لیکن دشمن بھی نیست و نابود ہو گیا (ذیل التفسیر لابن کثیر، صفحہ ۸ تا ۹)۔

اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کی زبانی سنیں (تفسیر طبری جلد اول صفحہ ۲۰):

''جب یمامہ کی لڑائی میں صحابۂ نبوی کی ایک تعداد شہید ہوئی تو حضرت عمر نے (خلیفہ) حضرت ابو بکر کے پاس جا کر کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی یمامہ کی لڑائی میں اس طرح گر (اور مر) رہے ہیں جس طرح پروانے آگ میں اور مجھے خوف ہے کہ (شہادت کے شوق میں) وہ آئندہ بھی موقع اور ضرورت پر ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ مگر قرآن کے جاننے والے بھی یہی ہیں۔ اس طرح قرآن ضائع ہو جائیگا اور بھلا دیا جائیگا۔ کاش آپ اسے جمع کریں اور لکھوا دیں..... حضرت ابو بکر بِدکے اور فرمانے لگے: کیا میں وہ کام کروں جو خود رسول اللہ نے نہ کیا تھا؟ وہ بحث اور تبادلہ خیال کرنے لگے۔ آخر میں انہوں نے حضرت زید بن ثابت کو بلا بھیجا اور وہ کہتے ہیں: میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت عمر بھی پاس موجود تھے۔ حضرت ابو بکر نے مجھ سے فرمایا: اس شخص (یعنی حضرت عمر) کو اصرار ہے کہ میں ایک کام کروں۔ مجھے اس سے انکار ہے۔ آپ وحی کی کتابت پر مامور رہے۔ اگر آپ کو اس (حضرت عمر) سے اتفاق ہو تو میں آپ دونوں کی اتباع کروں گا اور اگر آپ کو میری رائے سے اتفاق ہو تو پھر میں وہ کام نہ کروں گا۔ پھر حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کا مشورہ مجھ سے بیان فرمایا:

حضرت عمر چپ بیٹھے رہے۔ میں اس پر بدکا اور بولا: ''کیا میں وہ کام کروں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا تھا؟..... بحث ہونے لگی آخر حضرت عمر نے ایک بات کہی: ایسا کریں تو آخر اس میں برائی کیا ہے؟ ہم سوچنے لگے اور ہم نے کہا: ''واقعی اگر ہم ایسا کریں تو اس میں کوئی برائی نہیں نظر آتی۔ حضرت زید بن ثابت فرماتے ہیں: پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم پر میں نے قرآن کو چمڑے کے پارچوں، شانے کی چوڑی ہڈیوں اور کھجور کے درخت کے سرے میں غلاف در غلاف پائی جانے والی پرتوں پر

لکھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور حضرت عمر خلیفہ بنے تو انہوں نے اسے ایک مصحف (ورقوں والی کتاب) کی صورت میں نقل کیا اور اپنے پاس رکھا۔ جب ان کی بھی وفات ہوئی تو وہ آپ کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ پھر آرمینیا کی (۲۵ھ یا ۳۰ھ والی) ایک جنگ میں حصہ لے کر جب حضرت حذیفہ بن الیمان مدینہ واپس آئے تو گھر جانے سے بھی پہلے (خلیفہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "امیر المومنین لوگوں کی خبر لیجیے، پوچھا: کیا بات ہوئی ہے، حضرت حذیفہ نے کہا: میں نے آرمینیا کی مہم میں حصہ لیا۔ اس میں عراقی دستے بھی تھے، شامی دستے بھی، شامی لوگ حضرت اُبی بن کعب کی تلاوت کے مطابق قرآن پڑھتے اور ایسی چیزیں بولتے جو عراقیوں نے نہیں سنے تھے۔ اسی طرح عراقی لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود کی تلاوت کے مطابق قرآن پڑھتے اور ایسی چیزیں بولتے تھے جو شامیوں نے نہیں سنے تھے اور شامیوں نے ان پر کفر کا الزام لگایا، حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کے لیے قرآن لکھوں اور فرمایا: میں آپ کو ایک ایسا مددگار دوں گا جو ذہین بھی ہو اور جسے ادبی ذوق بھی ہو۔ آپ دونوں مل کر قرآن لکھیں اور اگر کبھی آپ دونوں میں اختلاف ہو تو مجھ سے رجوع کیا کیجیے اور انہوں نے اس کام کے لیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دیگر کاتب وحی) حضرت آبان بن سعید بن العاص کو نامزد فرمایا۔ جب یہ دونوں اثناء نقل میں (سورۃ ۲، آیت ۲۴۷ میں) بنی اسرائیل کی صندوقِ تبرکات کے ذکر پر پہنچے تو حضرت زید بن ثابت نے کہا کہ یہ لفظ تابُوہ ہے۔ حضرت آبان نے کہا: نہیں، اسے تابوت بولتے ہیں۔ اس پر ہم نے حضرت عثمان سے رجوع کیا اور انہوں نے تابوت لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زید فرماتے ہیں: جب میں نے نقل مکمل کر لی تو اسے دوبارہ پڑھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس میں ایک آیت (سورۃ ۳۳، آیت ۲۳):

"من المؤمنين رجال صدقوا ما عٰهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر و ما بدلوا تبديلا"

Marfat.com

غیر موجود ہے۔ میں نے اسے مہاجرین کے سامنے پیش کیا اور پوچھا (کہ آیا وہ ان کے پاس تحریری صورت میں موجود ہے؟) وہ ان کے پاس نہ ملی۔ پھر میں نے اسے انصار کے سامنے پیش کیا اور پوچھا۔ مگر وہ ان کے پاس بھی نہ ملی بجز ایک شخص کے یعنی خزیمہ بن ثابت کے ہاں، میں نے اس آیت کو لکھ لیا۔[۱] اس کے بعد میں نے ایک دوسری مرتبہ اس قرآن کو شروع سے آخر تک پڑھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس میں دو آیتیں (سورۃ ۹، آیت ۱۲۸ تا ۱۲۹) کم ہیں[۲] یعنی:

"لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم فان تولو افقل حسبی اللہ لآ الہ الّا ھُو علیه توکلتُ وھُو ربُّ العرش العظیم"۔

میں نے اسے مہاجرین کے سامنے پیش کیا اور پوچھا (کہ آیا وہ ان کے پاس ہیں؟) وہ مجھے ان کے پاس نہ ملیں۔ پھر میں نے اسے انصار کے سامنے پیش کیا وہ ان کے پاس بھی نہ ملیں سوائے خزیمہ نامی ایک اور شخص کے۔ میں نے اس کو سورۃ توبہ کے آخر میں درج

---

(۱) کاتب قرآن کو خلیفے نے ہدایت دی تھی کہ ہر آیت کی دو تحریری شہادتیں طلب کریں اور دو شہادتیں نہ ملیں تو اسے قرآن کے اندر شامل نہ کریں۔ حضرت خزیمہ بن ثابت کی اکیلی شہادت پر اس لیے اکتفا کیا گیا تھا کہ ایک مرتبہ ان سے خوش ہو کر رسولِ اکرم نے انہیں اس اعزاز سے سرفراز فرمایا تھا "خزیمہ کی شہادت دو شہادتوں کے برابر ہے"۔ (ابن کثیر صفحہ ۹)۔

(۲) مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سورۃ توبہ کی ان دو آیتوں پر صحابہ کے ہاں توجہ کم ہونے کی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ رسولِ اکرم ان آیتوں کو پڑھ کر جھاڑ پھونک فرمایا کرتے تھے (دیکھو ان آیتوں کی تفسیر، ابن کثیر وغیرہ کی تفسیروں میں) جس طرح آپ قرآن مجید کے دو آخری سوروں (قل اعوذ برب الفلق قل اعوذ برب الناس سے بھی فرماتے تھے اور اسی لیے بعض صحابہ نے ان کو اپنے قرآنوں میں ابتدائی نہیں لکھا تھا۔ اس کے برخلاف انہوں نے تشہد کو اپنے قرآن میں لکھ لیا تھا کیونکہ گمان کیا تھا کہ ہر وہ چیز جو نماز میں پڑھی جاتی ہے وہ قرآنی آیت ہے۔ صحیح بخاری (۶۶/۳ حدیث ۱) میں ان کا نام ابوخزیمہ الانصاری دیا گیا ہے۔

Marfat.com

کر دیا۔ اگر یہ دو کی جگہ تین آیتیں ہوتیں تو میں ان کو ایک مستقل سورۃ بنا دیتا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بی بی حفصہ سے فرمایا کہ وہ آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کا نسخہ قرآن مستعار دیں اور قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ ان کو واپس کر دیں گے۔ بی بی نے وہ آپ کے سپرد کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا میرے لکھے ہوئے نسخے سے مقابلہ کیا۔ دونوں میں کوئی فرق نہ ملا۔ اس پر انہوں نے بی بی کا نسخہ ان کو واپس کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے حکم دیا کہ آئندہ نقلیں اسی نئے نسخے سے کی جایا کریں۔

ان تفصیلات کے متعلق بخاری وغیرہ کی بہتر لیکن جستہ جستہ روایتوں میں کچھ خفیف اختلاف بھی ہے جو حسب ذیل ہے:

قرآن کو کتابی صورت (مصحف) میں لکھنا حضرت عمر نہیں بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی بات ہے۔ حضرت عمر کے پاس نسخہ وہی تھا جو حضرت ابوبکر کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ حضرت زید نے ہڈیوں وغیرہ پر قرآن نہ لکھا بلکہ ہڈیوں وغیرہ پر لکھے ہوئے اجزاء کو اوراق (صحف) پر نقل کیا: (بخاری ۶۶/۳ باب جمع القرآن، حدیث ۱)۔

حضرت عمر نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں ارادہ کیا تھا کہ قرآن کی نقلیں خود (سرکاری طور پر) کرا کر ہر جگہ بھیجیں، مگر اس پر عمل سے قبل ان کی وفات ہوگئی۔ (طبقات ابن سعد، ج ۳، قسم اول، صفحہ ۲۱۲: الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، صفحہ ۴۳۰: کتاب المصاحف لابن ابی داود، صفحہ ۱۰)۔

اشاعت کا یہ کام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا۔ انہوں نے ایک مستقل اور نیا نسخہ تیار کرا کر اس کا بی بی حفصہ کے ہاں کے نسخے سے مقابلہ نہیں کرایا بلکہ بی بی کے ہاں کے نسخے ہی کو نقل کرنے اور ضرورت پر الفاظ کے املاء کی اصلاح کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری ۶۶/۳-۲)۔

مؤطا ابن وھب کے حوالے سے سیوطی نے (اِتقان ۱/۷۴) میں لکھا ہے کہ اولین تدوین کے وقت حضرت زید نے اصرار کیا تھا کہ حضرت عمر بھی ان کے ساتھ شریک کار رہیں، تنہا کام کرنے سے انکار کیا تھا۔

اس پر سب کو اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر نے جب تدوین شروع کروائی تو حضرت

Marfat.com

زید کو حکم دیا کہ صرف حافظے پر اعتماد نہ کریں بلکہ ہر آیت کے لیے کم از کم دو آدمیوں کے ہاں دو تحریری شہادتیں تلاش کریں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے شہر مدینہ میں اعلان کرایا کہ جس کسی کے پاس قرآن کے اجزاء کیسے بھی موجود ہوں وہ لا کر حضرت زید کو بتائیں۔
ایک روایت اتقان سیوطی (۱/۷۳) میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ کام مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں انجام پایا۔ وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر شخص کو قسم دے کر پوچھتے تھے کہ آیا اس نسخے کی صحت کی نگرانی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے؟ اور قرات سماعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ہوئی ہے؟

ہر آیت کے لیے چونکہ دو تحریری شہادتوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے صرف ایک شاہد ملتا تو رد کر دیا جاتا۔ چنانچہ سیوطی (اتقان ۱/۷۳) نے ایک روایت درج کی ہے کہ ایک آیت خود حضرت عمر نے پیش کی، مگر چونکہ ان کی تائید کسی اور ذریعے سے نہ ہو سکی، اس لیے اس کو بھی رد کر دیا گیا (اس پر مزید بحث آگے منسوخ کے سلسلے میں ہوگی)۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے جو نسخہ تیار ہوا، اسے عام طور مصحف (یعنی صفحوں، ورقوں کا مجموعہ) کا نام دیا جاتا ہے (ذیل تفسیر ابن کثیر، صفحہ ۱۴)، لیکن اس کا نام بعض وقت ربعہ بھی بیان ہوا ہے (بحوالہ ایضاً)۔ اس کے لغوی معنی تو ہوں گے، چوتھائی والا، یعنی کاغذ کی وہ تقطیع جس میں کاغذ کو دو مرتبہ اس طرح موڑیں کہ اس سے چار ورق بن جائیں۔ ممکن ہے وہ نسخہ ایسا ہی ہو۔ اس لفظ کے ایک معنے جو گوشہ صندوق کے بھی ہیں۔ گویا صندوق میں محفوظ رکھی ہوئی کتاب (یہودیوں کے ہاں بھی تورات وغیرہ کے لیے مماثل رواج رہا ہے اور قرآن میں اس سلسلے میں ''تابوت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے) لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ربعہ کے معنی کراسوں کے مجموعے والی کتاب کے ہیں (الربعہ ہی الکتب المجمعہ)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب سرکاری طور پر نسخے لکھوائے گئے تو اس کے لیے طبری کی روایت میں دو کاتبوں کا ذکر ہے: زید بن ثابت اور آبان بن سعید صحیح بخاری (۶۶/۳-۲) میں عبداللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن الحارث بن ھشام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں اصل ذمہ دار افراد کا

ذکر ہے اور دوسری میں ماتحت نقل نویس خوشخط کاتبوں کا، تا کہ متعدد نسخے جلد تیار ہوں۔
ایک اور روایت میں (ذیل تفسیر ابن کثیر، صفحہ ۱۴، بحوالہ ابن ابی داود، بارہ نقل نویسوں کا ذکر ہے نقلوں کی تعداد کے متعلق ابن ابی داود نے (کتاب المصاحف، صفحہ ۳۴ میں) کہا کہ بعض لوگوں کے مطابق چار، اور بعض کے مطابق سات نقلیں تیار کی گئیں جن کو ملک کے مختلف صوبوں میں بھیج کر حکم دیا گیا کہ اس کے خلاف جو چیزیں ملتی ہوں انہیں ضبط اور تلف کر دیا جائے (حرق جلا دیا، خرق پھاڑ دیا، شق پھاڑ دیا، مختلف الفاظ میں مختلف عملوں کا ذکر ہے)۔ (ابن کثیر، صفحہ ۱۰) سو اس کا مزید ذکر آگے اختلاف روایات قرآن کے سلسلے میں ہوگا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے جو نسخے زید بن ثابت نے لکھے ان کو مجمع عام میں ایک ایک کر کے سنایا گیا۔ پھر ہر جگہ بھیجا گیا (ذیل التفسیر لابن کثیر، صفحہ ۱۵)۔

ان مختلف روایتوں کے پڑھنے سے جو تاثر ہوتا ہے اس کا ایک پرانے مولف ابوشامہ نے (دیکھو اتقان سیوطی ۱/۳/۷، نیز کتاب المصاحف لابن ابی داود، صفحہ ۴ تا ۵) خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: مقصد یہ تھا کہ سوائے اس کے کوئی چیز درج نہ کی جائے جو تحریری حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھی جا چکی ہو، محض حفظ کافی نہیں تصور کیا گیا، دوسرے الفاظ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو اس کام پر مامور ہوئے تھے، اور جو حافظ قرآن بھی تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ محض تحریری دستاویز حاصل کریں، بلکہ قرآن کے ایسے تحریری اجزاء جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں لکھے اور قرات سماعت کے ذریعے سے تصحیح پا چکے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تدوین و تحریر کا خیال خود رسول اکرم کو پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کام کی تکمیل سے قبل آپ کی وفات ہوگئی جیسا کہ ذیل کی روایت سے (اتقان سیوطی ۱/۳/۷) استنباط ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضور کے مکان میں اوراق قرآن کا ایک مجموعہ برآمد ہوا جن کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دھاگے سے نتھی کیا۔ (اگر یہ مکمل ہوتا تو مزید تلاش کی ضرورت نہ ہوتی)۔

Marfat.com

قرآن کے قدیم ترین مخطوطے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے برآمد شدہ مخطوطہ پھر کیا ہوا، اس کا پتا نہیں چلتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے جو نسخہ تیار ہوا وہ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ ایک معمہ ہے جو ابن کثیر (ذیل التفسیر، صفحہ۱۴) میں یوں بیان کیا ہے:

"روایت کی ہے ابن ابی داود نے محمد بن عوف سے انہوں نے ابوالیمان سے، انہوں نے شعیب سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے سالم بن عبداللہ بن عمر سے کہ مَروان بن حکم (گورنر مدینہ) حضرت حفصہ کے پاس آدمی بھیج کر وہ کراسے مانگا کرتا تھا جن میں قرآن لکھا گیا تھا۔ بی بی وہ اس کو دینے سے انکار کرتی رہیں۔ سالم کہتے ہیں: پھر جب بی بی کا انتقال ہوا اور ہم ان کو دفن کر کے واپس آئے تو مروان سے ایک قطعی حکم (خزیمہ) حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس بھیجا کہ وہ مذکورہ کراسے ضرور اس کے پاس بھیج دیں۔ عبداللہ بن عمر نے وہ اس کے ہاں بھیج دیے تو اس کے حکم سے ان کو پھاڑ دیا گیا (فشققت) اور مروان نے کہا: میں نے یہ اس لیے کیا کہ ان میں جو چیز تھی وہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے) مصحف میں لکھی گئی اور محفوظ کر دی گئی ہے اور مجھے خوف ہوا کہ اگر زیادہ زمانہ گزرے تو لوگوں کو اس مصحف کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے یا وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ اس میں شاید ایسی چیزیں تھیں جو نہیں لکھی گئیں۔ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔"

یہ منطق ہمیں سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ والا نسخہ محفوظ رہے تو جسے کچھ شبہ ہو، وہ اصل سے رجوع کر کے اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔ مروان عالم و فاضل شخص تھا۔ اس نے نیک نیتی ہی سے کیا مگر نیک نیتی کافی نہیں۔ کام کو بھی درست ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن میں کچھ ایسی چیزیں حذف کر دی گئیں جو حضرت ابوبکر کے نسخے میں تھیں اور مثلاً حضرت علی کی تعریف اور خلافت وغیرہ کے متعلق رہی ہوں۔ کیونکہ حضرت عثمان کے بعد جب حضرت علی خلیفہ

Marfat.com

ہوئے تو وہ کوئی چیز حذف ہوئی ہوتی تو بحال کر دیتے ۔ نہ انہوں نے ایسا کیا اور نہ ان کی طرف ایسا قول منسوب ہے کہ انہوں نے کسی چیز کے حذف کیے جانے کا خیال ظاہر کیا ہو۔

حضرت عثمان نے جو نسخے مختلف مقاموں پر روانہ کیے تھے ان میں سے کم از کم دو اب بھی باقی ہیں ۔ ایک تاشقند میں اور ایک استانبول میں ۔

تاشقند کا نسخہ پہلے سمرقند میں تھا اور ۸۰۲ھ میں اسے تیمور لنگ نے دمشق کو فتح کرنے کے بعد وہاں سے اپنے پایۂ تخت کو ایک قابلِ فخر چیز کے طور پر منتقل کیا۔ گزشتہ صدی میں جب زار روس نے سمرقند فتح کیا تو اس نے اسے اپنے پایۂ تخت سینٹ پیٹرس بورگ (حال لینن گراڈ) میں منتقل کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی تالیفِ قلبی کے لیے اس کا فوٹو لے کر بلاک سے چھپوایا (ہمارے پاس اس کا میکروفلم ہے)۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد کمیونسٹ انقلاب ہوا تو فوج کے ایک بڑے مسلمان افسر علی اکبر توپچی باشی نے اس کو سرکاری کتب خانے سے نکال کر بڑی مشکل سے ترکستان بھجوا دیا جہاں جنگ آزادی ہو رہی تھی ۔ خدا کو منظور نہ تھا کہ انور پاشا کی سرکردگی میں لگی ہوئی یہ جنگ کامیاب ہو لیکن قرآن وہیں رہا اور اب تک وہیں ہے ۔ حال میں روسی حکومت نے مکرر اس کو بلاک پر چھاپا اور تقسیم کیا ہے ۔ اس نسخے کے متعلق ابن کثیر نے (ذیل التفسیر، صفحہ ۱۵ اپر) تصریح کی کہ یہ پہلے طبریہ میں تھا پھر ۵۱۸ھ میں دمشق منتقل کیا گیا اور وہاں کی جامع اموی کی مقصورے کے مشرقی کونے میں رکھا گیا۔ بڑی تقطیع، واضح خط، عمدہ سیاہی اور جھلی پر جو غالباً اونٹ کی جھلی ہے، لکھا ہوا ہے۔

دوسرا نسخہ اب استانبول کے عجائب خانہ توپ قاپی سرائے میں ہے ۔ کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ذاتی نسخہ تھا اور شہادت کے وقت ان کے زیر تلاوت تھا ۔ چنانچہ آیت فسیکفیکھم اللہ، پر ان کے خون کے دھبے اب بھی واضح نظر آتے ہیں۔

استانبول میں متعدد صحابہ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن کے ٹکڑے بھی ہیں ۔ ایک پر جو چھوٹی تقطیع کا اور صرف چند سوروں پر مشتمل ہے ۔ آخر میں لکھا ہے، کتبہ کاتب الوحی عثمان بن عفان ، استانبول میں ایک ورق حضرت عمر کے ہاتھ کا بھی ہے جو مسجد سلیمانیہ کے پاس ، اسلام موزے سی ، نامی عجائب خانہ میں ہے، حضرت علی کی طرف

Marfat.com

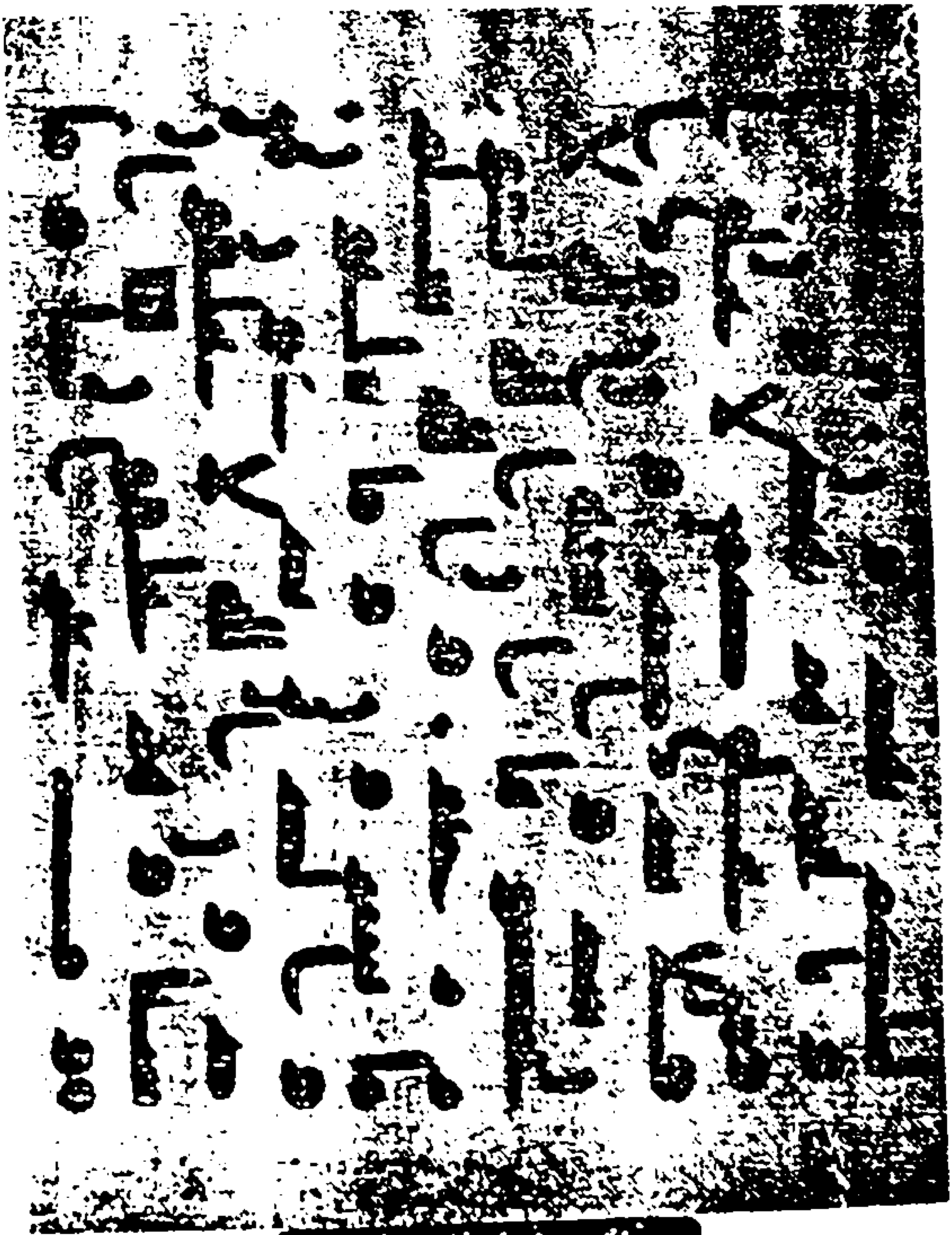

ورق مصحف حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

Marfat.com

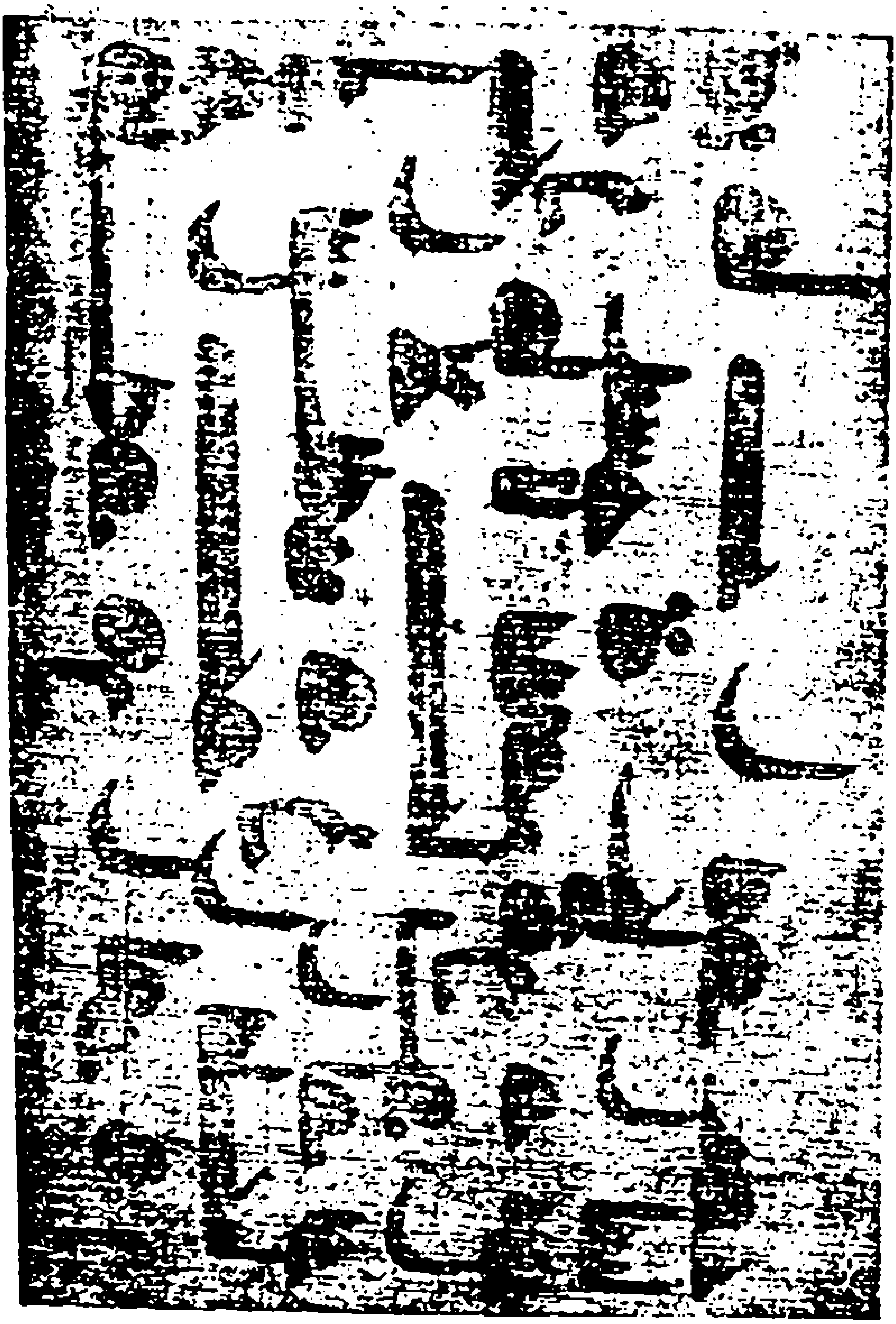

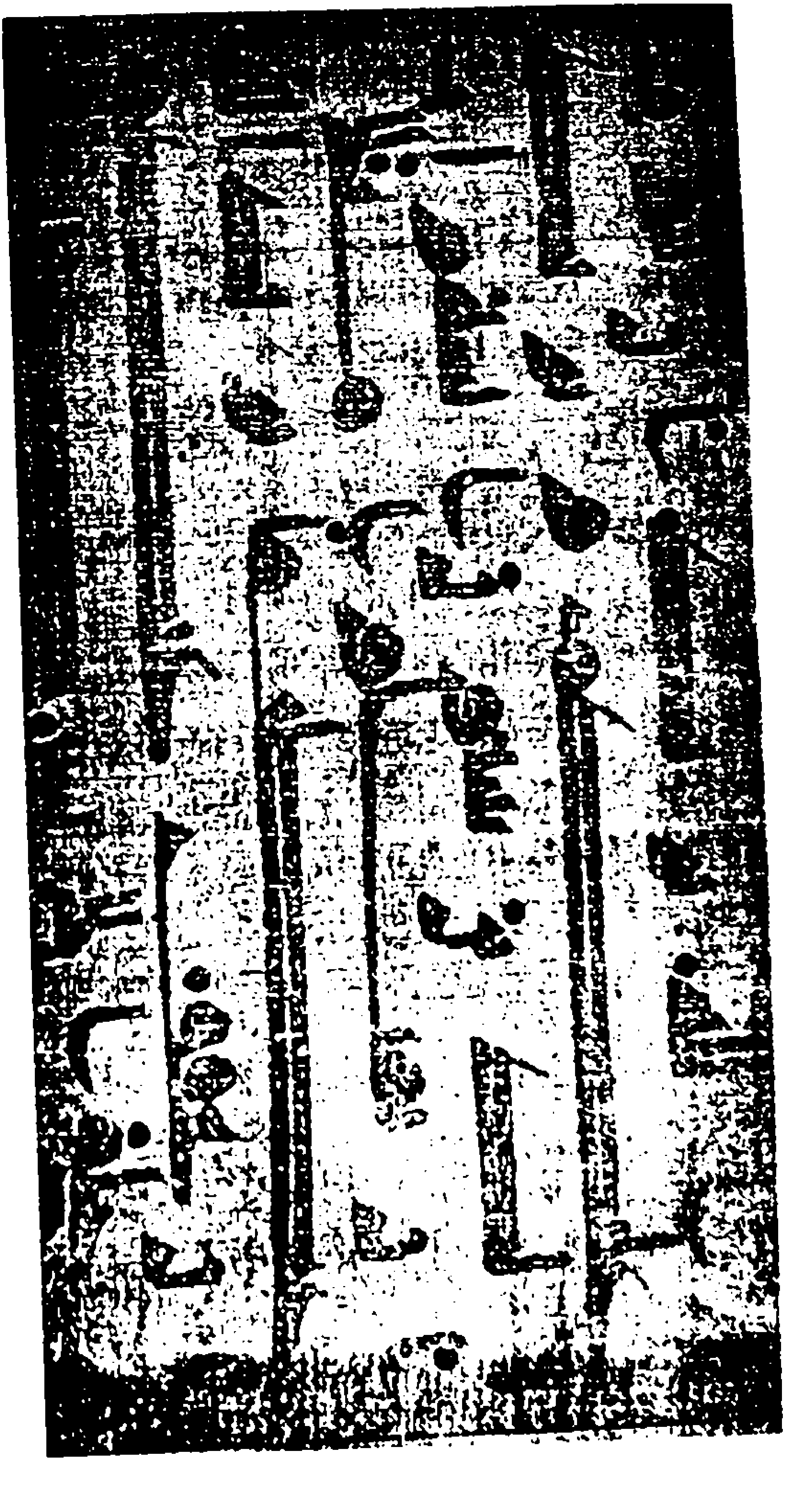

Marfat.com

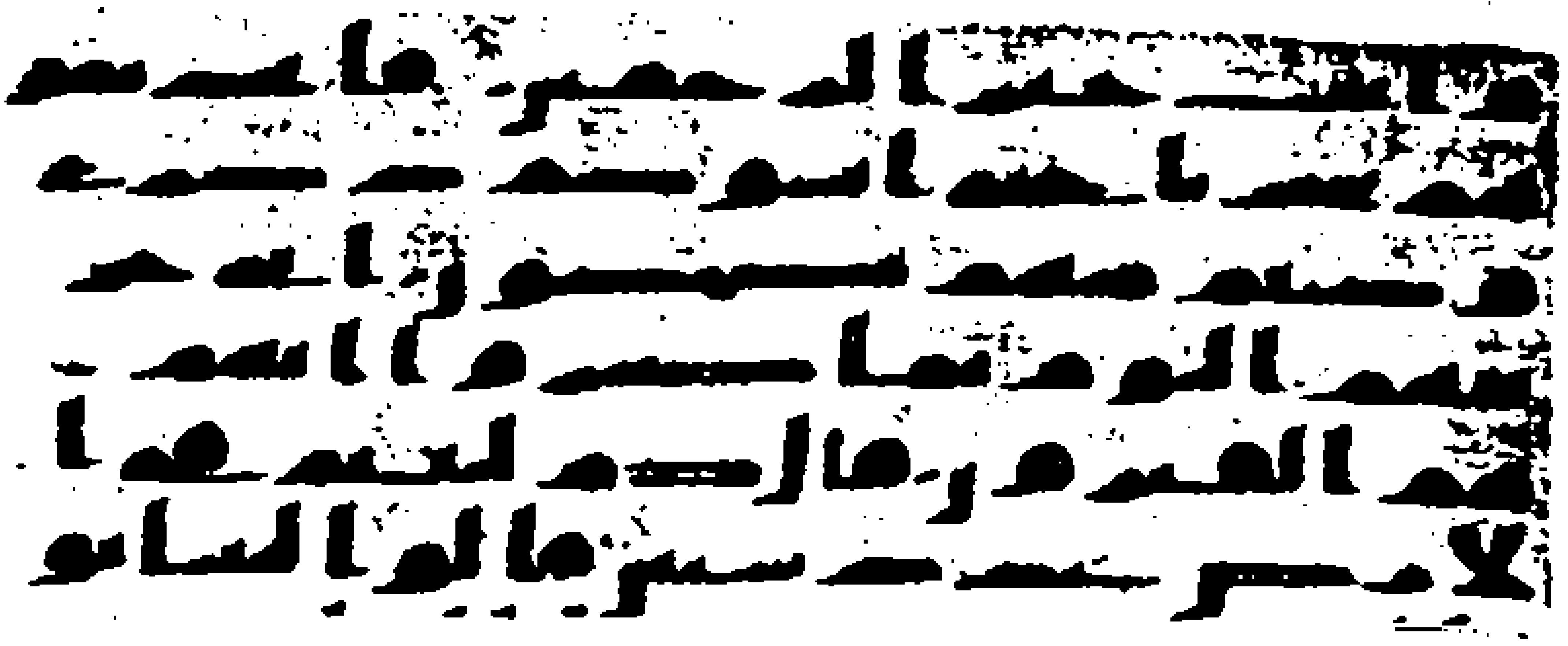

مصحف بخط کوفی دوسری صدی ہجری

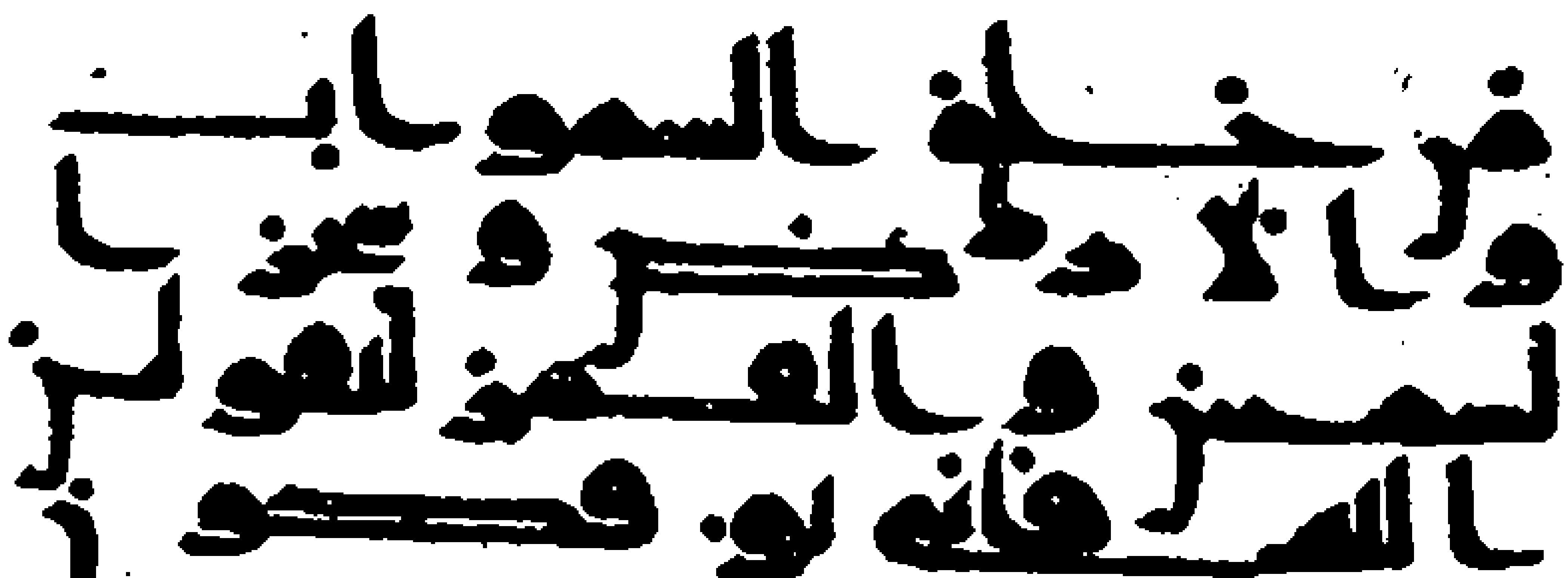

کوفی منقوط آخری تیسری صدی ہجری

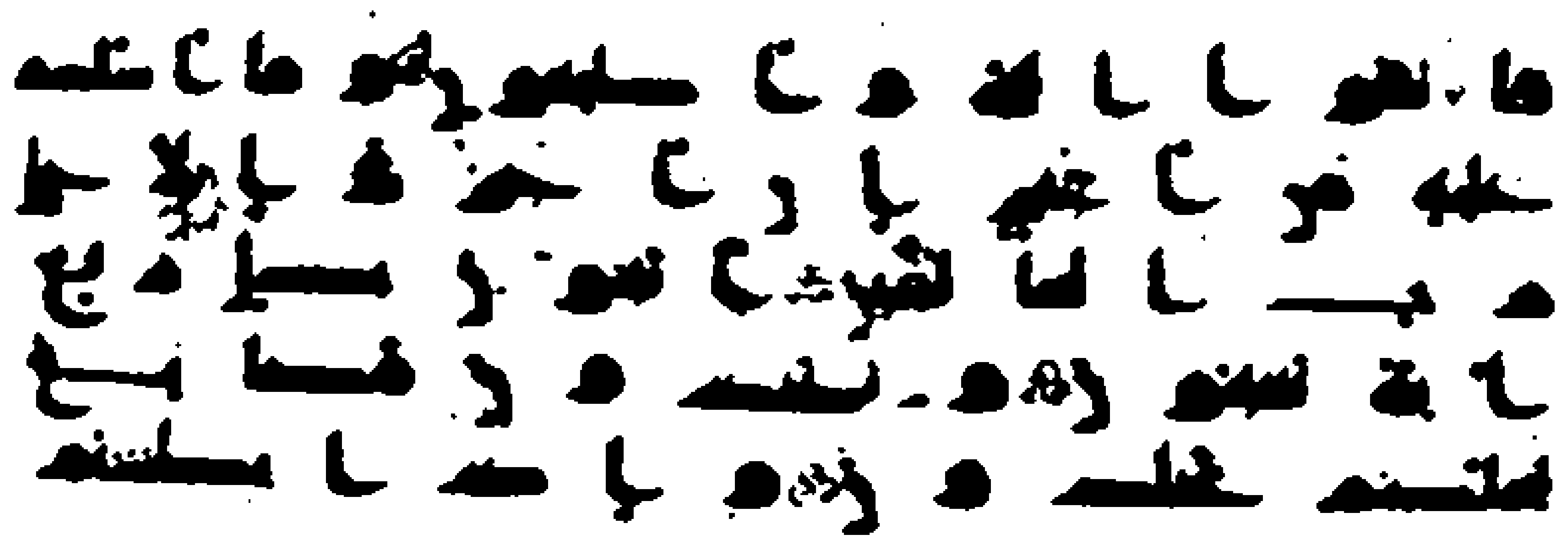

کوفی عراقی چوتھی صدی ہجری

منسوب قرآن دنیا میں بے شمار ہیں۔ ابن کثیر کے زمانے میں بھی ایسے کئی نسخے موجود تھے ،جن میں سے بعض پر کتبہ علی بن ابو طالب، (بجائے علی بن ابی طالب کے) لکھا ہوا تھا۔

پرانے نسخے کے ٹکڑے مشرقی اور مغربی، اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں میں بہ کثرت ہیں، پاریس کے ٹکڑوں کو غیر مسلم ماہر دوسری صدی ہجری کا ہونا بیان کرتے ہیں۔

حال میں جرمن مستشرقوں نے ساری دنیا سے ایسے پرانے ہزاروں نسخوں کے فوٹو میونک یونیورسٹی میں جمع کر کے حرف حرف کا مقابلہ کیا اور اعتراف کیا کہ قدیم ترین نسخوں اور جدید ترین مروجہ نسخوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ میونک کا یہ عظیم ذخیرہ دوسری جنگ عظیم میں امریکی بمباری میں ضائع ہو گیا لیکن اصل موجود ہیں۔ چاہیں تو مکرر ان کو جمع کر سکتے ہیں۔

ابن کثیر نے (ذیل التفسیر، صفحہ ۱۵ میں) یہ بھی لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں قرآن کو کوفی خط میں لکھا جاتا تھا۔ پھر وزیر ابو علی ابن مقلہ نے خط کی اصلاح کی اور ایک خاص نہج اور اسلوب کا خط ہوا۔ پھر علی بن ہلال بغدادی المعروف بہ ابن البواب نے خط میں مزید ترمیم کی اور پھر لوگ اسی کی پیروی کرنے لگے، ابن البواب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ، قرآن استانبول میں ہے اور ایک دوسرا ڈبلن (آئرلینڈ) میں۔ اس آخر الذکر کا فوٹو لے کر حال میں (۱۹۷۲ء میں) بلاک پر پاریس میں چھاپا گیا ہے جو ۳۹۱ھ کا مورخہ ہے۔

آیتوں اور سوروں کی ترتیب:

اس بارے میں سب کو اتفاق ہے کہ قرآن کے سوروں کے اندر آیتوں کی جو ترتیب ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہے۔ لیکن خود سوروں کی ترتیب جو موجودہ قرآن میں ہے کہ پہلے سورۂ فاتحہ، پھر سورۃ بقرہ وغیرہ، وہ کس نے دی؟ ذیل کی روایت بخاری ومسلم نے تو نہیں البتہ طبری، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن حنبل، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کی ہے کہ ایک دن حضرت ابن عباس نے حضرت عثمان سے پوچھا کہ سورۃ انفال کو جو چھوٹا ہے سورۃ برأت سے جو بڑا ہے، کیوں پہلے رکھا گیا ہے

Marfat.com

اور سورۃ برأت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی نہیں ہے، یہ کیوں؟ انھوں نے جواب دیا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض وقت کئی کئی سورے بہ یک وقت جزء اجزاء بھی نازل ہوتے تھے، (اس کا کچھ حصہ اور اس کا کچھ حصہ)۔ جب آپ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو کاتب کو بلا کر لکھاتے اور کہتے کہ اسے فلاں سورے کے فلاں مقام پر درج کرو۔ سورۃ انفال ہجرت کے آغاز پر نازل ہوا اور سورۃ برأت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری زمانے میں، دونوں کے مندرجات میں مماثلت ہے اور حضور نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ دونوں ایک ہی سورت ہیں۔ اسی لیے میں نے ان دونوں کو پاس پاس تو رکھا (یعنی ان کی ترتیب تو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، باقی رکھی) لیکن ان کے درمیان بسم اللہ (اپنی طرف سے) نہیں بڑھایا اور سورۃ انفال کو (مختصر تر ہونے کے باوجود) سات لمبے سوروں ہی میں رکھا۔ اس ایک روایت کی اساس پر (جس کے راویوں میں ایک غیر معروف شخص ہونے کے باعث یہ نہیں معلوم کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعینہ یہ الفاظ کہے یا ان کے مفہوم کو یوں بیان کیا گیا) بعض مولفوں نے یہ خیال کیا ہے کہ سوروں کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دی (ذیل تفسیر ابن کثیر ص ۱۱ تا ۱۲ مع حاشیہ)۔

لیکن یہ غلط فہمی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پوری دیانت داری سے قرآن کو جوں کا توں رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تک کا اضافہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ سورۃ براۃ میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ''رحمت'' نہیں بلکہ کافروں کے ساتھ شدت کا حکم ہے اور ان سے کیے ہوئے حلفیہ معاہدوں کے منسوخ کرنے کا ایک طرفہ اعلان ہے۔ رہی ترتیب وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہے اور سب جانتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ ہر سال (کم از کم مدینے میں) اس وقت تک نازل شدہ سارا قرآن مجمع عام میں بہ آواز بلند سنائیں (اور روایت میں ذکر ہے کہ اس وقت جبرئیل بھی موجود رہتے تھے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظے میں کبھی تردد ہو تو فوراً لقمہ دے کر اصلاح کر دیں) اور یہ کہ وفات سے پہلے کے رمضان میں جبرئیل کے کہنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا قرآن دو مرتبہ سنایا (اور اس سے استنباط کیا کہ اب قرآن کی تکمیل ہوگئی ہے اور آپ کی جلد

وفات ہونے والی ہے)۔اس قرأت سماعت کو عرضہ کا نام دیا گیا ہے اور آخری سال کے معاملے کو عرضہ اخیرہ۔اس وقت صحابہ اپنے نجی نسخوں کے ساتھ حاضر رہتے اور مقابلہ میں کوئی غلطی یا کوتاہی پاتے تو فوراً اصلاح کر لیتے (ایضا ابن کثیر، صفحہ ۱۴)۔ان حالات میں اس کا امکان نہیں کہ سوروں کی ترتیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نے دی ہو۔مزید برآں آج تک حافظوں اور قاریوں کو نسلاً بعد نسلٍ ان کے استادوں سے جو سند ملتی ہے اس میں موجودہ ترتیب ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کی صراحت ہوتی ہے۔مثلاً: مدینہ منورہ کے شیخ القراء مولانا شیخ حسن الشاعر اپنے شاگردوں کو جو اجازت نامہ دیتے ہیں اس کے آخری الفاظ یہ ہوتے ہیں: عثمان، وعلی، وابن مسعود، وابی بن کعب، وزید بن ثابت رضی اللہ عنہم نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضور نے جبرئیل سے، انہوں نے لوح محفوظ سے پڑھا اور اس میں رب العزت جل جلالہ سے آیا۔

غالباً انہیں وجوہ سے امام مالک نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ سوروں کی موجودہ ترتیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دی ہوئی ہے۔

رسم الخط:

اس بارے میں ذیل التفسیر لابن کثیر، صفحہ ۱۵، بحوالہ ابن الکلبی، فتوح البلدان للبلاذری صفحہ ۴۷۱ تا ۴۷۲، کتاب المصاحف لابن ابی داود، صفحہ ۴ تا ۵ وغیرہ کے حوالے سے میں نے ایک مضمون لکھا ہے، صنعۃ الکتابۃ فی عھد الرسول والصحابۃ، (مجلہ فکر وفن، ھامبورگ ۱۹۶۴ء)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا رواج پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں آنحضرت کی نوجوانی میں ہوا۔سب سے پہلے حضرت ابوسفیان کے باپ حرب بن امیہ نے نبطی خط سیکھ کر اس میں عربی زبان کو لکھنے کا آغاز کیا۔عربی میں اولین کتاب جو لکھی گئی وہ قرآن مجید ہے۔اس سے بہ آسانی معلوم ہوسکتا ہے کہ کیوں ابتداء میں املا اور رسم الخط میں دشواریاں رہیں۔ایک تو نبطی حروف تہجی عربی کے لیے ناکافی تھے۔(عربی میں، ث، خ، ذ، ض، ظ، غ، زیادہ ہیں)۔دوسرے عرب کے قبائل میں تلفظ کی حد تک باہم کثیر

Marfat.com

اختلاف تھا اور ابھی حروف پر نقطوں کا رواج بھی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کاتب حیران رہ جاتا تھا کہ کس طرح لکھے۔ عربی میں ہیں تو اٹھائیس حرف، لیکن حروف پر نقطوں کے ذریعے سے امتیاز نہ ہو تو صرف پندرہ شکلیں رہ جاتی ہیں اور باقی تیرہ حرف اٹکل پر پڑھے جاتے ہیں (اور ب۔ ت۔ ث۔ ز ذ میں باہم کوئی فرق نہ تھا) عربوں کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اپنے آپ پر اعتماد کو باقی رکھا اور رفتہ رفتہ ساری مشکلوں پر غالب آ گئے اور ان کا خط دنیا کا سب سے مکمل، سب سے خوبصورت اور ابہام سے پاک ہو گیا۔

اس رواج کے تیس چالیس سال ہی بعد قرآن کا نزول اور اس کی تحریری تدوین شروع ہو گئی۔ اس وقت تک چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، مکے والوں نے خط کو کافی ترقی دے لی تھی اور مجوزہ اصلاحوں کو آہستہ آہستہ قبول عام حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ ذیل کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں عربی خط کی کیا حالت تھی:

مقاییس اللغۃ (۲/۴۲۵ تا ۵۲۶ میں) ابن فارس نے لکھا ہے کہ قرآن مجید (۸۳/۹ نیز ۲۰) میں ''کتاب مرقوم'' کا جو لفظ آیا ہے اس میں ''مرقوم'' کے معنے ہیں حروف پر نقطے دے کر لکھا جائے۔

الجامع الاخلاق الراوی مولفہ خطیب بغدادی (حصہ سوم، باب تقید الاسماء بالشکل و الاعجام)، تاریخ دمشق لابن عساکر (سوانح عبید بن اوس الغسانی) اور تدریب الراوی للسیوطی (صفحہ ۱۵۲) میں یہ اہم واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن حضرت معاویہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اپنے کاتب عبید بن اوس کو ایک خط لکھاتے ہوئے کہا کہ ''رقش کرو'' عبید نے پوچھا رقش کیا چیز ہے؟ تو کہا ایک دن مجھے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لکھا رہے تھے اور اس اثناء میں فرمایا: ''رقش کرو'' میں نے پوچھا: رقش کیا چیز ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا: جہاں ضرورت ہو حروف پر نقطے لگانا، اُسد الغابہ لابن الاثیر (۱/۱۹۲) میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یے اور تے پر تم میں اختلاف ہو تو یے لکھو۔ (مثلاً تعلم اور لیعلم) یہ ممکن نہیں کہ نقطوں کے رواج کے بغیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا حکم دے سکیں۔

مصر میں پرانے بردی کاغذ (پاپیروس) پر لکھا ہوا ایک سرکاری مراسلہ دستیاب ہوا

Marfat.com

ہے جس پر ۲۲ھ کی تاریخ درج ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کی چیز ہے۔ اس میں خ، ذ، ز، ش اور ن پر نقط لگے ہوئے ہیں۔ یہ بردی اب ویانا آسٹریا میں ہے۔ تفصیلوں کے لیے دیکھو آدولف گرومان **Adolf Grohmann** کی انگریزی کتاب، عربی بردیوں کے منتخبات، **From the world of Arabic Papyri** مطبوعہ، مصر، صفحہ ۸۲، ۱۱۳، ۱۱۴)۔ ایسے ہی دو اور مراسلے برلین کے کتب خانے میں ہیں۔ ان پر بھی ۲۲ھ کی تاریخ درج ہے اور ان میں بھی متعدد حروف پر نقطے لگے ہوئے ہیں (دیکھو اسی آدولف گرومان کا انگریزی مضمون **The Problems of Dating Early Qurans** "قدیم ترین نسخہ ہائے قرآن کے زمانہ کتابت کے تعین کا مسئلہ" مطبوعہ رسالہ **Der Islam** برلین ۱۹۵۸ء، جلد ۲۳، عدد ۳، صفحہ ۲۲۰ فوٹو پلیٹ-۲)۔

طائف کے قریب ایک تالاب کے بند پر ایک کتبہ ملا ہے جس پر لکھا ہے کہ وہ ۵۱ھ میں خلیفہ حضرت معاویہ کے حکم سے بنایا گیا۔ اس میں بھی چند حروف پر نقطے نظر آتے ہیں (دیکھو جارج مالیس **George C. Miles** کا مضمون "حجاز میں طائف کے قریب قدیم اسلامی کتبے" **Early Islamic Inscriptions Near Taif in the Hijaz** مطبوعہ رسالہ **Journal of Near Eastern Studies** امریکہ، اکتوبر ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۴۰)۔

اس طرح نظر آتا ہے کہ تاریخی بیانات اور موجود حقائق ایک دوسرے کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔

زبر زیر کا موجودہ اعراب حجاج بن یوسف (گورنر عراق) کی طرف منسوب ہے یعنی آنحضرت کی وفات کے کوئی ستر اسی سال بعد کا واقعہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بھی اس طرف توجہ ہو چلی تھی اور کم از کم تنوین کی کوئی علامت بن گئی تھی کیونکہ نہ صرف اسم میں (کتابا، ذکرا وغیرہ کے لیے) بلکہ فعل میں (۱۲/۳۲: ولیکونا، ۹۶/۱۵: لنسفعا کے لیے) حتی کہ صرف میں (۱۴/۱۲: اذا کے لیے) تنوین مفتوح کے لیے الف لکھا جاتا ہے، نون (کتابن وغیرہ) نہیں۔ ایک جگہ (۲۱/۸۸) تو نجی لکھتے اور پڑھتے نجی ہیں گویا نُجّی ہے کہ تنوین صرف لفظ کے اخیر میں نہیں بلکہ بیچ میں بھی لکھتے تھے (یہ رواج آج

Marfat.com

تک افریقا کے بعض علاقوں میں باقی ہے اور کسی لفظ میں دو ''نون'' پاس پاس ہوں تو صرف ایک لکھ کر اس پر تنوین لگا دیتے ہیں، جیسا کہ بمرا زبان کے ترجمہ، قرآن میں نظر آتا ہے۔ دیکھو: پاریس کا ماہنامہ فرانس اسلام، دسمبر ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۲۔ ان افریقی مسلمانوں نے یہ چیز کسی پرانے عرب قبیلے کے مبلغ سے لی ہوگی۔

بہر حال نقطے لگانے اور اعراب لگانے کی دو اصلاحوں نے اعراب خط کو مکمل کر دیا اور وہ دنیا کے ہر خط سے زیادہ معین اور ابہام سے پاک ہوگیا ہے۔ یہ اصلاحیں قرآن مجید کی خاطر ہوئیں تاکہ اس کی قرأت صحیح طور پر ہو سکے۔ پھر دین کے ساتھ دنیا کا بھی فائدہ ہو گیا (اور غیر قرآنی عربی تالیفوں، تحریروں میں بھی اس کا استعمال کیا جانے لگا) اور ساتھ ہی قرآن کے تحفظ کا سہ گانہ طریقہ، یعنی تحریر، حفظ اور مستند استاد کے پاس پڑھنا، قرآن کی عبارت کی صحت کا نسلاً بعد نسلٍ ضامن بن گیا۔ جلدی ہی مسلمانوں نے (عربی خلافت کے زمانے میں) سستا اور اچھا کاغذ کثیر مقدار میں بنانا سیکھ لیا۔ تاکہ جھلی اور بردی کی ضرورت نہ رہے۔ قرونِ متوسط میں عربی علوم وفنون کی ترقی کا ایک راز یہ بھی تھا۔

نقل و روایت:

دیگر قوموں میں دینی کتابوں کا علم اور ان کی حفاظت کا فریضہ ایک طبقے اور گروہ سے مختص رہا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس کے برعکس چاہا کہ قرآن سے واقفیت مسلمانوں کے ہر ہر فرد کو ہو تاکہ وہ اس کے احکام زندگی کے ہر فعل میں ملحوظ رکھ سکے۔ یہ اوپر بیان ہو چکا کہ لکھنے اور زبانی یاد کرنے کا حکم امت کے لیے عام رہا۔ مزید برآں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشین خلفاء نے ہر زمانے میں سرکاری ملازموں کے لیے قرآن کا جاننا بہت ضروری قرار دیا۔ (کیونکہ دین کی طرح اسلامی قانون بھی اسی میں پایا جاتا ہے) اسی لیے اس کی تعلیم کے لیے ساری ضروری تدبیریں اختیار کیں۔

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے قرآن کی حفاظت کے لیے ایک اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ لکھنے اور زبانی یاد کرنے کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ (کہ غلط چیز زبانی یاد کر لی جا سکتی ہے) بلکہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ کسی مستند استاد کے پاس پڑھ کر صحت کا صداقت

Marfat.com

نامہ حاصل کریں۔ یہ اصول چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود اب تک جاری ہے اور تعلیم کے اختتام پر قرآن کا معلم اپنے شاگرد کو ایک صداقت نامہ دیتا ہے جس میں اولاً وہ اپنے اساتذہ کی نسلاً بعد نسلٍ فہرست دیتا ہے جو بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم نے اسی طرح پڑھاتھا جس طرح اس آخری استاد نے پڑھایا ہے۔

دنیا میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک کے ہر زمانے کے انگنت قرآنی مخطوطے موجود ہیں۔ اسی طرح مشرق ومغرب میں لاکھوں حافظ ہیں جن کو سارا قرآن مجید زبانی یاد ہے اور وہ اسے رمضان میں تراویح میں سب کو سناتے ہیں (ایک ترکی ہی میں کوئی دو لاکھ حافظ ہیں اور وہاں مرد ہی نہیں، عورتوں کے حفظ کے لیے بھی خصوصی تعلیم گاہیں موجود ہیں)۔ اور یہ دیکھنا ولولہ انگیز ہے کہ چین سے مراکش تک حافظوں کی یاد اور تحریری قرآنوں کی عبارت میں کہیں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

اختلاف روایت:

قرآن کے تحریری نسخوں میں کاتب کی غلطیاں ہوسکتی ہیں اور آسانی سے معلوم ہو جاتی ہیں ان سے یہاں بحث نہیں لیکن ان کے علاوہ چند الفاظ کی قرأت دوطرح سے ہوتی رہی ہے۔ اس بارے میں چند توضیحیں مناسب ہوں گی۔

اولاً یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ جو اختلاف ہیں ان میں یا تو قبیلہ وار تلفظ کا فرق ہے یا ایسا نازک امتیاز جس سے جملے کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ دوسرے بعض مولفوں کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے شرح وتفسیر کے ایک یا دو لفظوں کو متن میں شامل سمجھ لیا اور بس اس کی کچھ تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

ہر زبان میں علاقہ وار بولیوں اور لہجوں کا فرق ہوتا ہے۔ ایک علاقے کے بعض الفاظ دوسرے علاقوں میں غیر معروف ہوتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ دین آسان چیز رہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس پر عمل کر سکے۔ اس لیے آپ نے خود کلام اللہ میں بھی مقامی بولیوں کے اختلاف کو روا رکھا کیونکہ اہمیت مفہوم کو ہے، لفظ کو نہیں احکام پر عمل کو ہے۔ محض تلاوت کو نہیں۔ بخاری (۶۶/۵ نیز ذیل التفسیر،

Marfat.com

لابن کثیر ۱۹ تا ۲۴) کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: جبرئیل نے مجھے قرآن کو سات طرح کے حرفوں پر پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے آپ خود تو مثلاً اہل مکہ کی عربی میں قرآن پڑھا کرتے لیکن دیگر قبائل کے لوگوں کو اس کی اجازت دیتے تھے کہ بعض الفاظ کی جگہ وہ ایسے الفاظ استعمال کریں جو ان کے علاقوں میں مروج تھے (مثلاً سورۃ فاتحہ میں مالک کی جگہ مَلکِ ،سورۃ یوسف میں ہَیْتَ کی جگہ ہیت وغیرہ غالباً اسی کی اساس پر ایک مرتبہ جب حضرت ابن مسعود نے ایک بدوی کو تعلیم دی کہ طعام الاثیم ،گناہگار دوزخی کی غذا۔ تو اس نے اس کا تلفظ ،طعام الیتیم ۔یتیم کی غذا۔ کیا بار بار اصلاح کے بعد تھک گئے تو پوچھا: کیا تو فاجر کا لفظ پڑھ سکتا ہے؟ جب اس نے اس کا ٹھیک تلفظ ادا کیا تو کہا: اچھا اسے طعام الفاجر پڑھا کر) اس کا سلسلہ کچھ ہی عرصہ جاری رہا۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان کے زمانے میں تعلیم اتنی عام ہو چکی تھی کہ اب ان اختلافات کی ضرورت باقی نہ رہی اور انہوں نے سب کو سرکاری نسخۂ قرآن کے مطابق پڑھنے کا پابند کیا کیونکہ ،جیسا کہ تفسیر طبری (۱/ ۲۱،۲۲ نیز اِتقان سیوطی ۱/ ۷۵) میں لکھا ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کی اجازت دی تھی حکم نہیں دیا تھا۔ اضلاع اور دیہات میں صحابہ کے ہاں جو قرآن تھے اور وہ ان کے بعد ان کے بچوں پوتوں میں وراثت میں پہنچے تو ان میں ایسے کچھ فرق ملے جن کی اساس پر بعد کی صدیوں میں علماء نے اختلاف المصاحف کا ایک نیا علم پیدا کیا اور پوری دیانت داری سے ایسے سارے فرق بیان کیے۔ ایسی ایک تالیف ابن ابی داود کی کتاب المصاحف ،اب تک موجود ہے اور چھپ بھی چکی ہے۔ مسلمانوں کی اس علمی دیانت داری کو دیکھ کر مشہور مستشرق جیفری Jeffery اتنا ششدر ہوتا ہے کہ وہ Material for the History of the text of the Quran میں قرآن کی تاریخ کا مواد، نامی کتاب مطبوعہ لائیدن صفحہ ۹ میں لکھنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس طرح کا کوئی مواد مسلمانوں نے محفوظ بھی رکھا ہو۔ It is remakable that any at all has been preserved جیفری صاحب کو کون سمجھائے کہ آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است۔

Marfat.com

قرآن مجید عام طور پر عام فہم ہے لیکن اس کا اسلوب ایسا ہے کہ بعض بعض جگہ خود صحابہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اور بعض تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو اپنے نسخے کے حاشیے پر بھی لکھ لیتے کہ آئندہ بھول نہ جائیں۔ بعد کے نسخوں میں کسی نے ایسا نسخہ دیکھا اور کاتب کی وفات کے باعث دریافت بھی ممکن نہ تھی تو اس نے شرح کو متن کا جزء اور کتابت کی ابتدائی سہو کو تصحیح سمجھ لیا۔ اسی لیے حضرت عمر نے حکم دیا تھا (ابن سعد ۶/۳، تقییہ العلم للخطیب البغدادی، صفحہ ۳۳ تا ۳۴) کہ قرآن میں غیر قرآنی کوئی چیز نہ لکھو۔ مذکورہ بالا قسم کے اختلافات سیکڑوں ہیں لیکن یہ واقعہ کہ فلاں صحابی کے قرآن میں فلاں لفظ تھا جو کسی اور دوسرے صحابی کے ہاں نہ تھا، اہم چیز ہے کیونکہ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان خاص صحابی کو اس خاص لفظ کے سمجھنے میں مشکل پیش آئی تھی اور دریافت پر انہیں اس کا مطلب فلاں مترادف لفظ سے سمجھایا گیا۔ مزید برآں اس طرح کے اختلافات کے متعلق پرانے مولف جو چیزیں بیان کرتے ہیں ان میں بعض وقت تضاد بھی ہے۔ مثلاً ایک مولف بیان کرتا ہے کہ فلاں صحابی کے قرآن میں فلاں چیز زائد تھی اور دوسرا مولف اس سے انکار کرتا ہے کہ نہیں اس کے نسخے میں وہ چیز نہ تھی۔ مزید برآں ایسی ساری بیان کردہ اختلافی چیزوں کو جمع کیا جا چکا اور ان کی جانچ پر دیکھا جا چکا ہے کہ ان میں سے کسی سے بھی مروجہ قرآن مجید کا مفہوم نہ بدلتا ہے اور نہ حذف و اضافہ ہوتا ہے۔ ایک طرف موجود قرآن ہے جو انتہائی احتیاط سے حضرت ابوبکر کے زمانے میں تحریراً مدون ہوا اور من وعن ہم تک تواتر سے پہنچا ہے اور دوسری طرف اختلافات کی یہ روایتیں انفرادی بیانات (احاد) ہیں اور ان کی روایت نہ صرف مقابلۃً بہت کمزور ہے بلکہ اختلاف کے وجود میں خود بسا اوقات اختلاف ہے۔

اختلاف روایات کی ایک اور آخری وجہ اولین اسلامی زمانے کا عربی خط بھی ہے جس میں اعراب تو کیا، نقطے بھی کم ہی لگائے جاتے تھے۔ جن لوگوں کو ذرا بھی عربی زبان آتی ہے وہ جانتے ہیں زبر زیر کے فرق سے لفظ معروف کی جگہ مجہول ہو جاتا ہے (یَسئل وہ پوچھے گا: یُسئل اس سے پوچھا جائے گا) اور بعض جملوں میں صراحت نہ ہو تو دونوں معنی ممکن ہوتے ہیں مثلاً وہ (یعنی اللہ) پوچھے گا: اس (یعنی انسان) سے پوچھا جائے گا۔ معنی

Marfat.com

میں لفظی فرق تو ہوگا لیکن مفہوم اور مقصود میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ اختلاف کی ایسی بھی چند مثالیں ملی ہیں۔ کسی صحابی کو مثلاً کوئی بڑا سورۃ زبانی یاد نہ ہو اور اس کے تحریری قرآن میں نقطے اور زبر زیر نہ ہوں تو مادری زبان ہونے کے باعث وہ قیاساً پڑھ کر ایسی غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کی انفرادی غلطی ہوگی، قرآن میں اس سے اختلاف نہیں ثابت ہوتا بعض مفسر یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت دو طرح سے پڑھی جا سکتی ہے۔ تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ان کی ذہانت ہے یا واقعی کسی صحابی کو اس طرح کا واقعہ پیش آیا تھا۔

ناسخ و منسوخ:

لیکن ایک سوال باقی رہتا ہے کہ آیا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، وحی کی اساس پر، کبھی کوئی آیت، کوئی عبارت منسوخ فرمائی یا نہیں؟

نسخ اور تبدیل کا قرآن میں دو بار ذکر ہے:

۱۔ سورۃ (۲، آیت ۱۰۶): اگر ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس جیسی کو لے آتے ہیں۔ (یہ مدنی سورۃ ہے)۔

۲۔ سورۃ (۱۶، آیت ۱۰۱) اور جب ہم ایک کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں اور اللہ جو چیز نازل کرتا ہے اسے وہی بہتر جانتا ہے تو یہ (کافر) کہتے ہیں کہ تو (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹا مفتری ہے۔ مگر ان (کافروں) میں سے اکثر نادان ہیں، (یہ مکی سورۃ ہے یعنی نسخ کی اوپر کی آیت سے قبل نازل ہوا تھا)۔

کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ خود قرآن کی آیتوں میں یہ نسخ اور تبدیلی ہوئی ہے یا کچھ اور؟ اس موضوع کے پرانے محقق امام جصاص فوت ۳۷۰ھ نے اپنی کتاب، احکام القرآن، میں اس بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف خیالات بیان کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہمارے ایک معاصر (۱) نے یہ عجیب بات بیان کی ہے کہ مذکورہ عبارتوں

---

(۱) ممکن ہے اس سے مراد مشہور معتزلی مفسر، ابو مسلم اصفہانی (فوت ۳۷۰ھ) ہو، جس کی طرف یہ رائے منسوب بھی ہے دیکھو اس کی ملتقط جامع التاویل لحکم التنزیل (طبع کلکتہ ۱۹۲۱ء) صفحہ ۹، ۶۵، (بہ شکریہ ڈاکٹر محمد یوسف الدین)۔

میں قرآن کی آیتوں کے منسوخ ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ تورات انجیل وغیرہ قدیم تر نازل شدہ الہامی کتابوں کا قرآن کے ذریعے سے منسوخ ہونا مراد ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت دوم میں یہ کہتے ہیں کہ تو مفتری ہے۔ اس سے یہودی مراد ہوں تو بات پھبتی ہے کہ اور کے پاس تورات میں خدائی احکام موجود تھے جن میں سے بعض کو قرآن نے بدلا تھا۔ عرب مشرکین کے پاس کوئی دینی کتاب تھی ہی نہیں کہ اس کے بدلنے پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کا الزام لگائیں۔

یہ صحیح ہے کہ بعض دوسرے مسلمان مولف تسلیم کرتے ہیں کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن میں نسخ ہوسکتا ہے اور بعض مثالیں بھی دیتے ہیں جو دھندلی سی ہیں اور شاذ روایتیں ہیں کہ بخاری و مسلم وغیرہ مستند و محتاط مولف ان کا ذکر نہیں کرتے۔ (ایسی بعض چیزیں سیوطی نے اپنی کتاب اتقان میں جمع کی ہیں)۔

ایک واقعہ جو صحیح بخاری میں بھی بیان ہوا ہے وہ البتہ قابل ذکر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض نوجوانوں میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث چھڑی تھی کہ زنا کی سزا کیا ہے سب جانتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کی سزا قرآن (سورۃ نور) میں سو درے لگانا ہے اور شادی شدہ زانی کو حدیث میں پتھراؤ کرنے (رَجم) کا حکم ہے۔ اس پر ایک دن حضرت عمر نے ایک طویل خطبہ دیا جس میں اس کا بھی ذکر کیا۔ اس کا مفہوم تو سب روایتوں میں یکساں ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ کہیں کچھ، کہیں کچھ بیان ہوئے ہیں۔ (دیکھو بخاری ۸۶/۳۱، سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۱۴ تا ۱۰۱۵، مسلم، ترمذی، ابن حنبل، وغیرہ کی تفصیل کے لیے دیکھو تفسیر ابن کثیر، ۲۶۰/۳ تا ۲۶۱ سلسلہ تفسیر سورۃ نور)۔ غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ کتاب اللہ میں رجم کا حکم تھا اور لوگ اسے پڑھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر عمل بھی کرتے رہے۔ زمانہ گزرنے پر لوگ اسے بھول جائیں گے اور شاید یہ پوچھیں گے کہ قرآن میں رجم کی آیت کہاں ہے؟ اگر مجھے لوگوں کے اس الزام کا ڈر نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں کوئی چیز اپنی طرف سے بڑھا دی ہے تو میں رجم کی آیت اس میں شامل کر دیتا۔ امام بخاری کے استاد امام احمد بن حنبل نے (اپنی مسند، حدیث ۱۵۶ میں) اسی واقعے کی ایک دوسری روایت

میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یوں دیے ہیں: "تو میں رجم کی آیت کو مصحف کے ایک گوشے میں لکھ دیتا۔ (فی ناحیۃ من المصحف)، بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نسخ کا ایک اور واقعہ بھی یاد دلایا کہ ایک زمانے میں وہ ایک آیت سنا پڑھا کرتے تھے کہ کسی کا اپنے حقیقی والدین کو چھوڑ کر دوسروں سے نسب جوڑنا کفر ہے۔

یہ ممکن ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید کی چند آیتیں منسوخ ہوئیں اور قرآن سے خارج کر دی گئی ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ استنباط انفرادی غلط فہمی پر مبنی ہو۔ مثلاً: بعض صحابہ نے یہ گمان کیا تھا کہ نماز میں پڑھی جانے والی ہر چیز قرآن ہے اور اسی لیے انہوں نے تشہد کو بھی اپنے قرآن میں لکھ رکھا تھا۔ اسی طرح قرآن کے آخری دو سورے (سورۃ فلق اور سورۃ ناس) سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً بیماروں کی جھاڑ پھونک کا کام لیتے اور رات کو سونے سے قبل خود بھی ان کو پڑھ کر پھونک کر سارے جسم پر ملا کرتے تھے۔ اسی لیے بعض صحابہ نے اپنے نسخہ قرآن میں ان سوروں کو نہ لکھا تھا اور ان کو محض دعا خیال کر لیا تھا۔ اس طرح کی جتنی انفرادی غلط فہمیاں تھیں وہ حضرت ابوبکر کے زمانے کی تدوین کے وقت تدوینی کمیٹی میں آئیں اور رد ہو چکی تھیں اوپر بیان ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پیش کردہ ایک ،آیت ،کو بھی مطلوبہ گواہی (دو تحریری شہادتوں) کی عدم موجودگی کے باعث رد کر دیا گیا تھا۔ مولف اسے آیت رجم سے متعلق کرتے ہیں (جس سے ہم ابھی نیچے بحث کریں گے) لیکن ممکن ہے کہ یہی بات نسب کی تبدیلی کی آیت کے متعلق بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیش آئی ہو، اور وہ محض حدیث قدسی ہو۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو: اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ......اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نیک نیتی لیکن غلط فہمی سے اسے آیت فرض کر لیا ہو۔ ان کی غلط فہمی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ چونکہ ایک انصاری حضرت عتبان بن مالک سے بھائی چارہ کر کے اس کے ساتھ مدینے سے دور عوالی میں رہتے تھے ایک دن وہ مسجد نبوی کو آتے اور سارا دن وہیں رہتے اور انصاری اپنی کھیت یا باغ میں کام کرتا اور شام کو گھر واپسی پر سارے پیش آمدہ واقعات وہ اپنے بھائی سے بیان کرتے دوسرے دن انصاری مدینہ آتا اور حضرت عمر

Marfat.com

رضی اللہ عنہ سے شام کو دن بھر کے واقعات بیان کرتے (بخاری ۳/۲۷ باب التناوب فی العلم) اور غلط فہمی ان انصاری کی ہو۔

مگر آیت رجم میں پیچیدگی اس لیے بڑھ گئی ہے کہ اس آیت کی منسوخی کو تسلیم کرنے والے مولف خود ہی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس کے حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر عمل کرتے رہے اور ان مولفوں نے مسئلے کی ایک نئی شاخ پیدا کر کے یہ خیال کیا ہے کہ آیت منسوخ ہوئی مگر حکم برقرار رہا۔ واللہ اعلم (تفسیر ابن کثیر ۳/۲۶۱)۔

یہ حل ان محترم مولفوں کے ذہن میں آیا۔ ایک دوسرا حل ہمارے ناچیز ذہن میں آتا ہے۔ ناظرین غور فرمالیں: وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان میں رجم کا حکم اللہ کی کتاب میں تھا، کتاب سے مراد تورات لی جائے۔ اس بیان کی مختلف روایتوں میں ہمیں کہیں بھی رجم کا حکم قرآن میں تھا یہ الفاظ نہیں ملتے۔ اس تاویل و تعبیر سے ساری گتھیاں حل ہوتی نظر آتی ہیں۔ رجم کا حکم واقعی تورات اور انجیل میں ہے (کتاب لاویین ۲۰/۱۰ تا ۱۴، کتاب تثنیہ ۲۲/۲۱) انجیل یوحنا ۸/۵) اور قرآن مجید (۴/۲۶، ۶/۹۰) میں صراحت سے حکم ہے کہ پرانے انبیاء کی شریعتوں کے غیر منسوخہ حکم مسلمانوں پر بھی واجب ہیں اور بخاری (۶۳/۵۰، ۶۴۵، ۷۷/۷۰) وغیرہ میں صراحت ہے کہ رسول کو کسی مسئلے میں وحی نہ آئی ہوتی تو آپ اس بارے میں اہل کتاب سے موافقت کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ قرآن مجید میں صرف غیر شادی شدہ کی زنا کے متعلق سزا کا ذکر ہے، اور شادی شدہ کی زنا کا ذکر نہیں، اس لیے شادی شدہ کی حد تک تورات اور انجیل کا خدائی حکم خود بخود برقرار رہ جاتا ہے۔

جو بھی ہو، پرانے مولفوں کی اکثریت یہ تسلیم کرتی ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کے نسخ کا امکان تھا اور منسوخ شدہ آیتیں خدا نے بھلا بھی دیں۔ (کشف الاسرار شرح اصول البزدوی، مولفہ عبدالعزیز البخاری، ۳/۱۸۸) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے کسی نئے نسخ کا کوئی امکان نہیں۔

اس سلسلے میں ایک آخری سوال یہ ہے کہ آیا موجودہ قرآن میں کوئی منسوخ شدہ آیت موجود ہے یا نہیں۔ بعض لوگ اس کے قائل ہیں اور دو ایک مثالیں دیتے ہیں۔ لیکن

Marfat.com

غور سے مطالعہ کریں تو ان میں نسخ کا پتا نہیں چلتا۔ بہر حال یہ ہم خدامِ علم کا استنباط ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی صراحت اس بارے میں نہیں فرمائی ہے۔

تلاوت کا طریقہ:

قرآن مجید خود اس بارے میں کئی بار ذکر کرتا ہے۔ مثلاً: (۴/۷۳) و رتّل القرآن ترتیلا (اور قرآن کی ترتیل کے ساتھ تلاوت کر) یا (۱۰۶/۱۷) وقراٰناً فرقناہ لتقراٰہ علی النّاس علیٰ مُکث ونزلناہ تنزیلا (اور ایک قرآن جسے ہم تعالیٰ نے (سوروں آیتوں میں) بانٹا ہے تاکہ تو صلی اللہ علیہ وسلم اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور ہم تعالیٰ نے اسے جستہ جستہ کر کے اتارا ہے، یا (۱۶/۷۵) لاتحرك به لسانك لتعجل به (اس قرآن کے ساتھ تو صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان کو اس لیے زور سے نہ چلا کہ تو صلی اللہ علیہ وسلم اسے جلد ختم کر لے، وغیرہ)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود کس طرح تلاوت فرمایا کرتے تھے اس کی کچھ تفصیلیں حدیث میں ہیں مثلاً: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک آیت کو دوسری آیت ہی سے نہیں، ہر لفظ کو دوسرے سے جدا کر کے پڑھا کرتے تھے (ذیل تفسیر لابن کثیر، صفحہ ۴۷ بحوالہ احمد بن حنبل، ابوداود، ترمذی نسائی)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسب موقع لمبا (مد) کر کے پڑھا کرتے تھے چنانچہ بسم اللہ اااہ الرحماااانِ الرحی ی ی ی م۔ (بخاری ۶۶/ ۲۹، ابن کثیر صفحہ ۴۷)۔

جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری مشغولیتیں نہ ہوتیں اور تلاوت میں محو ہو جاتے تو ترجیع فرمایا کرتے تھے یعنی آواز میں تردد یا جھٹکے ہوں۔ چنانچہ فتح مکہ کے وقت آپ چلتی اونٹنی پر تلاوت فرما رہے تھے اور اونٹنی کی رفتار کے باعث مثلاً لمبے الف میں آ آ آ آ کر کے جھٹکے لگ رہے تھے (بخاری ۶۶/ ۳، ابن کثیر صفحہ ۴۷)۔

رسول اکرم نے بعض ہدایتیں بھی دی تھیں: قرآن کو گا کر یعنی ترنم کے ساتھ پڑھو۔ جو ترنم سے نہ پڑھے تو وہ ہم میں سے نہیں۔ اس کی ابوداود نے روایت کی ہے اور تغنی یعنی گانے کے جو معنے پرانے علماء نے سمجھے ہیں وہ یہ ہیں آواز کو خوبصورت بنائیں

Marfat.com

اور اس میں غمگینی پیدا کریں (ابن کثیر صفحہ ۳۵ و ۳۸، بحوالہ ابوداود)۔

قرآن میں اپنی آوازوں سے زینت پیدا کرو، (ابن کثیر صفحہ ۳۵ بحوالہ نسائی و ابن ماجہ)۔

خدا کسی (آواز کو اس قدر مسرت سے) نہیں سنتا جس قدر اس وقت جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم (کلام اللہ کو) گا کر پڑھتا ہے۔ (ابن کثیر صفحہ ۳۳ بحوالہ مسلم و نسائی)۔

خدا ہر مومن کی تلاوت کو درجہ بدرجہ خوشی سے سنتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا مومن ہوتا ہے۔

جو شخص قرآن کو اچھی آواز سے پڑھتا ہے، تو اللہ اس کو اس سے زیادہ کان لگا کر سنتا ہے جتنا کسی لونڈی کا مالک اس لونڈی کے گانے کو (ابن کثیر صفحہ ۳۳ و ۳۴ بحوالہ ابن ماجہ)۔

اسے ریگ (یا غبار) کی طرح نہ اڑاؤ (یعنی دھواں) دھار تیزی سے نہ پڑھو) اور نہ کسی بیت کے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑے کرو، (تفسیر ان کثیر ۴/۴۳۴ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود) بحوالہ بخاری ۶۶/ ۲۸)۔

ہر چیز کے لیے ایک زیور (یعنی زینت کا ذریعہ) ہوتا ہے اور قرآن کا زیور اچھی آواز ہے (ذیل التفسیر لا بن کثیر صفحہ ۵۴ بحوالہ بزاز)۔

قرآن پڑھتے وقت آوازوں کو اچھی بنایا کرو،، (ایضا صفحہ ۵۵ بحوالہ طبرانی)۔

ایک دن مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد گھر واپسی میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیری ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمرے میں آچکے تھے۔ بی بی آئیں تو پوچھا: کہاں تھی؟ جواب دیا: تیرا ایک صحابی مسجد میں قرآن کی ایسی عمدہ اور اچھی آواز سے تلاوت کر رہا تھا کہ میں نے آج تک ویسا نہ سنا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر مسجد میں جھانکا اور میں بھی اٹھی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: یہ سالم مولی ابی حذیفہ ہے۔ الحمد للہ کہ اس نے میری امت میں اس جیسا شخص پیدا کیا ہے۔ (ابن ماجہ حدیث ۱۳۳۸ ذیل ابن کثیر صفحہ ۳۵)۔

ایک دن حضور نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا کیا تمھیں معلوم ہوا کہ میں

Marfat.com

نے کل رات الگ سے تمہیں قرآن کی تلاوت کرتے سنا؟ اے ابو موسیٰ واقعی تمہیں (خدا کی طرف سے) حضرت داود کے لوگوں کے بانسریوں کی طرح ایک بانسری ملی ہے، ابو موسی نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر مجھے اس کا ذرا بھی پتا چلتا تو میں اس میں کچھ اور ہی زینت پیدا کرتا، (ذیل ابن کثیر صفحہ ۳۵، ۴۲، ۴۸ بحوالہ مسلم و بخاری ۶۶/۳۱ و ترمذی)۔

یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ قرآن نظم میں نہیں ہے لیکن اس میں وہ ساری خوبیاں ہیں جو نظم میں پائی جاتی ہیں جسے نغمہ، ترنم، جمالی وجلالی ضرورتوں کے لیے آواز کا اتار چڑھاؤ اور اس کے لیے موزوں حروف والے الفاظ کا انتخاب اصل میں قرآن نہ نثر میں ہے نہ نظم بلکہ ایک مستقل اور یگانہ اسلوب میں ہے جس میں نثر اور نظم دونوں کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ماہر ترین فن داں مسلمانوں نے اس کی تلاوت کے اصول منضبط کیے ہیں اور اس فن کو ریاضیاتی صحت والا علم بنا دیا ہے اور اس میں کوئی بیرونی اصول موسیقی کا اثر بالکل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا: قرآن کو عربی لحنوں اور آوازوں سے پڑھو، فاسق (گویوں) اور اہل کتاب (تورات انجیل والوں) کے لحنوں سے بچو۔ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن کو گانے، رہبانیت اور نوحے کی لے سے گائیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے زیادہ نیچے نہیں اترے گا (یعنی قرآنی احکام کو نہیں اپنائیں گے) ان کے دل بھی فتنے میں مبتلا ہوں گے اور ان لوگوں کے دل بھی جن کو ایسے (گویوں) کی حالت اچھی لگے گی۔ (ذیل التفسیر لابن کثیر صفحہ ۳۶، بحوالہ ابو عبید)۔

اولین قاریوں میں حضرت ابو موسیٰ اشعری ہیں جو یمنی تھے۔ (سالم مولی، ابی حذیفہ اصل میں ایرانی تھے لیکن پرورش کس عرب قبیلے میں ہوئی معلوم نہیں ممکن ہے یمن ہی میں ہوئی ہو اس سے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اصول تجوید یمن سے آئے ہیں۔ اس طرح کی لے اور نغمے سے قرآن ہی نہیں کسی بھی عربی عبارت کو پڑھنا حال حال (پٹرول نکلنے سے قبل تک) نجد میں باقی تھا۔ چونکہ یہ صحرائی علاقہ باقی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ اس لیے وہاں پرانی عربی چیزیں بغیر تغیر و تبدیلی کے برقرار اور محفوظ رہی ہوں گی۔

Marfat.com

اور زبانوں میں نظم پڑھنے کے لیے تال سُر کی خاص علامتیں برتی جاتی ہیں۔ اعراب لگی ہوئی عربی عبارت اتنی مکمل ہوتی ہے کہ موسیقی کی مزید علامتوں کی قاریوں کو ضرورت نہیں ہوتی پھر بھی سکتہ، اِشمام، وقف وغیرہ جن ضرورتوں کے لیے اعراب پر مستزاد چند علامتیں ہیں جو ہر قرآن میں مستعمل ہوتی ہیں۔ کسی مستند استاد کے پاس قرآن ایک بار پڑھ لیں تو پھر اس پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔

تلاوت کی مدت:

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اسے جتنی دفعہ پڑھو برکت ہی برکت ہے قرآن بھی (۱۲۱/۲، ۳۵......۲۹ وغیرہ) بہ کثرت آیتوں میں رات دن ہر کسی وقت قرآن کی تلاوت کی تاکید کرتا ہے، حدیث میں بھی اس کی فضیلتوں اور برکتوں کا ذکر ہے۔ (دیکھو ذیل التفسیر لابن کثیر، صفحہ ۳۴ تا ۴۳) عربی زبان سیکھ کر اور معنے سمجھ کر پڑھیں تو زیادہ مفید ہے لیکن بالکل نہ پڑھنے سے بہرحال یہی ہے کہ معنے سمجھے بغیر بھی ہر وقت تلاوت کرتے رہیں۔

قرآن مجید ایک بڑی کتاب ہے اور حضرت موسیٰ کی تورات اور مروجہ انجیلوں کی مجموعی ضخامت سے بھی وہ ضخیم تر ہے۔ لوگ مختلف قسم کے اور مختلف طبیعتوں کے ہوتے ہیں، انتہا پسند بھی اور اعتدال پسند بھی، بعض لوگ ایک ایک رات میں تین تین بار سارا قرآن پڑھ ڈالتے ہیں ظاہر ہے اس میں معنے پر ذرا بھی توجہ نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے صحابہ نے پوچھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کم سے کم مہینے میں ایک بار اور زیادہ سے زیادہ ہفتے میں ایک بار سارا قرآن دہرایا کرو۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ اس سے زیادہ تیزی سے نہ پڑھو (ابن کثیر، ایضاً، صفحہ ۴۹، بحوالہ بخاری مسلم وابوداود)۔

اسی لیے قرآن کی دو طرح تقسیم کی جاتی ہے۔ تیس جزء یا سیپاروں کا منشا یہ ہے کہ روز ایک سیپارہ پڑھ کر مہینے بھر میں اسے ختم کریں۔ قرآن کو سات منزلوں میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر روز ایک منزل کی تلاوت کریں۔ ظاہر ہے روز ایک منزل، ہر ہفتہ سارا قرآن دہرانا زیادہ بہتر ہے۔ پہلی منزل سورۃ فاتحہ سے، دوسری سورۃ مائدہ سے، تیسری

Marfat.com

سورۃ یونس سے، چوتھی سورۃ اسراء سے پانچویں سورۃ نمل سے چھٹی سورۃ فاطر سے، اور ساتویں سورۃ قاف سے شروع ہوتی ہے۔

تقسیمی اصطلاحوں کے روحانی معنے:

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، نیک لوگوں کی تلاوت کے لیے قرآن کو سات حصوں یا منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر منزل میں چند سورے اور ہر سورے میں چند آیتیں ہیں ان اصطلاحوں میں بڑے عمیق روحانی معنے بھی ہیں:

عربی مصدر آوی یا اوِی کے معنے ہیں بستر پر جانا۔ آیت کے معنے بستر کے ہوئے۔

سور کے معنے ہیں دیوار سورہ کے معنے ہوں گے حجرہ، منزل کے معنے ہیں طویل سفر میں رات گزارنے کے لیے اُترنے کا مقام، تا کہ آرام لے کر صبح کو آگے روانہ ہو سکیں۔

ان معنوں والی اصطلاحوں کا انتخاب کیوں ہوا ہے؟

بات یہ ہے کہ قرآن کے مطابق خدا ہر جگہ ہر وقت موجود ہے وہ ہم کو نظر نہیں آتا تو اس کے معنے یہ نہیں کہ اس کا وجود نہ ہو، بلکہ یہ کہ ہم اندھے ہیں نابینا ہونے کے باوجود ہر آدمی کے دل میں تڑپ ہے کہ اپنے مولا کے حضور میں پہنچے۔ آدمی اندھا ہو اور ساتھ ہی تنہا بھی، تو دور ہونے والے رہبر کے لیے ایک ہی چارہ ہے کہ اپنے کلام اور بلند آواز کے ذریعے سے ہدایت دے کہ کدھر جائے، کدھر مڑے تا کہ نہ بھٹکے اور نہ ٹھوکریں کھائے ہم اللہ کی طرف جانے کے خواہش مند ہیں اس لیے اپنی مہربانی سے اللہ اپنے کلام سے ہمیں ہدایت دیتا اور راستہ بتاتا ہے۔

مگر یہ سفر طویل بلکہ لامتناہی ہے۔ آدمی کو لمبے سفر میں ظاہر ہے کہ منزل کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہاں ٹھیریں منزل میں کمرے اور کمرے میں بستر کی ضرورت ہوگی اور یہی چیزیں منزل، سورہ اور آیت میں فراہم کی گئی ہیں۔ ہفتے میں صرف سات دن ہوتے ہیں اور وہی بار بار تکرار پاتے ہیں۔ وقت جو لامتناہی چیز ہے اس کو سات دن کے ہفتوں میں سہولت کے لیے تقسیم کیا جاتا ہے اور اصل میں سات کے معنے ہیں غیر محدود اور لامتناہی۔ اس طرح اللہ کا طالب اللہ کی طرف اللہ کے کلام کی مدد سے سفر کرتا ہے اور اس

کے سوا کوئی اور صورت ممکن بھی نہیں۔

تراجم کی تاریخ:

خود عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں اسلام غیر عرب لوگوں میں بھی پھیلنے لگا تھا۔ شروع میں مکے پھر مدینے میں رہنے والے حبشی، رومی، ایرانی وغیرہ پھر یمن اور عمان وغیرہ کی آبادیوں میں ایسے لوگ کثرت سے تھے جنہیں عربی نہ آتی تھی مثلاً حضرت سلمان فارسی کے متعلق امام سرخسی نے (مبسوط ۱۶/ ۸۹ میں) لکھا ہے کہ جب وہ پہلی بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آئے تو انہیں عربی نہیں آتی تھی۔ (شاید یہودیوں کا غلام ہونے کے باعث کچھ عبرانی سیکھ لی تھی) اس لیے ایک یہودی کو بطور ترجمان ساتھ لائے تھے۔ اس لیے ان کی دلچسپی قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے متعلق بے محل نہ تھی۔ امام سرخسی ہی نے (مبسوط، ۱/ ۳۷) میں لکھا ہے: روایت ہے کہ نومسلم فارسی لوگوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ انہیں سورۃ فاتحہ کا فارسی ترجمہ کر دیں اور وہ اسی کو اپنی نماز میں میں پڑھتے رہے تا آں کہ وہ عربی عبارت پڑھنے کے قابل نہ ہو گئے، تاج الشریعہ نے اپنی کتاب النھایہ حاشیۃ الھدایۃ (طبع دہلی ۱۹۱۵ء صفحہ ۸۶، حاشیہ ا باب الصلاۃ) میں اس روایت میں ایک مزید اضافہ کیا ہے اور انہوں نے تصریح کی ہے کہ حضرت سلمان نے یہ ترجمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ان نومسلم ایرانیوں کو بھیجا تھا اور اس ترجمے کا ابتدائی حصہ نقل بھی کیا ہے: بنام یزدانِ بخشایندہ مہربان۔

اس کے بعد چونکہ عربی زبان ہر جگہ کے نومسلموں میں بہت پھیل گئی تھی اس لیے عرصے تک مسلمانوں کے لیے ترجموں کی ضرورت نہ رہی (غیر مسلموں کا ترجمے سے دلچسپی لینا پہلی صدی ہجری ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کا نیچے ذکر آئے گا)۔

جاحظ (فوت ۲۵۵ھ) نے (البیان والتبیین، ۱/ ۱۳۹ میں) لکھا ہے کہ موسی بن سیار الاسواری ایک مشہور واعظ تھے جو اپنے طلبہ کے سامنے قرآن کی تفسیر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کیا کرتے تھے۔ (غالباً انہوں نے اسے لکھا نہیں اور اب اس کا کوئی پتا نہیں چلتا۔)

Marfat.com

بزرگ بن شہریار نے (عجائب الھند، صفحہ ۲ تا ۳ میں) لکھا ہے ۲۷۰ھ کے لگ بھگ زمانے میں سندھی یا ملتانی زبان میں ایک نومسلم راجہ کے لیے سارے قرآن مجید کی تشریح کی گئی تھی۔ اس کا بھی اب پتا نہیں چلتا۔

قدیم ترین کامل ترجمہ جواب ملتا ہے وہ فارسی میں ہے۔ سامانی خانوادے کے علم دوست حکمران منصور بن نوح نے علماء کی ایک کمیٹی نامزد کی جس نے ۳۴۵ھ میں مشہور عربی تفسیر طبری کا (جو تمیں جلدوں میں ہے خلاصہ فارسی میں لکھا یہ کتاب حال میں ایران میں چھپ گئی ہے۔ اس میں اولاً عربی آیت، پھر فارسی ترجمہ اور آخر میں فارسی ہی میں تفسیر ہے۔ مقدمے میں اس ترجمے کی ضرورت بتائی گئی ہے اور ان علماء کے نام بھی ہیں جو اس کام میں شریک رہے۔ ان ناموں میں بعض ایران والے ہیں تو بعض کا وطن وہ علاقہ ہے جہاں ترکی بولی جاتی تھی، جیسے الاسبیجابی وغیرہ۔

دو ترکی ترجمے بھی ملتے ہیں جن پر نہ تاریخ ہے اور نہ مترجم کا نام لیکن پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان وغیرہ ماہر لسانیات اسے چوتھی صدی ہجری کی زبان قرار دیتے ہیں اور ترجمہ مشرقی ترکی میں ہے اور دوسرا مغربی ترکی میں۔ ان کے مخطوطے استانبول، لینن گراڈ اور ڈریسڈن (جرمنی) میں ہیں۔ زکی ولیدی مرحوم نے اپنے متعدد مقالوں میں یہ گمان ظاہر کیا ہے کہ سامانی حکمران نے جو کمیٹی نامزد کی تھی اس کے ترکی ارکان ہی نے یہ ترکی ترجمے بھی کیے ہوں گے۔ بدقسمتی سے ان ترکی ترجموں میں کوئی مقدمہ نہیں ہے (جیسا کہ فارسی ترجمے میں ہے) جو اس گتھی کو حل کر سکے۔

ایک اور گمنام فارسی ترجمہ ملتا ہے وہ بھی اسی (چوتھی صدی ہجری) کے لگ بھگ زمانے کا قرار دیا جاتا ہے یہ انگلستان میں جامعہ کیمبرج کے کتب خانے میں ہے اور آنجہانی مستشرق براون نے رسالہ Jras لندن ۱۸۹۴ء صفحہ ۴۱۷ تا ۵۲۴ میں بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے۔

مترجموں کا نام پانچویں صدی سے ملنے لگتا ہے ایسا ایک ترجمہ سورابادی کا ہے جو پانچویں صدی ہجری کے وسط کا ہے (تفصیل کے لیے دیکھو اسٹوری کی انگریزی کتاب فارسی ادبیات، باب قرآن، جلد اول نمبر ۳)۔

دو مزید پرانے فارسی ترجمے اِسفرائی (فوت ۴۷۱ھ) اور زاھدی (تالیف ۵۱۹ھ) کے بھی اب تک مخطوطوں کی صورت میں محفوظ ہیں (ایضاً اسٹوری ۴)۔

خواجہ عبداللہ انصاری نے ۵۲۰ھ میں ایک نیا فارسی ترجمہ تفسیر کے ساتھ مرتب کیا جواب چھپ گیا ہے۔ مولف نے لکھا ہے کہ ان کے سامنے گزشتہ مولفوں کی ایک سو سات تفسیریں رہی ہیں جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔

غیر مسلموں کے کیے ہوئے قدیم ترجمے:

مانچسٹر (انگلستان) میں جان رایلانڈز نامی ایک مشہور کتب خانہ ہے جس کی قلمی کتابوں میں کچھ سریانی زبان میں بھی ہیں۔ ان کی اساس پر پروفیسر منگانا نے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب انگریزی میں شائع کی، ایک قدیم سریانی ترجمہ قرآن:

Mingana, An Ancient Syriac Translation of the Kuran, Manchester 1925 اس میں وہ لکھتا ہے کہ مذہبی مباحثوں اور اسلام کی تردید پر ایک گمنام سریانی کتاب کے چند ورق ملے ہیں جن میں قرآن کی عبارت اصل عربی میں لیکن سریانی خط میں دے کر سریانی ترجمہ بھی دیا گیا ہے پھر اس پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ جو ورق منگانا نے فوٹو لے کر کتاب میں شامل کیے ہیں، ان میں سورۃ فاتحہ بھی ہے مولف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب گمنام ہے لیکن ممکن ہے وہی ہو جس کا ذکر ۱۱۷۱ء میں فوت شدہ پادری دیونی سیوس بار صلیبی **Dionosius Bar Salibi** نے کیا ہے کہ اموی خلیفہ عبد الملک کے زمانے میں جب حجاج بن یوسف عراق کا والی (گورنر) تھا تو سریانی زبان میں قرآن کا ایک ترجمہ کیا گیا تھا۔ عہدہ (کذا) برگردن راوی یہ بیان کرتے چلیں کہ خلیفہ عبد الملک نے بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۸۵ھ میں وفات پائی تھی۔ اگرچہ حجاج بن یوسف مزید دس سال زندہ رہا، اور خلیفہ ولید کی خدمت کرتا رہا۔ اگر منگانا کا بیان صحیح ہے تو یہ پہلی صدی ہجری کے ثلثِ ثالث کا غیر مسلم ترجمہ ہے۔

فرانسیسی مستشرق ویں ساں موں تے ای **Vincent Monteil** نے اسلام پر **L,Islam** نامی ایک کتاب ۱۹۶۳ء میں پاریس میں شائع کی ہے۔ اس کے صفحہ ۸ پر لکھا

Marfat.com

ہے: جیسے تاس Nicetas نامی فلسفی نے قرآن کے ایک حصہ کا ترجمہ اور باقی کا خلاصہ یونانی میں دے کر اولین عقلی تنقید لکھی، مگر اس میں نہ حوالہ ہے کہ ہم مزید تحقیق کر سکیں اور نہ اس فلسفی کا زمانہ بتایا گیا ہے اور غالباً اب اس کا وجود بھی نہیں ہے بہر حال یونانی میں یہ پہلا ترجمہ تھا۔ استانبول پر سلطان محمد فاتح نے ۸۵۶ھ ۱۴۵۲ء میں قبضہ کیا۔ اس ساڑھے آٹھ سو سالہ ہمسائیگی کے باوجود یونانیوں کو قرآن سے کوئی علمی دلچسپی حتی کہ تردیدی اغراض کے لیے بھی نہ ہوئی۔

اس کے برخلاف اولین لاطینی ترجمہ ۵۳۶ھ/ ۱۱۴۱ء ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء میں طلیطلہ میں ایک انگریز کیٹنس والے رابرٹ Robertus Ketenensis نے کیا پھر لاطینی میں بہ کثرت دیگر ترجمے ہوئے جن میں سے ۴۳ اب ملتے ہیں۔ ان میں سے Maracci (ماراچی) کا ترجمہ بہت مشہور ہے جو پہلی دفعہ عربی متن کے ساتھ ۱۶۹۸ء میں طبع ہوا تھا۔ اس کے حاشیے تو لغو ہیں لیکن ترجمہ بُرا نہیں۔

۸۹۷ھ/ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ پر فرنگیوں کا قبضہ ہوا اور تقریباً نو سال کی شاندار حکومت کے بعد مسلمان اندلس میں مفتوح اور محکوم اور مظلوم زندگی گزارنے لگے۔ قدرت نے اسی سال کولمبس کے ہاتھوں انہیں امریکہ جانے کا راستہ بھی بتایا اور فرنگی سیاسی عروج میں علمی عروج بھی آہستہ آہستہ شروع ہوا۔ اندلس کے مسلمان مجبور ہوئے کہ عربی کی جگہ اسپینی میں (جسے وہ الاعجمیہ یعنی عجمی زبان کہتے تھے اور جو بگڑ کر اب Aljamiado تلفظ اَلخمیادو ہوگئی ہے)۔ لکھنے بولنے لگے تو اپنے بچوں کی تعلیم کی خاطر قرآن مجید کے الخمیادو میں ترجمے کرنے لگے۔ ان کے مخطوطے یا مخطوطوں کے ٹکڑے اب بھی اسپین کے کتب خانوں میں بیسیوں محفوظ ہیں۔ یہ الخمیادو عربی خط میں ہے اور قرآنی ترجمے بین السطور میں یعنی اوپر کی سطر میں ترجمے، نیچے کی سطر میں عربی آیت۔ جلد ہی فرنگی حکمرانوں نے عربی خط کی بھی ممانعت کر دی۔ اس پر لاطینی خط میں بھی ترجمے لکھے گئے۔ ان میں سے کم از کم ایک جو مکمل ہے، اب تک طلیطلہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

دولت اور علمی ترقی اسپین کے بعد آہستہ آہستہ باقی مغربی یوروپ میں بھی آئی سترھویں صدی سے وہاں قرآن کے ترجمے بھی شروع ہوئے چنانچہ پہلا ترجمہ جرمن میں

Marfat.com

۱۶۱۶ء میں ،فرانسیسی میں ۱۶۴۷ء میں ،اور انگریزی میں ۱۶۹۴ء میں چھپا، پھر نئے ترجمے بھی ہونے لگے جن کا سلسلہ ظاہر ہے کہ ختم نہیں ہوا۔ ہمارے علم میں ان کی تازہ ترین فہرست یہ ہے:

۱۔	اطالوی	۱۲ ترجمے
۲۔	البانی	۴
۳۔	انگریزی	۸۶
۴۔	ایسپرانٹو	۴
۵۔	بلغاری	۱ جو شائع نہ ہوا
۶۔	بوسینائی	
	بخط عربی	۳
	بخط کریلی	۳
	بخط لاطینی	۷ جملہ ۱۳
۷۔	بوھیمی	۵ (چک)
۸۔	پرتگالی	۶
۹۔	پولینڈی	
	بخط عربی	۲
	بخط لاطینی	۶
۱۰۔	ترکی	
	بخط اویغور	۲
	بخط عربی	۸۸
	بخط لاطینی	۳۲ جملہ ۱۲۲
۱۱۔	جرمن	۴۶
۱۲۔	ڈنمارکی	۴

Marfat.com

۱۳۔	روسی	۱۱
۱۴۔	رومانیائی	۱
۱۵۔	سویڈنی	۶
۱۶۔	فرانسیسی	۳۶
۱۷۔	فنلینڈی	۱
۱۸۔	قشتالی (اسپینی)	۲۰
۱۹۔	لاطینی	۴۳
۲۰۔	نارویجی	۲
۲۱۔	ہالینڈی	۷
۲۲۔	ہنگروی	۶
۲۳۔	یونانی	۵

۲۴ تا ۳۹ دیگر سولہ یوروپی زبانوں میں نامکمل ترجمے ہوئے ہیں۔

مشرقی زبانوں میں سے ستر سے زائد میں ترجمے ہوئے ہیں، سب سے زیادہ اردو میں پھر ترکی اور فارسی میں مکمل یا جزئی ترجمے جو ان تقریباً سوا سو زبانوں میں ہو چکے ہیں ان کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ عالمگیر تحریک قرآن مجید (حیدرآباد) نے القرآن فی کل لسان، نامی جو کتاب شائع کی تھی اس کی طباعت سوم مورخہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں ۶۷ زبانوں کا مواد تھا کہ ہر زبان میں کس نے کب ترجمہ کیا۔ اس کا نیا اڈیشن چھپے تو تازہ معلومات بھی حاصل ہو سکے گی۔

اردو تراجم:

القرآن فی کل لسان میں ۶۷ اردو ترجموں کا ذکر ہے، چاہے فقط ترجمہ ہوں، یا ترجمہ مع تفسیر، اس کے بعد انجمن ترقی اردو کراچی نے اپنی قاموس الکتب میں کچھ مزید معلومات مہیا کیے۔ حیدرآباد کے سابق پروفیسر زراعت ہاشم امیر علی صاحب نے بھی کچھ مواد جمع کیا ہے۔ رسالہ فیض الاسلام راولپنڈی کے قرآن نمبر میں جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا

Marfat.com

، محمد عالم مختار حق صاحب نے اردو تراجم و تفاسیر کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس میں (صفحہ ۴۷ پر) وہ بیان کرتے ہیں:

جہاں تک اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کے وجود کا تعلق ہے، عام روایت کے مطابق سب سے پہلا ترجمہ قرآن شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ محدث دہلوی کا ہے۔ مگر در حقیقت سب سے پہلا مکمل ترجمہ قرآن مجید وہ ہے جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے اور جس کا زمانہ تصنیف ۱۱۵۰ھ متعین کیا گیا ہے۔ پھر شاہ رفیع الدین صاحب نے ۱۱۹۰ھ میں اور ان کے پندرہ سال بعد ان کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب نے مرادی ترجمہ قرآن مجید ''موضح قرآن کیا، تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں خاص طور پر اردو میں بے شمار تراجم اور تفاسیر لکھی گئیں۔ ہر عالم نے ترجمہ و تفسیر کے ذریعہ (سے) اپنی استعداد اور زمانہ وقت کے تقاضے کے مطابق کتاب اللہ کو سمجھانے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔ جس کے لیے اُمت ان کی ممنون احسان ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کے مکمل (اردو) تراجم و تفاسیر کا تعلق ہے، اس کی تعداد جو اَب تک حیطۂ تحریر میں آسکی دو سو (۲۰۰) سے کم نہیں۔ مگر جہاں تک نامکمل یا سورہ و آیت کی تفاسیر کا تعلق ہے، ان کی تعداد چار سو کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے اور ابھی معلومات میں بفضلِ الٰہی برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اللّٰھم زِد فزِد۔

پھر اسی مولف نے سیارہ ڈائجسٹ، لاہور کے قرآن نمبر ۱۹۶۹ء میں بھی قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، کے نام سے ایک مقالہ لکھا جو مذکورہ قرآن نمبر کی جلد دوم میں صفحہ ۹۰۶ تا ۹۵۰ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں کل (۲۵۷) مکمل اور (۳۶۶) جزئی اردو ترجموں کا ذکر ہے اس کے دیباچے سے بھی ایک اقتباس یہاں دیا جاتا ہے:

> ''اس سلسلے میں توفیقی لحاظ سے سب سے پہلا ترجمہ و تفسیر (ہندی اردو میں) قاضی محمد معظم سنبھلی نے ۱۱۳۱ھ میں تصنیف کیا جس کا واحد مخطوطہ نور الحسن صاحب بھوپالی کے کتب خانے کی زینت ہے۔

بابائے اردو عبدالحق صاحب مرحوم نے بھی اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا جو مذکورہ قرآن نمبر میں صفحہ ۶۴۵ تا ۶۴۹ میں درج ہوا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس قسم کی سب

سے پُرانی کتاب جو مجھے دستیاب ہوئی ہے وہ پرانی گجراتی اردو میں ہے۔افسوس کہ یہ اول وآخر سے ناقص ہے اس لیے مصنف اور سنہ تصنیف کا پتا چلانا غیر ممکن ہے البتہ زبان کے ڈھنگ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دسویں صدی (ہجری) کے اواخر یا گیارھویں صدی کے اوائل کی تالیف ہے، دکنی ترجمے کا ایک نسخہ ایسا ملا ہے جو اول وآخر سے ناقص ہے اس میں قرآن شریف کے آخری پارے کی سورتوں کا ترجمہ ٹھیٹ دکنی میں کیا گیا ہے۔زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ بہت قدیم ہے اور دسویں صدی کے اوائل کا ہے۔

غرض علمی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دکنی اردو میں ۹۰۰ھ کے لوگوں نے قرآن کی خدمت شروع کردی تھی اور اب تقریباً پانچ سوسال گزرنے پر بھی الحمدللہ اس خدمت کا ذوق باقی بلکہ روزافزوں ہے۔

آپ بیتی:

ہمارے خاندان کو بھی قرآن مجید کی خدمت کی سعادت حاصل رہی ہے قدماء میں فقیہ علی مہائمی نے ایک تفسیر اب سے پانچ سوسال سے زیادہ عرصہ قبل عربی میں ''تبصیر الرحمان'' کے نام سے لکھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ تقریباً سو سال قبل مصر کے سرکاری مطبع بولاق میں چھپی ہے(مھائم شہر بمبی کا اب ایک محلہ بن گیا ہے)۔

خاص اردو میں ہمارے دادا محمد صبغۃ اللہ مرحوم (بدرالدولہ قاضی الملک مستعد جنگ) نے فیض الکریم (کے تاریخی نام سے :۱۱۹۱ھ) ایک ضخیم ترجمہ مع تفسیر لکھنا شروع فرمایا تھا۔تکمیل سے قبل ان کی وفات ہوگئی۔اسے ان کے بیٹے محمد سعید خاں مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن نے مکمل کرنے کی کوشش کی مگر کام ختم ہونے سے قبل وہ بھی وفات پاگئے۔بدرالدولہ مرحوم کی تالیف مطبع فیض الکریم حیدرآباد ۱۳۱۳ھ میں دوجلدوں میں اور مفتی محمد سعید کا تکملہ ایک جلد میں شائع ہوچکے ہیں بعدازاں مفتی محمد سعید کے بھائی مفتی محمود نے یہ کام ہاتھ میں لیا۔ان کی وفات ہوگئی توان کے بھتیجے حاجی ناصرالدین محمد بن قاضی محمد عبیداللہ نے اپنی وفات سے قبل آخراس کو مکمل کردیا۔لیکن مفتی محمود اور ناصرالدین محمد صاحب کے مرتبہ اجزائے فیض الکریم تاحال شائع نہیں ہوسکے ہیں۔

میں نے نہ صرف عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن کی شائع کردہ اردو تفسیر کی نظر ثانی کی تھی بلکہ اسی ادارے کے ہاں ''القرآن فی کل لسان'' کے نام سے ایک کتابیات شائع کی کہ دنیا کی کس زبان میں قرآن مجید کے ترجمے کس کس نے اور کب کب کیے ہیں اور بطور نمونہ ہر زبان میں سورۃ فاتحہ کا ترجمہ بھی شامل کیا ہے اس کا پہلا اڈیشن ۱۳۶۴ھ میں چھپا جس میں (۲۳) زبانوں کا مواد تھا۔ دوسرا ۱۳۶۵ھ میں (۴۳) زبانوں کے مواد کے ساتھ اور تیسرا ۱۳۶۶ھ میں (۶۷) زبانوں کے مواد کے ساتھ۔ اب مولف کے پاس تقریباً سوا سو زبانوں کا مواد جمع ہو گیا ہے جو بہ لحاظ حروف تہجی پاریس کے ماہنامہ فرانس اسلام، میں بہ تدریج شائع ہو رہا ہے۔ مولف کا ایک انگریزی مقالہ افریقی زبانوں میں تراجم قرآن ۱۹۶۸ء میں ڈربان کے مسلم ڈائجسٹ رمضان نمبر میں نکلا ایک کتاب ترکی میں قرآن کریم تاریخی وتور کچھ تفسیر لر ببلیو گرافیاسی ، کے نام سے ۱۹۶۵ء میں استانبول میں چھپی جس میں ترکی تراجم کی تفسیر اور سورۃ فاتحہ کے ترکی نمونے ہیں۔ انگریزی میں ایک سلیس تفسیر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک ڈربان کے رسالہ الحادی الامین میں نکلتی رہی جس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے تقریباً اواخر تک کام پہنچا ہے۔ فرانسیسی کامل ترجمہ مع حواشی ۱۹۵۹ء میں پاریس میں چھپا جس کا آٹھواں اڈیشن ۱۹۷۳ء میں نکلا ہے اور اب تک اس کے تقریباً ایک لاکھ نسخے پھیل چکے ہیں۔

خاندان میں الحمدللہ حافظوں کی بھی کمی نہیں۔ ان میں حافظ محمد مظہر صاحب نے تاریخ دکن کی بڑی خدمت کی ہے حافظ محمد عبدالعظیم صاحب نے کتب خانہ سعیدیہ جیسا عظیم علمی ادارہ حیدرآباد میں بنا چھوڑا ہے جس میں استاد مفتی محمد سعید خاں مرحوم کا ذاتی کتب خانہ موجود ہے۔

جہاں تک تفسیر حبیبی کا تعلق ہے، وہ ان درسوں پر مبنی ہے جو مولف کی طرف سے حیدرآباد میں محلہ کمل منڈی کی مسجد حبیب علی شاہ میں فجر کی نماز کے بعد ہر روز دیے جاتے رہے ہیں۔ اس میں بزرگوں اور مستند اہل سلف ہی کی خوشہ چینی کی گئی ہے اور خدا سے دعا ہے کہ اس خدمت علم ودین کو قبول فرمائے۔ آمین یارب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین فقط۔

Marfat.com

قرآن مجید کے ترجمے

عربی زبان:

سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ لیکن کم لوگ اس زبان کی بعض خصوصیتوں پر غور کرتے ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی، اگلے ہوں کہ پچھلے تا قیامِ قیامت، مادری زبان ہے کیونکہ امہات المومنین یہی زبان بولتی تھیں۔ کیا کسی کو یہ آیت ۳۳/۶ یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم وازواجه امھاتھم (مومنوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات سے اولیٰ (مرجح) ہوتا ہے اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں)؟

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ابدی اور غیر تبدل پذیر زبان ہے۔ دنیا کی زبانیں مرورِ زمانہ سے بدلتی رہتی ہیں حتی کہ پانچ ایک سو سال ہی میں وہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں مثلاً پندرہویں صدی عیسوی کے انگریز ادیب چاسر کی زبان آج انگلستان میں سوائے گنتی کے متخصصین کے کسی کی سمجھ میں نہیں آتی، موجودہ زبانیں ہوں کہ دنیا کی قدیم زبانیں، سب کا یہی حال ہے: اردو، انگریزی، ترکی، روسی، جرمنی، فرانسیسی، یونانی وغیرہ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں صرف عربی اس کلیے سے خارج ہے کہ چودہ سو سال پہلے کی قرآن وحدیث کی زبان وہی ہے جو آج بھی ریڈیو پر بولی جاتی، اخباروں کتابوں میں برتی جاتی اور بازار سے باہر علمی حلقوں میں نیز بین العرب ضروریات کے لکھی اور بولی جاتی ہے۔ کم از کم گزشتہ پندرہ سو سال سے نہ اس کے الفاظ کے معنی بدلے، نہ صرف ونحو بدلی، نہ املا وتلفظ! کسی ابدی تعلیم اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انسانیت کے لیے آئے

Marfat.com

ہوئے احکام خداوندی کی حامل کون سی دوسری زبان ہو سکتی ہے بجز اسکے جو مرور زمانہ سے نہ بدلے بلکہ ہمیشہ قابل فہم رہے؟

ان اور دیگر خصوصیات کے ساتھ اور اس امر کے باوجود کہ قرآن مجید "بلسان عربی مبین "نازل ہوا ہے۔ عجمی نہیں، خود عربوں کو بھی تفسیر کی ضرورت خود عہد صحابہؓ سے رہی ہے کیونکہ قرآن کی زبان کی بلاغت اور اس کے معانی کی گہرائی کل یوم ھو فی شان کا مصداق ہے اور اس کا ہر مطالعہ کرنے والا کچھ نہ کچھ نئی چیز پالیتا ہے بغیر اس کے کہ کسی دوسرے کو کچھ خسارہ ہو۔ چونکہ خدا نے اسے کافة للناس بشیراً ونذیراً بنا کر بھیجا ہے، عجمی بھی خدا کے فضل سے اس قرآن کے باعث ہدایت پاتے رہے ہیں اور موروثی مسلمانوں کی بداعمالی کے باوجود نومسلموں کی تعداد روزافزوں ہی ہے اور تو اور پولینڈ اور یوگوسلاویا جیسے کمیونسٹ (اور خدا اور دین کے دشمن) ملکوں میں بھی نومسلم نظر آرہے ہیں۔ ان غیر عرب لوگوں کے لیے اسلام لانے سے پہلے بھی اور اسلام لانے کے بعد بھی قرآن کے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ خارج از بحث اور خارج از امکان ہے کہ وہ پہلے عربی زبان سیکھیں پھر راست قرآن کو پڑھیں اور سمجھیں۔

اولین ترجمے:

تاریخ بتاتی ہے کہ علمائے اسلام، آغازِ اسلام سے لے کر گزشتہ صدی تک، قرآن مجید کا اجنبی زبانوں میں بغیر کسی ادنی تذبذب کے ترجمہ کرتے رہے۔ قدماء میں مثلاً مشہور و مستند فقیہ امام شمس الائمہ سرخسی اپنی تیس جلدوں والی کتاب المبسوط (ص ج ۱ ۳۷) میں لکھتے ہیں۔ "امام ابو حنیفہ نے اس روایت [1] سے استدلال کیا ہے کہ (چند نومسلم) ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ انہیں سورۃ فاتحہ فارسی میں لکھ دیں یہ لوگ اس (ترجمے) کو اس وقت تک نماز میں پڑھتے رہے جب تک کہ ان کی زبانیں عربی الفاظ سے مانوس نہ ہوگئیں۔" (یعنی قرآنی سورے حفظ نہ ہوگئے) ایک دوسرے مشہور فقیہ تاج الشریعہ ابن صدر الشریعہ نے اپنی فقہی کتاب "النھایۃ حاشیۃ

---

[1] مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا کہ قرآن کا ترجمہ نماز میں پڑھا جاسکتا ہے۔ (فاران)

Marfat.com

الھدایۃ'' (طبع دہلی 1915ء ج ا ص ۸۶ حاشیہ نمبر ا) میں اس کی مزید تفصیل دی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے سورۃ فاتحہ فارسی میں لکھ دیا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بنام یزدان بخشایندہ وغیرہ ترجمہ کیا اور لکھنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا پھر اسے ان (ایرانیوں) کو بھیج دیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند نہ فرمایا۔''

واقعہ ہے کہ فارسی مشرقی ترکی اور مغربی ترکی میں قرآن مجید کے ترجمے سامانی دور کے یعنی چوتھی صدی ہجری کے علماء نے کیے ان میں سے فارسی ترجمہ جس کے ساتھ تفسیر طبری کا خلاصہ ترجمہ بھی انہیں علماء کا کیا ہوا موجود ہے حال میں ایران میں چھپ گیا ہے یہ بادشاہ منصور بن نوح کے حکم سے ۳۴۵ھ میں انجام پایا تھا اس سے کچھ ہی بعد کے فارسی ترجمے سورا بادی، زاہدی، اسفرائنی اور خواجہ عبداللہ انصاری نے کیے جن میں سے بعض چھپ بھی گئے ہیں۔ سامانی دور کے ترکی ترجمے البتہ ابھی ناشر کے انتظار میں ہیں۔ جاحظ (فوت ۲۵۵ھ) نے اپنی کتاب البیان والتبیین (ج ا ص ۱۳۹) میں لکھا ہے کہ موسیٰ بن سیار الاسواری قرآن کی فارسی میں تفسیر کیا کرتے تھے۔ بزرگ بن شہریار نے اپنی کتاب عجائب الہند والصین (طبع یورپ ص ۲ تا ص ۳) میں لکھا کہ ۲۷۰ھ کے لگ بھگ کامل قرآن مجید کا شمالی ہند کی ایک زبان میں (شاید سندھی یا ملتانی ہو) ترجمہ ہو گیا تھا۔

ترجمہ قرآن کے ناجائز ہونے کا ادعا:

جواز اور عمل کی ان پرانی اور مستند روایتوں کے باوجود گزشتہ صدی کے اواخر میں خاص کر ترکی سلطنت اور ان کے مصر شام وغیرہ علمی نقطۂ نظر سے ترقی یافتہ عربی صوبوں میں یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ قرآن مجید کی اعجاز بیانی کیوجہ سے اس کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ ناجائز ہے اور یہ خیال ابھی حال تک بھی باقی رہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب محمد مار ماڈیوک پکتھال نے نظام حیدر آباد عثمان علی خاں کی سرپرستی میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کیا اور پھر مزید احتیاط کے لیے مصر جا کر شیخ الازہر کی نگرانی میں اس کی نظر ثانی بھی کی اور شائع کیا تو اس کا داخلہ مصر میں ممنوع قرار دیا گیا۔ اس نقطۂ خیال کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے دو باتیں نظر آئیں۔

Marfat.com

1. ترجمے کی حرمت کے خیالات کا ذکر کرنا اوران کو اچھالنا اسلامی کتب ورسائل سے زیادہ عیسائی مشنریوں کے رسالوں میں نظر آیا۔
2. یہ اس زمانے کا ذکر ہے کہ جب قریب قریب سارے اسلامی ملکوں پر فرنگی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

کیاان حقائق کو اتفاقات سے سمجھا جائے۔ یاان میں باہم ربط وصلہ سمجھا جائے؟
اسے بھی نہ بھلایا جائے کہ سیاہ افریقہ ہی نہیں، الجزائر وغیرہ عربی علاقوں میں بھی فرنگی حاکموں نے عربی زبان کی تعلیم بند کردی۔ غیر سرکاری اسلامی مدرسے بھی مسدود کردیے۔ ہندوستان میں انگریز مشنریوں نے تو اس کی بھی کوشش کی کہ قرآن کے سارے نسخے خرید کران کو تلف کردیں۔

میں ان سب سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ ان عیسائیوں نے چاہا کہ مسلمان عربی سے نابلد ہو جائیں اور مقامی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ بھی نہ ہو۔ اس طرح عیسائیت کے لیے میدان خالی ہو جائے۔ مگر تدبیر کند بندہ۔ تقدیر زند خندہ۔

ہوا یہ کہ ان مہربانوں نے یہ فرض کیا کہ قرآن مجید کا ترجمہ عرب ہی کریں گے۔ اسی لیے یہ خیال عربی ممالک میں پھیلایا یا غالباً کسی مشنری نے ایک بھولے بھالے مسلمان عالم سے کہا: قرآن مجید کی زبان واقعی ایک معجزہ ہے۔ اس کا ترجمہ ناممکن ہے! یہ بھولے بھالے فاضل خوشی سے اچھل پڑے کہ الفضل ماشھدت بہ الاعداء (جادووہ جو سر پر چڑھ کے بولے) دشمن کی شہادت سے بڑھ کر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ حلقہ احباب میں فخر سے اس کا ذکر کیا اور جلدی ہی معجزبیاں قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے کو ایک قدم آگے بڑھا کر ناجائز ہے کردیا۔ اور جیسا کہ عرض ہوا یہ خیالات عربی ممالک میں پھیلے اور پھیلائے گئے۔

مگر اس منطق میں ایک نقص تھا۔ یہ مفروضہ ہی غلط تھا کہ ترجمے عرب کریں گے کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ ترجمے ان عجمیوں نے کیے جنہوں نے عربی سیکھی اور علوم اسلامی میں رسوخ حاصل کیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے، یہ خیالات ہندوستان، ایران، افغانستان، ملایا وغیرہ کے علماء میں بالکل نظر نہ آئے۔ مصری، شامی اہل قلم کے خیالات کا انہیں علم ہوا بھی تو بھی بہ ظاہر انہوں نے مسکراہٹ سے زیادہ قابل اعتناء نہ سمجھا ہوگا کیونکہ ہندوستان

Marfat.com

میں اردو فارسی ترجمے اسی زمانے روز افزوں ہونے لگے۔

ابھی بیان ہوا کہ اسلام کے عہد زریں میں محترم اور ثقہ علماء نے قرآن مجید کے ترجموں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ مثلاً خواجہ عبداللہ انصاری اپنے فارسی ترجمے اور تفسیر کے متعلق ۵۲۰ھ میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیشرووں کی (۱۰۷) عربی فارسی تفسیروں سے استفادہ کیا ہے۔

دنیا میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار عربی زبان کے پھیلنے کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ اور غیر عرب نومسلموں کو اسلام کی اساسی کتاب یعنی قرآن مجید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ترجمے کی ضرورت پر حکومتوں نے بھی توجہ کی اور علماء ربانییّن رحمۃ اللہ علیہم نے بھی جہاں تک سامانی دور کے مذکورہ فارسی اور ترکی ترجموں کا تعلق ہے، میں کہہ سکتا ہوں وہ بہت نفیس ہیں، زبان بھی اچھی ہے اور مفہوم بھی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ ہمالہ تلے کے براعظم میں مسلمان علماء نے قدیم سے ملک کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اسلام یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پہنچا۔ اکیلی اردو زبان ہی میں آج تک قرآن کے تین سو سے زائد ترجمے ہوئے ہیں اور نئے ترجموں کا شوق تا حال نہ ہند میں ختم ہوا ہے نہ پاکستان میں ترکی اور فارسی میں بھی اب سو سو سے زیادہ تراجم ہو چکے ہیں۔

یوروپی زبانوں میں سے اندلسی اور پولینڈی میں قرآنی تراجم قدیم ہیں۔ اس زمانے میں یہ زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی تھیں۔ یوشناق یعنی پوسینہ (یوگوسلاویہ) میں عربی خط کا ترجمہ قرآن غالباً متاخر زمانے میں ہوا ہے۔ شاید گزشتہ صدی سے پہلے کا ایسا ترجمہ موجود بھی نہیں ہے۔

عربی خط:

حقیقت یہ ہے کہ عربی خط پر اعراب لگا ہو تو دنیا کا کوئی دوسرا خط صحتِ تلفظ میں اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ **Hamid** تلفظ حمد، حامد، حمید، حامید چار طرح سے ہو سکتا ہے۔ اعراب لگے ہوئے عربی خط میں ایسا ابہام ناممکن ہے۔ جسے اللہ نے سمجھ دی وہ اسے سمجھ گیا، جسے نہ دی، نہ سمجھا، یہ بیان کرتے چلیں تو کوئی حرج نہیں کہ قدیم اندلس میں عام مسلمان عربی بولتے لکھتے تھے لیکن بعض اندلسی (غیر مسلم ہی نہیں

نومسلم بھی) ایسے بھی تھے جو اندلسی (اسپینی اور پرتگالی زبانیں) بولتے بھی تھے اور لکھتے بھی اور لکھنے میں عربی خط برتتے تھے اور اس عربی خط والی اندلسی زبان کو وہ الاعجمیۃ کہتے تھے (جواب بگڑ کر الخمیادو **Aljamiado** ہوگیا ہے۔ اسپینی میں ز کا تلفظ جیم نہیں، ـ خ ہوتا ہے) سینکڑوں الخمیادو مخطوطے آج بھی مغربی کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان میں قرآن مجید کے ترجے بھی موجود ہیں۔

غیر مسلم مترجم:

قرآن کریم کے اجنبی زبانوں میں ترجے مسلمانوں نے بھی کیے ہیں، غیر مسلموں نے بھی۔ ظاہر ہے کہ عربی داں مسلمان عالم قرآن کا ترجمہ زیادہ تر اپنے بچوں اور ملک کے عربی نہ جاننے والے مسلمانوں کے لیے کرتا ہے۔ غیر مسلم مترجموں کی غرض مختلف افراد کے لحاظ سے مختلف ہوتی رہی ہے۔ کوئی اپنے دین کی حفاظت اور اسلام کی پیشروی کو روکنے کے لیے ترجمہ کرتا ہے تاکہ عربی نہ جاننے والے غیر مسلم عالم اس کا مطالعہ کر کے بحث وجدل کے لیے اس میں قابلِ اعتراض مقامات کا پتا چلا سکیں لیکن کچھ ایسے بھی رہے ہیں جو محض علم اور اپنی زبان کو متمول کرنے کے لیے بھی اس کام میں مشغول ہوئے ہیں۔ اسی طرح عربی دانی بھی افراد کے لحاظ سے کم وبیش ہوا کرتی ہے۔

جہاں تک غیر مسلموں کے کیے ہوئے ترجموں کا تعلق ہے، غالبًا قدیم ترین سُریانی زبان میں ہے یہ تو معلوم نہیں کہ سُریانی عیسائیوں نے کامل قرآن کا ترجمہ کیا یا نہیں، لیکن جو اقتباسات جدل اور مباحثوں کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ حجاج بن یوسف کے زمانے یعنی پہلی صدی ہجری کے نصفِ دوم سے متعلق ہیں۔ یہ لوگ ذمی یعنی اسلامی رعایا سے تھے اور سُوریا یعنی شام میں رہتے تھے ان کتابوں کے وجود سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان روادار اور فراخ دل تھے کہ اپنی غیر مسلم رعایا کو اس کی بھی اجازت دیتے تھے کہ اسلام کے خلاف اپنے اختلاف کا برملا بھی اظہار کریں۔

بیزنطینی نصرانیوں کی یونانی کتابوں میں بھی جو مذہبی جدلی اور مباحثوں پر ہیں، قرآنی اقتباسات ملتے ہیں۔ فرانسیسی مستشرق وَے سال مونتے ای **(Prof. Vincet Monteil)** جنہوں نے ابھی حال میں ۱۹۷۷ء میں اپنے اسلام کا اعلان کیا ہے اپنی ایک

Marfat.com

پرانی کتاب میں لکھا تھا کہ بیزنطینی پادری نیقی طاس (Nicitas) نے قرآن کے ایک حصے کا کامل اور باقی کا خلاصہ ترجمہ یونانی زبان میں کیا تھا؟ لیکن نہ تفصیل دی، نہ حوالے بیان کیے۔ فرانسیسی فاضل مستشرقہ مس دالویرنی (Dalverny) نے مجھ سے بیان کیا کہ نیقیطاس نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) یعنی عباسی دور کا مولف ہے اس نے اسلام کے خلاف کئی جدلی رسالے لکھے ہیں (جو پاترولوگیا گریکا Patrologia Graeca نامی کتاب میں) چھپ چکے ہیں اور ان میں قرآنی اقتباسات یونانی زبان میں ملتے ہیں۔ ان معلومات پر میں مس صاحبہ کا شکر گزار ہوں۔

یونانی کے بعد یورپی زبانوں میں قدیم ترین قرآنی ترجمہ لاطینی میں ہوا جو قرون متوسطہ میں سارے یورپ کی مشترکہ علمی زبان تھی ایسا قدیم ترین ترجمہ میرے علم کی حد تک ۱۱۴۱ء میں ہوا اور یہ اندلس کی بات ہے دیگر یوروپی زبانوں میں سے اطالوی میں ۱۵۴۳ء میں جرمن میں ۱۶۱۶ء میں ونسیزی (ہالینڈی) میں ۱۶۴۱ء میں، فرانسیسی میں ۱۶۴۷ء میں اور انگریزی میں ۱۶۴۸ء میں پہلی بار قرآن کا ترجمہ چھپا۔ نشاۃ ثانیہ، یورپ میں، سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی سے شروع ہوئی پھر باقی مغربی یورپ میں سترہویں صدی میں پھیلی۔ مشرقی یوروپ میں قدیم ترین روسی ترجمہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ سابقہ ترجموں کی اصلاح کے لیے مختلف فرنگی زبانوں میں یکے بعد دیگرے متعدد ترجمے چھپتے رہے ہیں۔

عربی زبان غیر عربی خط میں:

یہ بھی شاید قابلِ ذکر ہے کہ بعض عجمی لوگ قرآن کے عربی متن کو اپنے غیر عربی خط میں بھی نقل کرتے رہے ہیں۔ ایسی قدیم ترین مثال سُریانی مخطوطوں میں ملتی ہے جو پہلی صدی ہجری کی چیز ہیں چونکہ سریانی زبان عربی سے اتنی ہی قریب ہے جتنی مثلاً فارسی زبان اردو سے، اس لیے عربی عبارت کو سُریانی پڑھنے والے کم و بیش سمجھ لیتے تھے۔ اس کے بعد یہودیوں نے قرآن کو عبرانی خط میں لکھا۔ پھر اہلِ یورپ نے لاطینی (انگریزی) خط میں بھی منتقل کیا۔ ہمارے اپنے زمانے میں آج کل بنگالی، تُرک، چینی وغیرہ لوگوں نے بھی یہی کیا اور آجکل کوریا والے بھی اپنے زیر تالیف ترجمہ قرآن میں عربی متن بھی

Marfat.com

کو رپائی رسم الخط میں دے رہے ہیں اس کی ایک اور ضرورت چھوٹے پیمانے پر یہ بھی ہے کہ نومسلم کو پہلے ہی دن سے نماز پڑھنا لازم ہے اور نماز میں سورے، التحیات اور دیگر دعائیں صرف عربی میں ہوتی ہیں جو زبانی یاد کر کے پڑھنی ہوتی ہیں۔ عربی خط سیکھنے میں کافی وقت لگتا ہے اس لیے فوری ضرورت کے لیے یہ عربی متن گراموفون کے علاوہ فرنگی یا دیگر خطوں میں لکھنے پر حفظ میں سہولت ہوتی ہے مگر اس عارضی کو مستقل بنانے کی خواہش کی حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ ناروچ کے نومسلم انگریز اب انگریزی زبان کو روز افزوں عربی خط میں لکھ رہے ہیں۔ ایسا ایک ترجمہ قرآن بھی چھپنا شروع ہوا ہے۔ حدیث وغیرہ کے ترجمے بھی انگریزی زبان اور عربی خط میں چھپنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

حجم قرآن کی تفصیل پر کتب ورسائل:

تقریباً پچاس ایک سال قبل جرجی زیدان نے اپنے عربی ماہوار رسالہ ''الہلال'' (مصر) میں ایک مختصر فہرست شائع کی تھی کہ کس کس زبان میں کس نے قرآن کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ رسالہ اس تحریر کے وقت پیش نظر نہیں ہے کہ تاریخ دے سکوں کچھ معلومات جواد سلماسی زادہ کی فارسی کتاب ''تاریخ سیر ترجمہ قرآن دراروپا وآسیا'' (تہران یور ۱۳۴۲ فصلی) میں اور کچھ محمد سالم قاسمی کی اردو کتاب ''جائزہ تراجم قرآنی'' مطبوعہ دیوبند ۱۹۶۸ء میں ہیں۔ لیکن الفاظ پر اعراب نہ ہونے سے فرنگی ناموں کا پڑھنا آسان نہیں خاص کر جب غیر انگریزی الفاظ کو انگریزی کے طور پر پڑھ کر عربی خط میں لکھا جائے عبدالصمد صارم کی تاریخ القرآن کا یہی حال ہے۔

میری اپنی القرآن فی کل لسان **Quran in every language** کا تیسرا ایڈیشن ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں حیدرآباد دکن میں چھپا تھا۔ اس میں فرنگی اور اصحاب الشمال کی زبانوں کے معلومات لاطینی خط میں اور عربی خط میں لکھی جانے والی زبانوں اردو، فارسی، پشتو، ترکی وغیرہ) کو عربی خط میں دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تیس سال میں یہ معلومات پرانے ہو گئے ہیں، میرے پاس جو تازہ ترین معلومات ہیں وہ **France Islam** نامی پاریس کے فرانسیسی ماہنامے میں حروف تہجی پر چھپ رہے ہیں چنانچہ آغاز

Abyssin یعنی حبشی زبان سے ہوا اور اب ۱۹۷۷ء حرف G میں گاتلک زبان تک پہنچا ہوں۔ اس میں ہر زبان کے تمام معروف کامل وجزئی ترجموں کا ذکر، مولف کے نام اور مقام اشاعت اور اشاعت کی تاریخوں کی بھی تفصیل رہتی ہے اور ہر زبان میں بطور نمونہ سورۃ فاتحہ کا ترجمہ دیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ آئے دن نئے ترجمے نکلتے ہیں اور شائع شدہ معلومات اضافہ طلب ہوجاتے ہیں میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن کے دیباچے میں صرف یوروپی زبانوں کے ترجموں کی تفصیل دی گئی ہے یہ اب تک آٹھ بار چھپا ہے فرنگی ماخذ بہ کثرت ہیں۔ ہر سائیکلو پیڈیا میں کچھ ذکر آتا ہے اور خصوصی مراجع کی کتابوں میں بھی اہم تر کا ذکر کرتا ہوں۔

1. Byunet, Manuel Du Libraire, 1862, III, 1306-1310.
2. Victor Chauvin, Bibliognaphie Des Ouvrages Arabes Ou Relaties Aux Arabes, Liege - Lipzig 1907, Vol x, Le Coranet La Tardition.
3. Erert, Allgemeines Bibliographischen Lexikon, 1821, I, 945 - 947.
4. Keyzer, Bijzonderheden Nopens Almede Beoordling van de bestende Koranvertaligen Op Java, 1863.
5. Peavmuller, Hanbuch Der Islamlitteratur, a Quran.
6. Schnorrer, Bibliotheca Apabica, I, LVII - LXII.
7. Storey, Persian Literature, Vol I, Quran and Tafsir.
8. Veth, Jets over De Vertaligen Des Dorans In De Talen Van Oen Indischen Archipel, 1867.
9. D. Van Wijk, De Koranische Verhalen In Het Maleisch, Batavia 1893.
10. Zenker, Bibliotheca Orientalis. I, 167 - 174, II, 85 - 88.
11. Moslim World, USA, July and October 1927.

Marfat.com

12. MissionsBlatt, Barmen 1883, P 58 - 76.

ان پرانے ماخذوں میں سے نمبر ۳ اور نمبر ۵ زیادہ اہم ہیں آخر الذکر دو رسالے بھی کارآمد ہیں نمبر ۷ میں صرف فارسی تراجم کا ذکر ہے جس طرح ترکی کتاب قرآن تاریخی (Kuran Tarihi) میں جو میں اور ماجد پاشاء اوغلو نے مل کر شائع کیا، صرف ترکی ترجموں کا ذکر ہے۔

موجودہ معلوم ترجمے:

ان تمہیدی معلومات کے بعد بطور خلاصہ عرض ہے کہ میرے ناچیز وحقیر علم میں فی الوقت ذیل کی زبانوں میں قرآنی ترجمے موجود ہیں۔

شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۱	آذری	ایشیا	عربی وروسی	کامل	۴
۲	آسامی	ایشیا	خاص	کامل	۱
۳	اثیوبی (حبشی)	افریقہ	خاص	کامل	۲
۴	اراغونی	یورپ	لاطینی	کامل	۲
۵	اردو	ایشیا	عربی	کامل	تین سو سے زائد
۶	لینڈی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۷	ارمنی	ایشیا	خاص	کامل	۵
۸	اُڑیا	ایشیا	خاص	جزئی	۱
+	اسپینی	دیکھو تحت قشتالی			
+	اسکاٹلینڈی	دیکھو تحت گانلک ولولینڈی			
۹	اَئسلینڈی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱

Marfat.com

۱۰	اطالوی	یورپ	لاطینی	کامل	۱۲
۱۱	افریقانیہ	افریقہ	عربی	کامل	۲
۱۲	افریکانس	افریقہ	لاطینی	کامل	۴
۱۳	البانی	یورپ	عربی ولاطینی	کامل	۴
۱۴	الخمیادو	یورپ	عربی	کامل	۳۶ مخطوطے
۱۵	اَمہری	افریقہ	خاص	کامل	۱
۱۶	انڈونیسی	ایشیا	عربی ولاطینی	کامل	۶
۱۷	انگریزی	یورپ	لاطینی	کامل	۹۲
۱۸	اوکرانی (یوکرینی)	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۱۹	اسپیرانتو	یورپ	لاطینی	کامل	۴
۲۰	ایستونی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۲۱	ایوے	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۲۲	باشک	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۲۳	بربر	افریقہ	عربی	جزئی	۱
۲۴	برمی	ایشیا	خاص	کامل	۴
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۲۵	بُرنو	افریقہ	عربی	جزئی	۱
۲۶	بروہوی	ایشیا	عربی	کامل	۱
۲۷	بریتونی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۲۸	بُجناق	یورپ	لاطینی	کامل	۱۰
	بُجناق	یورپ	روسی	کامل	۴

Marfat.com

	بشناق	یورپ	عربی	جزئی	۳
۲۹	بلغاری	یورپ	روسی	کامل	۳
۳۰	بلوچی	ایشیا	عربی	کامل	۳
۳۱	بمبرا	افریقہ	عربی ولاطینی	جزئی	۲
۳۲	بنگالی	ایشیا	عربی وخاص	کامل	۲۵
۳۳	بوہیمی (چکوسلواکی)	یورپ	لاطینی	کامل	۴
۳۴	پالی	ایشیا	خاص	جزئی	۱
۳۵	پرتگالی	یورپ	لاطینی	کامل	۴
۳۶	پردوانسانی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۳۷	پشتو	ایشیا	عربی	کامل	۵
۳۸	پلات واچ	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۳۹	پنجابی	ایشیا	عربی	کامل	۵
۴۰	پولینڈی	یورپ	عربی	کامل	۳
	پولینڈی	یورپ	لاطینی	کامل	۵
۴۱	تامل	ایشیا	خاص وعربی	کامل	۵
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۴۲	ترکستانی	ایشیا	عربی	کامل	۲
۴۳	ترکی	یورپ وایشیا	اویغوری	جزئی	۲
	ترکی	یورپ وایشیا	عربی ولاطینی	کامل	سو سے زائد
۴۴	تلنگی	ایشیا	خاص	کامل	۶
۴۵	تھائی لینڈی	ایشیا	خاص	کامل	۲

Marfat.com

۴۶	جاپانی	ایشیا	خاص	کامل	۷
۴۷	جاوی	ایشیا	عربی	کامل	۵
۴۸	جرمن	یورپ	لاطینی	کامل	۴۹
۴۹	چینی	ایشیا	خاص	کامل	۱۳
۵۰	حوسا	افریقہ	عربی ولاطینی	کامل	۲
۵۱	دانمارکی	یورپ	لاطینی	کامل	۶
۵۲	دکھنی	ایشیا	عربی	کامل	۱
۵۳	دیولا	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۵۴	روسی	یورپ وایشیا	روسی/ یلی	کامل	۱۱
۵۵	رومانش	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۵۶	رومانوی	یورپ	لاطینی	کامل	۲
۵۷	زولو	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۵۸	ساراکولا	افریقہ	عربی	جزئی	۱
۵۹	سُریانی	ایشیا	خاص	جزئی	۱
۶۰	سندانی	اوقیانوسیہ	لاطینی	جزئی	۱
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۶۱	سندھی	ایشیا	عربی	کامل	۳۶
۶۲	سنسکرت	ایشیا	خاص	جزئی	۳
۶۳	سنہالی	ایشیا	خاص	کامل	۱
۶۴	سواحلی	افریقہ	عربی ولاطینی	کامل	۲
۶۵	سونرائی	افریقہ	عربی	جزئی	۱

۶۶	سویڈنی	یورپ	لاطینی	کامل	۳
۶۷	عبرانی	ایشیا	خاص	کامل	۵
۶۸	عربی	ساری دنیا	عربی دیگر	کامل	اصل
۶۹	فارسی	ایشیا	عربی	کامل	سو سے زائد
۷۰	فرانسیسی	یورپ	لاطینی	کامل	۴۶
۷۱	خریزونی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۷۲	فُلاتا	افریقہ	عربی	کامل	۲
۷۳	فلاماں	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۷۴	فنلینڈی	یورپ	لاطینی	کامل	۱
۷۵	قتلانی	یورپ	لاطینی	جزئی	۲
۷۶	قشتالی (اسپینی)	یورپ	عربی ولاطینی	کامل	۱۹
۷۷	کررجا	جنوبی امریکہ	لاطینی	جزئی	۱
۷۸	کُردی	ایشیا	عربی ولاطینی	کامل	۲
۷۹	کریئول	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۸۰	کشمیری	ایشیا	عربی	کامل	۳
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجم	تعداد تراجم
۸۱	کمبوجی	ایشیا	خاص	جزئی	۱
۸۲	کنڑی	ایشیا	خاص	کامل	۱
۸۳	کوتوکولی	افریقہ	لاطینی	جزئی	۲
۸۴	کوریائی	ایشیا	خاص	کامل	۲
۸۵	کوکنی	ایشیا	عربی	جزئی	۱

۸۶	کوہستانی	ایشیا	عربی	جزئی	۱
۸۷	کیوا	جنوبی امریکہ	لاطینی	جزئی	۱
۸۸	گالہ	افریقہ	عربی	جزئی	۱
۸۹	گائلک	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۹۰	گجراتی	ایشیا	خاص وعربی	کامل	۶
۹۱	گُرجستانی (گُرجانی)	ایشیا	لاطینی	جزئی	۱
۹۲	گروز	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۹۳	گورمکھی	ایشیا	خاص	کامل	۱
۹۴	لاپلینڈی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۹۵	لاتوی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۹۶	لاطینی	یورپ	لاطینی	کامل	۴۴
۹۷	لوگانڈی	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۹۸	لولینڈی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۹۹	مُجند ناو	ایشیا	عربی ولاطینی	کامل	۲
۱۰۰	مرہٹی	ایشیا	خاص	کامل	۱
شمار	زبان	ملک	خط	مقدار ترجمہ	تعداد تراجم
۱۰۱	مکاسری	ایشیا	خاص	جزئی	۲
۱۰۲	ملایو	ایشیا	عربی ولاطینی	کامل	۵
۱۰۳	ملایاضم	؟	؟	؟	؟
	ملایالم	ایشیا	عربی وخاص	کامل	۲
۱۰۴	ملتانی	ایشیا	عربی	کامل	۲

Marfat.com

۱۰۵	مدگاش	افریقہ	عربی ولاطینی	جزئی	۲
۱۰۶	میمنی	ایشیا	عربی	جزئی	۱
۱۰۷	نارویجی	یورپ	لاطینی	جزئی	۲
۱۰۸	ولاپوکی	یورپ	لاطینی	جزئی	۱
۱۰۹	ولندیزی (ہالینڈی)	یورپ	لاطینی	کامل	۷
۱۱۰	ولوف	افریقہ	عربی ولاطینی	جزئی	۲
۱۱۱	ہندی	ایشیا	خاص	کامل	۴
۱۱۲	ہنگروی	یورپ	لاطینی	کامل	۲
۱۱۳	یدش	یورپ	عبرانی	جزئی	۳
۱۱۴	یروبا	افریقہ	لاطینی	جزئی	۱
۱۱۵	یوروبا	افریقہ	عربی ولاطینی	کامل	۱
۱۱۶	یونانی	یورپ	خاص	کامل	۵

نوٹ: اگر نمبر ۱۱، نمبر ۱۲ افریقانیہ اور افریکانس کو ایک ہی زبان شروع کریں تو تعداد (۱۱۵) رہے گی حقیقت میں ان میں صرف رسم الخط کا فرق ہے اور بس۔

(فاران-کراچی دسمبر ۱۹۷۷ء)

Marfat.com

زبان اور اللہ کا کلام

کلام اللہ کی وحی کے لیے زبان کی ضرورت:

کوئی ہستی، کوئی چیز اپنے آپ کی خالق ہو نہیں سکتی۔ اس لیے ہر موجود کا کوئی موجد، ہر مخلوق کا کوئی خالق ہونا ضروری ہے، لیکن یہ واجب الوجود ذات حواس سے پرے اور ہر ادراک سے بالاتر ہے۔ تفصیلوں میں گئے بغیر کہنا یہ ہے کہ ایسے ماوراء ادراک واجب الوجود کا کلام ہم تک کیسے پہنچ سکتا۔ اگر زبان نہ ہوتی؟ اگر زبان نہ ہوتو بھی ہم اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کریں گے لیکن یہ عمل ہوگا جبلت کا، جانوروں کی طرح کا، عقل کا نہیں، انسان کا نہیں۔ خوش بختی ہے کہ حیوان ناطق کو اس کے خالق نے جن فضیلتوں کے ذریعے سے دیگر مخلوقات سے ممتاز کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے اس تک کلام اللہ پہنچتا ہے اور یہ کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے۔

مسلمانوں کا عقیدہ سیدھا سادہ ہے کہ ماوراء ادراک ذات باری تعالیٰ کسی آسمانی پیام رساں کے ذریعے سے اپنا کلام اور اپنا حکم کسی چیدہ و برگزیدہ انسان تک پہنچاتا ہے اور یہ انسان اسے دوسرے انسانوں کو سناتا ہے۔ عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا کلام گوشت و پوست کی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کا کلام ہیں۔ مسلمان بھی انہیں کلمۃ اللہ مانتے ہیں اور (یہ میرا موضوع نہیں، بہرحال) جہاں تک میں جانتا ہوں، مسلمان اس کا مطلب یہ لیتے ہیں۔ کہ یہ فنافی اللہ ہونے کی حالت ہے کہ خدا ان کی زبان سے بولتا، ان کے پاؤں سے چلتا، ان کے ہاتھ سے پکڑتا اور ان کے دل و دماغ سے کوئی چیز چاہتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اللہ کے محبوب بندوں کی توصیف میں

بیان ہوا ہے۔ ہندوؤں کے اوتار کی بھی یہی تعبیر سمجھ میں آتی ہے۔ جو بھی ہو مسلمانوں کے پیغمبر، عیسائیوں کے کلمۃ اللہ اور ہندوؤں کے اوتار کے ذریعے سے خدا کا کلام انسان تک پہنچنا کسی زبان ہی کے ذریعے سے ہے۔

ماوراء ادراک خدا کا کلام آواز ہی نہیں، زبان سے بھی بالاتر ہوتا ہے۔ مثال مناسب سمجھی جائے تو یوں بیان کریں کہ خدا کا کلام ایک برقی بیٹری تک پہنچتا ہے، جو بجلی کی رو (کرنٹ) کی طرح اسے منتقل کرتی ہے۔ پیغمبر کا دل ایک بلب سمجھیے جو اس برقی رو سے منور ہو جاتا ہے۔ بلب کا رنگ اس پیغمبر کی مادری زبان خیال کریں تو خدا کا کلام اسی رنگ کی روشنی میں نظر آتا ہے جو اس بلب کا رنگ ہو۔ یہ ہے زبان کی اہمیت ماوراء ادراک خدا کا کلام وحی کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچنے کے سلسلے میں۔

زبان کا انسانوں میں آغاز:

قرآن مجید کی ایک مشہور آیت ''اور اللہ نے (حضرت) آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھائے پھر (موسوم چیزوں) کو فرشتوں پر پیش کر کے فرمایا، مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم (اپنی انسان پر فضیلت کے دعوے میں) سچے ہو۔ انہوں نے کہا ہمیں اس کے سوا کسی چیز کا علم نہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، علم و حکمت تو تجھ ہی کو سزاوار ہے۔ اس پر (اللہ نے) فرمایا۔ اے آدم (علیہ السلام) ان (فرشتوں) کو ان چیزوں کے نام بتا دے اور جب (آدم علیہ السلام نے) وہ انہیں بتا دیے تو (اللہ نے فرشتوں سے) فرمایا کیا میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا مجھ ہی کو علم ہے اور جو چیز تم بتاتے اور جو چیز تم چھپاتے ہو ان کا مجھ ہی کو علم ہے؟'' (سورۃ ۲، آیت ۳۱ تا ۳۳)۔

صوفی ہوں کہ فلسفی یا کوئی اور ہر متخصص ان آیتوں کا مفہوم اپنے فن اور اپنے اختصاص کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کرے گا۔ ان میں کوئی تضاد نہیں، وہ باہم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو جانوروں بلکہ فرشتوں پر بھی فضیلت ملتی ہے تو زبان کے ذریعے سے اور زبان کا آغاز ہوتا ہے ہر چیز، ہر مفہوم کو ایک نام دے کر اسے دوسری چیز سے ممتاز کرنے کے ذریعے سے۔ گویا ابتداء یہ

Marfat.com

مفردات ہوتے تھے کہ ان کے ربط سے ایک طویل اور پیچیدہ مفہوم دوسرے ہم جنس تک ہم پہنچاتے تھے۔ پھر خداداد طاقتوں ہی سے ایک، یعنی تجربے سے سبق لینا اور دشواریوں کی اصلاح کرنا ہی اس زبان کو ترقی دیتا ہے۔

اگر یہ گمان درست ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں اس قدامت کی سب سے زیادہ حامل یا محافظ چینی زبان ہے۔ میں نے پینتیس سال ہوئے، اس کی کوئی دو مہینے تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ چینی زبان میں کوئی صرف و نحو نہیں ہوتی، بلکہ مفردات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ وہاں حروف تہجی بھی نہیں۔ جتنے مفہوم ہیں (اور جو کہتے ہیں کہ چینیوں کے مطابق آٹھ لاکھ ہیں) تو ہر ایک کو لکھنے کے لیے ایک الگ شکل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جملہ لیں۔ پہلی شکل انسان کی، دوسری شکل افق پر طلوع ہونے والے سورج کی، تیسری شکل دوڑنے کی، چوتھی شکل درختوں کے مجموعے یا جنگل کی، پانچویں شکل نظر سے غائب ہونے کی۔ جب آپ یہ پانچوں شکلیں یکجا دیکھیں تو یہ سمجھ لیں گے کہ ایک شخص صبح کے وقت بھاگتا ہوا جا کر جنگل میں چھپ گیا۔

اچھی زبانیں:

ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو، بہرحال میرا خیال ہے کہ جس طرح افراد میں صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح افراد کے مختلف مجموعوں یعنی قوموں میں بھی صلاحیتوں کی حد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان صلاحیتی اختلافوں کے باعث زبانوں میں اختلاف بھی پیدا ہوتا ہے۔ ہر مجموعہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے سے اپنی ایک بولی بناتا ہے جو دوسروں کی بولیوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔

کم یا زیادہ اچھے افراد، کم یا زیادہ اچھی قوموں کی طرح زبانیں بھی کم یا زیادہ اچھی ہوتی ہیں، لیکن اس کی جانچ کا معیار کیا ہو؟ خدا کے کلام کو ہر حیثیت سے شاندار ہونا چاہیے۔ منجملہ اور ضرورتوں کے اسے ایسی زبان میں ادا ہونا چاہیے جو صحت اور وضاحت میں دقیق نزاکتوں کو ملحوظ رکھ سکے، سننے والوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے وغیرہ۔

اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ دنیا کی سب سے اچھی زبانیں وہ ہیں جن کو خدا کے

Marfat.com

کلام کی وحی کا حامل بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت موسیٰ و حضرت داؤد کی عبرانی ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آرامی ۔ پارسیوں کو دعوٰی ہے کہ اوستا خدا کی وحی ہے ۔ ہندوؤں کو بھی اصرار ہے کہ ویدیں خدا کا کلام ہیں ۔ اگر ایسا ہی ہے تو پرانی ایرانی اور پرانی سنسکرت زبانیں بھی ''اچھی'' زبانوں کے زمرے میں شامل ہو جائیں گی ۔ اس میں اصولاً کوئی امر مانع نہیں ۔ مسلمانوں کا عقیدہ کہ قرآن نہ صرف خدا کا کلام ہے بلکہ خدا کا آخری پیغام ہے ۔ آخری پیغام کو جو بھی ترجیحی خصوصیتیں حاصل ہوں گی وہ اس آخری پیغام کی حامل بننے والی زبان کو بھی حاصل ہونی ضروری ہیں تا کہ یہ وسیلہ مناسب حال ہو ۔ قرآن میں عربی کو ''لسان عربی مبین (یعنی ایک واضح اور خوب اچھی طرح بیان کرنے والی زبان) کا نام دیا گیا ہے، جو بے وجہ نہیں ہو سکتا ۔

میں ان اچھی زبانوں کی اچھائی کی تفصیل میں جا نہیں سکتا ۔ اس کی مجھ میں صلاحیت بھی نہیں ۔ لیکن ''پدرم سلطان بود'' اچھے معنوں میں لیا جائے تو میں کہوں گا کہ جو زبانیں ان ''اچھی زبانوں'' سے پیدا ہوئی ہیں وہ شاہ نہیں تو شہزادیاں ضرور ہیں ۔ شہزادی کو والدین، ایک باپ اور ایک ماں کا ہونا ضروری ہے ۔ خوش قسمت ہے وہ شہزادی جو نجیب الطرفین ہو ۔ باپ بھی کہیں کا سلطان اور ماں کہیں کی حکمران رہی ہو ۔ اردو کی ماں سنسکرت اور باپ عربی سمجھے جا سکتے ہیں ۔

زبانی پیام رسانی:

اللہ کا پیام انسانوں تک کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے پہنچایا جا سکتا ہے ۔ اس بارے میں ایک مشہور حدیث یاد آتی ہے ۔ ''ایک دن پیغمبر اسلام علیہ السلام نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مختلف ملکوں میں تبلیغ دین چاہی تو اپنے حواریوں میں ایک ایک کو ایک ایک ملک کے لیے نامزد کیا ۔ یہ حواری ہچکچائے کہ ہمیں وہاں کی زبان نہیں آتی ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی اور ہر حواری اپنی منزل مقصود کی زبان معجزانہ طور پر سیکھ کر خود بخود بولنے لگ گیا[1] ۔ میں بھی تم میں سے چند

---

[1] یہ واقعہ انجیل میں بھی مذکور ہے ۔ دیکھو انجیل مرقس باب ۱۶، جملہ ۱۵ تا ۱۷ ۔

لوگوں کومختلف ممالک میں بھیجنے کے لیے چنوں گا۔تم حواریوں کی طرح نہ ہچکچاؤ اور نہ انکار کرو۔اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو نامزد فرمایا کہ کوئی آپ کا نامہ قیصر روم کے ہاں لے جائے،کوئی کسرائے ایران کے ہاں،کوئی نجاشی حبش کے ہاں وغیرہ (طبقات ابن سعد وغیرہ میں اس کا ذکر ہے)۔

وحی تو ایک زبان میں،پیغمبر کی مادری زبان میں ہوتی ہے لیکن اس کی تبلیغ کے لیے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ دنیا کے سارے لوگ ایک زبان نہیں بولتے۔قرآن مجید کے سورۃ روم میں (سورۃ ۳۰،آیت ۲۲) ٹھیک یاد دلایا گیا ہے کہ ”......اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا فرق بے شک اہل علم کے لیے اس میں (بھی خدا کے کمالات کی) نشانیاں پائی جاتی ہیں۔“ایک اور آیت ہے (سورۃ ابراہیم یعنی سورۃ ۱۴،آیت ۴)”اور ہم نے کوئی رسول بھیجا تو اس کو قوم کی زبان ہی میں تاکہ وہ ان لوگوں کو (خدا کے احکام) اچھی طرح بیان کر سکے......“ غرض تنزیل ایک زبان میں ہوتی ہے اور اس کی تبلیغ مختلف زبانوں میں کرنی پڑتی ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جیسا مخاطب ہوتا،رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اسی کی زبان میں بات کرتے۔آپ نے نبوت سے پہلے کافی سفر فرمایا تھا۔دو بار بیزنطینی (یونانی) فلسطین تشریف لے گئے تھے۔مسند احمد بن حنبل کے مطابق ایک بار قبیلہ عبدالقیس کے علاقے (یعنی ایرانی مسقط وعمان) کو،اور نجاشی کے نام مکتوب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس سے آپ کی شخصی واقفیت تھی،گویا ایک بار حبش بھی تشریف لے گئے ہوں گے۔کئی بار حباشہ (یمن) بھی جانے کا ذکر ملتا ہے۔حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے چند حبشی اور چند فارسی الفاظ بھی سنے جانے بیان ہوئے ہیں،لیکن زیر بحث حدیث کو زیادہ تر اس معنے میں لینا چاہیے کہ عرب کی مختلف مقامی بولیوں سے آپ کو اچھی واقفیت تھی۔زبانوں کا سیکھنا پیغمبر پر واجب نہیں ہوتا لیکن تبلیغ کا انتظام کرنا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

کتبِ سیرت میں صراحت ہے کہ دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مختلف زبانیں

Marfat.com

جاننے والے صحابہ موجود تھے۔ فارسی، حبشی، قبرصی، رومی، عبرانی وغیرہ مختلف زبانوں کا اس سلسلے میں ذکر ہے۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کے جزئی ترجمے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ شمس الائمہ سرخسی جو حنفی فقہ کے سب سے بڑے ماہروں میں سے ہیں اور جن کو امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں شاگردوں (امام ابویوسف اور امام محمد شیبانی) کے بعد ہی تیسرے نمبر پر جگہ دی جاتی ہے، اپنی کتاب المبسوط میں نماز کے باب میں ایک واقعہ لکھتے ہیں: ''امام ابوحنیفہ کا خیال تھا (جس سے بعد میں انہوں نے رجوع کرلیا) کہ نماز میں قرآن مجید کا فارسی ترجمہ پڑھنا جائز ہے اور انہوں نے استدلال اس واقعہ سے کیا تھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے جب چند نومسلم ایرانیوں نے خواہش کی تو حضرت سلمان نے سورۃ فاتحہ کا ترجمہ فارسی میں کیا اور (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے) وہ ان لوگوں کو بھیجا۔ اسے وہ لوگ اس وقت تک نماز میں پڑھتے رہے تا آنکہ ان کی زبانیں عربی متن سے (حفظ کے ذریعے سے) مانوس نہ ہوگئیں۔'' گویا نومسلم کو ابتدائی چند گھنٹے یا چند دن، عربی دعائیں اور عبارتیں حفظ ہونے تک، اپنی زبان میں عبادت کرنے کی اجازت ہے۔

اس واقعے ہی کا نتیجہ ہوگا کہ ہر ملک میں ہر زمانے میں قرآن مجید کے ترجمے ہوتے رہے تاکہ خدا کے کلام اور خدا کے احکام سے وہ انسان بھی استفادہ کرسکیں جن کی زبان کو وحی کی حامل ومحافظ بننے کا شرف حاصل نہ ہوسکا اور آج مسلمانوں کی نااہلی اور تقصیر کے باوجود ایک سو سے زیادہ زبانوں میں قرآن مجید کا کامل یا جزئی ترجمہ موجود ہے اور بڑی زبانوں میں ایک سے زائد لوگوں نے ترجمے کیے ہیں اور کیے جارہے ہیں۔ اردو، ترکی اور فارسی میں سے ہر ایک میں ایک ایک سو سے زائد ترجموں کا مجھے پتا چلا ہے۔ اس کی تفصیل کا موقع الگ ہوگا۔

قرآن مجید کا سب سے پہلا حکم:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے۔ لکھنا پڑھنا سیکھنے کا بچپن میں کوئی موقع نہ ملا تھا۔ اس کے باوجود کتنا ولولہ انگیز واقعہ ہے کہ سب سے پہلی وحی، سب سے پہلا خدائی پیغام جو آپ اپنی امت کو پہنچاتے ہیں وہ لکھنے پڑھنے کے حکم اور اس بیان پر مشتمل ہوتا ہے

Marfat.com

کہ سارا انسانی تمدن قلم کا رہین منت ہے کہ قلم ہی سے انسان وہ سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ قلم (سورۃ ۹۶، آیت ۱ تا ۵) میں جو اولین وحی سے عبارت ہے، یوں ارشاد ہوا ہے:

''پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے (ہر چیز) پیدا کی، جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔

پڑھ اور یہ تیرا نہایت محترم و فیاض پروردگار ہی ہے جس نے قلم کے ذریعے سے سکھایا۔

جس نے انسان کو وہ چیز سکھائی جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

اس حکم کی تعمیل جس جوش و خروش سے کی گئی اس کی ایک اثر انداز مثال یہ ہے کہ جنگ بدر میں جب دشمن کے بہت سے آدمی قید ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے پڑھے لکھے لوگوں کا فدیہ رہائی یہ مقرر کیا کہ ہر ایسا شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ دوسرے قیدیوں کو چار چار ہزار درہم (روپے) کی خطیر رقم ادا کرنی پڑی۔ اس کے نتائج پر مورخ ششدر رہ جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید عربی زبان کی پہلی کتاب ہے۔ (اس سے پہلے اس زبان میں کوئی کتاب لکھی نہ گئی تھی کہ وہ ان پڑھ لوگوں کی زبان تھی) اور اس پر بہ مشکل دو سال گزرے تھے کہ عربی زبان نہ صرف دنیا کی متمول ترین علمی زبانوں میں سے ایک ہوگئی بلکہ اس کے کچھ ہی بعد بین الممالک علمی زبان بن گئی اور مشرق ہی نہیں سارے یورپ سے طلبہ اسلامی درسگاہوں میں آتے اور (اندلس واٹلی) میں ہر علم و فن خاص کر طب، ہیئت، ریاضی وغیرہ کی تعلیم پاتے۔

قرآن کے اثر مسلمانوں کی علمی ترقی پر:

قرآن ہی نے ان پڑھ امی لوگوں کو حکم دیا کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر وہ تمام علوم حاصل کریں جو وہ نہیں جانتے ہیں۔ ان ابتدائی مسلمانوں کے پاس سوائے قرآن مجید کے اور تھا بھی کیا جس کی وہ تعلیم حاصل کرتے؟ وہ قرآن ہی کا غور و خوض سے مطالعہ کرتے رہے۔ اس نے ناگزیر سب سے پہلے علم تفسیر پیدا کیا۔ لیکن قرآن کی تفسیر کرنے کے لیے سیکڑوں

علموں کی ضرورت تھی اور خواہی نخواہی ان علوم کو بھی پیدا کرنا پڑا۔ قرآنی الفاظ نے علم لغت، قرآنی زبان نے صرف نحو اور بلاغت، قرآن کے تاریخی اشاروں نے علم تاریخ، قرآن کے جغرافی اشاروں نے مبادیات جغرافیہ، قرآن کے احکام نے فقہ (قانون) عقائد اور علم کلام وعلی ھذا القیاس، پھر ذیلی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ قرآن نے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا تو اوقات نماز و روزہ نے علم ہیئت کو ترقی دینے پر مجبور کیا تاکہ صحیح وقت پر نماز پڑھیں اور سحری اور افطار کریں۔ قرآن نے نماز کے سلسلے میں حکم دیا کہ دنیا میں جہاں بھی رہو کعبے کی طرف منہ کرو۔ اس نے جغرافیہ اور علم ہیئت کو مزید ترقی دی۔ حج فرض کیا تو مکہ جانے کے راستے معلوم کرنے پڑے، جس سے جغرافیہ کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ زکوٰۃ (ٹیکس) فرض کیا تو ادا طلب رقم کے لیے حساب سیکھنا پڑا۔ تقسیم ترکہ کے لیے بھی حساب کی ضرورت ہوئی۔ قرآن کو فنی نقطۂ نظر سے صحیح پڑھنے کے لیے تجوید کی ضرورت پڑی جو علم موسیقی کی ایک شاخ ہے۔ قرآن کو صحیح پڑھنے کے لیے عربی خطاطی اور خط میں نقاط و اعراب کو ترقی دینی پڑی۔ ادب اور احترام کا تقاضا تھا کہ قرآن خوبصورت ہو۔ اس نے جلد سازی، تذھیب اور دیگر آرائشی فنون پیدا کیے اور اس میں قطعی کوئی مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں میں دنیوی اور دینی سارے علوم کا آغاز قرآن کے باعث ہوا اور پھر یہ علوم رفتہ رفتہ مستقل علم بنتے چلے گئے۔ تاریخ قدیم کا بھی مطالعہ ہوا، تقابلی ادیان کا بھی، لغوی شواہد کے لیے پرانی عربی شاعری کا بھی اور دیگر ان گنت علوم وفنون کا بھی۔

جب مسلمانوں میں ہر جہتی علمی ترقی ہوئی تو جو بھی غیر عرب مسلمان ہوتا یا اسلامی درسگاہوں میں شریک ہوتا وہ ان علوم کو سیکھنے کے بعد اپنی مادری زبان میں ان کو مکرر لکھ بھی سکتا اور پھیلا بھی سکتا اور اس طرح مسلمان بالواسطہ ساری انسانیت کی علمی سطح بلند کرنے کا باعث بنے۔ وہ کیا باعث بنے، اصل میں قرآن اس کا باعث تھا۔

بعض لطیفے بھی پیش آتے رہے۔ چند سال قبل ایک انگریز ڈاکٹر نے صرف اس بنا پر اسلام قبول کیا کہ قرآن میں نطفے کی بہ تدریج ترقی اور جنین کی پیدائش کا جو صحیح اور تفصیلی ذکر ہے وہ خود پرانے یونان کے شہرہ آفاق طبیبوں کو معلوم نہ تھا۔ ایسی نامعلوم چیز اب سے چودہ سو برس پہلے کے ایک امی عرب نے بیان کی تو وہ خدا کا پیغمبر ہی ہو سکتا ہے۔ خود

Marfat.com

پارلیس کے ایک ڈاکٹر نے جو ابھی زندہ ہے، یہ بیان شائع کیا ہے کہ اس کا آبائی مذہب (کیتھلک) گندہ رہنے کو خشوع وخضوع اور تواضع قرار دیتا ہے، اس کے برخلاف اسلام صفائی اور طہارت کو "آدھا دین" قرار دیتا ہے جو طبی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح اور معقول ہے۔

یہی نہیں، قرآن اسلام اور مسلمانوں کی بقا کا باعث بنا۔ ملکوں کی فتح آسان چیز ہے۔ فتح کو برقرار رکھنا ہزار گنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر چہ اسلامی فتوح بھی، جو قرآنی تعلیم کے زیر اثر مسلمانوں نے کیں، تاریخ میں لاثانی ہیں (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عثمان کے زمانے میں مسلمان فوجیں ایک طرف اندلس (یورپ) میں پہنچ گئیں تو دوسری طرف ماوراء النہر میں چین کے اندر گھس گئیں۔ جنوب میں مغربی ہند اور مغربی پاکستان کے ساحلی رقبے بھی ان کے زیر اقتدار آ گئے اور تین براعظموں، ایشیا، یورپ اور افریقا پر وہ حکومت کرنے لگے)۔ لیکن اس سے بڑھ کر حیرت اس پر ہوتی ہے کہ مفتوحوں نے ان مسلمان فاتحوں کا ظالموں نہیں بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا اور ان کی حکومت اتنی دیر پا رہی کہ اندلس کو چھوڑ کر یہ سارے علاقے عملاً آج بھی مسلمان ہی ہیں۔ پائدار اور پر امن حکومت کرنے کے لیے صرف فوج کافی نہیں ہوتی، قانون اور نظم و نسق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنا سارا قانون (دستوری، دیوانی، فوجداری، قانون بین الممالک، تجارت، غیر مسلم رعیت سے برتاؤ کے قواعد وغیرہ وغیرہ) سارے ہی قواعد و قوانین قرآن سے نکالے اور ایسے نکالے کہ وہ قانون روما سے بھی زیادہ منصفانہ اور متمدن تسلیم کیے گئے اور اب مغرب میں یہ مسلم ہو گیا ہے کہ اسلامی قانون کی پیدائش و ترقی پر رومی قانون کا کوئی اثر نہیں پڑا (جیسا کہ اٹلی کے پروفیسر نالینو اور فرانس کے پروفیسر بوسکے نے صراحت سے لکھا ہے)۔ ان کی جنگوں کے متعلق کیمبرج کے پروفیسر واکر نے تاریخ قانون بین الممالک میں لکھا ہے کہ "ابتدائی مسلمانوں سے پہلے آج تک تاریخ نے یہ کبھی نہ دیکھا تھا کہ وحشی فاتح اپنے متمدن مفتوحوں سے زیادہ متمدن ہوں۔" قرآن نے مذہبی رواداری کو ترقی دی، اسلام نے علوم و فنون میں، تجارت و صنعت میں، غرض ہر شعبۂ حیات میں انسانیت کی جو خدمت کی اس پر

Marfat.com

مسلمانوں کو کسی کے سامنے شرمانے کی ضرورت نہیں۔

اس قرآن سے اردو ترجمے کے ذریعے سے ہم بھی عربی نہ جاننے کے باوجود استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس ضرورت کو ہمارے اجداد نے صدیوں قبل محسوس کیا۔ جب سے اردو پیدا ہوئی، اردو میں اور دینی و دنیوی علوم کے ساتھ قرآن کے ترجمے اور تفسیریں بھی لکھی جانے لگیں اور ان کا سلسلہ ختم ہونے کے اب بھی کوئی آثار نہیں۔ مجھے چند ایک زبانوں سے واقفیت ہے اس لیے تقابلی مطالعے کے بعد میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو تراجم قرآن دنیا کے بہترین تراجم کی صف اول میں ہیں۔ ترجمے کی صحت میں شاہ عبدالقادر، زبان کی سلاست میں ابوالاعلیٰ مودودی قابل ذکر ہیں۔ اسرار و غوامض کی بلند پایہ اور دل کو لگتی ہوئی تشریحوں کی بھی اردو تفسیروں میں کمی نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اعلیٰ ترین یورپی مستشرقوں کے تراجم قرآن بھی اردو کے اچھے تراجم کے سامنے گرد ہیں۔ ایک اور بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ ایک ہی کام اگر مختلف زمانے میں بار بار ہوتا رہے تو تقابل کرنا اور ارتقاء کا مطالعہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اردو تراجم اس کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اب ایک سو سے زائد اردو ترجمے موجود ہیں اور کئی سو سال میں پیدا ہوئے ہیں۔ اردو کے ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مواد میرے علم میں نہیں ہے۔

شمشیر یا قلم؟

تاریخ بتاتی ہے۔ تلوار ہمیشہ کام نہیں دیتی اور نہ حق کو ہمیشہ فتح ہونی ضروری ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی جب اجمیر آئے تو نہ ان کے پاس شمشیر تھی اور نہ شمشیر زن نہ محافظ و معاون۔ ہمالیہ تلے کے براعظم میں آج جو پندرہ بیس کروڑ مسلمان ہیں وہ محمود غزنوی یا تیمور کے باعث نہیں، خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے ہم مسلک درویشوں کا صدقہ ہیں۔ ان صوفیۂ کرام نے ان پتھر کے دلوں کو موہ لیا جنہیں نہ تلوار ڈرا سکتی تھی اور نہ پیسہ رام کر سکتا تھا۔ یہ تو ہمارے ملک کی بات ہے۔ ایک ہمسایوں کا بھی قصہ یاد دلاؤں۔ ہلاکو خاں نے باجبروت خلافتِ عباسیہ کے دارالخلافت بغداد کو اس طرح زیر کیا کہ گویا وہ محض ہوا بھرا ہوا لفافہ ہو۔ سارے ترکستان و ایران کو تباہ و برباد کرتے ہوئے اس کی جبار و قہار

Marfat.com

فوجیں کچھ اس طرح زمین کو روند رہی تھیں کہ اس کا کوئی انسانی علاج مسلمانوں کے پاس نہ تھا۔ اس وقت چند درویش اٹھے اور ہلاکو کے پوتے کا زمانہ تھا کہ یہ سارے تاتاری مسلمان ہونے پر فخر کرنے لگے اور پھر صدیوں تک مسلمانوں کے فوجی محافظ بنے رہے۔

ان صوفیہ کو جو کامیابی ہوئی اس کا پہلا وسیلہ یہ تھا کہ وہ اپنے محافظوں سے ان کی اپنی زبان میں اسلام کی دلپذیر باتیں کرتے تھے۔ بزرگ بن شہریار کے مشہور سفرنامہ ''عجائب الہند'' میں لکھا ہے کہ ۲۷۰ھ کے لگ بھگ (ملتان، کشمیر یا سندھ کے) کسی راجہ کی فرمائش پر قرآن مجید کا کامل ترجمہ وتفسیر لکھی گئی اور راجہ مسلمان ہوگیا۔ یہ زبانیں اردو کی جدآت تھیں۔ آج یورپ اور امریکہ کو ہم نہ اپنے علم سے مرعوب کر سکتے ہیں اور نہ ہماری کمانوں کے تکلوں سے، اس کے باوجود ہر روز کثرت سے فرنگی مسلمان ہو رہے ہیں۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک، شمالی وجنوبی امریکہ کوئی اس سے مستثنٰی نہیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے پتا چلایا کہ ان کا ننانوے فیصد حصہ تصوف اور صوفیہ کی تعلیم کے باعث اسلام قبول کر رہا ہے، عقل پرستوں کی لایعنی تفسیروں اور تحریروں کے باعث نہیں۔ مسلمان صوفیہ کی چیزیں اب آہستہ آہستہ فرنگی زبانوں میں ترجمہ یا تالیف ہو رہی ہیں۔ میں خود عقلیت کا دلدادہ تھا۔ یہاں آ کر اپنی ہار ماننی پڑی۔ اسلام دل کے راستے سے ہی پھیل سکتا ہے۔ دل رابدل رہیست۔ دل کی زبان میں جو تاثیر ہے، جو سحر ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں۔ یہ کام اردو علاقے کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے بھی اتنا ہی واجب اور اتنا ہی مفید ہے جتنا تجربے نے دوسری زبانوں کے متعلق ثابت کیا ہے۔ ہم جس کی نقالی کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے آپ سے اب بیزار ہوگیا ہے۔

(اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ خصوصی شمارہ
بتقریب جشنِ صدسالہ اورینٹل کالج لاہور
مارچ - جون ۱۹۷۳ء)

Marfat.com

سیرت

Marfat.com

Marfat.com

ہجرت

جلاوطنی، توطن، تبادلہ آبادی اور مماثل مفہوم رکھنے والی اصطلاحیں آج کل نہ صرف بین الاقوام اور بین الممالک سیاست میں روز افزوں اہمیت اختیار کرتی جارہی ہیں بلکہ ایک جماعت کے سیاسی خیالات کے باعث یہ مسئلہ اب خود ہمارے گھروں میں منڈلانے لگا ہے، حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل نے اجتماعی طور سے مصر سے ترک وطن اور بعد میں فلسطین والوں کو نکال کر ان کے ملک میں خود توطن اختیار کیا تھا۔ پھر بخت نصر کے زمانے میں انہیں فلسطین کے اس نئے وطن سے دیس نکالا ملا تو اس کی صدائے بازگشت مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں آتی رہی۔ اس تاریخ کا جدید ترین اعادہ یہودیوں کے فلسطین میں قومی وطن بنانے اور نازی جرمنی سے ان کے نکالے جانے کی صورت میں ہویدا ہوا ہے۔

یہودیوں سے قطع نظر حالیہ سالوں میں ترکوں نے پچاس لاکھ سے زائد انسانوں کا ہمسایہ ممالک سے تبادلہ کیا ہے، جنوبی تیرول سے کئی لاکھ جرمن درہ برنیز کے اس پار چلے جانے پر حال میں اٹلی کی طرف سے مجبور کیے گئے جن کی جائیداد غیر منقولہ کی قیمت کا اندازہ پانچ تا بارہ ارب لیرا کیا گیا اور ساڑھے سات ارب پر تو سب متفق ہیں۔ ۲۰ رنومبر ۱۹۳۹ء کے لندن ٹائمز کے مطابق پولینڈ میں لبلن کے اطراف جرمنی، آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے کوئی ڈیڑھ کروڑ یہودی یکجا کیے جارہے ہیں۔ اسی طرح بالٹک ممالک سے کئی لاکھ جرمن مشرقی جرمنی میں منتقل کیے گئے ہیں۔ ۱۴ رفروری ۱۹۴۰ء کے لندن ٹائمز کے مطابق بارہ دن میں چھ لاکھ روسیوں کو جرمن مفتوحہ علاقے سے روس منتقل کرنے کے

Marfat.com

انتظامات کیے گئے ہیں، فرانسیسی مستشرق خاص کر حالیہ زمانوں میں قدیم عرب نوآبادکاری کا مطالعہ کرنے لگے ہیں کیونکہ عربوں سے بڑھ کر کوئی نوآبادکار قوم نہیں گزری ہے جس نے جذب اور قلب ماہیت کے شام، مصر، عراق، شمالی افریقہ وغیرہ میں عجیب اور حیرت انگیز واقعات ثبت تاریخ کیے ہیں۔ عربوں کی کارروائی جو زیادہ تر حضرت عمر کے زمانے میں عمل میں آئی، دراصل عہد نبوی ہی کی تعلیم اور عمل پر مبنی ہے۔ تاریخ کے اس اہم گوشے پر بہت کم کبھی کسی نے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم میرے مطالعے میں کسی زبان میں ایسی کوئی چیز پڑھنے میں نہیں آئی۔ (۱) پانچ چھ سال سے میں اس موضوع پر مواد جمع کرتا رہا ہوں۔ اب اس جمع شدہ مواد سے ایک سرسری خاکہ کھینچ کر اہل علم کی خدمت میں بغرض تنقید واصلاح اور بغرض توسیع وامداد پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

"لغتی تحقیق"

لفظ "ہجرت" سامی زبانوں میں ایک دلچسپ تاریخ رکھتا ہے۔ یہ لفظ "ہجر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی حبشی اور بعض دیگر سامی زبانوں بلکہ خود قدیم عربی میں "شہر" کے ہیں۔ چنانچہ مشہور بیس جلدوں والی بڑی عربی لغت "لسان العرب" میں ایک قدیم لغت نویس الازہری کے حوالے سے لکھا ہے:

قال الازهری: واصل "الهجرة" عندالعرب خروج البدوی من بادیته الی المدن یقال "هاجر الرجل" اذا فعل ذلک۔ الازہری کا بیان ہے کہ عربوں کے نزدیک اصل میں "ہجرت" کے معنے یہ ہیں کہ کوئی خانہ بدوش صحرانشین (بدوی) اپنے صحرا کو چھوڑ کر کسی شہر میں جا بسے۔

(لسان العرب تحت کلمه "هجر" نیز دیکھو تحت کلمہ "عرب")

ظاہر ہے کہ جب "ہجر" کے معنے شہر کے ہیں تو ہجرت کے معنے ابتداء صرف یہی ہو سکتے تھے کہ کسی بستی، کسی شہر میں جا کر آباد ہو جانا اور خانہ بدوشی کی جگہ حضری زندگی اختیار کر لینا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ عرب میں خود "ہجر" نام کا ایک بڑا شہر گزرا ہے۔ یہ سلطنت بحرین کا پایہ تخت تھا اور حالیہ صوبہ "الحسا" میں (جو عرب میں خلیج

فارس پر واقع ہے) آباد ہوا تھا کسی شہر کو "شہر" کا نام دینا سچ پوچھیے تو نیا نہیں بلکہ قدیم سے ہر قوم اپنے پایۂ تخت کو شہر ہی کہتی رہی ہے۔ "مدینے" کے معنے بھی شہر کے ہیں۔ مکے کا قدیم نام "بکہ" بھی یہ معنے رکھتا ہے، چنانچہ بت بعل کا شہر بعلبک کہلاتا ہے۔ قرآن میں مکے کو "هذا البلد الامين" کا بھی نام دیا گیا ہے اور "بلد" کے معنے بھی شہر کے ہیں حضرت ابراہیم کے زمانے میں ان کے ملک کے صدر مقام کا نام "اُور" تھا۔ اور "اُور" کے معنی بھی شہر کے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہندوستان بھی یہ لفظ پہنچ کر زیادہ تر دکن میں بنگلور، میسور، ناگور، تنّور وغیرہ ناموں میں بطور لاحقہ موجود ہے۔ رومی بھی اپنے شہر "روم" کو عام طور سے اُربس کہتے تھے۔ اس کے معنے بھی شہر کے ہیں (انگریزی لفظ اربن (Urban) بمعنی شہری، اسی سے ماخوذ ہے)۔ بلدہ حیدرآباد اور مصر القاہرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

غرض ہجرت کے لغوی معنے شہر میں جا بسنے کے تھے، (۲) اور آسان ہے کہ کوئی صحرا کی تکلیف دہ زندگی کو چھوڑ کر کسی نخلستان کی سرسبز بستی میں جا بسے تو لفظ "ہجرت" کو بعد میں یہ معنے دیے جائیں کہ کسی نعم البدل کو حاصل کرنا، کسی خراب جگہ کو چھوڑ کر اچھی جگہ رہنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسول کریم کے ترک وطن کر کے مدینہ جا رہنے کو اسی آخر الذکر مفہوم میں بلحاظ ادب "ہجرت" کے نام سے موسوم کیا گیا، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سیرت نبوی اور خلافت راشدہ کے سلسلے میں ہجرت کے معنے صرف ہجرت مدینہ ہی کے نہ تھے بلکہ نومسلموں کا اسلامی علاقے میں آ آ کر اکٹھا ہونا اور مفتوحہ علاقوں میں مسلم آبادکاروں کا لے جا کر بسانا اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۱۔ عہدِ نبوی میں ہجرت کا تاریخی مفہوم:

مکے میں تبلیغ اسلام کی رکاوٹوں سے مجبور اور دل برداشتہ ہونے کے بعد حضرت رسول کریم نے اپنے ساتھیوں کو ابتداءً حبشہ ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ کئی سو آدمی چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں بحری راستے سے نجاشی کے ملک میں جا رہے۔ ایک ٹکڑی کی سرگزشت طبری نے لکھی ہے کہ یہ لوگ مکے سے چل کر شعیبہ کی بندرگاہ پہنچے جو حالیہ جدہ

Marfat.com

کے قریب تھی۔ وہاں ایک جہاز لنگر اٹھانے کو تیار تھا اور ان لوگوں نے نصف دینار یعنی پانچ درہم کرایہ پیش کیا اور حبش جا اترے۔ معلوم نہیں یہ کرایہ فی کس تھا یا جملہ جماعت کا۔ کچھ دنوں کے بعد ''غرانیق'' (۴) کے مشہور واقعے کے سلسلے میں چند لوگ مکہ واپس آ گئے مگر بہت جلد وہ اور ان کے علاوہ بعض دیگر مسلمان دوبارہ حبش چلے گئے۔ یہ دونوں واقعے ہجرت حبشہ کے نام سے مشہور ہیں۔

آنحضرت کو جب مربی و با اثر چچا اور شفیق بیوی کی وفات کے بعد آپ کے نئے بزرگ خاندان (ابولہب) نے ذات باہر کر دیا تو آپ اپنے ایک غلام کے ساتھ طائف تشریف لے گئے اور ارادہ فرمایا کہ اگر وہاں تبلیغ میں کوئی کامیابی کی صورت ہو تو وہیں بس جائیں۔ لیکن وہاں مکے سے زیادہ تکلیف ہونے پر آپ واپس چلے آئے۔ مگر تاریخ نے اسے ہجرت کی اصطلاح سے یاد نہیں کیا ہے۔

قدیم عرب بھی حج کیا کرتے تھے چنانچہ حج کے موسم میں جب مختلف اقطاع عرب کے حاجی آ کر منیٰ (قریب مکہ) کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور میلہ لگتا تھا تو اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر آنحضرت مختلف قبائل کے پڑاؤوں میں جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دے کر کہتے کہ مجھے اپنے ملک لے چلو۔ اگر تم میری بات مانو تو قیصر و کسریٰ کی دولتیں تم پر نچھاور ہونے کو تیار ہیں۔ تاریخ نے اس خواہش ترک وطن کو بھی ہجرت کا نام عام طور سے نہیں دیا گو بعض وقت ''ہجرت کا ارادہ'' اسے ضرور سمجھا گیا ہے۔

آخر مدینے والوں سے بیعت عقبہ ہوئی اور انہوں نے اقرار کیا کہ آنحضرت اور دیگر مکی مسلمانوں کے مدینہ آنے پر وہ ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی۔ اور چند سو مسلمان جو مکے میں تھے مدینہ چلے گئے یہ وہ ہجرت ہے جس کی طرف منسوب ہو کر سنہ ہجری بھی رائج ہے اور لفظ ہجرت سے اب عام طور پر دماغ اسی واقعے کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

۲۔ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں آ رہنے کا حکم دینا:

لفظ ہجرت کے اس دوسرے مفہوم کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہی جو آج کل 'ملکی بننا'

Marfat.com

(نیچرلائی زیشن) کہلاتا ہے، یعنی جب ایک قومیت والا دوسری قومیت اختیار کرنا چاہے تو آخرالذکر کے ملک میں جا کر مقیم ہو جائے اور حتی الامکان اسی کا تمدن اور تخیل بھی اختیار کرے۔ چونکہ اسلام ایک خاص قسم کی اور مستقل قومیت ہے جو دیگر جغرافی، نسلی، لسانی اور رنگی قومیتوں سے جدا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اسلام اپنے گھر میں اپنے مخصوص اصولوں پر عمل چاہے گا۔ جو شخص اسلامی قومیت اختیار کرنا چاہے اس کے رنگ، اس کی نسل اور اس کی زبان سے بحث نہیں ہوگی۔ اسے صرف ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا قائل ہونا اور قرآن پر چلنے کا اقرار کرنا ہوگا۔ اسی لیے نہ تو ایسے شخص کو بارہ سالہ قیام کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مقامی زبان اچھی طرح جاننے کا صداقت نامہ پیش کرنا ہوتا ہے اور نہ کسی خاص جگہ رہنے کی پابندی ہوتی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس پر وہ سب ذمہ داریاں فوراً عائد ہو جاتی ہیں جو عام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں اور وہ سب حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو عام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ آج کل یہ ضروری نہیں رہا ہے کہ کوئی شخص جو اسلام قبول کرنا چاہے وہ اسلامی ملک میں بھی رہے اور عہد نبوی میں بھی فتح مکہ کے بعد کوئی ایسی پابندی نہیں تھی لیکن مدینہ کے بعد ابتدائی چند سالوں میں ہر مسلمان ہونے والے شخص کو اسلامی سرزمین میں آ کر مقیم ہونا پڑتا تھا جیسا کہ نیچے مزید تفصیل آئے گی۔

اس مفہوم کا دوسرا پہلو وہ پالیسی ہے کہ مسلمان اسلامی علاقے میں رہیں اور مرکز سے بچھڑے رہنے کے باعث نقصان نہ تو خود اٹھائیں اور نہ دیگر مسلمانوں کو پہنچائیں۔ اسلامی علاقے میں آ رہنے سے ایک تو ''افتتان'' سے بچنا ممکن ہے، ورنہ غیر مذہب والے ہمسایہ بہلا پھسلا کر، ڈرا دھمکا کر، خانگی یا اجتماعی یا سرکاری دباؤ ڈال کر فتنے میں مبتلا کر سکتے ہیں، چنانچہ خود عہد نبوی میں مہاجرین حبشہ میں سے کم از کم دو اشخاص باوجود نجاشی کی غیر متعصبانہ حکومت کے اس عیسائی ماحول میں عیسائی بن گئے تھے۔ ایک بی بی سودہ کا شوہر سکران، دوسرا بی بی ام حبیبہ کا شوہر عبیداللہ بن جحش۔ اس آخرالذکر نے بقول طبری اپنی بیوی کو بھی عیسائی بننے کے لیے دباؤ ڈالا مگر وہ ثابت قدم رہیں۔ دوسرے اسلام کے جملہ اصول کا سیکھنا اسلامی تہذیب اور اسلامی ماحول کا حاصل کرنا غیر اسلامی ملک میں بڑی حد تک ناممکن ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں چھوٹے دیہات میں بھی میں نے نومسلم

Marfat.com

دیکھے ہیں اور ان کو سب سے بڑی تکلیف یہ محسوس ہوتی تھی کہ ان کے بچوں کی تعلیم عام مقامی مدارس کے غیر اسلامی ماحول میں کماحقہٗ نہیں ہو سکتی۔ تیسرے اگر مسلمان چوطرف بٹے رہیں تو ہر ٹکڑی کمزور ہو گی اور ہر کسی طاقت والے کا شکار بن جائے گی۔ اس لیے مسلمانوں کا عہد نبوی میں فریضہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اسلام قبول کر کے اسلامی احکام پر چلیں بلکہ اسلامی علاقے میں بھی آ کر آباد ہو جائیں۔ اس طرح مسلمانوں کی اجتماعی قوت زیادہ ہو گی اور وہ اپنے حریفوں کا نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے، غرض ''اولاً استحکام پھر توسیع'' کا اصول کارفرما رہا۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی کسی قبیلے کا وفد مدینہ آ کر اسلام قبول کرنے کا اظہار کرتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو مدینہ آ بسنے کی ہدایت فرماتے۔ اسی طرح جب کبھی دورہ کرنے والے مبلغ بھیجے جاتے تو انہیں سمجھا دیا جاتا کہ نومسلموں سے کہہ دیں کہ وہ مدینہ جا رہیں جہاں ان کے لیے روزگار کا انتظام کیا جائے گا۔ یہ لوگ زیادہ تر قابل کاشت افتادہ زمینوں، بعض صورتوں میں معدنیات کی کانوں میں کام کرتے اور اپنی گزر بسر کا انتظام کر لیتے تھے۔

سات سال تک اس اصول کی پابندی ہوتی رہی اور جب مکہ فتح ہو گیا اور اسلام کا پورے عرب میں بول بالا ہو گیا تو پھر اعلان نبوی شائع ہوا کہ **لا هجرة بعد الفتح** (فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں)۔ اس مشہور و معروف حدیث شریف کا ایک تو یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ اہل حجاز کو ہجرت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب ان کا پورا علاقہ اسلامی سرزمین بن چکا ہے اور اسلامی قلمرو میں داخل ہو گیا ہے یا اس کا مفہوم ایک عام حکم ہے کہ جب کسی علاقے پر اسلامی مملکت قائم ہو جائے تو پھر اس علاقے کے اندر مسلمان کا جبری تبادلہ آبادی غیر ضروری ہے کیونکہ اس سرزمین کے ہر گوشے میں اسلامی حکومت ہو گی، اسلامی ماحول ہو گا اور اسلامی تعلیم و عبادت کی سہولت ہو گی۔

عہد نبوی میں فتح مکہ سے پہلے چند قبائل کو اس قاعدے سے مستثنیٰ بھی کیا گیا تھا۔ طبقات ابن سعد وغیرہ میں تلاش پر مجھے ایسی دو ہی چار نظیریں مل سکی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے سیاست نبوی کی دُور رس مصلحتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی کسی قبیلے کا اِکا

Marfat.com

دُکا آدمی مسلمان ہوتا تو اسے اپنے سابقہ وطن میں رہنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اسے لازمی طور سے مدینے آ رہنے کی تاکید کی جاتی۔ اور وہ (مع بیوی بچوں کے اگر کوئی ہوں) اسلامی علاقے میں آ کر بس جاتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی پورے کا پورا قبیلہ مسلمان ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ وہ کس جگہ پر رہتے ہیں۔ اگر ان کا علاقہ اسلامی سرزمین سے متصل یا بہت قریب ہوتا اور اس قبیلے کی قوت بھی کافی ہوتی تو اسے وہیں اس کے سابق وطن ہی میں رہنے دیا جاتا۔ کیونکہ اس کے معنے دراصل اسلامی مملکت کی سرحد کی توسیع اور نئے علاقے کا الحاق تھا۔ قبیلہ مزینہ اس کی اچھی نظیر ہے جس کے حالات ابن سعد نے لکھے ہیں۔ ۵ھ میں یہ قبیلہ مسلمان ہوا۔ اس قبیلے کے وفد ہی میں کئی سو آدمی تھے۔ ان کا علاقہ مدینے سے صرف بیس میل پر واقع تھا۔ آنحضرت نے ان سب کو انکے سابقہ مسکن ہی میں رہنے کا حکم دیا۔ البتہ تعلیم و تربیت وغیرہ کا مناسب بندوبست کر دیا گیا۔ اس توسیع کی پالیسی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دشمن کو گھیر لیا جائے چنانچہ مکے کے چاروں طرف اسلامی قبائل آباد رہنے دیے گئے۔ قبیلہ اسلم خاص طور پر اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ اس قبیلہ کے لوگوں کو آنحضرت نے فرمایا تھا کہ تم لوگ اپنے ملک ہی میں رہو اور تمہیں وہی حقوق اور وہی ثواب حاصل ہوگا جو مہاجرین کو حاصل ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت نے ہجرت کا حکم دے کر اس کو مذہبی رنگ بھی عطا کر دیا کہ ہجرت کرنا ایک ثواب کا کام ہے اور کسی مذہبی آدمی کے لیے یہ بات کافی ہے۔ مزید برآں مہاجرین کے لیے چند حقوق بھی تھے مثلاً اسلامی مملکت کی آمدنی اسلامی سرزمین ہی پر خرچ ہوتی تھی اور روزینے، تنخواہیں، انعام و اکرام وغیرہ بھی وہیں کے باشندوں کو حاصل ہو سکتے تھے۔

قبیلہ اسلم اصل میں قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی، خزاعہ مکے کے جنوب میں رہتے تھے اور غالباً اسلم بھی وہیں رہتے ہوں گے جب دشمن کے چاروں طرف اس طرح اسلامی بستیوں کا سلسلہ قائم ہو کر جال بن گیا تو زبردست دشمن کو بغیر خونریزی مطیع کرنے کا عام اسلامی اصول بہ آسانی روبہ عمل آ سکا۔ اور زبردست دشمن کے مطیع اور مسلمان ہو جانے سے اس کی پوری قوت اسلام کے کام آ سکتی ہے۔ اس کے محض تباہ کر دینے کے معنی ایک ممکنہ قوت و مدد سے محروم ہونا ہے۔

Marfat.com

بہرحال اس طرح کی اجازت دینے میں اس کی سختی سے جانچ پڑتال ہوتی تھی کہ آیا وہ لوگ اپنی ضرورتیں خود مہیا کرتے ہیں، ان کے پاس کافی ذرائع معیشت مثلاً جانور اور زمین وغیرہ ہیں یا نہیں اور یہ کہ حریف ان پر معاشی دباؤ ڈال کر انہیں مرتد تو نہیں کر سکتا ہے؟ ان سب کے علاوہ ایک اور صورت بھی ممکن تھی اور اس کی بہ کثرت نظیریں ابن سعد وغیرہ نے محفوظ کی ہیں، وہ یہ کہ اگر کسی قبیلے کے چند خاندان مسلمان ہو جائیں اور یہ نو مسلم بذات خود کافی قوت رکھتے ہوں اور معاشی حیثیت سے پختہ ہوں تو ایسے نو مسلموں کو آنحضرت کا حکم "فارقوا المشرکین" ہوا کرتا تھا۔ یعنی اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور حلیفوں سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لو۔ شادی بیاہ، بین القبائل جنگیں، اور مماثل معاملات میں مشرکین سے ان کا کوئی تعلق نہ رہے۔ وہ اسلامی تعلیم پر عمل کریں، نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کریں اور سیاسی حیثیت سے مدینے کے ساتھ ملحق ہو جائیں۔ ایسے دُور دراز قبائل کو مقامی خود اختیاری بھی حاصل ہو جاتی تھی اور مدینے کے ساتھ ان کا تعلق میری نظر اور اندازے میں ایک ''عہد یہ'' (کنفی ڈریشن) سے بڑھ کر نہ تھا۔ چنانچہ آس پاس کے دیگر اسلامی قبائل یا بستیوں کی وقت ضرورت حفاظت کرنا، کمک اور مدد بہم پہنچانا اور دیگر غیر مسلم قبائل سے لڑ کر اپنی حفاظت و استحکام کے فرائض انجام دینا، یہ سب ایسے امور تھے جن کی ہدایت تو مدینے سے ہوتی تھی لیکن نگرانی اور تعمیل مقامی وحدت سے متعلق تھی۔ چنانچہ ایسی تفصیلی نظیریں متعدد موجود ہیں۔ اسی طرح کے نو مسلم قبائل میں سے یمن کی ایک دلچسپ نظیر ابن سعد نے محفوظ کی ہے کہ چند لوگ مدینہ آئے اور آنحضرت سے کہا کہ آپ کے بھیجے ہوئے معلم ہمارے پاس آئے اور انہوں نے ہم سے کہا کہ جو ہجرت نہ کرے، اس کا اسلام قبول نہیں۔ ہمارے ملک میں ہماری جائداد اور معیشت کی چیزیں ہیں۔ کیا آپ کے معلم کا کہنا ٹھیک ہے؟ ہمیں اس کی تعمیل میں کوئی تامل نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا: نہیں، اسلام کا قبول ہونا اس پر موقوف نہیں۔ تم جہاں رہو تمہیں مہاجرین ہی کے حقوق و فرائض حاصل ہوں گے۔

اس طرح کی دُور دراز اسلامی بستیوں میں تعلیم کے بندوبست کے لیے دورہ کناں معلم مقرر کیے جاتے تھے، ان مقاموں کے نوعمر اور ذہین لوگوں کو مدینہ بلا کر کچھ

Marfat.com

عرصہ اسلامی صدر مرکز میں رکھا جاتا، اور اسلامی تربیت سے آراستہ کر کے ان کے ملک کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان کے علاقوں میں مسجدیں بنانے کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ عمان جیسے دُور دراز مقام کے نومسلموں کے نام آنحضرت کا ایک تنبیہی ہدایت نامہ بخاری وغیرہ نے محفوظ کیا ہے کہ مسجدیں بناؤ ورنہ فوج بھیج کر تمہیں سزا دی جائے گی۔

مختصر یہ کہ عہد نبوی میں ہجرت کا یہ مفہوم بھی تھا کہ نومسلموں کو اسلامی علاقے میں بسایا جائے اور آیت و من یخرُج من بیته مهاجراً الی الله و رسوله میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے رفتہ رفتہ اسلامی علاقے کی توسیع ہوتی رہے گی، تاکہ اس بڑھنے والی آبادی کے لیے خدا کی زمین تنگ نہ ہو جائے۔ اصل منشاء یہ تھا کہ خدا کے ملک میں خدا ہی کا راج ہو۔ اور عام فاتحین کے برخلاف جو فتح کا منشاء لوٹ مار کرنا اور اپنوں کو نوازنا سمجھتے رہے ہیں، اسلامی فتح کا منشاء یہ تھا کہ کسی انسان، کسی جانور تک کا بے ضرورت خون نہ بہایا جائے اور کوئی درخت کوئی پودا تک رائیگاں ضائع نہ کیا جائے جیسا کہ سپہ سالاروں کو دی ہوئی ہدایتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمایا ہے۔ منشاء صرف یہ تھا کہ دنیا میں خدا کی حکومت اور خدا ہی کا بول بالا ہو اور خدا کے احکام سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہو یہاں تک کہ حکمرانِ ملک تک اپنے کیے کا مواخذہ دار ہو۔ سیرت شامی میں ایسے بکثرت نظائر ایک مستقل باب میں جمع کیے گئے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے خلاف مقدمے سنے اور فریق ثانی کے حق میں فیصلے کیے۔

۳۔ نوآبادکاری یا مفتوحہ علاقے میں مسلمانوں کو بسانا:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس معروف سال ایک مملکت کے قیام و استحکام میں نہ صرف صَرف کیے بلکہ اپنے ہونے والے جانشینوں کو حکمرانی اور سپہ سالاری کے ساتھ ساتھ مکمل تربیت بھی دی، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند ماہ بعد ہی جب آپ کے جانشین نے حضرت سیف اللہ خالد بن الولید کو ایرانی سرحد پر بھیجا تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرب میں عربوں کا نہ سما سکنا اور سرحد پر نئی عرب بستیوں کا بسانا ایک طے شدہ مسئلہ تھا۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے اپنی مشہور کتاب الخراج

Marfat.com

(صفحہ ۸۵) میں حضرت خالد اور حیرہ والوں کا ۱۲ھ کا جو طویل معاہدہ نقل کیا ہے اس میں دارالاسلام اور دارالہجرت کا اس طور سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا وہ مشہور و معروف چیزیں ہیں اور سباق و سیاق اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کرنے دیتے کہ دارالاسلام سے مراد عرب ہے اور دارالہجرت سے مراد جنوبی عراق کا وہ مفتوحہ اسلامی علاقہ ہے جہاں عرب فوراً بستے جا رہے تھے۔ اس سلسلے میں قادسیہ کی مشہور اور عہد آفریں جنگ کے بعد اسلامی سپہ سالاروں اور مرکز خلافت، میں جو مراسلت ہوئی وہ ایک مزید اہم تاریخی دستاویز ہے۔

ثم كتب سعد الى عمر بما فتح الله على المسلمين فكتب اليه عمر: ان قف ولا تطلبوا غير ذلک فكتب اليه سعد ايضاً انماهي سربة ادركناها والارض بين ايدينا. فكتب اليه عمر: أن قف مكانک ولا تتبعهم واتخذ للمسلمين دارهجرة ومنزل جهادٍ لا تجعل بيني وبين المسلمين بحرا.

(تاریخ طبری احوال ۱۴ھ نیز تاریخ دینوری بر موقع)

فیلڈ مارشل حضرت سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس فتح کی کیفیت لکھ بھیجی جو خدا نے مسلمانوں کو (قادسیہ میں) عطا کی تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیا کہ ٹھہرے رہو اور کسی دوسری چیز کی تلاش نہ کرو اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پھر لکھا کہ یہ (جانوروں یا عورتوں کا) ایک گلہ تھا جو ہمیں ملا ورنہ زمین تو ہمارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر یہی جواب دیا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور ان کا پیچھا نہ کرو اور مسلمانوں کے لیے ایک جہاد کے لیے راستے میں ٹھہرنے کی منزل تیار کرو۔ لیکن مجھ میں اور مسلمانوں میں کوئی ندی سمندر حائل نہ ہو۔

غرض اصول یہ تھا کہ ٹھوس اسلامی علاقے اور دشمن کے علاقے کے بیچ میں نو آبادیاں بسائی

جائیں اور گھر سے ان کو کمک جانے میں کوئی موانع حائل نہ ہوں اور اس نوآبادی کا منشا صرف ایک منزل اور اسٹیشن کا ہو، تا کہ اور آگے جانے میں سہولت ہو۔ اور بغیر اس طرح کے استحکامی انتظامات کرنے کے محض آگے بڑھ جانا چاہے اس میں کتنی ہی سہولت کیوں نہ ہو، نامناسب ہے۔ چنانچہ ان احکام کی تعمیل میں بصرہ اور کوفہ بسائے گئے اور سکندر و ہلاکو کی سی بے اصول فتوحات کا باوجود ہر طرح کی للچاہٹ کے سد باب کیا گیا۔ نتائج ظاہر ہیں کہ کس کی فتوحات دیرپا رہیں۔

جب اس طرح کی نوآبادیاں (یا اس زمانے کی اصطلاح میں ''دار ہجرت'') چن لی جاتیں تو پھر سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں عرب مع خاندانوں، بیوی بچوں اور غلاموں کے وہاں جا بستے۔ نوآبادی کا ایک خصوصی افسر ہوتا تھا جو سڑکوں کی جگہ چھڑواتا۔ مسجد اور بازار کی جگہ معین کرتا اور پوری باقاعدگی سے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عرب شہر آباد ہو جاتا۔ پروفیسر مارسے نے فرانسیسی اکاڈیمی کی رکنیت پر منتخب ہونے پر جو افتتاحی مضمون لکھ کر سنایا تھا وہ ''اسلام اور حضری زندگی'' پر تھا۔ اس میں وہ تسلیم کرتا ہے کہ نئے شہر بسانے میں عرب بڑے خوش نصیب رہے ہیں۔ ان کا بسایا ہوا تقریباً ہر شہر آج بھی آباد و سرسبز ہے اور بعض کی اہمیت تو تیرہ سو سال گزرنے پر بھی روز افزوں ہے (مثلاً بصرہ) شہر کوفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جس طور سے بسایا گیا تھا اس پر پروفیسر ماسینیوں نے ایک دلچسپ مقالہ شائع کیا ہے جس کے ساتھ اس ابتدائی بستی کا نقشہ بھی موجود ہے جو اس عہد کی ''تمصیر'' یعنی شہر بسانے کے اصول پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔

نظر بندی:

اس عنوان سے میرا منشاء یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو فرار ہو کر دشمن سے جا ملنے سے جبراً روکا جائے تا کہ عارضی اختلاف رائے کے باعث اپنے دل برداشتہ بھائیوں کو ایسی حرکت نہ کرنے دی جائے جس کے سبب سے قطع تعلق مدامی اور ناقابل اصلاح ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک تو صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے جس میں قریش نے آنحضرت

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اقرار لیا تھا کہ اگر کوئی قریشی اپنے ولی وسرپرست سے پوچھے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلا آئے تو قریش کے مطالبے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے واپس کر دیں لیکن کوئی مسلمان قریش کے پاس چلا جائے تو اس کی تحویل نہیں ہو سکے گی۔ قریش کا اس سے ظاہر ہے وہی منشاء تھا جو اوپر بیان ہوا۔ اس یک طرفہ شرط کی پابندی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام سرخسی کی رائے میں اس لیے قبول کیا تھا کہ اس وقت (۶ ھ میں) مسلمانوں کے وقتِ واحد میں دو دشمن تھے۔ مدینے کے شمال میں خیبری یہود اور مدینے کے جنوب میں مکی قریش۔ ان میں باہم حلیفی کی گفت وشنید ہو رہی تھی اور مسلمانوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ دونوں کے علاقوں پر فوجیں بھیج کر سانپوں کو انڈے ہی میں کچل سکیں اور مناسب معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک فریق سے صلح کر کے دوسرے کا قلع قمع کیا جائے۔ حسبِ صلح حدیبیہ کی یہ شرط منظور کی گئی اور معاوضے میں قریش سے غیر جانبداری کا اقرار لیا گیا ہے اور مہینے بھر بعد خیبر کے فتنے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی شرطِ تحویل کی تعبیر یہ فرمائی کہ کوئی مرد اگر مکے سے آئے تو وہ مطالبے پر واپس کر دیا جائے گا لیکن کوئی عورت اس طرح واپس نہیں کی جائے گی اگر وہ مسلمان ہو چکی ہو۔ معاہدہ ہو چکنے کے بعد بعض مقدمات میں اس تعبیر کی ضرورت پیش آئی تھی اور قریش نے بھی اسے تسلیم کر لیا تھا۔

دوسری نظیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملی ہے۔ چنانچہ ۱۷ھ کے حالات میں طبری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک خط بنام قیصر ہرقل نقل کیا ہے:

”مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک عرب قبیلہ ہمارے ملک کو چھوڑ کر تیرے ملک میں آ گیا ہے۔ خدا کی قسم اگر تو ان کو نکال واپس نہ کرے تو ہم (ہمارے ملک میں رہنے والے) نصرانیوں سے صلح توڑ دیں گے اور ان سب کو تیرے ملک کی طرف جلاوطن کر دیں گے۔“

تبادلہ آبادی:

عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں سوائے جنگی قیدیوں کے دیگر طبقات آبادی کے

دوسرے ممالک میں تبادلہ کی مجھے کوئی نظیر نہیں ملی۔ فقہ کی کتابوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کسی نومفتوح علاقے کے باشندوں کو عام طور پر چھ مہینوں کی مہلت ہوتی تھی کہ وہ اپنے مسکن کے متعلق فیصلہ کرلیں کہ اسلامی رعایا اور ذمی بننا چاہتے ہیں یا اپنے لیے کوئی اور ملک پسند کر کے چلے جانا چاہتے ہیں۔ مگر اسے مشکل ہی سے تبادلہ آبادی کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو قومیت، نسل، زبان یا رنگ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے لیے اس زمانے میں غیر ممالک سے ہم قوم (یعنی مسلمان) تبادلے میں مل بھی نہیں سکتے تھے۔

منتقلی و جلاوطنی:

جلاوطنی کی البتہ بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے یہودی قبائل بنو قینقاع اور بنو نظیر کو ان کی شرارتوں کی بناء پر حکم دیا تھا کہ مدینے سے چلے جائیں۔ ان میں سے اکثر خیبر میں جا بسے اور جو اس وقت تک ایک آزاد شہری مملکت تھا۔ ۷ھ میں جب اس کا الحاق مملکت اسلامیہ سے ہوا تو ابتداً سب یہودیوں کو وہاں سے بھی چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ پھر انہیں تا حکم ثانی اس شرط پر وہاں رہنے کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے باغوں کی آدھی فصل مال گذاری میں دیں۔

جلاوطنی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مشہور حدیث یہاں بیان کی جاسکتی ہے جو اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی کہ عرب میں دو دین والے نہ رہیں (یعنی صرف ایک ہی دین کے پیرو یعنی مسلمان رہیں) اور یہ کہ یہود و نصاریٰ کو عرب سے نکال دیا جائے۔ اس کی تعمیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نجران (یمن) سے عیسائیوں کو اور خیبر سے یہودیوں کو نکال کر دیگر اسلامی علاقوں یعنی عراق اور شام میں منتقل کر دیا۔ اس پالیسی کا شاید یہ منشاء تھا کہ صدر مقام اور مرکز میں اجنبی اور ناقابل اعتماد عناصر نہ رہیں اور یہ امر نیم جنگی اور نیم معاشرتی مصلحت پر مبنی تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فیلڈ مارشل حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بعلبک والوں سے جو معاہدہ کیا تھا (دیکھیے تاریخ طبری) اس میں یونانیوں کو چند ماہ

Marfat.com

تک ملک میں رہنے کی اجازت دی گئی تھی جس کے بعد انہیں وہاں سے جہاں جی چاہے نکل جانے کا پابند کیا گیا تھا بجز ان کے جو مسلمان ہو جائیں۔

شہر بیت المقدس سے جو معاہدہ ہوا اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقامی عیسائیوں کی یہ شرط منظور کی تھی کہ ان کے شہر میں یہودی نہ رہنے دیئے جائیں۔ (حوالہ ایضاً)۔

مختصر یہ کہ ''اولاً استحکام پھر توسیع'' کا اصول اس عہد کی پالیسی کا ایک اہم ستون تھا اور "لا اکراہ فی الدین" کے حکم کے باعث جبراً کسی کو مسلمان بنانے کی تو کبھی بھی اجازت نہ ملی لیکن حکومت الٰہیہ کا قیام ایک فریضہ قرار دیا گیا (اور ''وقاتلو هم حتیٰ لاتکون فتنۃٌ ویکون الدین کله لله'' میں ''دین'' سے مراد غلبہ اور حکومت ہے) اور ذمی رعایا بننے کی اس شرط پر اجازت دی گئی کہ وہ اطاعت کریں، ''صغار'' قبول کریں یعنی حکومت میں شرکت نہ چاہیں اور شرائط معاہدہ کی تعمیل کرتے رہیں ایسا ہو تو ان کو ہر کام کی آزادی رہے گی۔ اور ان کے مذہبی اور عدالتی مسائل انہیں کے ہم قوم افسروں کے سپرد رہیں گے اور ان کی جان و مال کی اسلامی حکومت اتنی ہی حفاظت کرے گی جتنی مسلمان رعایا کی۔ یہی حال عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع سے رہا جب کہ مدینے کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (۴) کو اعلیٰ ترین عدالتی اور فوجی اور سیاسی اختیارات سپرد کر دیے تھے اور یہی اصول خلافت راشدہ میں بھی کارفرما رہا۔

حواشی

(۱) اس مضمون کے مطبع کو جانے لیکن شائع ہونے سے کوئی تین ماہ پہلے عبدالقدوس ہاشمی صاحب نے روزنامہ رہبر دکن میں البتہ ایک مختصر عام پسند مضمون لکھا ہے۔

(۲) فرانسوانو (Francois nau) نے اپنی فرانسیسی کتاب ''عراق اور شام کے عیسائی عرب ساتویں سے آٹھویں صدی عیسوی تک'' مطبوعہ ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۹ تا ۱۳۲۔

Marfat.com

میں ایک جگہ ضمنا لفظ ہجرت Les Arabes Chretiens de Mesopotamie
"ہاگر" یعنی بی بی ہاجرہ کے (جن کو بخاری شریف میں ہاجر ہی کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو ابراہیم کی بیوی اور حضرت اسمٰعیل کی ماں تھیں) نام سے ماخوذ سمجھا ہے۔ مگر یہ توجیہ محض ناسمجھی تھی اور ظاہر ہے کہ کسی نے قبول بھی نہیں کی۔

(۳) قرآن مجید میں ایک جگہ لات، عزّیٰ اور منات تین بتوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد بتوں کی بےبسی اور بت پرستی کی برائی کا ذکر ہے۔ قرآن کی تفسیروں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جب آنحضرت نے ایک مرتبہ "الّات و العزی ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ" کی آیتیں پڑھیں تو کسی نے قافیہ ملا کر "تلک الغرانیق العلیٰ وان شفا عتھم لترتجی" (یعنی وہ بڑے سردار ہیں اور ان کی سفارش کی توقع کی جاسکتی ہے) کا جملہ کس دیا اور شہر میں مشہور ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کے متعلق اس رعایت کو منظور کرتے ہیں کہ وہ خدا تو نہیں ہیں لیکن وہ خدا کے پاس سفارش کر سکتے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے اصل آیتیں پڑھیں اور مکے والوں کو کوئی دھوکا نہ رہا۔ مگر ابتدائی خبر کا ایک جز حبشہ پہنچ گیا کہ آنحضرت اور مکہ والوں میں صلح ہوگئی ہے۔ میرا ذاتی گمان ہے کہ غرانیق کی آیتیں ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تلاوت فرمائی ہوں لیکن سوال کے طور پر (یعنی کیا وہ بڑے سردار ہیں اور کیا ان کی سفارش کی توقع کی جاسکتی ہے؟) بغیر حرف سوال کے سوالیہ آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں (مثلاً حضرت ابراہیم کا چاند سورج وغیرہ کو خدا کہنا) اور جب التباس کا شبہہ ہوا تو یہ آیتیں منسوخ ہوگئیں، جس طرح قرآن میں اور جگہ بھی ہوا ہے اور نئی آیتیں نازل کی گئی ہیں)۔

(۴) ملاحظہ ہو باب "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتب کیے ہوئے تحریری دستور مملکت مدینہ بابت ۱ھ کی تحلیل کی گئی ہے۔

(سیاست، حیدرآباد، دکن جولائی ۱۹۴۰ء)

Marfat.com

عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم

عرب اور خاص کر مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبل اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی اپج اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا اور جب ''وحدت اور حرکت کے مذہب'' یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور ان میں مزید قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو دعوت مبارزت دیں اور وقت واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہیتوں یعنی ایران اور روم (بیزنطینہ) سے جنگ کریں۔

میں نے اپنے بعض مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی عربی خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوت برداشت اور دیگر اعلیٰ مہمات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں مدومعاون رہیں جن پر خود نپولین (۱) کو رشک تھا۔ عرب میں معینہ اوقات پر لگنے والے بازاروں اور کاروانوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں یا خفاروں کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہو گیا تھا کہ اس نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی ''وفاق'' قائم کر دیا تھا جس سے عربوں میں وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے اور اسلام کے تحت ان کی ''سیاسی وحدت'' کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اسی طرح شہری مملکتِ مکہ کا دستور بھی خاصہ ترقی یافتہ تھا، جس سے وہاں کے باشندوں کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں (۲)۔

Marfat.com

آج میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی علمی صلاحیتیں بھی اتنی خاصی تھیں کہ ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عربوں نے علوم وفنون کی حیرت انگیز فصلیں کاٹیں۔ انہی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا، ان کی خفیہ قابلیتوں کو بیدار کرنا اور ان کو مفید اغراض میں کام میں لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے۔

عہدِ نبویؐ کے نظامِ تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہوگا کہ اسلام سے پہلے عرب میں علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے۔

عرب میں زمانۂ جاہلیت میں تعلیم:

بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانۂ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے کہ اس زمانے میں وہاں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا اور کچھ یہ کہ لاکھوں کروڑوں کتابیں ہلاکو خان وغیرہ نے بغداد، قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے میں تباہ کر دیں، جب کہ ابھی فن طباعت سے کتابیں چھاپنے کا کام نہیں لیا جانے لگا تھا۔ اس دشواری کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہنچ چکا ہے اس کی مدد سے زمانہ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتا چلتا ہے جس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے اور اس قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے جو اَن پڑھ ہونے پر اتراتی تھی۔ (۳)

اولاً ان کی زبان کو لیجیے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات میں اس زمانے میں ترقی کرتی ہے جب اس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پر ہو اور اس سے پہلے اس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے کہ اس کو جانوروں کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس زبان میں نہ تو اونچے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کے سوا اس میں کوئی علوم و فنون ملتے ہیں۔ اگر اس معیار پر اسلام سے عین پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعدِ صرف ونحو کے استحکام اور خاصے بلند معیار کے لٹریچر کے ذخیرہ کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مستند عربی زبان زمانۂ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے۔ اسلامی تمدن کے عہدِ زریں کی زبان کو یہ

Marfat.com

حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم زمانہ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں، تو ان کے دو مولف جن میں مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو، تو ایک ہی زبان کے یہ مولف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے برخلاف امراء القیس کی زبان اور قواعد صرف ونحو بالکل وہی ہیں، جو مثلاً زمانہ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔ قرآن اور حدیث اس "جاہلی زبان" میں ہیں جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قایم کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ قرآن اور حدیث زمانہ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ میں آتے تھے، جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔ اس زمانے میں عربی زبان، لغات کی حد تک اتنی وسیع اور متمول ہو گئی تھی کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانوں سے بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کی مجھے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ ہر عربی دان اس سے واقف ہے۔ میرا منشا صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہیں کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والوں میں ادبیات کی بڑی صلاحیتیں اور بڑے چرچے رہے ہوں۔

بے شمار نظمیں زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔ خود نثر میں بہت سے خطبوں، تقریروں، ضرب المثلوں، کہانیوں، کاہنوں اور حکموں (پنچ) کے فیصلوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک ان کی یادگاریں پہنچی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کر لے گا کہ اس زمانہ کے عربوں میں بلاغت، ظرافت، حسنِ ذوق اور دقتِ نظر کا معیار کتنا بلند تھا۔ خود لفظ "عرب" کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنا مطلب اچھے طور سے واضح کر سکتا ہو۔ تمام غیر عرب عجم کہلاتے ہیں، جس کے معنی گونگے کے ہیں۔

یہاں تک تو استنباطات اور قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہیں ہیں۔ مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے میں وہاں نہ صرف تعلیم گاہیں تھیں بلکہ ایسی تعلیم گاہیں، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پاتی ہوں؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴ ص ۱۰۳) میں بیان کیا ہے کہ مکہ کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ عورت ظلمہ جب بچی تھی، تو ایک

Marfat.com

مدرسہ جاتی تھی، جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے۔ اس دلچسپ واقعہ سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قبیلہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ان میں لڑکیاں اور لڑکے تعلیم پانے کے لیے جاتے تھے۔

بازار عکاظ میں ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا، اس کے باعث اسے ایک ''پان عرب لٹریری کانگریس'' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عکاظ نے مورخین اور مولفین کو ہمیشہ سے ہی لبھا رکھا ہے حال میں جامعہ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلہ کلیۃ الادب میں اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ مجھے یہاں عکاظ کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے، جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لیے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے (۴) کہ وہ ہفتہ میں ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس میں نظمیں پڑھی جاتیں اور ان پر تنقید ہوتی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض میں مشغول ہوتا۔ اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جاہلیت میں طائف والوں کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا۔

اس زمانے میں مکہ کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ سبع معلقات مکہ ہی کے معبد کعبہ میں لٹکائے جاتے رہے اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظموں کو عربی ادبیات میں ایک لافانی زندگی عطا کر دی ہے ورقہ بن نوفل مکہ کا ایک باشندہ تھا۔ اس نے زمانہ جاہلیت میں توریت اور انجیل کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ غالباً یہ مکہ والے ہی تھے جنہوں نے عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی حیثیت عطا کی تھی۔ (۵) غالباً یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

قصہ نویسی، ناول اور ڈرامہ زمانہ حال میں ادبیات میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مکہ والوں کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ چاندنی راتوں میں خاندانی اجتماع گاہوں پر یا شہر کے مرکزی دارالندوہ میں یہ لوگ جمع ہوتے اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہاں برجستہ یا

سنے ہوئے قصے بیان کر کے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے۔ اس کے کچھ حوالے میرے مضمون ''شہری مملکت مکہ'' میں ملیں گے۔

ادبی ذوق جاہلیت میں صرف عربوں ہی میں نہ تھا بلکہ عرب میں رہنے والی دوسری قوموں میں بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ یہودی سموأل بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعرا کے دیوان بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے ایک بیت المدارس قائم کر رکھا تھا، جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتا چلتا ہے۔ (دیکھیے سیرۃ ابن ہشام میں غزوہ بنی قینقاع وغیرہ)۔ زمانہ جاہلیت میں عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لیے بڑی کثرت سے الفاظ ملتے ہیں چنانچہ صرف قرآن مجید ہی میں حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے۔ رق اور قرطاس (کاغذ) قلم، ن (دوات) نستنسخ، مرقوم، مسطور، مستطر، مکتوب، تخطہ، تملی، یملل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہیں، یہ ان کے صیغے ہیں) کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابوں اور تحریری چیزوں کے معنوں میں) وغیرہ۔ غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم وفنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانہ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں، جن پر پورے کرۂ ارض کی علمی دنیا فخر کر سکتی ہے۔

قبلِ ہجرت اسلام:

یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں پہلی وحی اتری۔ اس بات کا کوئی پتا نہیں چلتا کہ نوعمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو یا آپ عمر بھر اُمی ہی رہے اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلی وحی آئی، اس میں آپ کو اور آپ کے تبعین کو ''اقراء'' یعنی پڑھنے کا حکم تھا اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے۔

> ''پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے۔ جس نے انسان کو ایک
> جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ یہ تیرا بزرگ پروردگار ہے
> جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی جسے وہ

نہیں جانتا تھا۔" (قرآن مجید سورہ ۹۶۔ آیۃ ۱ تا ۵)

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا (۶)۔ سہولت کے لیے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے اور اس تقسیم سے وہ زمانے بھی متعین ہو جاتے ہیں، جب آپ کے ہاتھ میں دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا۔

یہ امر نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتیں ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟

(قرآن مجید ۳۹/۹)

۲۔ تم کو علم سے تھوڑی مقدار دی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۱۷/۸۵)

۳۔ اللہ سے اس کے بندوں میں صرف عالم ہی ڈرتے ہیں۔ (قرآن مجید ۳۵/۲۸)

۴۔ اور کہہ میرے آقا مجھے علم میں زیادتی عطا کر۔ (قرآن مجید ۲۰/۱۱۴)

۵۔ تمہیں وہ چیز سکھائی گئی جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے آباؤ اجداد۔ (قرآن مجید ۶/۹۲)

۶۔ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سات دیگر سمندروں کے ساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکیں۔ (قرآن مجید ۳۱/۲۷)

۷۔ قسم ہے پہاڑ کی اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۵۲/۱ تا ۳)

۸۔ قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو۔ (قرآن مجید ۶۸/۱)

۹۔ اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھیجی ہوتی۔

(قرآن مجید ۶/۷)

Marfat.com

۱۰۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو۔ (قرآن مجید ۱۶/۴۳)

یہ تمام آیتیں ہیں۔

کسی قوم میں پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لیے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیں حیرت نہ ہو کہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (۷)۔ اس کی تائید قرآنی آیتوں سے بھی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا:

۱۔ (ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے دعا کی) اے ہمارے آقا ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیتیں سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقت ور اور عقل مند ہے۔ (قرآن مجید ۲/۱۲۹)

۲۔ وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں کا ایک رسول بھیجا تا کہ انہیں اس کی آیتیں سنائے ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ خاص گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضاً ۶۲/۲)

۳۔ بے شک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیجا، جو انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضاً ۳/۱۶۴)

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں۔ خاص کر ایسے شخص کے لیے جو مذہب و سیاست کو بالکل الگ اور ایک دوسرے سے آزاد چیزیں نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمحِ نظر یہ ہو کہ:

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"

(ایضاً ۲/۲۰۱)

بیعت عقبہ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانہ میں جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی، کوئی ایک درجن مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول کریم صلی اللہ علیہ

Marfat.com

وسلم نے ان کے ساتھ مکہ سے ایک تربیت یافتہ معلم (۸) روانہ کر دیا تھا، جو انہیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے۔ بے شبہ اس ابتدائی زمانہ میں تعلیم سے مراد صرف مبادیِ دین اور عبادت کے طریقوں کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی۔

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے میں بیان کی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے، اس کو لکھ لیں اور اس کی نقلیں کریں۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے تو انہیں قرآن مجید کی چند سورتیں اپنی بہن کے گھر میں لکھی ہوئی ملی تھیں اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھی۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو قرآن شریف کی ایک مکی سورت (کہف) میں مذکور ہے کہ کس طرح وہ طلب علم کے لیے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور دل ہلانے والے تجربات حاصل کیے۔ اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے، ہر چیز نہیں جان سکتا۔ اور یہ کہ علم میں زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے۔ (۹)

بعد ہجرت:

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہوگا۔ مثلاً مدرسوں کا انتظام، امتحانات، اقامت خانے ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھانے کا بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صوبہ جات میں تعلیمی انتظام، صوبہ جات میں دورہ اور تنقیح کرنے والے افسر وغیرہ۔

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا۔ جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بے شمار اور بے حد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے کہ

Marfat.com

مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دُور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کر سکیں چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تقرر کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں یہ بہت خوش نویس بھی تھے (۱۰)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندگی سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد جب ساٹھ ستر مکہ والے جنگ بدر میں گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو آپ نے ان لوگوں کا، جو مالدار نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں (۱۱) حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں۔ (۱۲)

صفہ سے مراد مکان کا ملحق حصہ ہوتا ہے یہ مسجد نبویؐ میں ایک احاطہ تھا، جو اس غرض کے لیے مختص کر دیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے لیے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھرے طالب علموں کے لیے دارالاقامے کا بھی کام دے اور مدرسہ کا بھی، اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بندوبست تھا جس کی نگرانی خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شخصی طور پر فرمایا کرتے تھے اور وہاں رہنے والوں کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے۔ یہ طلبہ اپنے فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔ (۱۳)

درس گاہ صُفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے، جن کے مدینہ میں گھر تھے اور وہ صرف درس کے لیے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی۔ (۱۴)

مقامی طلبہ کے علاوہ دُور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے (۱۵)۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے ساتھ

Marfat.com

ان کے مسکنوں کو روانہ کر دیتے تا کہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں، جس کے بعد وہ مدینہ واپس آ جاتے۔ (١٦)

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینہ کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترکِ وطن کر کے مرکزِ اسلام کے قریب آ بسیں (١٧)۔ جہاں بعض وقت ان کو اپنی آبادی بسانے کے لیے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں۔ (١٨)

ترکِ وطن کے اس حکم میں فوجی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے، وہ ظاہر ہیں۔ ابن سعد (١٩) نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، ایک معلم روانہ کیا۔ معلموں کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدایتیں تھیں اس کی انہوں نے لفظی تعمیل کی اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے، وہ مسلمان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ قبیلے والے پریشان ہوئے مگر وہ سمجھدار تھے۔ انہوں نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا تا کہ براہِ راست جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کریں کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشا ہے اور کہ عرض کریں کہ انہیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر عظیم معاشی نقصان ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکلات کو سن کر انہیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا، جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

مدنی زندگی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ قبائل میں تعلیم و تربیت کے لیے معلم روانہ کریں بیر معونہ کے مشہور واقعہ میں ستر قاریانِ قرآن بھیجے گئے تھے جن کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہیں نجد کے ایک آباد علاقے میں اور کثیر قبائل میں کام کرنا تھا۔

قبائلی نمائندوں کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ و نادر واقعہ نہ تھا (٢٠) اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ایسے لوگوں کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے اور یہ لوگ عموماً صفہ میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

Marfat.com

مدینہ منورہ میں صُفّہ واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں (۲۱) اور اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلہ داروں کے لیے درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی۔ خاص کر بچے وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ قبا مدینہ منورہ کے جنوب میں مسجد نبویؐ سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے اور وہاں کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے (۲۲)۔ بعض احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے (۲۳)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی احکام صادر کیے تھے کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کریں۔ (۲۴)

ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے (۲۵) کہ ایک دن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے۔ جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے کہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔ البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جو علم حاصل کر رہے ہیں اور جہالت دُور کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لیے جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا۔

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دی جانے والی حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے۔ (۲۶)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی تو فوراً تدارک فرما دیا کرتے۔

چنانچہ ترمذی میں ہے (۲۷) کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قضاؤ قدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا آپ اپنے حجرے سے باہر آئے۔ مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتمار ہا تھا اور راوی کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گزشتہ امتیں اسی مسئلہ میں الجھ کر گمراہ ہو گئی تھیں۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طے شدہ سیاست تھی کہ صرف وہی لوگ مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہوں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کوششیں بیکار نہ گئیں۔ اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی دن گزرے تھے کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم ادھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جایا کرے۔ اس کا منشا قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی ”خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور شہادت کے اغراض کے لیے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے“۔ (۲۸)

مدینہ میں خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور ظاہر ہے کہ ملک میں خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور کاتبوں کا بھی اس زمانے میں پتا چلتا ہے۔ (۲۹)

ہجرت کے بعد ہی سے سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم میں جانے والے رضا کاروں کے ناموں کی فہرستیں (۳۰) مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار (۳۱) جو عموماً تحریری طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے۔ نیز مردم شماری (۳۲) اور اس طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں کہ خواندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے۔ تاریخ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں (۳۳)۔ صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینا پڑے تھے۔

Marfat.com

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے شروع ہوا (۳۴)۔ آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر لحاظ رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہوسکتا ہے، جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈال کر خشک کرلو۔ (۳۵) یا یہ کہ حرف ''س'' کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو (۳۶)۔ غالباً یہ حکم اس لیے تھا کہ شوشے نہ دینا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاددہانی ہوجاتی ہے۔ (۳۷)

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلاں کے پاس جائے وغیرہ (۳۸)۔

متعدد حدیثوں میں معلموں کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے (۳۹)۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ وہ درس گاہ صُفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انہیں ایک کمان نذر کی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قبول کرنے سے روک دیا۔ (۴۰)

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو دربارِ رسالت کے میر منشی کہے جاسکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے (۴۱)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہوگئے تھے (۴۲)۔ چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو لکھ یا پڑھ لیا کرتے تھے۔

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی

Marfat.com

نہیں۔ ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا۔ معینہ کتب پڑھانے کی جگہ معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی (۴۳)، پیراکی (۴۴)، تقسیم ترکہ کی ریاضی (۴۵)، مبادی طب (۴۶)، علم ہیئت (۴۷)، علم انساب (۴۸) اور علم تجوید قرآن (۴۹) کی تعلیم دی جایا کرے ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاد کی عزت کی جائے۔ (۵۰)

مکہ کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بے حد لحاظ رہتا تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں اور مکہ کی رنگارنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے، جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا اور آئندہ زندگی میں آپ اسے یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ معززین مکہ میں اس کا رواج آج بھی چلا آتا ہے۔

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکہ والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لیے جو کاروان جایا کرتے تھے، اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیج دیا کریں۔ چونکہ مکہ کی معاشی زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا، اس لیے اس طریقے کی اہمیت مکہ والوں کے لیے جیسی کچھ تھی، ظاہر ہے سفر کے تجارب کا فائدہ ماسوا تھا۔

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دینی چاہیے۔ نشانہ اندازی اور پیراکی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو سزا دینے کا حکم تھا۔ (۵۱)

عورتوں کے ساتھ علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتے میں ایک دن مقرر کیا تھا، جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے،

ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے (۵۲)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے چرخہ کاتنا سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا۔ (۵۳) ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون سے خواہش کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں (۵۴)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا (۵۵)۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدھا علم عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حاصل کرو (۵۶)۔ قرآن نے بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں (۵۷)۔ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کی تربیت کرے اور اچھی تربیت کرے، پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرے، تو اسے دگنا ثواب ملے گا (۵۸)۔

رفتہ رفتہ مملکتِ اسلامیہ جو ابتداءً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی، پھیلتی گئی اور نہ صرف خانہ بدوش بدوی بلکہ شہروں میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قائم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ عہدِ نبویؐ کے اختتام پر حکومت اسلامی باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی۔ کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیج دیے جاتے تھے اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں (۵۹)۔ یمن کے گورنر عمرو ابن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے (۶۰)۔ اس میں بھی گورنر کو ہدایت ہے کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ اور علومِ اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا

Marfat.com

چاہیے اور وہ جملہ یہ ہے کہ ”لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب (۶۱) دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں۔“ گورنروں کی جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز باجماعت، روزہ اور حجِ کعبہ کے احکام شامل تھے۔

صوبہ وار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے (۶۲)۔ کوئی تعجب نہیں جو صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کیے گئے ہوں۔

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن وحدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف وصریح الفاظ میں اندھی تقلید کو بُرا ٹھہرایا گیا (۶۳) ہے اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور وفکر کرے اور کسی رسم ورواج کی پیروی محض آبائی وموروثی ہونے کی بنا پر نہ کرے (۶۴)۔ کسی اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہوگا جتنا قرآن مجید میں ہے کہ سورج، چاند، سمندر کی موجیں، دن اور رات، چمکتے ہوئے ستارے، دمکتی فجر، پودے اور حیوانات۔ تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بتائے گئے ہیں، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق علم لامتناہی ہے (۶۵)۔ اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے، اپنے برتاؤ اور کردار کے مطابق جانچا جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق وصداقت کی پیروی کی جانی چاہیے اور موروثی عقائد ورواجات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔

احادیث میں بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور ان کو سب سے بہتر انسان قرار دیا گیا ہے (۶۶)۔ حتیٰ کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے (۶۷)۔ آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جس کا اکثر حوالہ آتا ہے اگرچہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ

Marfat.com

میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے لیکن اس کا مفہوم قرآن وحدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہے یعنی ''علم حاصل کرو، اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت کا فریضہ ہے (۶۸)۔

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہے کہ ''اے خدا میں تجھ سے علم نافع اور رزق طیب اور عمل مقبول کی استدعا کرتا ہوں'' (۶۹) اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا طَيِّبًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا

آمین!

حواشی

(۱) سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد ۳ ص ۱۸۳

(۲) ''شہری مملکت مکہ'' جو رسالہ اسلامک کلچر جلد ۱۲ شمارہ ۳ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

(۳) خود ایک حدیث میں ہے ''ہم ایک امّی قوم ہیں، لکھنا اور حساب کرنا ہمیں نہیں آتا۔'' مختصر جامع بیان العلم ص ۳۵۔

معارف: اصل حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے مگر اس میں فخر کا شائبہ نہیں بلکہ قمری مہینوں کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے۔

(۴) الازمنہ والامکنہ مولفہ مرزوقی جلد ۲ ص ۸۰-۷۹۔ نیز معارف ابن قتیبہ۔

(۵) فہرست ابن ندیم س ۷۔ نیز کتاب الخراج مولفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفورڈ میں ہے (مگر غلطی سے قلاقہ کی طرف منسوب ہے)۔

(۶) ترمذی ۶۸/۴۴، ابوداؤد ۱۶/۳۹، ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۱۵، طیالسی ص ۵۷۷

(۷) ابن عبدالبر کی مختصر جامع بیان العلم ص ۲۵۔

معارف: ابن ماجہ باب فضل العلماء

(۸) سیرت ابن ہشام ص ۴۸۹

(۹) طلب علم کے لیے سفر کے سلسلے میں دیکھیے مقدمہ دارمی ص ۴۶

(۱۰) استیعاب ابن عبدالبر ص ۳۹۳، نیز نظام الحکومت النبویہ مولفہ کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد۔

(۱۱) ابن سعد ۲/ص ۱۴، بیہقی ۲/۲۹، مسند ابن حنبل ۱/۲۴۷، کتانی کتاب مذکور ۱/۴۸۔

(۱۲) کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد وغیرہ

(معارف، ابوداؤد کتاب البیوع باب کسب العلم)

(۱۳) بخاری باب سریۂ بیر معونہ۔

(۱۴) مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷

(۱۵) بخاری باب رحمۃ البہائم نیز تفسیر طبری جلد ۱۱ ص ۵۰ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیہ ۱۲۲ کی تفسیر جہاں قرآن مجید میں حکم ہے کہ پوری قوم جہاد پر نہ جائے بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کر کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۰ تا ۲۱۔

(۱۶) کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ ص ۴۳ وما بعد

(۱۷) دیکھیے مفتاح کنوز السنہ لفظ ہجرہ

Marfat.com

(۱۸) ابوداؤد جلد۲ص ۳۲ وغیرہ

(۱۹) طبقات ابن سعد باب الوفود

(۲۰) اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

(۲۱) ابوداؤد "کتاب المراسیل" نیز عینی شرح بخاری جلد۲ص ۴۶۸۔

(۲۲) ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۹۷

(۲۳) ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۱۴

(۲۴) کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ جلد۱ص ۴۱

(معارف: صحیح بخاری املاء نبوی بیان حضرت عمرؓ)

(۲۵) ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۵، نیز دیگر کتب حدیث

(۲۶) سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "عالم وفقیہ" بحوالہ بخاری ودیلمی، نیز ترمذی باب العلم۔

(۲۷) شمائل ترمذی برموقع۔

(۲۸) قرآن مجید ۲/۲۸۲

(۲۹) کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ، ۱/۲۷۵ تا ۲۷۷

(۳۰) کتانی کتاب مذکور جلد۱ص ۲۲۱ بحوالہ صحیح مسلم

(۳۱) کتانی ۱/۳۶۲ تا ۳۶۳

(معارف: خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں۔ ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیج دی ہو)

(۳۲) صحیح بخاری ۱۸۱/۵۶ کتانی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شماری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوئے تھے۔ جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا۔

(۳۳) اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے۔

(۳۴) کتانی ۱/۱۷۷ فتوح البلدان مولفہ بلاذری باب الخاتم

(۳۵) کتانی ۱/۱۲۹

(۳۶) ایضاً ۱۲۵ ومابعد

(۳۷) ایضاً ۱/۱۲۵ ومابعد، (معارف: اوپر کی دونوں باتیں صحیح حدیثوں میں نہیں)

(۳۸) طبقات ابن سعد برموقع

(۳۹) سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "علا" بحوالہ طبرانی نیز بخاری ۱۶/۱۳۷ ابوداؤد ۲۲/۳۶

(۴۰) ابوداؤد جلد۲۔ص ۱۲۹۔ اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم جلد۲ص ۸۸ میں بھی ہے۔

Marfat.com

(۴۱) کتانی ۲۲/۱ بحوالہ العقد الفرید مولفہ ابن عبدربہ وغیرہ
(۴۲) ایضاً ۲۰۳/۱ بحوالہ بخاری وغیرہ
(۴۳) جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان ''علموا'' بحوالہ ابن مندہ، ابونعیم و دیلمی۔
(۴۴) ایضاً تحت عنوان ابونعیم و ابن مندہ
(۴۵) ایضاً تحت عنوان ''تعلموا'' بحوالہ طبرانی و دارقطنی وغیرہ نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۸۰، ابوداؤد ا/ ۱۸، ابن ماجہ ا/۲۳
(۴۶) سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان ''تعلمن'' بحوالہ مالک
(۴۷) ایضاً تحت عنوان ''تعلموا'' بحوالہ ابن سنی
(۴۸) ایضاً تحت عنوان ''تعلموا من انسابکم'' بحوالہ مالک و ترمذی بیہقی و طبری۔
(۴۹) ایضاً تحت عنوان ''تعلموا من امر النجوم'' بحوالہ دیلمی۔
(۵۰) جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''تعلموا'' بحوالہ طبرانی۔
(۵۱) جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''علموا صبی'' بحوالہ ابن حنبل و ترمذی و بغوی۔
(۵۲) صحیح بخاری کتاب العلم۔
(۵۳) جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''علمو'' (نعم لهوا لمومنة فی بیتها الغزل) بحوالہ ابو نعیم و ابن مندہ
(۵۴) کتانی ۴۹ تا ۵۵/۱ بحوالہ قاضی عیاض و ابوداؤد۔
(۵۵) سیرۃ النبیؐ مولفہ شبلی طبع دوم ۴۰۷/۲
(۵۶) احادیث فضل عائشہ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے۔
(۵۷) قرآن مجید ۳۴/۳۳
(۵۸) ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۲۶
(۵۹) کتانی ۴۳/ا و مابعد
(۶۰) سیرت ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ص ۹۶۲، تاریخ طبری ص ۷۲۷ تا ص ۷۲۹، کتانی ۲۴۸ تا ۲۴۹/ا وغیرہ
(۶۱) جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان ''علموا'' (علموا ولا تعنفوا فان العلم خیر من العنف علموا ویسروا ولا تعسروا) بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن حنبل۔
(۶۲) تاریخ طبری ص ۱۸۵۲ و ۱۹۸۳ (احوال ۱۱ھ)
(۶۳) ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص ۱۶۷ باب ذم التقلید بحوالہ آیت ''اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله۔''

Marfat.com

(۶۴) طلب علم کی فضیلت کے لیے دیکھو ابو داؤد ۱، ۲/۲۴، مقدمہ ابن ماجہ ص ۱۷، مقدمہ دارمی ص ۳۱ وغیرہ، ترمذی ۲، ۱۹/۳۹

(۶۵) قرآن مجید ۵۸/ ۱۷ قرآن مجید میں قصہ موسیٰ وخضر کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایاں کرنا ہے۔

(۶۶) من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین (بخاری ۱۰-۱۳/۳، ۱۰/۹۶، ترمذی ۱/۳۹، ترمذی ۱/ ۹۶ مقدمہ ابن ماجہ ص ۱۷، مقدمہ دارمی ص ۲۳، ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۱۶، حدیث خیر الناس العلماء والمتعلمون (مقدمہ دارمی ص ۲۵ و ص ۳۱ ابو داؤد ۱، ۳/۲۴۔

(۶۷) اَلْعُلَمَاُ وَرَثَۃ الانبیاء (بخاری ۱۰/۳، ترمذی ۹/۱۳۹ ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۲۱)

(۶۸) اطلبوا العلم ولو بالصّین فانّ طلب العلم فریضۃ عَلیٰ کُلّ مُسلم و مُسلمۃ (ابن عبد البر کی کتاب العلم بیہقی کی شعب الایمان، ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہے)

(۶۹) حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مولفہ ابن عبد البر ص ۸۴۔

(نقوش لاہور - رسول نمبر - ۴ برائے جنوری ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

اطلبوا العلم و لو بالصین
(کے اسانید) کی تحقیق

فاضل محترم غازی عزیر صاحب نے مذکورہ عنوان موضوع پر لاہور کے موقر رسالہ محدث میں ایک طویل مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے جس کی آخری قسط جولائی ۱۹۸۸ء کے شمارے میں چھپی ہے اسی پر کچھ معروضہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مذکورہ مقالے کا لب لباب یہ ہے کہ اس حدیث کے اسانید میں بعض راوی ناقابل اعتبار ہیں، اس لیے یہ حدیث قابل رد ہے۔

علم ''جرح وتعدیل'' مسلمانوں کی ایک قابلِ فخر اور بے مثل ایجاد ہے اور اسی کے ذریعے سے صحیح واقعے اور من گھڑت افسانے میں امتیاز ہوتا ہے لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس علم کی کتابوں کے قابل احترام مؤلفوں نے کبھی معصومیت کا ادعاء نہیں فرمایا۔ وہ اپنی رائے اور تاثر کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں کسی شخص کے متعلق بعض وقت اختلاف رائے بھی ہوتا ہے۔ اس سے تلخ تجربے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ محترم سیرت نگار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مجھے بھی ایک بار پیش آچکا ہے۔ اس میں مبالغہ مناسب نہیں۔ وہ کسی حدیث کی صحت کو جاننے کے متعدد وسائل میں سے ایک ہے، واحد وسیلہ نہیں۔

مذکورہ عنوان پیاری حدیث کی اگر ساری معلوم روایتیں ایک ہی صحابی سے منسوب ملتیں، اور وہ ساری کی ساری ایک ہی ناکارہ راوی کے توسط سے ہم تک پہنچی

Marfat.com

ہوتیں تو بات الگ ہوتی لیکن زیر بحث حدیث ایک نہیں کم ازکم چھ سات صحابیوں رضی اللہ عنہم سے مروی ہے گویا عام حالتوں میں اسے حدیث صحیح ہی نہیں، حدیث متواتر کہا جا سکتا ہے اس کے علاوہ مختلف اسانید کے مطعون راویوں کے متعلق جرح یا اعتراض میں درجات کا تفاوت بھی ہے یوں بھی چھوٹے سے چھوٹا شخص بھی سو فیصد جھوٹ نہیں بولتا۔ کراماً کاتبین ہی جانتے ہیں کہ پیدائش سے لے کر اب تک میں کتنی بار جھوٹ بول چکا ہوں لیکن جب جب اللہ نے توفیق دی تو میں سچ بھی بولتا رہا ہوں۔ جھوٹ کی ایک قسم وہ ہے جس کو خود قرآن مجید نے ''اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ '' کے الفاظ میں جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً بھی وارد ہے۔ ایک صورت ''توریہ'' (یعنی دکھاوے) کی ہے۔ ایک اور صورت کو لیجیے کسی آدمی کو زہر دینا کیسا امر ہے؟ کسی فقیہ یا مشیرِ قانون سے پوچھو تو وہ کہے گا کہ یہ ایک جرم ہے اور حرام۔ لیکن کسی طبیب سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ وہی زہر فلاں بیماری کا علاج اور تریاق ہے۔

زیر بحث حدیث کے مطعون راوی عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی نسلوں بلکہ کئی صدیوں بعد کے لوگ ہیں اگر آئندہ خوش قسمتی سے ان سے پہلے کے راویوں (صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین وغیرہ) کی کتابیں دستیاب ہو جائیں۔ (اور الحمد للہ ہو رہی ہیں) اور ان میں یہ حدیث بھی مل جائے تو ظاہر ہے کہ متاخر زمانے کے کسی ضعیف یا جھوٹے راویوں نے بھی اسی حدیث کی روایت کی ہو تو اس سے اصل حدیث کی صحت متاثر نہ ہو سکے گی۔

علمِ جرح وتعدیل میں صرف ''روایت'' سے نہیں بلکہ ''درایت'' سے بھی کام لیا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہ روایت کے لحاظ سے کوئی حدیث صحیح قرار پائے، لیکن درایت کے لحاظ سے وہ ناممکن ہو تو حدیث کو رد ہی کرنا پڑے گا، اور خیال کرنا پڑے گا کہ راوی سے سہو ہوا ہے۔ مثلاً جس لمحے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ فرما رہے تھے۔ کسی کی چھینک سے راوی پورا جملہ سن نہ سکا اور اس طرح اسے غلط فہمی ہو گئی۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ روایۃً تو حدیث رد کرنے کے قابل ہو، لیکن دیگر شواہد موجود ہوں تو اس کو قبول کرنے میں تامل نہیں کیا جائے گا۔

Marfat.com

میں یہاں زیرِ بحث حدیث کے کچھ شواہد عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اسواق العرب کا (یعنی قبل اسلام عرب میں جو سالانہ میلے لگتے تھے۔ ان کا) بہ کثرت مورخوں نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک ابن قتیبہ کے استاذ، محمد بن حبیب کی کتاب المحبر (مطبوعہ حیدرآباد دکن، صفحہ ۲۶۵ تا ۲۶۶) میں لکھا ہے:

"ثُمَّ سُوقُ دَبَا وَهِيَ اِحْدٰى فَرْضَتَيِ الْعَرَبِ يَأْتِيهَا تُجَّارُ السِّنْدِ وَالْهِنْدِ وَالصِّينِ، وَأَهْلُ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ فَيَقُوْمُ سُوْقُهَا اٰخِرَ يَوْمٍ مِّنْ رَجَبٍ"

"پھر دبا کا میلہ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ وہاں سندھ، ہندستان، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے تھے اور یہ کہ اس کا میلہ ماہِ رجب کے آخری دن لگتا تھا۔"

اس کے ساتھ مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (جلد۴ صفحہ ۲۰۶) کو پڑھیے۔ وہاں قبیلہ عبدالقیس کے وفد کا ذکر ہے، جو اسی علاقے میں رہتا تھا اور اپنے اسلام کے اعلان کے لیے مدینہ آیا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے سردار سے اس کے ملک کے بعض آدمیوں اور بعض مقاموں کے متعلق کچھ دریافت فرمایا تو اس نے بے ساختہ کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ ہمارے ملک سے ہم سے بھی زیادہ واقف نظر آتے ہیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: "میں نے تمہارے ملک کو روندا ہے اور مجھے وہاں بہت دن رہنے کا موقع ملا ہے۔"

ان دونوں تذکروں کو ملائیں تو گمان ہوتا ہے کہ غالباً اسلام سے قبل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مالِ تجارت لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس علاقے کو تشریف لے گئے تھے۔ تعجب نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں چینی تاجروں کو دیکھا اور ان کے سامان مثلاً ریشم، چینی برتن وغیرہ کو دیکھ کر کاریگری سے متاثر ہوئے ہوں، اور ان سے پوچھا ہو کہ تمہیں اپنے ملک سے یہاں (مشرقی عرب تک) آنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ اور اسی تاثر کے باعث بعد میں فرمایا ہو کہ: "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ"

اس استنباط کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ دبا کے میلے میں چینی ہی نہیں ہندی

Marfat.com

اور سندھی تاجروں کا بھی ذکر ہوا ہے۔ حدیثِ ذیل سے (جو ابن ہشام طبری، ابن سعد وغیرہ بہ کثرت مولفوں نے بیان کی ہے اور جو قبیلہ عبدالقیس کے مذکورہ بالا وفد کی ہمعصر ہے) کون واقف نہیں؟ ۱۰ھ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن الولید کو یمن بھیجا۔ انہوں نے اطلاع بھیجی کہ قبیلہ بلحارث (بنی الحارث بن کعب) مسلمان ہو گیا ہے، تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خط بھیجا کہ اب مدینہ واپس آ جاؤ اور نو مسلم قبیلے کے چند لوگوں کو بھی ساتھ لاؤ۔ جب وہ آئے تو دور سے دیکھ کر پوچھا۔

"مَنْ هٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ کَاَنَّهُمْ رِجَالُ الْهِنْدِ؟"

"یہ کون لوگ ہیں جو اہلِ ہند کے سے معلوم ہوتے ہیں؟"

اس کا پس منظر بھی وہی دبا کا میلہ ہونا چاہیے، جہاں تیس چالیس سال قبل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہندوستانی بنیوں کو دیکھ چکے تھے۔

ان شواہد کی موجودگی میں یہ ناممکن نہیں کہ بعض ضعیف راویوں کی موجودگی کے باوجود "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْنِ" کی حدیث (جو قرینِ قیاس ہے) صحیح ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ماہنامہ محدث لاہور- اگست، ستمبر ۱۹۸۸ء)

Marfat.com

اکابرین

Marfat.com

حضرت علیؓ بن ابی طالب

تاریخ اسلام کے کسی شخص کی سوانح عمری لکھنا غالباً اتنا دشوار نہیں جتنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، کیونکہ اس میں تعلق بد قسمتی سے عقائد سے ہو گیا ہے، اور سنی، شیعہ، معتزلی، اور اباضی (خارجی) مورخ بھی بے شعوری میں جذبات سے اتنے متاثر نظر آتے ہیں کہ آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد بھی دامن سمیٹ کر کوئی ایسی چیز لکھنا آسان نہیں جسے سب قبول کر سکیں۔ اختلافی چیزوں سے سکوت کرنے میں سوانح عمری نامکمل ہو جاتی ہے، اور تحقیق حق کے نتائج کو بیان نہ کرنا بد دیانتی ہوتی ہے۔ بہرحال ہم امکانی حد تک کوشش کریں گے۔

یہ ابو طالب بن عبدالمطلب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کے بیٹے، پیغمبر اسلام کے چچازاد بھائی اور داماد، اور سابقین اوّلین میں سے تھے۔ ولادت کہتے ہیں اس وقت ہوئی جب حاملہ ماں جوف کعبہ کے اندر تھی (۱) سنی انہیں خلفائے راشدین میں بطور خلیفۂ چہارم داخل کرتے ہیں۔ شیعوں کے ہاں ان کو خلیفۂ اول ہونے کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ معتزلہ ان کی فضیلت کے بارے میں سنیوں سے اختلاف کرتے ہیں۔ غالی خارجی ان کو اسلام ہی سے خارج کرتے ہیں۔

یتیم پیغمبر اسلام نے ابو طالب کے گھر میں پرورش پائی اور سن شعور کو پہنچے تو چچا کو تجارتی کاروبار میں مدد دیتے رہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کے بعد چچا کا مکان ترک کیا اور بیوی کی تجارت میں شریک اور کارندہ ہو گئے۔ یہ تو واضح نہیں کہ پھر چچا کی دکان بھی چلاتے رہے یا نہیں، لیکن چچا کا مالی بوجھ کم کرنے کے لیے اس کے ایک بیٹے، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کو اپنی تبنیت میں لے لیا اور سفارش کر کے ایک دوسرے

بیٹے، جعفر کو عباس بن عبدالمطلب کی تبنیت دلا دی۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سانولے اور پستہ قد تھے۔ زمانہ خلافت میں کوفہ میں لوگ ان کو دیکھتے تو "بزرگ اشکنب (شکم) آمد" کا فقرہ کسا کرتے تھے (۲)۔ بڑا سر، ذہین اور سورما سپاہی تھے۔ روحانی لگاؤ بھی بہت تھا، اور شیعہ ہی نہیں سنیوں کے ہاں بھی متعدد سلسلہ ہائے طریقت انہیں کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل ہوتے ہیں، جیسے قادریہ، سہروردیہ۔

ان کا بعثت نبوی کے وقت علی العموم نابالغ ہونا سمجھا جاتا ہے۔ ابن سعد (طبقات ۳-۱، ص ۱۳) کے مطابق "گیارہ، دس، نو، یا نو سے بھی کم سال کے" تھے۔ ممکن ہے بعثت کے وقت تقریباً نو سال کے ہوں، اور فترت کے بعد جب تبلیغ شروع کی تو گیارہ ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں یہ بھی مسلمان ہوئے ہوں۔ ابن کثیر کے مطابق تو ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ یا ۱۶ سال کی عمر میں اسلام لائے تھے۔ ابتدائی مسلمانوں میں سے ایک کا بیان ہے: میں نے ایک دن دیکھا کہ ایک شخص اٹھک بیٹھک کر رہا ہے اور اس کے دائیں ایک لڑکا، اور پیچھے ایک عورت بھی اقتدا کر رہے ہیں۔ دریافت پر لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ان کا متبنیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور ان کی بیوی خدیجہ ہیں اور ایک نئے دین پر عمل کرنے لگے ہیں (۳)۔

طبری نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کی دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک (ص ۱۱۶۴) یہ کہ وہ شروع ہی سے مسلمان ہو گئے تھے اور چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دن ابو طالب نے دیکھ لیا اور پوچھا: کیا کر رہے ہو؟ پھر منع نہ کیا بلکہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اچھی بات ہی کا مشورہ دیتے ہیں اس لیے برابر یہی کیا کرو (۴)۔ دوسری روایت (طبری ۲، ۱۱۷۱ تا ۱۱۷۳) کے مطابق ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے تبلیغ کی اور کہا کہ کون ہے جو مسلمان ہو؟ وہ میرا بھائی، وصی (نافذ کنندۂ وصیت) اور تم میں میرا خلیفہ (نائب) ہوگا۔"...... النسائی فی الخصائص کی روایت میں، جیسا کہ ازالۃ الخفا ۲-۲۵۲ میں نقل ہوا ہے، الفاظ یہ تھے: میرا بھائی اور صاحب (رفیق) اور تم میں میرا وارث ہوگا"...... حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: کسی نے بھی اسے قبول کرنا نہ چاہا۔ میں اس وقت سب سے کم سن تھا، میری آنکھوں میں (آشوب

Marfat.com

چشم کی وجہ سے) زیادہ گندگی تھی اور میری پنڈلیاں سب سے زیادہ نحیف تھیں۔ میں اٹھا اور بولا: ''میں، اے اللہ کے نبی، اس کام میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وزیر (بوجھ اٹھانے میں شریک) رہوں گا''۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری گردن پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے، اس لیے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو''۔ اس پر حاضرین ہنسنے لگے اور کہا: ابو طالب (مبارک ہو)، محمد کہہ رہا ہے کہ اب تمہیں بھی اپنے بیٹے کی بات سننی اور ماننی ہوگی۔ اس طنز کی وجہ سے ابو طالب نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس روایت میں ایک تو الفاظ کو اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی معنوں میں لینا چاہیے کہ ابھی اصطلاحیں وجود میں نہ آئی تھیں۔ دوسرے وصی اور موصیٰ لہ ایک نہیں ہوتے؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موصیٰ لہ کون تھا، معلوم نہیں، اور تیسرے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً خلیفہ بن گئے، یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر خلیفہ بنیں۔ اس بنا پر ہم نے ''جانشین'' کی جگہ ''نائب'' ترجمہ کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خلافت یا نیابت اس وقت کی کارکردگی کے مطابق ہوگی، اور اس وقت تک سلطنت اور حکومت کا سوال نہ تھا، بلکہ روحانی تعلیم تھی، اور روحانی امور کی مملکت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ بلافصل سنیوں کے ہاں بھی ہیں۔

مواخات قبل ہجرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا بھائی بنایا، جس طرح ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ ہجرت کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سہل بن حنیف اوسی انصاری کا بھائی بنایا گیا، اور ان دونوں میں دوستی ہمیشہ برقرار رہی۔ چنانچہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلافت کے لیے کوفہ روانہ ہوئے تو سہل ہی کو مدینہ کا گورنر بنایا، پھر شام کا گورنر نامزد کر کے دمشق پر قبضہ کرنے کا حکم دیا، مگر معاویہ کی فوجوں نے پیش قدمی کی اور ان کو تبوک سے پسپا کر دیا (۵)۔ پھر جنگ صفین میں یہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج میں نظر آتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مشرکین مکہ کی جو امانتیں تھیں، وہ مناظر احسن گیلانی کے گمان میں مضاربت کے اصول پر نفع آور تجارتی حصہ داری سے متعلق ہوں گی۔ بہرحال جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ جانے لگے تو یہ امانتیں واپس کرنے

Marfat.com

کا کام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے سپرد کیا اور کہا کہ تین دن بعد یہ مالکوں کو واپس پہنچا کر مدینہ آ جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امانت داری مخالفین کو بُری لگتی ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے جدید ایڈیشن میں مادۂ علی میں کوئی وجہ بتائے بغیر لکھا ہے: ''یہ مختلف وجوہ سے غیر قرین قیاس ہے''۔

ایک عجیب واقعہ نسائی میں بلا تاریخ ہے (۲)۔ اسے ہجرت کی رات ہی کا واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کعبہ گئے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کی چھت پر کے ایک تانبے کے مضبوط نصب شدہ بت کو اکھاڑ کر نیچے پھینک دیا اور وہ کچھ ٹوٹ بھی گیا، پھر دونوں چپکے سے تیز تیز وہاں سے واپس ہو گئے۔ کعبہ کی چھت پر ہبل نصب تھا، کیا وہی مراد ہے؟

ہجرت کے بعد صفر سنہ ۲ میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر فاطمہ سے نکاح کیا، رخصتی چند ماہ بعد ہوئی، بلاذری (انساب، مخطوطہ استانبول ۱-۲۶۵) کے مطابق آپ کا حلیہ بی بی فاطمہ کو پسند نہ تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی کہ وہ ''أکثرهم علما و أعظمهم حلما''۔ کئی بچے ہوئے جن میں امام حسن اور امام حسین ممتاز ہیں۔ ایک بیٹی ام کلثوم سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں نکاح کیا۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوجہل کی نومسلم بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ فاطمہ کا دل دُکھے گا۔ اس لیے بی بی کی وفات تک وہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرتے رہے۔ شروع میں گھر داماد رہے۔ بی بی فاطمہ اور حضرت عائشہ کے کمروں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اس میں ایک کھڑکی تھی جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لڑکیوں کو دیکھ اور ان سے بات چیت کر سکتے تھے۔ ام کلثوم کے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کے بعد فاطمہ وہاں تنہا رہ گئیں۔ پھر شوہر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی وہیں رہنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے سارے حجروں کی طرح، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کمرے کا بھی صرف ایک دروازہ تھا جو اولاً مسجد کے صحن میں کھلتا تھا، پھر تبدیل قبلہ کے بعد مسجد کی

اولین صفوں اور مسقف حصے میں کھلنے لگا۔ ان کمروں میں مقابل سمت میں دروازے نہ تھے۔ غسل وغیرہ کے لیے باہر نکلنا چاہتے تو مسجد میں سے گذرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اسی لیے، تبدیل قبلہ پر لوگوں کے قبلے کی دیوار میں کھلنے والے سارے دروازے بند کرائے گئے، اور مسجد میں حالت جنابت میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا تو اس سے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مستثنیٰ کرنا ناگزیر تھا (جیسا کہ ترمذی وغیرہ نے صراحت کی ہے)۔ عورتیں اپنے کمروں کے اندر ٹب میں بیٹھ کر نہا لیا کرتیں (حضرت حفصہ کے ٹب میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض موت کے زمانے میں سات مختلف کنوؤں کے پانی سے نہلانا سب کو معلوم ہے): بنی قینقاع کے اخراج پر جب ان کے مکان خالی ہوئے تو ان میں سے ایک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسوں اور ان کے والدین کو دیکھنے وہیں جایا کرتے تھے (۷)۔ تبدیل قبلہ کے بعد پبلک کے مسجد میں کھلنے والے جو دروازے بند کرائے گئے، وہ صرف قبلہ رخ دیوار میں معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ وفات نبوی سے عین قبل جب لوگوں کے دروازے مکرر بند کرائے گئے (اور ان میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دروازہ مستثنیٰ کیا گیا)، تو ان دونوں واقعات میں تطبیق کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ پہلے حکم کو قبلہ رخ دیوار سے متعلق کیا جائے، اور دوسرے حکم کو باقی مسجد سے ورنہ پہلے حکم کے بعد نئے دروازے کھل نہ سکتے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوق بنی قینقاع میں منتقلی کے بعد ان کا تخلیہ کردہ کمرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زور یعنی ملاقات گاہ بن گیا، جیسا کہ سمہودی میں ہے۔ یہ حضرت عائشہ کے کمرے سے متصل تھا اور شروع میں وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیاں رہتی تھیں۔

سنہ ۲ کے غزوۂ بدر میں انہوں نے سفید صوف کا طرہ لگایا تھا (ابن سعد ۳-۱، ص ۱۴)۔ اس موقع پر اور ہر دیگر جنگ میں بہ کثرت دشمنوں کو تہ تیغ کیا۔ تبوک میں ان کو ساتھ لینے کی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مدینے میں نائب کی حیثیت سے چھوڑا۔ لوگوں (غالباً منافقوں) نے طنز کیا کہ تم اچھے سپاہی نہیں ہو اس لیے تمہیں عورتوں

بچوں میں چھوڑا ہے۔ یہ بھاگے ہوئے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیمپ میں گلہ کرتے ہیں تو حضور فرماتے ہیں: ''کیا تمہیں پسند نہیں کہ میرے پاس تمہارا وہی رتبہ ہو جو حضرت ہارون کا حضرت موسیٰ کے پاس تھا؟ بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں (۸) (کہ کوہ طور کے اعتکاف کے زمانے میں وہ بنی اسرائیل میں نائب بن کر رہے تھے)۔ مگر راز کی وجہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پبلک میں بتا نہیں سکتے تھے کچھ اور معلوم ہوتی ہے: مشہور منافق ابن ابی کا برتاؤ ان دنوں بہت مشتبہ ہو گیا تھا، حتیٰ کہ وہ تبوک کی اس مہم میں کچھ دور شریک رہ کر مدینہ واپس آ گیا تھا؛ جیسا کہ مسعودی نے (التنبیہ والاشراف میں) صراحت کی ہے۔ ان حالات میں پیشبندی کے لیے ضرورت تھی کہ مدینہ میں ایک جری اور قابل اعتماد فوجی افسر موجود رہے۔ تبوک سے پہلے غزوۂ خیبر میں انہوں نے ایک مقامی مستحکم قلعہ قصر مرحب کو بھی فتح کیا۔ یہ اب تک معروف اور دشوار گزار پہاڑی کی چوٹی پر ہے، نیچے سے اوپر چڑھنے والوں کو دشمن آسانی سے پتھراؤ کر سکتا تھا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک بڑے دروازے کو چھتری یا سپر بنا کر پیش قدمی جاری رکھی اور کامیاب رہے۔ خیبر کی مدد کے لئے فدک والے آ رہے تھے۔ ان کو روکنے کے لیے بھی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا گیا لیکن بلاذری (انساب، طا مصر، ف ۷۹۳) نے جو یہ واقعہ بیان کرتا ہے لکھا ہے کہ غزوۂ خیبر محرم میں ہوا اور فدک کی مہم شعبان میں ہوئی ...... غالباً یہ وقت شماری کے دو مختلف مروجہ طریقوں کا نتیجہ ہے کہ ایک میں اہلِ مکہ کے کبیسے کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور دوسری خالص قمری تقویم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں ہرقل کو بھیجے ہوئے مکتوب نبوی میں بھی یہی فرق ہے کہ سفیر محرم ۷ میں جاتا اور چھ ماہ قبل جمادی الآخرہ سنہ ۶ میں واپس آتا ہے۔ (اس بحث اور تقویمی حل کے لیے دیکھئے میری فرانسیسی سیرت نبوی میں باب مکتوب نبوی بنام ہرقل)۔

فتح مکہ کی تیاری کے زمانے میں حاطب بن ابی بلتعہ نے بھولے پن سے اہل مکہ کو اطلاع بھیجی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ بر عورت کے تعاقب کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا۔ فتح مکہ کے بعد بنی خذیمہ میں خالد بن ولید نے غلطی سے کچھ خونریزی کی تو تلافی کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی بھیجے گئے۔

Marfat.com

قبیلۂ طئی میں پیشہ ور لٹیرے بہت تھے۔ ابن سعد وغیرہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک مہم کا ذکر کرتے ہیں جو تبوک کے غزوے سے پہلے بھیجی گئی تھی اور جس میں انہوں نے وہاں کے بت خانے کے چڑھاوے بھی بطور مال غنیمت لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیے تھے۔ نہ اس کی ٹھیک تاریخ معلوم ہے اور نہ وجوہ و اسباب۔

سنہ ۹ میں نجران کے عیسائی مدینہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کرنے کو کہا کہ ''جھوٹے اور اس کے کنبے پر خدا کی لعنت ہو''۔ یہ ام المومنین ام سلمہ کے مکان میں ہوا۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شریک کیے گئے۔ مگر نجرانی کترا گئے۔

سنہ ۹ میں حج کے موقع پر اس اعلان کا فریضہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کیا گیا تھا کہ اب آئندہ غیر مسلم کعبہ کے حج کے لیے نہ آسکیں گے، اور یہ کہ جن غیر مسلم قبائل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معین مدت کے لیے حلفی کے معاہدے کیے تھے وہ چار ماہ بعد ختم سمجھے جائیں گے۔ اس سے ان قبائل کو تشویش ہوئی کہ مزید دیر کیے بغیر مسلمان ہو جائیں۔

رمضان سنہ ۱۰ میں انہیں یمن بھیجا گیا۔ وہاں لوگوں نے جنگ نہ کی اور ان کی تبلیغ سے سارا قبیلہ ایک ہی دن میں مسلمان ہو گیا، اور زکوٰۃ بھی دی (۹) وہاں سے فارغ ہو کر یہ مکہ گئے اور حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ یمن سے واپسی میں راستے میں انہوں نے ساتھیوں کو ناراض کر دیا تھا (ان ساتھیوں نے زکوٰۃ کے سرکاری کپڑوں کو لے کر حج کا احرام بنایا تھا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ کپڑے واپس کرنے کا حکم دیا تھا)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ واپسی کے زمانے میں رابغ کے قریب غدیر خم کے پڑاؤ کے وقت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید کی اور بتایا کہ سرکاری مال میں خیانت نہیں کرنی چاہیے۔ اور اسی خطبے میں ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کا مشہور جملہ بھی فرمایا تھا (جس کے دستوری مفہوم کے لیے دیکھو میرا مضمون Constitutional Problems in Early Islam)۔ شیعہ

Marfat.com

مکتب خیال اس جملے کو ولی عہدی سمجھتا ہے لیکن خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خیال نظر نہیں آتا: نہ صرف خلفائے ثلاثہ کے انتخاب کے وقت بلکہ اس وقت بھی نہیں جب وہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی خلافت جتانے کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو خط و کتابت ہوئی وہ شیعی کتاب نہج البلاغة للشریف الرضی میں محفوظ ہے۔ ان خطوط میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی فضیلت اور ترجیح کے سارے استدلال بیان کرتے ہیں بجز اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ولی عہد نامزد کیا ہو۔

غزوات میں اگر یہ علمبردار ہوتے تو ''اثنائے سفر میں میسرہ العبسی اسے اٹھائے لے جاتے اور جب معرکہ شروع ہوتا تو اس وقت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے لے لیتے'' (١٠) کہتے ہیں کہ ایک دن یہ ایک اہم سرکاری کام میں مشغول تھے اور آفتاب غروب ہونے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور آفتاب رُک گیا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز قضا نہ ہوئی۔

خلافت صدیقی میں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کے وقت یہ سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود نہیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بعد کی بیعت عامہ میں بھی وہ شریک نہ ہوئے، اور بعد میں وجہ بتائی کہ قرآن جمع کرنے میں مشغول تھا (١١) مگر اس کی تفصیل معلوم نہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کب کی: بیعت عامہ کے تھوڑی دیر بعد یا چھ ماہ بعد (١٢) لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت عامہ پر جب بی بی فاطمہ اپنے دادا حضرت عباس کے ہمراہ اور یقیناً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اجازت سے ان کے پاس جا کر گفتگو کرتی ہیں تو یہ نہیں کہتیں کہ خلافت کا حق میرے شوہر کو ہے، بلکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث میں اپنا حصہ اور فدک کی جاگیر مانگتی ہیں، یعنی وہ اور عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جائز خلیفہ اور مختارِ کل تسلیم کرتے

Marfat.com

ہیں اور اسی حیثیت میں ان سے اپنے مقدمے کے لیے رجوع کرتے ہیں (۱۳)۔ طبری اور ابن کثیر کے مطابق بی بی نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خواہش یہ کی کہ ان کے شوہر کو فدک کا ناظر بنائیں۔ ابوالحسین المعتزلی نے لکھا ہے: ''مگر صحیح یہ ہے کہ بی بی نے فدک میراث نہیں بلکہ بطور نحلہ یعنی ہبہ مانگا تھا'' (۱۴)۔ بخاری نے لکھا ہے کہ بی بی نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مال میں میراث مانگی جو بطور فی صرف خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھا...... یعنی خیبر، فدک اور خود مدینہ کی زمینیں...... جہاں تک مدینہ کی اراضی کا تعلق ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشترکہ تصرف میں دے دیں لیکن خیبر و فدک انہوں نے ان کو نہ دیا اور کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ یعنی سرکاری مصارف کے لیے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت بوقت پیش آنے والے اخراجات اور اتفاقی مصارف کے لیے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس شخص کے لیے دیے ہیں جو آپ کے بعد ولی الامر (خلیفہ) بنے۔ بہرحال ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں آپ لوگوں کو جو دیتے تھے میں بے کم و کاست جاری رکھوں گا، بی بی کو ناگوار گزرا۔ چند ماہ بعد جب بی بی کی وفات ہوئی تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر کیے بغیر راتوں رات دفن کر دیا۔

خلافت صدیقی میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شروع سے پورا تعاون کرتے رہے، اور مشوروں میں چاہے سیاسی اور نظم و نسقی ہوں یا فقہی اور علمی پورے شریک رہے۔ مرتدین کے مدینہ پر یورش کرنے کا خطرہ پیدا ہوا تو ابوبکر نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن مسعود کو مدینے کے بیرون شہر سے آنے کے راستوں کی حفاظت کرنے بھیجا تھا (۱۵) ایک مرتد سردار ربیعہ بن بجیر التغلبی کو جب خالد بن الولید نے شکست دی تو اس کی بیٹی کو لونڈی بنا کر مدینہ بھیجا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خریدی اور اسے ام ولد بنایا (۱۶)۔

خلافت فاروقی میں:

ابن سعد (۳-۱، ص ۱۹۶) کے مطابق علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوبکر سے ان کے بستر مرگ پر، گمنام شخص کی بطور ولی عہد بیعت لینے پر آ کر پوچھا کہ کسے نامزد کیا ہے؟ کہا: عمر کو۔ دونوں نے کہا: خدا کو کیا جواب دو گے؟ کہا: کیا تم مجھے خدا سے ڈراتے ہو؟ میں اللہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تم دونوں سے زیادہ جانتا ہوں، اور میں اللہ سے کہوں گا کہ میں نے تیرے سب سے بہتر بندے کو خلیفہ نامزد کیا۔

مگر خلیفہ بننے کے بعد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا برتاؤ ایسا رہا کہ کسی کو شکایت نہ رہی۔ دونوں ایک دوسرے کی انتہائی عزت کرتے تھے، اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی چھوٹی بیٹی ام کلثوم بھی عمر سے بیاہ دی۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی رائے کی بہت قدر کرتے تھے اور ایک آدھ بار تو فرط تعریف سے کہا: ''علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا'' (۱۷) اسلامی تقویم کو ہجرت سے شروع کرنے کا مشورہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی نے دیا تھا (۱۸)۔ شراب نوشی کی سزا بڑھا کر اسی درے کرنے میں بھی علی کا مشورہ شریک تھا (۱۹)۔ اہلِ قومس اور طبرستان وغیرہ نے جوابی حملہ کیا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشاورت پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ساری شامی فوج ادھر بھیجیں تو قیصر حملہ کر دے گا، ساری یمنی فوج بھیجیں تو حبشہ حملہ کر دے گا، اس لیے ہر جگہ سے وہاں کی ایک تہائی فوج بطور کمک بھیجی جائے۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میری بھی یہی رائے تھی اور میں اوروں کا اتفاق چاہتا تھا (۲۰)۔ بنی تغلب کے عیسائیوں سے لی جانے والی رقم کو جزیہ کی جگہ صدقہ کا نام بھی بمشورہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیا گیا (۲۱) مگر اختلاف بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہر سال کی آمدنی اسی سال ختم کر دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان کی رائے پسند کر کے دیوان قائم کیا (۲۲) دیوان بننے لگا تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر سے کہا: ''آپ اپنے سے شروع کریں''، مگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور حضرت عباس سے شروع کیا (۲۳)۔

Marfat.com

خلافت عمری میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کے قاضی رہے (۲۴)۔ اپنے بیرون عرب سفروں میں عمر نے کئی بار علی کو نائب بنا کر چھوڑا (۲۵)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو سپہ سالار بنا کر شام بھیجنا چاہا مگر خود انہوں نے پسند نہ کیا۔

خلافتِ عثمانی میں:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قاتل نے مہلک طور پر زخمی کیا تو انہوں نے اپنے جانشین کو خود معین کرنے کی جگہ ایک شوریٰ (کمیٹی) کے سپرد کیا کہ اپنے ہی میں سے کسی کا انتخاب کر لے۔ اس وقت عشرہ مبشرہ میں سے سات زندہ تھے جن میں سے سعید بن زید حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رشتہ دار تھے اس لیے وفور تقوٰی سے ان کو شوریٰ سے خارج رکھا۔ باقی چھ رائیں اگر آدھوں آدھ بٹ جائیں تو گتھی دُور کرنے کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتواں رکن اس صراحت سے بنایا کہ وہ صرف گتھی کی صورت میں رائے دیں، اور ان کی رائے بھی معین کر دی کہ اس طرف ہو جدھر عبدالرحمٰن بن عوف ہوں۔

شوریٰ میں اولاً سوال یہ کیا گیا کہ کون امیدوار نہیں ہے؟ ایسے چار شخص نکلے۔ اس پر امیدواروں سے کہا گیا کہ کسی ایک غیر امیدوار کو پنچ بنالیں اور فیصلہ اس پر چھوڑ دیں۔ اس کے لیے عبدالرحمٰن بن عوف چنے گئے اور طبری کے الفاظ میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حلف لے کر کہا کہ ہم اس شخص کی بیعت کریں گے جس کی تم بیعت کرو حتیٰ کہ اگر تمہارا ایک ہاتھ تمہارے ہی دوسرے ہاتھ کی بیعت کیوں نہ کرے۔ مگر عبدالرحمٰن نے اس سے کوئی بے جا فائدہ نہ اٹھایا بلکہ کئی دن شہر میں دورہ کیا، مقامی اور مسافر، بوڑھے اور بچے، مرد اور عورت ہر کسی سے رائے پوچھی اور سوائے دو افراد کے سارے لوگوں نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ترجیح دی۔ پھر انہوں نے خلوت میں عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اقرار لیا کہ اگر اس کا انتخاب نہ ہو تو وہ فوراً منتخبہ شخص کی بیعت کر لے گا: آخر میں مسجد نبوی میں مجمع عام میں منبر پر سے علی سے پوچھا: اگر تمہارا انتخاب کروں تو کیا قرآن و حدیث اور نظائر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر

Marfat.com

رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر عمل کرو گے؟ انہوں نے کہا: قرآن و حدیث پر بے شک لیکن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظائر پر امکان کی حد تک۔ اسی سوال پر عثمان نے غیر مشروط طور پر ہاں کہا۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عوف نے انہیں کا انتخاب کیا، اور لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے (۲۶)۔

اس زمانے میں اولین مسئلہ عبیداللہ بن عمر کا تھا جنہوں نے اپنے باپ کے قتل کے سلسلے میں قاتل کے بعض ہم وطن (ایرانیوں) کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ ان کے ہتھیار مہیا کرنے اور شریک سازش ہونے کی اطلاع ملی تھی، مگر ایسے ایک شخص، جفینہ، کی ایک ننھی بچی کو بھی قتل کر دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قصاص کے رائے دی (۲۷)۔ مگر رائے عامہ کے دباؤ پر کہ کل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قتل ہوئے آج ان کے بیٹے کو قتل کیا جا رہا ہے، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان ایرانی مقتولوں کے رشتہ داروں کے اتفاق سے خون بہا پر مسئلہ ختم کیا، اور خون بہا اپنی جیب سے دے دیا۔

خلیفہ ہوتے ہی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "لوگوں کی تنخواہوں میں سالانہ ایک سو درہم اضافہ کرنے کا حکم دیا، اور صوبہ جاتی شہروں سے (بیعت کیلیے) مدینہ وفد بلائے اور ان کی ضیافت کی، اور سب سے پہلے انہیں نے اس عمل کا آغاز کیا (۲۸)"۔ ابتدائی پانچ چھ سال ہردلعزیزی کے تھے، وہ خزانہ سے کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے بلکہ داد و دہش ہی کرتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اولین اعتراض حج کے زمانے میں منیٰ میں قصر کی جگہ کامل نماز پڑھنے پر ہوا۔ لوگوں کے کہنے پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے گفتگو کی مگر جواب سے وہ مطمئن نہ ہوئے (۲۹)۔ ممکن ہے انہوں نے سہو اور بے خیالی میں چار رکعتیں پڑھا دی ہوں مگر انہوں نے کہا کہ ان کے اجتہاد میں وہ چار رکعت پڑھ سکتے ہیں۔

پھر حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ شروع ہوا۔ ان کی رائے تھی کہ ایک رات اور ایک دن سے زیادہ کا غذائی ذخیرہ گھر میں رکھنا حرام ہے، اور سونا اور چاندی بھی گھر میں رکھنا ناجائز ہے۔ مگر یہ لفظی تعمیل تھی کیونکہ تنخواہ ملتے ہی خود ابوذر دراھم اور دنانیر کو

Marfat.com

تانبے وغیرہ کے فلوس میں تبدیل کر لیتے تھے اور اس کو گھر میں رکھنے میں حرج نہ سمجھتے تھے۔
جب تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندہ تھے، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ چپ رہے مگر اب اپنی رائے کو شدّ ومدّ سے ظاہر کرنے لگے اور لوگوں نے شکایتیں کیں تو مجبوراً ان کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم دیا کہ صحرا میں زبدہ نامی مقام پر رہو اور وہاں سے کہیں نہ جاؤ۔ ان کے مدینہ سے جاتے وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ان کو وداع کرنے کے لیے مشایعت کی، جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت پر محمول کی جاسکتی ہے۔

سنہ ۳۴ میں ابن سبا کی سازش شروع ہوئی: اسی یہودی نے اس زمانے میں اسلام قبول کیا تھا پھر شہر شہر پھر کر کارستانی کی تنظیم کی (۳۰)، جو یہ تھی ہر شہر سے دوسرے شہر کے ایجنٹ کو خط جائے کہ ہمارے ہاں اسلام باقی نہیں، گورنر علی الاعلان بدکاری کرتے ہیں، نماز کوئی نہیں پڑھتا وغیرہ۔ یہ ایجنٹ شہر کی کسی چھوٹی مسجد میں ایسے خطوط وقتاً فوقتاً سب کو پڑھکر سناتا۔ سارے لوگ کہتے: الحمدللہ ہمارے شہر میں ایسا بالکل نہیں ہے، اور خیال کرتے کہ ساری دنیائے اسلام بگڑ گئی ہے، صرف ان کا ایک شہر اچھا ہے اور ہر جگہ ایسا ہی ہوتا۔ رفتہ رفتہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اطلاع آئی تو انہوں نے صحابہ کے مشورے سے ایک غیر جانبدار کمیشن بھیجا کہ ساری مملکت کا دورہ کر کے تحقیقات کرے۔ اس کا پول تو کھل گیا لیکن کچھ بھولے لوگ کمیشن کو سرکاری کمیشن سمجھ کر اپنی غلط فہمیوں میں غلطاں رہے تو حیرت کی جگہ نہیں، خاص کر جب یہ نکتہ ابن سبا کے ایجنٹ ہر وقت یاد دلاتے رہتے۔ چنانچہ کمیشن کے ایک رکن عمار بن یاسر ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کی شہادت کی بنا پر مصر کے گورنر کے متعلق مطمئن نہ ہوسکے۔ مزید برآں کمیشن کا بیان مدینے میں شائع ہوا، بہ ظاہر اضلاع کو اس کی اطلاع نہ بھیجی گئی اور وہاں بدگمانیاں برقرار رہیں۔

ایک مرتبہ شاکیوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف الزام لگا کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گفتگو کے لیے مامور کیا۔ وہاں بھی بے بنیاد باتیں تھیں (۳۱)۔
ان سازشیوں نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام سے سارے اضلاع میں خط بھیجے کہ عثمان رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے خلاف مسلح بغاوت کرو (۳۲)۔ بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق مسروق کی ایسی ہی روایت طبری کے ہاں بھی ہے۔

اب سنہ ۳۵ھ میں سبائیہ لوگوں نے خانہ جنگی کی کوشش کی۔ اس کے لیے بصرے کے لوگ طلحہ کے پاس، کوفی لوگ زبیر کے پاس اور مصری لوگ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ تم عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہتر ہو۔ ہماری بیعت قبول کرو ہم تمہیں خلافت دلاتے ہیں۔ ان تینوں نے ظاہر ہے دھتکار کر ان کو ان کے اپنے اپنے ملک کو واپس جانے کا مشورہ دیا (۳۳)۔ مسلمان مؤرخ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے رہے ہیں کہ سبائیہ میں پھوٹ تھی، لیکن ہماری رائے میں ابن سبا کا ماسٹر پلان ہی یہ تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ نہ صرف عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قتل ہوں بلکہ اس کے بعد طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی خانہ جنگیاں ہوں۔ مذکورہ بصری، کوفی اور مصری وفد مدینہ سے روانہ تو ہو گئے لیکن تھوڑی دُور جا کر پھر واپس آئے اور کہا کہ ہمارے قتل کے احکام سرکاری ڈاکیوں کے پاس سے برآمد ہوئے ہیں (۳۴)۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی خفیہ گفتگو ہوئی تھی، ان کے نام حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیسے معلوم ہو گئے، اور پھر سارے ہی ڈاک لے جانے والے کیسے پکڑے گئے؟

ابن حجر (المطالب العالیہ، نمبر ۴۴۳۸) نے ابن راھویہ کی یہ اہم اور معنی خیز روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مصری گورنر کو بدلنے پر رضامندی ظاہر کی تو مصری وفد خوش خوش واپس ہو گیا، لیکن جب وہ مصر کے راستے میں تھا تو ایک اونٹ سوار (راکب) ملا جو ان کے قریب سے گزرتا پھر ان کو چھوڑ کر دور ہو جاتا، پھر مکرر ان کی طرف آتا اور کچھ دیر بعد انہیں چھوڑ کر دور چلا جاتا، اور مدنیوں کو گالیاں دیتا۔ مدنیوں نے کہا: تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تجھے کوئی خاص کام ہونا چاہیے، تیرا کیا حال ہے؟ کہا: میں امیر المومنین کا خط مصر کے گورنر کے نام لے جا رہا ہوں۔ وفد نے اس کی تلاشی لی تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے ان کی مہر لگا ہوا ایک خط مصر کے گورنر کے نام برآمد ہوا کہ ان مدنی لوگوں کو سولی چڑھائے، یا قتل کرے، یا ان کا مختلف جہتوں کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹے۔ یہ وفد مدینہ آ کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور

Marfat.com

کہا: دیکھا؟ یہ اللہ کا دشمن (عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہمارے متعلق فلاں فلاں بات لکھتا ہے۔ اب اس کا خون حلال ہو گیا۔ اٹھئے اور ہمارے ساتھ (اسے قتل کرنے) چلیے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف نہیں چلوں گا۔ انہوں نے کہا: ایسا ہے تو پھر آپ نے خط لکھ کر ہمیں کیوں بلایا؟ فرمایا: خدا کی قسم، میں نے تمہیں کبھی کوئی خط نہیں لکھا۔ اب وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

مصری گورنر کے خلاف شورش سب سے پُرزور تھی، کہ ابن سبا مصر ہی میں رہتا تھا۔ سازش سے ناواقف خلیفہ نے خیال کیا کہ عوام کو ٹھنڈا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی لیے شورشیوں ہی سے پوچھ کر محمد بن ابوبکر کو (جن کی نامناسب حرکتوں کے باعث ان کی بہن ام المومنین عائشہ انہیں سخت نفرت سے دیکھتی تھیں)، مصر کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے ہی راستے میں اس سرکاری ڈاکیے کو پکڑا، اور اس کے پاس سے جو خط برآمد کیا اس میں ان کی مصر آمد پر قتل کا حکم پایا گیا (۳۵)۔ سیوطی نے تدریب الراوی (ص ۱۵۱) میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں حروف پر نقطوں کا زیادہ رواج نہ تھا، اور حسب دستور مصر کے گورنر کو پیشگی آگاہ کیا گیا کہ ایک نیا گورنر آ رہا ہے "فاذا جاء کم فاقبلوہ" (جب وہ وہاں آئے تو اس کو قبول کرو)، لیکن نقطے نہ ہونے سے اسے 'فاقتلوہ" (اسے قتل کر ڈالو) بھی پڑھا جا سکتا تھا، اور محمد بن ابوبکر ایسا ہی پڑھ کر مدینہ واپس آئے اور شہر میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بدنام کر کے ان کے خلاف تن من دھن سے کوشش میں لگ گئے۔ طبری نے لکھا ہے کہ سارے مدینہ میں صرف تین شخص حضرت عثمان کے مخالف تھے، محمد بن ابی بکر، محمد بن ابی حذیفہ، اور عمار بن یاسر۔ باغی (مصری) انہیں سے سازشیں کرتے رہے۔ (محمد بن ابی بکر کی غلط فہمی کی وجہ ہم ابھی اوپر لکھ چکے ہیں۔ محمد بن ابی حذیفہ کو یتیم ہونے کے باعث حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑی محبت سے پرورش کیا تھا۔ جوانی پر اس نے گورنری مانگی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ناموزوں پا کر انکار کیا۔ اس پر یہ ناشکرا ان کی جان کا دشمن ہو گیا۔ عمار بن یاسر جب مصر سے ابن سبا سے متاثر ہو کر آئے تو ایک بار حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلاموں نے ان کو مار پیٹ کی تھی اور اسے وہ

Marfat.com

کبھی بھول نہ سکے)۔ بہرحال مصری باغی اب مدینہ میں گھس آئے اور مسجد نبوی پر قبضہ کرلیا (۳۶) ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کا خطبہ دینے لگے تو ان لوگوں نے ان پر پتھراؤ کیا اور غشی کی حالت میں انکو گھر لے جایا گیا (۳۷)۔ قبضہ مسجد کے بیس دن بعد انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد میں آنے اور نماز پڑھانے سے بھی روک دیا اور پھر باغیوں کا سردار الغافقی (جو غالباً یہودی النسل ہی تھا، کیونکہ اس نے قرآن مجید کو لات ماری تھی، دیکھو نیچے)، امامت کرنے لگا (۳۸) امام حسن، زید بن ثابت وغیرہ کئی لوگوں نے ان باغیوں سے جنگ کرنی شروع کی تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکان کے چھجے میں سے ان کو قسمیں دے کر ان کو گھروں کو واپس بھیجا (۳۹) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد کو ام المومنین ام حبیبہ آئیں تو قریب تھا کہ وہ مار ڈالی جاتیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بھائی محمد کو لعنت ملامت کر کے واپس کرنا چاہا مگر اس نے نہ مانا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی آ کر باغیوں کو سمجھانے لگے، مگر کسی نے ان کی بات نہ مانی (۴۰) اس صورت حال پر طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا کر خانہ نشین ہو گئے محصور ہونے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (۴۱) نہ چاہا کہ مدینہ کے لوگ حج کو نہ جائیں بلکہ اصرار کر کے ابن عباس کو امیر الحج بنا کر بہت سے باشندوں اور امہات المومنین کے ساتھ مکہ بھجوایا (۴۲) (طبری ص ۱۱-۳) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر مضبوط و مستحکم تھا، اور اس کا دروازہ توڑا نہ جا سکا تو اسے اور چھجے کو باغیوں نے آگ لگا کر منہدم کیا، پھر اندر گھسے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے۔ غافقی نے قرآن مجید کو لات ماری (۴۳) اور معصوم خلیفہ کو شہید کر دیا گیا۔

قتل کے بعد بھی دشواریاں کم نہ ہوئیں: عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسلامی قبرستان جنت البقیع میں دفن نہ کرنے دیا گیا اور کہا کہ ان کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفنایا جائے۔ آخر مشکل سے جنت البقیع کے باہر ایک سادہ زمین میں ان کو دفن کیا جا سکا جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی مدد دی۔ اموی خلافت کے زمانے میں وہ مقام جنت البقیع میں داخل کر دیا گیا۔

Marfat.com

خلافت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

باغیوں نے نوے سالہ اور روزہ دار حضرت عثمان کو تلاوت قرآن کرتے وقت شہید تو کر دیا لیکن رائے عامہ کے ردعمل سے گھبرائے اور چاہا کہ کسی طاقتور شخصیت کے پیچھے اپنے کو چھپائیں۔ سب سے ممتاز حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ پہلے وہ انہیں کے پاس آئے لیکن وہ روپوش ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی حال طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا۔ اس پر وہ سعد بن ابی وقاص کے پاس پہنچے۔ انہوں نے قطعاً انکار کیا۔ پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے، اور وہاں بھی انکار ہی ملا۔ اس پر وہ گھبرائے کہ اگر اپنے ہم وطنوں کے پاس ان حالات میں جائیں تو ہماری خیر نہیں۔ طبری کی روایت میں ہے کہ اس پر سارے بزدلوں کی طرح انہوں نے کمزوروں پر دباؤ ڈالا اور عام اہل مدینہ کو دھمکی دی: ہم تمہیں تین دن کی مہلت دیتے ہیں، اگر کسی موزوں شخص کو خلافت قبول کرنے پر تم آمادہ نہ کرسکو تو ہم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بہ کثرت عوام کا قتل عام کریں گے۔ یہ طریقہ کارگر ہوا، اور خود اہل مدینہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے الحاح و اصرار کرنے لگے۔ وہ انکار پر ڈٹے رہے تو طلحہ پھر زبیر کے پاس گئے اور ان کے انکار پر مکرر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے پاس آ کر رونے لگے: تمہیں اللہ کا ڈر نہیں، تمہیں ہم پر رحم نہیں آتا؟ اہل مدینہ اور باغیوں کی الحاح وزاری پر انہوں نے معذرت پر اصرار کرتے ہوئے کہا: ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں تمہاری بات کو مان لوں تو تمہیں اپنی مرضی کے مطابق چلاؤں گا اور کسی کی بات یا عتاب کی پروا نہ کروں گا۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو تو تمہارے میں سے ایک کی طرح رہوں گا اور جس کو تم امیر بناؤ اس کا شاید تم سب سے زیادہ ہی مطیع اور بات ماننے والا رہوں گا۔ اور میں تمہارے لیے امیر کی جگہ وزیر رہوں تو تمہارے ہی لیے زیادہ بہتر ہے'' (۴۴)۔ سب نے کہا آپ کی شرطیں منظور ہیں۔ اس پر فرمایا: اچھا تو کل مجمع عام میں بیعت ہوگی۔ باغیوں نے آپس میں سوچا: اگر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ممکنہ رقیبوں کو بھی ان کی بیعت پر مجبور کر دیں تو استقامت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ زبیر کو ان کے کوئی دوست،

Marfat.com

اور طلحہ کو ان کے بصری دوست بلا کر لائے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرائی۔ دوسرا دن جمعہ کا تھا۔ اطلاع ملنے پر لوگ سویرے ہی سے مسجد میں جمع ہونے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ کر منبر پر چڑھے اور حاضرین سے مخاطب ہو کر پوچھا: لوگو! میں علی الاعلان کہتا ہوں یہ (خلافت) تمہارا کام ہے، جس کے سپرد تم کرو اس کے سوا کسی اور کو اس پر حق نہیں۔ کل ایک سمجھوتے پر ہم نے باتیں ختم کی تھیں۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو میں (بیعت کے لیے یہاں) بیٹھتا ہوں، ورنہ مجھے کسی کے خلاف کچھ رنج نہ ہوگا۔ اس پر بیعت شروع ہوئی۔ ''پہلے طلحہ بہ جبر لائے گئے اور انہوں نے کہا: میں اکراہ کے تحت بیعت کرتا ہوں (بعد میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اسے تسلیم کریں گے: ہم نے ان کو اتحاد پر مجبور کیا، انتشار پر نہیں)۔ پھر زبیر بھی لائے گئے۔ اس کے بعد ان لوگوں کو لایا گیا جو پیچھے رہ گئے تھے (تخلفوا۔ اس سے مراد غالباً عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، صہیب وغیرہ ہیں جو فتنے کے زمانے میں غیر جانبدار رہنا چاہتے تھے اور باغیوں کی تلواروں کے سائے میں انتخاب سے خوش نہ تھے)، اور انہوں نے کہا: ہم اس بات پر بیعت کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کو قریب اور بعید، قوی اور ذلیل سب پر نافذ کیا جائے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اس پر بیعت کی۔ پھر عوام الناس اٹھے اور بیعت شروع کی''۔

بیعت کی رسم ختم ہونے کے بعد، ابن کثیر (بدایہ، ۷-۲۲۷ تا ۲۲۹) کے مطابق طلحہ، زبیر اور دیگر اکابر صحابہ ان کے پاس آئے اور قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قصاص کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا ان (باغیوں) کے پاس بڑی قوت ہے ان کے خلاف فی الوقت فوراً کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے کوفہ کا والی بناؤ میں وہاں سے فوجیں لے کر آتا ہوں۔ اسی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: مجھے بصرہ کا والی بناؤ تاکہ وہ وہاں سے فوجیں لا کر ان خوارج (یعنی باغیوں) اور جاہل بدویوں کے مقابلے کے لیے قوت حاصل ہو۔ کہا: میں غور کروں گا۔ ابن عباس نے مشورہ دیا کہ سارے پرانے والیوں کو امن قائم ہونے تک ان کی خدمتوں پر بحال رکھا جائے، خاص کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کے صوبہ پر۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

Marfat.com

نے کہا میری یہ رائے نہیں ہے۔ خاص کر معاویہ کے متعلق تو قطعاً نہیں۔ پھر شام کی گورنری ابن عباس کو پیش کی مگر انہوں نے انکار کیا۔ پھر سھل بن حنیف کو وہاں نامزد کر کے بھیجا، مگر معاویہ کی سوارہ فوج کے رسالے نے تبوک ہی سے انہیں واپس کر دیا۔ مصر پر قیس بن سعد کو نامزد کیا، مگر وہاں والوں نے اسے نہ مانا۔ اہل بصرہ نے بھی نئے گورنر کو قبول نہ کیا۔ عمارہ بن شہاب کو کوفہ بھیجا تو راستے میں طلحہ بن خویلد نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کو آگے جانے نہ دیا۔ والی کوفہ ابو موسیٰ اشعری نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل کوفہ کی بڑی اکثریت کی بیعت بھیجی بلاذری (انساب) کے مطابق خود اہل مکہ نے بھی بیعت سے انکار کیا۔ غرض انتشار پھیل گیا۔

عوام نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑی توقع کی لیکن دن گذرتے گئے اور قاتلین عثمان کے خلاف کچھ بھی نہ ہونے سے ان کی مقبولیت روز بروز متاثر ہوتی گئی۔

اس پر طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ چلے گئے اور امہات المومنین سے جو وہاں سخت تاسف و تاثر کی حالت میں تھیں کہا کہ ہم حضرت عثمان کا بدلہ لیں گے۔ طلحہ کا بصرہ میں بڑا اثر تھا۔ وہاں کا قصد کیا تو بی بی عائشہ نے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کی۔ بی بی حفصہ بھی آمادہ تھیں لیکن ان کے بھائی عبداللہ بن عمر نے روکا اور کہا میں ساتھ نہ آؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان لوگوں کو بصرہ جانے میں وہاں کے خزانے اور چھاؤنی کی اہمیت کے باعث خانہ جنگی کا خطرہ محسوس کیا، اور مدینہ سے روانہ ہوئے کہ ان سے پہلے خود بصرہ پر قبضہ کر لیں۔ ابن سبا بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کے ہمراہ بصرہ روانہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے والی کوفہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اشعری کو کمک بھیجنے کا حکم روانہ کیا۔ صریح احادیث نبویہ کی یاد میں وہ خانہ جنگی روکنے کے لیے اپنے علاقے کے رضا کاروں کو باہر نہ جانے کی تاکید کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب امام حسن نے آ کر مسجد میں لوگوں کو ساتھ چلنے کا مشورہ دیا تو بھی وہ اپنی امن پسندی سے باز نہ آئے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں فوراً خدمت سے معزول کر دیا، اور اس متقی گورنر نے کوئی مخالفت نہ کی بلکہ خدمت کا خاموشی سے جائزہ دے کر صحرانشین ہو گئے۔

Marfat.com

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی عراق پہنچے اور حضرت طلحہ وزبیر و عائشہ بھی۔ جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو بہت سے سربرآوردہ مسلمان اس خانہ جنگی کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں تھیں: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خیال کر رہے تھے کہ حضرت عائشہ وطلحہ ان کے شخصی مخالف ہیں۔ فریق ثانی کو گمان تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شہادت عثمانی میں ہاتھ ہے جس کی وجہ سے وہ ان قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی جو ان کی اپنی فوج میں ہیں سزا دینا نہیں چاہتے۔ جب غیر جانبدار بیچ میں پڑے تو غلط فہمیاں دُور ہو گئیں اور مصالحت مکمل ہو گئی (۴۵) ابن سبا اور اس کے ساتھی گھبرائے کہ اب ان کی خیر نہیں۔ اس پر بڑی رات گئے اس گروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پڑاؤ کی طرف سے آکر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غافل اور مطمئن فوج پر ہلہ بول دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فطرۃً گمان کیا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غداری کی ہے۔ جب انہوں نے مدافعت میں جوابی حملہ کیا تو اب حضرت عائشہ اور طلحہ کو بھی مماثل گمان ہوا، اور جلدی ہی دونوں فوجیں گتھ گئیں۔ حضرت عائشہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر پوری جوانمردی سے معرکہ میں شریک ہوئیں، اور اسی لیے اس لڑائی کو جنگ جمل کا نام دیا گیا ہے۔ لڑائی دیر تک جاری رہی۔ اس اثنا میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طلحہ اور زبیر کو پیام بھیجے، اور یہ دونوں اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ فوج چھوڑ کر صحرا میں پناہ گزین ہونے چلے گئے، لیکن بعض مخالفین نے بظاہر ناواقفیت میں ان کو راستے میں مار ڈالا۔ ان کے جانے پر فریق ثانی کی فوج کمزور ہو گئی۔ حضرت عائشہ کے ساتھی، غلط فہمی میں، انتہائی بہادری سے لڑے مگر آخر مغلوب ہو گئے۔ (تنبیہ مسعودی کے مطابق اصحاب الجمل میں سے تیرہ ہزار آدمی مارے گئے جن میں سے قبیلہ ازدہی کے چار ہزار تھے)۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی شرافت کا برتاؤ کیا: بھگوڑوں کے تعاقب سے روکا، مجروحین کو قتل کرنے سے منع کیا، مال غنیمت میں سے سرکاری سامان اور ہتھیار تو ضبط کر لیے لیکن باقی سامان مالکوں یا ان کے وارثوں کو واپس کرنے کا حکم دیا (اور لوگ رفتہ رفتہ عرصہ دراز تک آکر اپنا سامان پہچان کر لے جاتے رہے)۔ عورتوں کی

Marfat.com

عصمت بچائی۔ یہودی غنڈوں کو یہ اچھا نہ لگا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بگڑ کر ڈانٹا: کون ہے جو ام المومنین عائشہ کو لونڈی بنا کر ان کی عصمت دری کرنے پر آمادہ ہے؟ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پوری عزت وحرمت سے ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور دیگر معتمد علیہ لوگوں کی حفاظت میں مدینہ واپس بھیجنا چاہا۔ حضرت عائشہ اتنا متاثر تھیں کہ انہوں نے شکر گذاری میں کہا، میں تمہارے ساتھ رہ کر اہل شام کے مقابلے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو اصرار سے مدینہ واپس بھیج دیا۔

اس پہلی فتح پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پوزیشن کافی مستحکم ہوگئی اور حرمین اور عراق ہی نہیں، خراسان، آذربیجان، بلاد الجبل، یمن اور مصر نے بھی بیعت کر لی۔ لیکن بصرہ کے بیت المال کو بہر حال انہوں نے سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا اور اس کی ساری رقم اپنی فوج کو انعام میں دے دی۔ ہر شخص کو پانچ پانچ سو درہم ملے۔ اور وعدہ کیا کہ دمشق کا خزانہ بھی ان کو بانٹیں گے۔

اب انہوں نے شام کی طرف توجہ کی اور طویل خط وکتابت ہوتی رہی۔ (اس کا بڑا حصہ نہج البلاغہ میں محفوظ ہے)۔ بلاذری (انساب، مخطوطہ استانبول، ۱-۳۴۴) کے مطابق المسور بن مخرمہ الزہری کے ہاتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خط بھیجا: ''لوگوں نے مشورہ کیے بغیر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مار ڈالا ہے، پھر میری بیعت کی ہے۔ تم بھی بیعت کر لو، اللہ تم پر، توفیق دیتے ہوئے، رحم کریگا، اور میرے پاس شام کے شرفاء کا وفد ساتھ لے کر آؤ۔ لیکن معاویہ کے لیے گورنری کا کوئی ذکر نہ کیا''۔ اولاً معاویہ نے کہلا بھیجا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے رشتہ داروں کے سپرد کرو، اور خلافت کو شوریٰ بناؤ تاکہ لوگ آزادی سے کسی کا انتخاب کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ رد کر دیا۔ طبری، نہج البلاغہ وغیرہ میں مندرج خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے حضرت علی کا واحد استدلال یہ تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں اور نبوت وخلافت ایک ہی جگہ رہ سکتی ہیں (یعنی وراثت) اور یہ کہ انتخاب کا حق صرف اہل مدینہ کو ہے، صوبہ جات کو صرف اطاعت کرنی

Marfat.com

چاہیے۔ اور کسی خط میں خفیف سے خفیف اشارہ بھی اس طرف نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ولی عہد نامزد کیا ہو۔ (فضائل علیؓ کی حدیثوں سے علیؓ پسند لوگ اب جو استنباط کرتے ہیں کیا وہ بعد کی چیزیں ہیں؟) ان کا معاویہ کے متعلق قول کہ وہ طلقاء فتح مکہ میں سے ہونے کے باعث خلافت کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بھی بعد والوں کی ایجاد ہے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتح مکہ سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑاؤ میں اسلام قبول کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا: جو کوئی ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں چلا جائے اسے امن رہے گا۔ معاویہ کے اس سے بھی سال بھر قبل اسلام لا چکے ہونے کی روایت کو قبول نہ بھی کیا جائے تو، اس فرمان نبوی کے باعث معاویہ نہ غلام بنے اور نہ آزاد کیے گئے (طلقاء کے معنی ہیں: تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے، مواخذہ نہیں کیا جاتا، یہ نہیں کہ آزاد کیا جاتا ہے، اگر وہ آزاد کردہ غلام بھی ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک سالم مولی ابی حذیفہ کے خلیفہ بن سکنے کی موزونیت بھی اس استدلال کے خلاف پڑے گی)۔

جب باتوں سے کام نہ بنا تو آخرؔ العلاج الکی، دونوں طرف سے فوجیں آگے بڑھنے لگیں۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نوے ہزار، اور معاویہ کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی، صفین پہنچ کر ایک سو دس دن تک آمنے سامنے پڑی رہیں اور اس اثنا میں صرف چپقلشیں ہوتیں اور فریقین میں قراء بیچ میں پڑ کر لڑائی سے روکتے رہے: یہ لوگ قرآن لے کر دونوں فوجوں کے مابین بیٹھ جاتے اور کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ قرآن پڑھنے والوں کو روندتے ہوئے جائیں۔

آخری معرکے سے قبل چند ضمنی امور کا ذکر بے جا نہ ہوگا: معاویہ جیسے فقیہ اور امن پسند صحابی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیوں مخالفت کی؟ خود ان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حکمرانی کی پیشین گوئی فرمائی اور تاکید کی کہ اگر میں اس رتبے پر پہنچوں تو درگذری کو اپنی عادت بناؤں۔ جب سے میں نے یہ سنا مجھے خلافت کی تمنا رہی (ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب کے وقت کسی چناؤ کا سوال نہ تھا)۔ ایسی ساری حدیثیں ازالۃ الخفا (۱-۱۴۸،

Marfat.com

۱-۱۵۳تا۱۵۴،۱۶۹) میں جمع کر دی گئی ہیں: ترمذی میں ہے: ''اے اللہ تو اس (معاویہ) کو ھادی اور مہدی بنا اور اس کے ذریعے سے ہدایت دے''۔ ابن سعد اور ابن عساکر میں ہے: ''اے اللہ تو اسے کتاب (قرآن) سکھا، اسے ملک میں متمکن کر، اور اسے عذاب سے بچا''۔ وغیرہ۔

سیاسی نقطۂ نظر سے: اس اثنا میں خراسان اور ترکستان کی سرحد بظاہر پُرامن رہی، اور مصر میں بھی بیرونی حملہ کا خطرہ نہ پایا گیا۔ رومی شہنشاہ قسطنط Constant نے فائدہ اٹھانا چاہا: اپنی سابق رعایا کو مسلمانوں سے بغاوت پر ورغلایا، اور حملہ کرنے کی تیاری شروع کی۔ شام میں معاویہ کے حسن انتظام سے عیسائی رعایا کو مذہبی متعصب بیزنطینی حکومت کا جوا دوبارہ گلے میں ڈالنے کی کوئی خواہش نہ تھی (اور ایسی مثالیں صدیوں تک ملتی رہیں کہ غیر فرقے کے عیسائیوں کے ماتحت بننے پر یہ لوگ مسلمانوں کی ماتحتی کو ترجیح دیتے رہے، حتیٰ کہ حروب صلیبیہ کے زمانے میں بھی)۔ مگر فریس معاویہ کسی پہلو کو نظرانداز نہ کرتے تھے: انہوں نے ایک طرف قسطنط کو لکھا کہ اگر وہ حملہ کرے تو وہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صلح کر کے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے مقدمۃ الجیش میں رہ کر اس کا مقابلہ کریں گے (۴۶)۔ اور ساتھ ہی اسے پیشکش کی کہ اگر وہ پُرسکون رہے تو اسے معقول رقم ''خراج'' میں دیں گے۔ یہ نرم و گرم جوڑ توڑ کارگر رہا۔

صفین میں آخر جب لڑائی ہوئی تو آخری دن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غلبہ ہو گیا اور قریب تھا کہ ان کی فتح پر جنگ ختم ہو جائے۔ اس وقت فریق ثانی نے مہلت حاصل کرنے کی ایک جذباتی تدبیر کی: قرآن مجید کے کوئی پانچ سو نسخے سپاہیوں نے نیزوں کی نوک پر باندھ کر بلند کیے، اور دمشق کا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا روانہ کردہ مصحف اعظم بھی جو اتنا بڑا تھا کہ پانچ نیزوں پر باندھا گیا اور اسے پانچ سپاہیوں نے اٹھایا۔ اور مطالبہ کیا کہ فریقین قرآن پر عمل کریں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ یہودی تو نہیں، لیکن خارجی جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج میں کافی تھے، قرآن پر وار کر نہیں سکتے تھے۔ جب انہوں نے مقدمۃ الجیش کے کمانڈر مالک الاشتر کو روکنے میں کامیابی حاصل نہ کی تو براہ راست حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مجبور کیا۔ لڑائی میں کچھ یہودی مارے بھی گئے ہوں

Marfat.com

گے لیکن وہ بہرحال اپنے کو کٹانے کے زیادہ خواہشمند ہو نہیں سکتے تھے۔ اصل جوش اور خلوص یمن کے قراء اور خوارج میں تھا اور انہیں کی جانبازی سے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فتح حاصل ہو سکتی تھی۔ ان کے اس دیندارانہ مطالبہ کو وہ اب رد کر نہیں سکتے تھے۔ ان کو سمجھانے کی کوشش میں جب وہ کامیاب نہ ہوئے تو مالک الاشتر کو ہتھیار روکنے اور واپس آنے کا حکم دے دیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کامل فتح میں بھی ابن سبا و شرکا کو دغدغہ تھا۔ ان لوگوں نے فوراً دونوں فریقوں میں ایجنٹ پھیلائے اور دونوں کی مہربانیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک یہودی تھا اشعث بن قیس کندی (۴۷)، سات پشت کا غدار ابن غدار، کچھ عرصہ بعد اسی کی بیٹی سے امام حسن نے نکاح کیا مگر اس نے انہیں زہر دے دیا۔ غرض اسی الاشعث بن قیس نے دوادوی کر کے اور بیچ میں پڑ کر فریقین میں "صلح" کرائی تاکہ جنگ کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ وہ مصالحت یہ تھی فریقین ایک ایک حکم نامزد کریں، اور دونوں حکم باہم گفتگو کر کے قرآنی احکام کے مطابق فیصلہ سنائیں۔ عہد نامہ لکھا گیا تو فریقین کے ممتاز لوگوں نے اس پر دستخط کیے، اشعث نے بھی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے دستخط کرنے کی عزت حاصل کی، پھر اس کا نسخہ لے کر دستہ بہ دستہ گھومتا رہا تاکہ لوگوں کو اپنی کارگزاری بتائے کہ کتنی اچھی اور دیندارانہ شرائط کے تحت صلح ہوئی ہے (اگرچہ بعض خارجیوں کا اختلاف اسی وقت سے شروع ہو گیا)۔ معاہدۂ تحکیم ہم یہاں کاملاً درج کرتے ہیں (متن کے لیے الوثائق السیاسیۃ، نمبر ۳۷۲)۔ کچھ اختلاف روایات بھی ہے، لیکن قدیم ترین متن دینوری کی الاخبار الطوال میں ہے، جو یہ ہے:

۱) یہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان اور ان کے ہم خیالوں نے، باہمی قبول کی ہوئی چیزوں کے تحت، فیصلہ کیا ہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبویہ کے مطابق حکم دیا جانا چاہیے۔

۲) علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلہ کی موجود و غائب (سارے) اہل عراق پر (پابندی) ہے، اور معاویہ کے فیصلہ کی موجود و غائب اہلِ شام پر۔

۳) ہم نے باہم رضامندی سے قبول کیا ہے کہ قرآن شروع سے آخر تک جو حکم دیتا

Marfat.com

ہے اسی پر توقف (عمل) کیا جائے گا: جسے وہ زندہ کرتا ہے، ہم زندہ کریں گے، جسے وہ مار ڈالتا ہے ہم بھی مار ڈالیں گے۔ اسی (شرط) پر ہم نے باہم فیصلہ کیا اور باہمی رضامندی دی ہے۔

۴) علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اس کے ہم خیالوں نے عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) کو ناظر اور حکم بنانے پر رضا مندی دی ہے، اور معاویہ اور اس کے ہمخیالوں نے عمرو بن العاص کو ناظر اور حکم بنانے پر۔

۵) علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ دونوں نے عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص سے اللہ کا عہد و میثاق و ذمہ اور رسول خدا کا ذمہ لیا ہے کہ وہ قرآن کو اپنا امام بنائیں گے اور اس میں جو چیز لکھی ہوئی ملے اس کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں گے۔ اور انہیں جو چیز وہاں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متحد کنندہ سنت کی طرف رجوع کریں گے۔ اور اس کی عمداً ہرگز نہ خلاف ورزی کریں گے اور نہ اس میں کوئی مشتبہ چیز تلاش کریں گے۔

۶) عبداللہ بن قیس اور عمرو بن العاص نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ سے اللہ کا عہد و میثاق لیا ہے کہ یہ دونوں کتاب اللہ وسنت نبویہ میں (موجود چیز) کے ذریعہ سے جو حکم دیں گے اس کو وہ قبول کریں گے اور انہیں یہ حق نہ ہوگا کہ اس (فیصلۂ تحکیم) کو توڑیں اور اس کے خلاف کسی اور چیز کی طرف جائیں۔

۷) ان دونوں کو تحکیم کے بارے میں جان و مال، بال و پوست اور اہل اولاد کے متعلق امن رہے گا۔ یہ دونوں حق بات سے تجاوز نہ کریں گے چاہے وہ کسی کو پسند آئے یا ناگوار گذرے۔ ساری امت ان دونوں کی، ان کے کتاب اللہ (میں مندرج اور اس) کے مطابق کیے ہوئے فیصلہ کے متعلق، مددگار ہوگی۔

۸) اگر دونوں حکموں میں سے کوئی تحکیم کے طے ہونے سے قبل فوت ہو جائے تو اسی کی پارٹی اور اسی کے مددگار اس کی جگہ کسی اور صاحب عدل و صلاح شخص کا انتخاب کریں گے۔ اور اس پر بھی اسی عہد و میثاق کی پابندی ہوگی جیسا کہ اس (متوفی) رفیق پر تھی۔

۹) اور اگر اس عہد نامۂ تحکیم میں بیان کردہ مدت کے اندر دونوں امیروں (علیؑ و معاویہ) میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اسی کے ہم خیال اس کی جگہ اس شخص کو والی بنائیں گے جس کی عدالت پر وہ رضامند ہوں۔

۱۰) فریقین پر یہ فیصلہ، اور گفت وشنید، اور ہتھیار روکنا نافذ ہوتا ہے۔

۱۱) اس فیصلہ نے وہ چیز واجب کر دی ہے جس کا اس تحریر میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ دونوں امیروں، دونوں حکموں، اور دونوں فریقوں پر کیا شرط عائد ہو گی۔ اللہ سب سے زیادہ قریبی گواہ ہے اور اسی کی گواہی کافی ہے۔ اگر دونوں (حکم) اس کے خلاف کام کریں اور تعدی کریں تو ساری امت ان کے حکم سے اپنے کو بری قرار دیتی ہے پھر ان کے لیے نہ (حفاظت) کا عہد برقرار رہے گا نہ ذمہ۔

۱۲) سارے لوگوں کو مدت کے ختم ہونے تک جان، مال، اولاد اور اہل کے بارے میں امن رہے گا۔ ہتھیار ڈال دیے جائیں گے۔ راستے پُرامن رہیں گے۔ فریقین کے غائب (غیر موجود) لوگوں کو بھی وہی (حق) حاصل ہو گا جو حاضر لوگوں کو ہے۔

۱۳) دونوں حکموں کو حق ہو گا کہ اس مقام پر قیام کریں جو اہل عراق اور اہل شام کے مابین متوسط اور مساوی فاصلے پر ہو۔

۱۴) ان کے پاس سوائے اس کے کوئی جا نہ سکے گا جس کو وہ پسند کریں اور راضی ہوں۔

۱۵) مدت ماہ رمضان کے ختم ہونے تک ہے۔ اگر دونوں حکم تحکیم کو اس سے قبل ہی کرنے کی رائے رکھیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ اور وہ مدت کے آخر تک تاخیر کرنا چاہیں تو تاخیر بھی کر سکتے ہیں۔

(یہ آخری جملہ بلاذری اور جاحظ کے ہاں: ''مدت کے آخر تک'' کی جگہ علی الترتیب یوں ہے: تاخیر کرنا چاہیں تو تاخیر بھی کر سکتے ہیں'' اور ''تاخیر کرنا چاہیں تو دونوں حکم باہمی رضامندی سے تاخیر بھی کر سکتے ہیں''۔ بہ ظاہر یہی صحیح ہے کیونکہ تحکیم کو کوئی ڈیڑھ سال لگا)۔

۱۶) اگر مدت کے آخر تک بھی یہ دونوں حکم کتاب اللہ اور سنت نبویہ کے مندرجات کے

Marfat.com

مطابق تحکیم نہ کر سکیں تو فریقین اپنی سابقہ حالت پر عود کر آئیں گے۔

۱۷) ساری امت پر اس بارے میں اللہ کا عہد و میثاق ہے کہ وہ ہر اس شخص کے، جو اس بارے میں الحاد، ظلم اور پھوٹ چاہے: خلاف ہو کر ایک ہاتھ بن کر مقابلہ کریں گے"۔ (تمت)

متن میں تاریخ نہیں ہے، جو ۱۷ صفر سنہ ۳۷ھ کہی جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چاہا تھا کہ ان کا نمائندہ ان کے سیاست دان چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس یا کمانڈر مالک الاشتر ہوں لیکن امن پسند قراء نے کہا کہ ابن عباس غیر جانبدار نہ رہیں گے اور مالک الاشتر ہی فساد کی جڑ ہے اور مجبور کیا کہ ابو موسیٰ اشعری جیسے خدا ترس متقی کو، جو خانہ جنگی کو روکنے کی ناکام کوشش کر بھی چکے تھے، معین کیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ماننا پڑا۔

ظاہر ہے کہ قرآن مجید کوئی پیشین گوئیوں کی کتاب نہیں کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا ان کے مخالفین کے متعلق کوئی صراحت اس خانہ جنگی کے متعلق ملے۔ مقتول کے وارثوں کو قاتل کے قتل کر سکنے کا حق ضرور بیان ہوا ہے، لیکن جھگڑا اس پر نہ تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے۔ دونوں قصاص پر متفق تھے۔ بلکہ یہ کہ خلافت کے مستحق اس زمانہ میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں یا معاویہ؟ اب قرآن و حدیث کی جگہ محض اجتہاد اور صوابدید کا مسئلہ تھا کہ جائز خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چونکہ کسی کو ولی عہد نامزد نہیں کیا تھا اس لیے نئے خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہو؟

حکموں کے مجتمع ہونے کے مقام کے متعلق اذرح اور دومۃ الجندل دونوں کا ذکر آتا ہے۔ اس کی وجہ بلاذری نے بتا دی ہے: "دونوں حکم پہلے تدمر میں ایک مہینہ رہے۔ باہم بحث بھی ہوئی اور ہر ایک حکم اپنے امیر کو لکھ کر جوابات بھی حاصل کرتا رہا۔ پھر تدمر سے دومۃ الجندل جا کر وہاں مہینہ بھر رہے۔ پھر وہاں سے اَذرح چلے گئے"۔ (۴۸)

مروج الذھب (مسعودی) کے ہاں بعض تفصیلیں ہیں جو محض افسانہ معلوم ہوتی ہیں، مثلاً یہ قصہ کہ حکم نامزد ہونے کے بعد جب شامی فوج واپس ہوئی تو عمرو بن العاص نے معاویہ کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا (کہ میں اب مختار کل ہوں، چاہے معاویہ کو رکھوں یا

Marfat.com

معزول کروں، غرض انہیں مجھ سے ہے مجھے ان سے نہیں)۔ اس پر معاویہ ایک دن عمرو بن العاص کے گھر گئے اور بلطائف الحیل ملاقات کے کمرے کو عمرو کے آدمیوں سے بالکلیہ خالی کرا کے اپنے سپاہیوں سے بھر دیا اور کمرہ اندر سے بند کر کے کہا: میری بیعت کر ورنہ ابھی قتل کرا دیتا ہوں۔ عمرو نے مصر کی گورنری مانگی، جو معاویہ نے بخوشی دی۔ پھر عمرو کی بیعت لے کر گھر واپس گئے۔

بلاذری وغیرہ کے ہاں صراحت ملتی ہے کہ حکموں نے کبار صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص وغیرہ سے درخواست کی کہ وہ زحمت کر کے ان سے ملنے آئیں اور مشورے دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکموں کی اولین ملاقات کے بعد ہی طے ہوا ہوگا، اور اس میں وقت بھی لگا ہوگا کہ دعوت نامہ جائے اور یہ لوگ (غالباً مکہ یا مدینہ سے) عرب کے شمال میں پہنچ سکیں۔

مروج الذھب (مسعودی) کے ہاں بعض دیگر تفصیلیں بھی ہیں جو اوروں کے ہاں نہیں ہیں، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس حد تک صحیح ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جب پہلی بار دونوں حکم ملے تو ابو موسیٰ نے ایک طویل تقریر کی، اور اسلام کی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا: اے عمرو، آؤ، ایسا کام کریں جس کے باعث اللہ مسلمانوں میں الفت پیدا کرے اور جھگڑوں کو دُور کرے۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا: یہ ٹھیک ہے لیکن بھول نہ جانے کے لیے مناسب ہے کہ ہم میں طے شدہ ہر چیز لکھ لی جائے۔ پھر اپنے کاتب کو بلا کر کہا: تجھ سے جو چیز کہی جائے اگر اسے ہم دونوں حکم منظور کریں تو لکھنا ورنہ نہیں۔ پھر ایک عبارت لکھوانی شروع کی کہ یہ ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کا متفقہ فیصلہ ہے۔ شروع میں حمد وصلاۃ، پھر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برحق اور اچھے خلفاء ہونے کا ذکر آیا۔ بعد ازاں یہ کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اجماع امت اور شورائے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلیفہ بنے، وہ دیندار مومن تھے، مظلوم قتل کیے گئے، اور ان کا خون ان کے ولی۔ اور قریب ترین ولی معاویہ ہیں طلب کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ابو موسیٰ نے کہا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شامی، اور معاویہ کو عراقی پسند نہیں کرتے۔ اس لیے دونوں کو معزول کر کے کسی موزوں شخص کو خلیفہ نامزد کیا جائے۔ ابو

Marfat.com

موسیٰ نے عبداللہ بن عمر کا نام پیش کیا۔ عمرو بن العاص نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرو بن العاص کا۔ ابو موسیٰ نے کہا: عبداللہ بن عمرو بھی موزوں تھے لیکن تمہیں نے ان کو جنگ میں گھسیٹ کر داغدار کر دیا ہے۔ (غالباً اس کے بعد عبداللہ بن عمرو غیرہ مشاورت کے لیے بلائے گئے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ و معاویہ کی جگہ کسے چنیں)۔ اس بارے میں دارقطنی کی روایت بھی دیکھی جائے (جسے ابن العربی نے العواصم، ص-۱۲۸-۱۲۹ میں نقل کیا ہے) کہ اس کی بھنک حضرت معاویہ کے کانوں پر بھی پڑ گئی تھی اور دونوں میں کچھ تنت بھی ہو گئی تھی۔

بلاذری (انساب، مخطوطہ) کے مطابق عمرو بن العاص نے عبداللہ بن عمر سے کہا: میں تمہیں خلیفہ بناؤں تو کیا مجھے مصر کا والی بناؤ گے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ بلاذری ہی نے ابو خیثمہ کے حوالے سے ایک اس سے بھی زیادہ غیر قرین قیاس قصہ لکھا ہے: عمرو بن العاص نے عبداللہ بن عمر سے کہا کہ ہم دونوں حکم اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ تمہیں خلیفہ بنائیں: کیا تم کچھ رقم لے کر اس شخص کے حق میں دستبردار نہ ہو جاؤ گے جو اس کا خواہشمند ہے؟ ظاہر ہے کہ ابن عمر نے خفگی اور حقارت سے اسے رد کیا اور کہا کہ میں خلافت اس وقت تک قبول نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ متفقہ نہ ہو، اور اگر دو آدمی بھی مخالف ہوں تو پھر میں اسے قبول نہ کروں گا۔

بہرحال اس طرح دونوں حکموں میں مہینوں پیچیدہ سیاسی رسہ کشی ہوتی رہی۔ تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو موسیٰ اور عمرو بن العاص اس پر راضی ہو گئے کہ معاویہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کو معزول کر کے کسی کا آزادانہ انتخاب ہو۔ یہ ممکن ہے لیکن اس سے سیاسی خلا پیدا ہو جاتا، اور فریقین کی فوج کی موجودگی میں، جب کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ اپنی اپنی خلافتوں کو منانے پر تلے ہوئے ہوں، آزادانہ انتخاب کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ واحد حل یہ تھا کہ دونوں حکم کسی ایک نام پر متفق ہوں، اور یہ ہو نہیں رہا تھا۔ عمرو بن العاص نے یہ بھی محسوس کیا ہو گا کہ اگر ان کا اپنا بیٹا خلیفہ نہیں بنتا ہے تو محض معاویہ کی معزولی اور سیاسی خلا کے پیدا کرنے کے بعد وہ نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے (کذا)۔ اس لیے اگر انہوں نے شروع میں ابو موسیٰ کی تجویز منظور بھی کی ہو تو

Marfat.com

غورِ مکرر کے بعد رائے بدل دی ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابو موسیٰ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ ان حالات میں اوپر بیان شدہ حکموں میں یادداشت کا لکھا جانا ایک افسانہ بن جاتا ہے کیونکہ جب حکموں نے فیصلہ سنایا اور ان میں اتفاق نہ پایا گیا تو ابو موسیٰ نے کیوں نہ کہا کہ یہ ہمارے نوشتہ معاہدہ کے خلاف ہے؟

جو بھی ہو، تحکیمی فیصلہ سنانے کے لیے فریقین کے نمائندے جمع ہوئے۔ پہلے ابو موسیٰ نے اٹھ کر کہا کہ امت میں دوبارہ اتحاد پیدا کرنے کے لیے بہتر ہے کہ موجودہ دونوں امیدواروں کو معزول کر کے کسی تیسرے کا انتخاب کیا جائے۔ اس کے بعد عمرو بن العاص نے کہا کہ ابو موسیٰ کو صرف اپنے موکل کو معزول کرنے کا حق ہے اور میں اسے نوٹ کرتا ہوں۔ رہا میں، میں اپنے موکل کو معزول نہیں کرتا بلکہ انہیں برقرار رکھتا ہوں۔

فرقہ واری بحث میں اس پر گالی گلوچ بلکہ تکفیر تک کی نوبت آگئی ہے۔ ہم ٹھنڈے دل سے کچھ غور کریں:

بخاری وغیرہ میں ایک مشہور حدیث امام حسن کے فضائل میں ہے: میرا یہ بچہ ایک سردار ہے اور ایک دن آئے گا کہ اللہ اس کے باعث ''مسلمانوں کے دو گروہوں میں'' صلح کرائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو مسلمان قرار دیتے ہیں تو پھر کسی مسلمان کو ان کی تکفیر بہر حال نہ کرنی چاہیے۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ میں معاہدہ یہ ہوا تھا کہ تحکیم متفقہ ہو تو ان پر پابندی عائد ہوگی۔ وہ متفق علیہ نہ ہو سکی اس لیے ردی کا کاغذ اور ناقابلِ نفاذ تھی۔ اور جیسا کہ معاہدہ کی دفعہ ۱۶ میں صراحت ہے، علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی نقصان نہ ہوا اور حالت سابقہ عود کر آئی۔

ہر وکیل اپنے موکل کے لیے سارے جتن کرنے کا عقلاً اور قانوناً مجاز ہے۔ عدالت اسے رد کرنے کی مقتدر ہے لیکن وہ کسی وکیل کو محض اس کی بحث کی وجہ سے نہ کوئی سزا دیتی ہے اور نہ اس کی نیت پر حملہ کرتی ہے (کہ جانبدارانہ بحث وکیل کے فرائض میں داخل ہے) بلکہ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتی ہے کہ تمہاری دلیلیں ہمیں معقول نہیں معلوم ہوتیں۔ اس چودہ سو سال پہلے کے واقعہ میں ہم خواندگان بھی عدالت کی طرح سنجیدہ اور

Marfat.com

جذبات سے خالی فیصلہ سنائیں اور بس۔

اعلان تحکیم کے بعد ظاہر ہے کہ ابو موسیٰ سیاست سے کنارہ کش ہو کر گوشہ گزین ہو گئے۔ معاویہ کی پوزیشن کئی طرح سے بہتر ہو گئی: تحکیم سے ان کو اخلاقی تقویت ہوئی ہو یا نہیں، صفین کے بعد کی مہلت میں ان کی فوجی حالت ضرور بہتر ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں اسی زمانے میں پھوٹ پڑ گئی: خوارج نے اس نازک وقت اتحاد و تعاون کی جگہ ایسے مباحث چھیڑے جو نہ علمی حیثیت سے اور نہ ہی سیاسی نقطۂ نظر سے معقول تھے۔ میدان صفین سے تحکیم نامہ سنتے ہی چند لوگ کہنے لگے "لا حکم الا للہ، اور اس کے خلاف کرنے والا کافر ہے"۔ پھر یہ لوگ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج سے نکل کر ہر جگہ دعایہ (پروپگنڈہ) کرنے لگے۔ ان کے بعض گروہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منتشر کیے تو آخر وہ نہروان میں جمع ہونے لگے۔ (کیا اس میں بھی یہودی ہی ان کو شہ دیتے رہے؟ کوئی صراحت تو نہیں ملتی لیکن مروج الذھب میں بیان ہوا ہے کہ ان کو سمجھانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ یہ خوارج جو عام مسلمان ہی نہیں سارے غیر مسلموں کو بھی گردن زدنی سمجھتے تھے، ان تک ایک یہودی کا پُرامن طور سے آنا جانا کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے)۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں نظم و ضبط کے خراب ہونے کا اندازہ اس سے کریں کہ ان کے گورنر بصرہ نے بیت المال سے، بروایت بلاذری ساٹھ لاکھ درھم، جبراً لے لیے۔ خازن کی شکایت اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جواب طلبی پر انہوں نے جواب لکھا: کسی اور کو گورنر بنا کر بھیج دو، اور رقم لے کر وہاں سے چلے گئے۔ اس سے بڑھ کر ذہبی کی روایت ہے: حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جعفر نے معاویہ کو خط لکھ کر کچھ پیسہ مانگا۔ معاویہ نے ان دونوں کو ایک لاکھ (دینار) بھیج دئے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطلاع ملی تو ان دونوں سے کہا: تمہیں شرم نہیں آتی؟ جس شخص پر ہم صبح شام طعن و تشنیع کرتے رہتے ہیں اسی سے تم پیسہ مانگتے ہو۔ دونوں نے جواب دیا: آپ نے ہمیں محروم رکھا ہے، اور انہوں نے جود و سخا دکھائی ہے" (۴۹)

ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فوراً

Marfat.com

جنگ نہ کر سکے۔ عراق ہی میں خوارج کی پیدا کردہ بدامنی دُور کرنی تھی یہ لوگ غیر خوارج مسلمانوں کے دودھ پیتے بچوں کو بھی قتل کرنے سے باک نہ رکھتے تھے، اوران کے فقیہ نجدۃ الحروری کا استدلال تھا کہ قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ کے معلم خضر نے ایک مستقبل کے برے بچے کو پیشگی ہی قتل کر دیا تھا (۵۰)۔ یہ لوگ بے عقل لیکن انتہائی مخلص اور دیندار مسلمان تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہروان میں ان پر حملہ کر کے ان کا قتل عام کیا، چنانچہ کوئی دس ہزار میں سے صرف دس زندہ بچ سکے۔ مگر سارے خوارج نہروان میں نہ تھے۔ ان سرفروشوں نے صدیوں مسلمان خلفاء کی نیند حرام کیے رکھی۔

نہروان کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام جانا چاہا تو اشعث کندی نے رکوایا کہ ہتھیار وغیرہ درست کرنا ہیں۔ ٹھہرے تو فوج کے لوگ کھسکنے لگے، اور جلدی ہی بمشکل ایک ہزار آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت اطلاع آئی کہ معاویہ نے شہر انبار پر حملہ کر کے چھاونی کے لوگوں کو قتل کیا۔ اس پر حضرت علی نے فوجی رضا کار مانگے۔ لوگ پھر بھی نہ آئے۔ اس پر جبراً فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کس کام کی ہوتی۔ اس مایوسی کے زمانے میں وہ بعض وقت بے اختیار کہا کرتے تھے: ''وہ بڑا شقی آخر کیا انتظار کر رہا ہے؟'' (۵۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی تھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک بڑا شقی قتل کرے گا)۔ اس سے بھی زیادہ حیرت مروج الذھب کی اس روایت پر ہوتی ہے کہ الحارث بن راشد نامی ایک شخص تین سو ساتھیوں کے ساتھ ان کی فوج سے نکل کر چلا گیا اور یہ سب نصرانی بن گئے۔

طبری، سنہ ۴۰ ابن الجوزی (المنتظم ۳-۲۹)، ابن کثیر (البدایہ ۷-۳۲۲) اور العواصم من القواصم لابن العربی، ص ۱۵۲، کے مطابق معجم الصحابۃ للبغوی، سب ہی صراحت کرتے ہیں کہ ''علی اور معاویہ میں طویل خط و کتابت کے بعد سنہ ۴۰ ھ میں ایک مہادنہ (معاہدۂ جنگ بندی) ہو گیا کہ دونوں میں جنگ رُک جائے، علی کو عراق، اور معاویہ کو شام (کی حکومت) حاصل ہو، ان دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے علاقے میں فوج لے کر نہ جائے اور نہ لوٹ مار غارت گری کرے۔ ابن اسحاق کے مطابق جب دونوں میں سے کسی نے دوسرے کی اطاعت (بیعت) منظور نہ کی تو معاویہ نے علی کو لکھا:

Marfat.com

اگر اس سے تم کو انکار ہے تو عراق تمہارا، اور شام میرا۔ اور اس تلوار کو اس امت سے روکو، اور مسلمانوں کا خون نہ بہاؤ۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قبول کیا اور سب اس پر راضی ہو گئے۔'' ایک طرف یہ، اور دوسری طرف ایسی روایتیں بھی ہیں کہ شام پر حملہ کرنے کے لیے وہ فوج جمع کر رہے تھے اور جب ہزاروں لوگ مرنے مارنے کی بیعت کر چکے تھے تو ان کو ایک خارجی نے شہید کر دیا۔

خارجی اپنی انتہا پسند تقشف کی تحریک میں سب سے بڑی رکاوٹ تین شخصوں کو سمجھتے تھے: علی، معاویہ اور عمرو بن العاص۔ اور علی سے نہروان کے قتل عام کا انتقام بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ چند سرفروش نکلے کہ ان تینوں کو ایک ہی معین دن فجر کی نماز کے وقت مسجد میں قتل کر دیں۔ عمرو بن العاص اتفاق سے اس دن مصر میں نماز کی امامت کے لیے نہ آئے۔ معاویہ اور علی دونوں زخمی ہو گئے۔ مگر معاویہ کا زخم کاری نہ تھا۔ (ان کے کردار کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ جب قاتل نے گرفتار ہو جانے پر معاویہ سے کہا: اے اللہ کے دشمن، کیا میں نے تجھے قتل کر دیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہرگز نہیں اے میرے بھائی (۵۲)۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتل ابن ملجم کو بھی گرفتار کر لیا گیا، اور علی نے کہا: اسے قید رکھو لیکن اذیت نہ دو۔ میں جانبر ہو گیا تو دیکھوں گا کہ معاف کروں یا کوئی سزا دوں؛ اور اگر مر جاؤں تو اس سے قصاص لے لینا۔ پھر جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دار فانی سے روانہ ہو گئے تو امام حسن نے اسے محبس سے نکالا، اور لوگ نفط اور لکڑی کا برادہ لائے کہ اس کی لاش کو جلا ڈالیں (۵۳) پھر اس کا ایک ایک عضو کاٹا جانے لگا مگر اس نے اف نہ کیا۔ جب اس کی زبان کاٹنے کا حکم دیا تو وہ رونے لگا۔ وجہ پوچھی گئی تو کہا: مجھے مرنے کا کوئی ڈر نہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ آخری سانس تک اللہ کا ذکر کرتا رہوں زبان کے کٹ جانے پر یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ ایسے کرداروں پر آدمی کو دم بخود مبہوت ہو جانا پڑتا ہے اور وہ سمجھ نہیں سکتا کہ کیا رائے دے۔ ایک اور معاصر خارجی کو سزائے موت دینے کے بعد اس کے خادم خاص سے پوچھا گیا کہ وہ زندگی میں کیسا تھا؟ کہا: مجھے کبھی دن میں غذا حاضر کرنے کی، اور رات میں بستر بنانے کی ضرورت نہ پڑی (کہ وہ قائم اللیل صائم الدھر تھا) (۵۴)۔

زخمی حضرت علی نے پورے سکون سے جان دی۔ بیٹے امام حسن کو ایک وصیت کی

Marfat.com

(جو جائداد اور خاندان کے افراد کے باہمی برتاؤ کے متعلق ہے، ولی عہدی یا سیاسیات کا اس میں کوئی ذکر نہیں) (ابن کثیر، مقاتل الطالبین للاصبہانی، طبری، ابن الاثیر) بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی تو ولی عہد نامزد کرنے سے انکار کیا (۵۵)۔ بعض اور نے پوچھا: کیا آپ کے بعد ہم حسن کی بیعت کرلیں؟ تو کہا: نہ تمہیں حکم دیتا ہوں، نہ منع کرتا ہوں۔ پھر وہ جنت کو سدھارے۔

چار سال نو ماہ کی حکمرانی کے بعد ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو چودہ لڑکے اور انیس لڑکیاں چھوڑ کر فوت ہوئے۔ ابن کثیر کے مطابق چار بیویاں اور انیس لونڈیاں گھر میں چھوڑیں، نیز چودہ بیٹے اور سترہ بیٹیاں۔ ابن حجر کے مطابق ۲۱ بیٹے اور ۱۸ بیٹیاں۔

ان کے خاندان میں ایک سندھی لڑکی بھی آئی اور اسی سے زید بن علی پیدا ہوئے تھے (۵۶)۔

روحانی زندگی:

سارے کبار صحابہ کی طرح، یہ بھی عابد و زاہد تھے، اور قرآنی حکم "في الدنیا حسنة وفي الآخرة حسنة" کی تعمیل میں انہوں نے نہ دنیا کو ترک کیا (حصول خلافت کی کوشش کی) اور نہ آخرت کو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی تعلیم کو جن صحابہ نے بطور خاص پھیلایا، ان میں یہ بہت ممتاز ہیں۔ اور آج تک نہ صرف شیعہ بلکہ سنی (قادری، چشتی، سہروردی وغیرہ) سلسلے انہیں کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مکتسب ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں انسانی چیزوں کو عیسائیوں کی طرح دینی اور دنیوی میں نہیں بلکہ ظاہری اور باطنی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکمرانی کے ساتھ ساتھ ظاہری امور دین یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ بھی خلیفۂ سیاسی سے متعلق ہوئے، اور باطنی امور خلیفۂ طریقت سے۔ خلافتِ سیاسی کو بعض انصار نے متعدد امیروں میں بانٹنا چاہا تھا (منا أمیر و منکم أمیر)، لیکن امت نے اسے پسند نہ کیا، لیکن خلافت باطنی میں ایک سے زائد صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ بلافصل بنے، علی بھی، ابوبکر بھی۔ شاہ ولی اللہ (بحوالہ ازالۃ الخفا ۲:۱۸۵) کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا

Marfat.com

سلسلۂ فاروقیہ بھی برقرار رہا ہے۔ نیز متعدد دیگر صحابہ سے بھی۔ حضرت علی رسول اکرم کے سیاسی خلیفۂ بلافصل نہ بنے (اور دنیا ایک سایہ ہے، آئی گئی چیز)، لیکن ابدی زندگی کے سلسلے میں وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ بلافصل ہیں، اور اس میں سنی شیعہ سب متفق ہیں۔ اب لے دے کر دونوں فرقوں میں فرق یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سیاسی زندگی میں بھی خلیفہ بلافصل اور خلیفۂ اول بننے کا حق تھا یا نہیں؟ اب ان کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو سال بعد اس مسئلے کی عملی اہمیت کچھ بھی نہیں، اس لیے اس کا فیصلہ خدا پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

غالی فرقے بھی پیدا ہوئے، سب سے پہلے ابن سبا نے یہ خیال پھیلایا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں خدا نے حلول کیا ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور آخر الاوصیاء ہیں (طبری)۔ حضرت نے اسے قید بھی کیا، جلاوطن بھی کیا مگر معلوم ہوتا ہے بڑا چرب زبان بھی تھا، عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی مصر گئے تو اس سے متاثر ہو گئے (طبری)۔ علوی، فاطمی وغیرہ بھی ان کے احترام میں مبالغہ کرتے ہیں۔ امامیہ شیعوں میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی نہیں ان کے جانشین بارہ پشت کے امام بھی معصوم ہیں۔

اداری نظام:

ان کا زمانہ خانہ جنگی کا تھا، اس لیے بیرونی فتوح بالکل بند ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ صرف سندھ کی سمت ان کے والی نے کچھ عملیت جاری رکھی۔

کشوری نظم ونسق میں جو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا، کوئی خاص فرق خلافت علی میں نظر نہیں آتا۔ دستور بھی برقرار رہا کہ خلیفہ منتخب تو ہو مگر تا حیات۔ خلیفہ دستوری حکمران یعنی آئین پسند ہی رہا اور وہ قانون کو بدلنے کا مجاز نہ تھا بلکہ قرآن و حدیث کا کاملاً تابع تھا، اور اپنے اعمال کے لیے عوام کے سامنے ہر وقت جوابدہ۔ مرکزی حکومت میں سارے امور خلیفہ سے متعلق رہے۔ مشورہ تو ہوتا ہے لیکن انہیں سے جن کو خلیفہ پسند کرے، عوام کے منتخبہ نمائندوں، اور شعبہ وار خود مختار وزیروں کا ابھی سوال نہ تھا۔

Marfat.com

سب سے اہم چیز شاید یہ تھی کہ مدینہ منورہ کی جگہ کوفہ دارالحکومت بنایا گیا۔ ابن عمر کے اعتراض پر کہا: وہاں مال اور آدمی (سپاہی) ہیں۔

صوبوں میں حسب سابق گورنر تھے۔ اور ان میں بہت سے بنی ہاشم کے تھے۔ فوج اور سرکاری خزانہ گورنر ہی کے ماتحت ہوتا تھا۔

خودمختار قاضی ایک ایسا ادارہ ہے جس پر اسلام فخر کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی مامور کنندہ خلیفہ کی بھی سماعت کر سکتا تھا۔ ابوبکر کی طرح علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی ان کے زمانۂ خلافت میں قاضی کے ہاں رجوع ہونا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک یہودی کے خلاف قاضی کے ہاں رجوع کیا، اور ثبوت کے لیے اپنے بیٹے اور غلام کو بطور گواہ پیش کیا۔ قاضی شریح نے شہادت رد کر دی کہ بیٹا باپ کے حق میں شہادت نہیں دے سکتا۔ فوری خفگی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاضی کو برطرف کر دیا لیکن دوسرے ہی دن اضافۂ تنخواہ کے ساتھ مکرر مامور کر کے اپنی حق پسندی کا ثبوت دیا۔ ان کے زمانے کی ایک اہم اور اچھی اصلاح یہ تھی کہ ایک گواہ دوسرے گواہ کا بیان نہ سنے، ورنہ سابق میں سب حاضر رہتے اور گواہ ثانی گواہ اول کے بیانات سے معلومات حاصل کرتا اور امکان ہوتا کہ جھوٹا گواہ بھی اس طرح تفاصیل سے واقف ہو جائے۔ یعقوبی عام طور پر ناقابل اعتماد مؤرخ پایا گیا ہے۔ بہرحال وہ لکھتا ہے: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عجیب عجیب احکام دیے حتیٰ کہ بعض لوگوں کو زندہ جلایا، بعض کو دھوئیں سے سزا دی (دخن)، چوری میں پہنچے کی جگہ صرف انگلیاں کاٹیں، لواطت میں مجرمین پر دیوار گرا کر ملبے میں زندہ دفن کیا''۔

غیر مسلموں کی عدالتیں بھی حسب سابق جدا ہی رہیں۔ ان سے سلوک اچھا رہا، انہیں سفیر تک بنایا۔ جزیے میں رقم کی طرح ہم قیمت مصنوعات بھی قبول کیے جا سکتے تھے۔ (۵۷)

ان کے زمانے میں قانون بین الممالک کی قسم ''قانون بین المسلمین'' نے خانہ جنگی کے باعث نظائر کے ذریعے سے ترقی کی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرزِ عمل اب فقہ کی کتابوں میں ''کتاب البغاۃ'' میں عام طور پر درج ملے گا۔ اسلحہ کے سوا مسلمان

باغی کی دیگر گرفتار شدہ جائداد کو وہ مالِ غنیمت نہیں بناتے تھے، بلکہ بھگوڑوں کا تعاقب تک نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر تو بعد میں کم عمل ہوا لیکن مسلمان باغی کو غلام نہ بنا سکنا ایسا فیصلہ تھا جو ذہنوں میں راسخ ہو گیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جنگ جمل کے فریقین کے مقتولوں پر انہوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ سنن سعید بن منصور (حدیث ۲۹۶۷) میں ہے: ان سے کسی نے پوچھا تو کہا: ہمارے اور ان کے مقتولوں میں سے جو شخص بھی وجہ اللہ اور دار آخرت چاہتے ہوئے لڑ کر مارا گیا وہ جنت میں جائے گا۔

نماز فجر کی دعائے قنوت میں وہ آخری زمانے میں معاویہ، عمرو بن العاص وغیرہ پر لعنت کرنے لگے تو اطلاع ملنے پر معاویہ نے بھی مماثل طرز عمل اختیار کیا (۵۸)۔ یہ نامناسب بدعت حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ختم کرائی۔

ان کی سرکاری مہر پر ''اللہ الملک'' درج تھا۔ کبھی کبھی '' محمد رسول اللہؐ '' والی مہر بھی استعمال کرتے تھے، جیسا کہ تحکیم نامۂ صفین میں کیا تھا۔ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی عبارت والی مہر بعد میں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استعمال کی تھی، اس لیے اس کے سیاسی مضمرات واضح ہیں۔

ان کے ذہانت آمیز فتوے اور فیصلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تعریف حاصل کر چکے ہیں، اور خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی۔ خود ان کے زمانۂ خلافت میں بھی اس کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں: دو شخص کھانے پر مل کر بیٹھے تھے، ایک کے پاس پانچ روٹیاں اور دوسرے کے پاس تین روٹیاں تھیں۔ اتفاق سے ایک شخص پاس سے گذرا تو اسے بھی کھانے کی دعوت دی۔ اس نے چلتے ہوئے شکر گذاری میں آٹھ درہم پیش کیے۔ ان کے بٹوارے میں جھگڑا ہوا۔ پانچ روٹیوں والے نے تین روٹیوں والے رفیق سے کہا: پانچ درہم مجھے، تین تجھے ملنا چاہیے۔ دوسرے نے اصرار کیا کہ رقم مساوی بٹنی چاہیے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مقدمہ کیا تو انہوں نے تین روٹیوں والے جھگڑالو سے کہا: تیرا دوست جو دے رہا ہے لے لے۔ وہ اپنے اصرار پر قائم رہ کر عدالتی فیصلہ چاہنے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: تجھے آٹھ میں سے صرف ایک درہم ملے گا، اور سات درہم تیرے رفیق کو۔ وہ بوکھلایا تو کہا: آٹھ روٹیوں کو تین شخص نے کھایا،

Marfat.com

ان روٹیوں کے چوبیس ٹکڑے کرنے تھے تا کہ ہر ایک آٹھ ٹکڑے کھا سکے۔ یہ فرض کرنا چاہیے کہ تینوں نے مساوی مقدار میں کھانا کھایا۔ تیرے رفیق کے پاس کی پانچ روٹیوں کے پندرہ ٹکڑے بنے، اور تیری تین روٹیوں کے نو۔ ان نو میں سے آٹھ خود تو نے کھائے اور صرف ایک ٹکڑا مہمان کو دیا اور تیرے رفیق کے پندرہ ٹکڑوں میں سے اس نے آٹھ کھائے اور سات مہمان کو دیئے۔ لہٰذا مہمان کے دیئے ہوئے آٹھ درہم میں سے ایک تجھے اور سات اسے ملیں گے (۵۹)۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فتوؤں کی دھوم تھی اس لیے بعد میں بعض جاہ پرست مؤلفوں نے اصلی نقلی چیزوں کے مجموعے تیار کئے تھے۔ ایک اس طرح کا مجموعہ فتاویٰ حضرت عبداللہ بن عباس کو دکھایا گیا تو انہوں نے بہت سی چیزوں کو مٹا دیا اور کہا کہ یہ حضرت علی پر افترا ہے۔

انہیں حدیث نبوی سے بھی بڑی واقفیت تھی۔ ان کی روایتیں یکجا بھی مل سکتی ہیں، مثلاً مسند احمد بن حنبل، المعجم الکبیر للطبرانی، المستدرک للحاکم، وغیرہ میں انہوں نے حدیثیں لکھائیں بھی۔ ایک دن مسجد کوفہ میں کہا: کون ہے جو میرا علم ایک درہم میں حاصل کرنا چاہتا ہے؟ الحارث الاعور دوڑ کر بازار گیا اور ایک درہم کا کاغذ خرید لایا اور اس نے بہت سی چیزیں (علما کثیرا) لکھیں۔ حر بن عدی کے پاس بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لکھائی ہوئی چیزوں کا ایک پورا رسالہ (صحیفۃ) تھا۔ ان کے پاس چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تلوار آ گئی تھی اس لیے اس پر جو دستاویزیں رسول اللہ نے لپیٹ رکھی تھیں وہ بھی ان کے پاس تھیں اور وہ ان کو پڑھ کر سناتے اور کہا کرتے قرآن اور ان دستاویزوں کے سوا میرے پاس کوئی اور لکھی ہوئی چیز نہیں ہے (۶۰)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شہری مملکت مدینہ کا دستور، اور تخطیط حدود حرم مدینہ، نیز نصاب زکوٰۃ کی تفصیلیں شامل تھیں۔

دائرۃ المعارف اسلامیہ (فرنگی) کی طبع دوم کی مقالہ نگار مادۂ ''علی'' نے اپنی رائے یوں دی ہے: ''ان کا نظام العمل غیر معین تو نہیں لیکن خواب وخیال کی دنیا کا **utopian** تھا مگر جب اقتدار ہاتھ آیا تو غالباً انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ نظام العمل تحقق پذیر ہونے

Marfat.com

کے ناقابل ہے"۔

حواشی

۱۔ شاہ ولی اللہ ۔ ازالۃ الخفاء۔ ۲-۲۵۱

۲۔ احمد بن یحییٰ البلاذری، انساب الاشراف ط مصر ج ۱، ف ۳۲۰۔

۳۔ محمد ابن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک ص ۱۱۶۱

۴۔ احمد بن یحیی البلاذری، انساب الاشراف ف ۲۱۸

۵۔ ابن کثیر دمشقی، البدایۃ و النھایۃ ۷-۲۲۷

۶۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء ۲-۲۵۲

۷۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح ۔ ۳۴-۴۹-۵ وغیرہ

۸۔ ایضاً ۶۴-۷۸-۵

۹۔ احمد بن یحیی البلاذری، انساب الاشراف ج ۱ ف ۸۲۶

۱۰۔ ایضاً مخطوطہ استانبول ۱-۳۷۶

۱۱۔ ایضاً۔ ف ۱۱۸۴، ۱۱۸۷

۱۲۔ ایضاً۔ ف ۱۱۸۳ تا ۱۱۸۶

۱۳۔ تاریخ الامم و الملوک ص ۱۸۲۵

۱۴۔ ابو الحسین المعتزلی: کتاب المعتمد مطبع بیروت ۲-۶۴۶

۱۵۔ تاریخ الامم و الملوک ص ۱۸۷۴

۱۶۔ ایضاً ص ۱۹۷۷، ۲۰۷۲

۱۷۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب نمبر ۲۰۱۵

۱۸۔ دیکھیے میرا مضمون the Nasi مجلہ ہسٹاریکل سوسائٹی آف پاکستان، جلد ۱۶ شمارہ اوّل و چہارم، ۱۹۶۸ نیز اسلامک ریویو جلد X شمارہ ۲، ۱۹۶۹۔

۱۹۔ ازالۃ الخفا ۱-۱۷۷

۲۰۔ تاریخ الامم و الملوک ص ۲۶۱۳

۲۱۔ ایضاً ص ۲۵۱۰

۲۲۔ ایضاً ص ۲۷۵۰

۲۳۔ ایضاً ص ۲۴۱۲

۲۴۔ ایضاً ص ۲۲۱۲

Marfat.com

۲۵۔ ایضاً ص ۲۵۲۲
۲۶۔ البدایہ والنہایہ ۷-۱۴۲۱
۲۷۔ تاریخ الامم والملوک ص ۲۷۹۶
۲۸۔ ایضاً ص ۲۷۸۶
۲۹۔ ایضاً ص ۲۸۳۳ تا ۲۹۳۵
۳۰۔ تاریخ الامم والملوک ص ۲۹۴۲
۳۱۔ ایضاً ص ۲۹۳۷
۳۲۔ (ابن سعد ۳-۱ ص ۵۷ ابن کثیر ۷-۱۷۵) بی بی عائشہ سے متعلق مسروق کی ایسی ہی روایت طبری کے ہاں بھی ہے۔
۳۳۔ تاریخ الامم والملوک ص ۲۹۵۵
۳۴۔ ایضاً ص ۲۹۵۸
۳۵۔ ایضاً ص ۲۹۶۴
۳۶۔ ایضاً ص ۲۹۶۰
۳۷۔ ایضاً ص ۲۹۶۱
۳۸۔ ایضاً ص ۲۹۶۲
۳۹۔ ایضاً ص ۲۸۶۱
۴۰۔ ایضاً ص ۳۰۱۰
۴۱۔ ایضاً ص ۲۰۱۱
۴۲۔ ایضاً ص ۳۰۱۱
۴۳۔ ایضاً ص ۳۰۱۷ تا ۳۰۱۸
۴۴۔ شریف رضی، نہج البلاغۃ، ۱-۱۸۲ خطبہ ۸۸
۴۵۔ ابن کثیر۔ الکامل والتاریخ ۷-۲۳۷
۴۶۔ محمد حمید اللہ۔ الوثائق السیاسیۃ نمبر ۳۷۳
۴۷۔ ابو جعفر محمد ابن حبیب، کتاب المحبر ص ۲۴۵
۴۸۔ انساب مخطوطہ استنبول ۱-۳۸۴
۴۹۔ تاریک الاسلام۔ ۲-۳۲۳
۵۰۔ محمد بن احمد ابی سہل سرخسی، المبسوط ۱۰-۲۹
۵۱۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب زیر "علی" (ترتیب ابجدی)

Marfat.com

۵۲۔ ابو حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری، کتاب الاخبار الطوال ص ۲۲۹

۵۳۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳-ال-ص ۲۶

۵۴۔ الاخبار الطوال ص ۲۲۹

۵۵۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ ۳-۱ ص ۲۲

۵۶۔ انساب الاشراف ۱-۳۴۰

۵۷۔ الاستیعاب۔ مادہ "علی"

۵۸۔ الکامل والتاریخ۔ ۷-۲۸۳

۵۹۔ الاستیعاب۔ حوالہ بالا

۶۰۔ بخاری، الصحیح۔ ۵۸-۱۰، ۹۱، ۹۶ وغیرہ

(فکرونظر-اسلام آباد- جولائی، ستمبر ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

مولانا مُفتی مُحمدؐ شفیع عُثمانی

میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ فاضل گراں مایہ، فخر عصر محمد شفیع عثمانی مرحوم اعلی اللہ مقامہ سے زیادہ استفادے کا موقع نہ پاسکا۔ حیدرآباد دکن میں ولادت اور بے وطنی سے قبل کی تقریباً ساری عمر وہیں گزرنے کے باعث اگر مرحوم سے ملاقات بالکل ہی نہ ہوتی تو بھی باعث حیرت نہ ہوتا لیکن خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ خدا نے اس کا موقع دیا۔ پاریس میں قیام پذیر تھا کہ یکایک آب ودانہ ۱۹۴۹ء میں کشاں کشاں کراچی لے گیا۔ وہاں پورا ایک سال رہنا ہوا۔ مجلس دستور ساز میں ایک مشاورتی (فنی) مجلس تعلیمات اسلامی قائم کی گئی تو مقامی علماء میں سے حضرت مفتی محمد شفیع منتخب ہوئے اور اس سے بہتر کوئی انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ ذمہ دارانِ اعلیٰ مقام نے نہ معلوم کس غلط فہمی میں اس ناکارے کو بھی اس میں داخل کیا۔ اس طرح مرحوم سے ملاقات کی صورت ہو گئی۔

اپنی سرکاری مصروفیت سے مجھے یہاں بحث نہیں تعطیلات کو چھوڑ کر حضرت مفتی صاحب سے ہر روز ہی ملاقات ہوتی رہی۔ وقتاً فوقتاً علمی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی ناگزیر تھا۔ ان کے عمقِ علمی اور وسعتِ نظری کو آدمی دور سے تحریروں کو پڑھ کر بھی جان سکتا اور سراہ سکتا تھا، جو چیزیں دُور سے نہیں بلکہ صرف قریبی اور طویل تماس ہی پر نظر آسکتی ہیں ان میں اولاً تواضع کی اسلامی صفت ہے۔ کیوں نہ ہو شاخِ بے ثمر سر اٹھائے اکڑتی رہتی ہے۔ تو میوہ دار شاخ کا سر روزافزوں جُھکتا ہی جاتا ہے، عالم میں اَنانیت غرور اور تکبر کی جگہ تواضع ہو تو اس کی عزت گھٹتی نہیں بڑھ ہی جاتی ہے۔

دوسری صفت جس سے میں ہمیشہ متاثر ہوتا رہا، وہ ان کی وسعتِ قلبی تھی کہ چھوٹوں

Marfat.com

سے بھی کچھ سیکھنے میں کبھی خفیف ترین تذبذب نہ ہو، وہ بڑے فقیہ اور مستند مفتی تھے، ایک دن میں نے اصول فقہ پر کچھ سطحی خیالات ظاہر کرنے کے بعد (کہ یہ علم قانون میں مسلمانوں کی بہت بڑی جدت تھی جس کا نہ یونانیوں اور رومیوں کو کبھی خیال آیا اور نہ ہندیوں، چینیوں، مصریوں، بابلیوں کو) جب یہ عرض کیا کہ کاش کراچی میں کوئی دیو بند ثانی، کوئی بلند معیار کا علمی مدرسہ بن جائے تو میں بھی آں محترم کے دروس میں حاضر ہوا کروں کسے یقین آئے گا کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ اصول فقہ پر تمہارے دروس میں میں بھی شریک ہوا کروں گا۔ (ابھی دار العلوم بنانہ تھا)۔ ایسے ادارے کی ضرورت سے مرحوم بھی پورے متفق تھے لیکن شش و پنج اس پر تھا کہ آیا طلبہ ملیں گے بھی۔ میں نے عرض کیا کہ دیو بند جیسے ایثار طلب اور ترکِ دنیا کرانے والے مدرسے میں جانے والے لوگ ہمالیہ ملے کے براعظم میں کم نہ تھے۔ مہاجرین میں ایسے لوگ کم نہیں۔ یکا یک مولانا کا چہرہ تکنے لگا اور فرمایا: ٹھیک کہتے ہو غالباً اس لمحے ہی سے وہ فیصلہ کر چکے اور عزم بالجزم فرما چکے تھے کہ جیسے ہی مجلسِ دستور ساز سے سبکدوشی ہو، تدریس اور علم دین کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کر دیں۔

ان میں ایک اور صفت بھی دیکھی جو نادر ہے وہ یہ کہ ہر نئی چیز کو بدعت اور قابلِ نظر اندازی قرار دے لینے کی جگہ اس کو سمجھنے کی کوشش فرماتے تھے تاکہ فیصلہ کریں تو واقفیت کے ساتھ۔ یاد رہے کہ ایک دن گفتگو ہوئی کہ انکم ٹیکس کی شرح میں درجہ بندی کیوں ہوتی ہے؟ میں نے عرض کیا: فرض کیجیے کہ میرے گھر میں ایک بیوی اور دو بچے ہیں اور ختم سال پر حوالانِ حول والے دو سو روپے ہیں۔ میں پانچ روپے زکات میں دینے پر مکلف ہوں؟ اور فرض کیجیے کہ آپ کے مکان میں بھی ایک بیوی اور دو بچے ہیں اور نقد اندوختہ دو کروڑ کا ہے۔ اس لیے آپ کو پانچ لاکھ زکات دینی ہوگی۔ کہا: ہاں تو پھر؟ میں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ محکمۂ فنانس والے کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی ضرورتوں کے مساوی ہونے کے باوجود میرے پاس (۱۹۵) روپے اور آپ کے پاس ایک کروڑ پچانوے لاکھ روپے رہیں گے، جو خلاف عدل و انصاف ہے، اس لیے اگر مجھے زکات معاف نہ بھی کی جائے تو آپ سے ذرا زیادہ شرح سے رقم لینی چاہیے! یکا یک چہرہ سنجیدہ، اور ذہن غور و فکر

Marfat.com

میں غرق ہو گیا۔ زبان سے صرف ایک لفظ نکلا: واقعی غور طلب چیز ہے۔ پھر سوچ میں مشغول ہو گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نہ میں، نہ وہ زکات کی شرح بدلنے کے قائل ہو سکتے تھے۔ لیکن فوائب میں بتدریجی شرح کے استعمال کو انہوں نے فوراً رد بالکل نہ کیا۔

میں نے فوراً انہیں ٹوک دیا اور کہا: نہیں جی، اس کے معنی قاتل کے ہیں اور اس کے بہ کثرت شواہد موجود ہیں۔ مرحوم کو ضروریاتِ زمانہ کا کامل احساس تھا۔ اس لیے اقتصادی مسائل پر احادیث وغیرہ سے ہمیشہ شغف رکھتے تھے، جب بنی النضیر کو عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینے سے نکالا گیا تو انہیں یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ مسلمانوں پر ان کے جو قرض ہیں وہ بھی واپس حاصل کر سکیں، ان میں سے بعض طویل مدت کے لیے دیے گئے تھے میں نے شرح السیر الکبیر للسرخسی رحمۃ اللہ علیہ سے رسول اکرم کا یہ ارشاد دکھایا: ضَعُوا و تَعَجّلوا (مقدار گھٹاؤ اور قبل از وقت قرضہ واپس حاصل کر لو) فوراً عبارت اور حوالے کو اپنی یادداشت کی کاپی میں نوٹ فرما لیا۔

مرحوم علمی خدمت کے لیے سلفِ صالح کی روایات پر عامل تھے یعنی کوئی نجی ذریعہ روزگار ہوتا کہ فراغبالی سے علمی خدمت بے مزد و بلا معاوضہ کر سکیں اور آزادی بھی برقرار رہے کہ پیسے کی خاطر اربابِ حکومت کے لیے ضمیر فروشی کی کبھی ضرورت نہ رہے اور سرکاری ملازمت ہو بھی تو اسے ہر لمحہ لات مار سکیں۔ چنانچہ بچوں کو اعلیٰ دینی تعلیم دلانے کے بعد تجارت و اشاعتِ کُتب میں لگایا تھا۔ ایک دن خود مُصر ہو کر مجھ سے خواہش فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی مرتب کر کے اشاعت کے لیے پیش کروں، غالباً یہ کئی بار چھپی ہے۔ اگرچہ حالات نے ناشر کو موقع نہ دیا کہ مؤلف نے ترمیم و اضافہ شدہ جو نسخہ بھیجا تھا اس کی اساس پر مکرر کتابت و طباعت میں آئے۔

لعلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعدَ ذالِكَ أمرا

جب مجھے فرانس واپس ہونا تھا تو روانگی سے ایک یا دو دن قبل مرحوم نے زحمت فرمائی اور خداداد کالونی کی میری قیام گاہ پر تشریف لا کر میری سرفرازی فرمائی اور دیر تک تاسف کرتے رہے اور اس طرح وداع فرمایا گویا کسی عزیز قریب سے محروم ہو رہے ہیں۔

Marfat.com

کوئی پچیس طویل سالوں کے وقفے کے بعد جب مجھے مکرر کراچی سے گزرنے کا موقع ملا اور سلام کے لیے خدمت میں حاضر ہوا تو باوجود علالت کے جوش جذبات سے کھڑے ہوگئے اور گلے لگالیا۔ اس کے بعد وہ جلدی ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مرحوم ومغفور نہ صرف بڑے عالم تھے بلکہ اچھے ادیب بھی تھے۔ ایک تو ان کی کتاب ''معارف القرآن'' ہے جو اچھی عصری تفسیر ہے۔ اسی طرح ان کا مختصر مضمون ''اسلامی ذبیحہ'' معلومات کا گنجینہ ہے اور طعام اہل الکتاب'' کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ ''اسلام کا نظام اراضی'' بھی ایک بہت مفید تالیف ہے ان کے علاوہ بھی مرحوم کی بہ کثرت مطبوعہ (اور شاید بعض اشاعت طلب) تصنیفیں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے چندگراں مایہ مقالوں کا عربی ترجمہ ہوکر عرب ممالک کے علمی رسالوں میں شائع ہوتو مرحوم کی قدروقیمت سے ایک وسیع تر حلقہ واقف ہوسکے گا۔ ان کی تفسیر کا انگریزی ترجمہ شروع ہوا ہے لیکن عربی ترجمے پر بھی توجہ ہوتو نامناسب نہ ہوگا۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کی مشترکہ علمی زبان اور خاص کر دینی علم کا ماخذ عربی زبان ہی ہے۔ امہات المومنین کی زبان ہونے کے باعث وہ سارے اگلے پچھلے مسلمانوں کی مادری زبان بھی ہے۔

خدا مرحوم کو اعلائے علیین میں جگہ دے، پس ماندوں کو صبر کی توفیق اور ہم سب کو ان کی علمی میراث سے استفادے کا موقع عطا فرمائے۔

(البلاغ کراچی۔ اشاعت خصوصی بیاد فقیہ ملت حضرت
مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، قدس اللہ سرہ
جمادی الثانیہ تا شعبان ۱۳۹۹ھ)

Marfat.com

مولوی عبدالحق مرحوم کی یاد میں

کم از کم ساٹھ ستر برس سے ہمالیہ تلے کے براعظم میں عبدالحق اور اردو مترادف ہو چلے ہیں۔ اگرچہ اردو ادبیات نہ کبھی میرے درسی موضوعات میں رہے اور نہ جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد علمی مشغولیات میں۔ لیکن عبدالحق صاحب کو دیکھنے ملنے والوں میں رہا اس لیے ان کی یاد سے کچھ نہ کچھ باتیں ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں کوئی اہمیت تو نہیں لیکن عبدالحق صاحب پر کچھ لکھنے کی فرمائش اصرار اور بار بار کی یاد دہانی کے باعث یہ سطریں قلمبند کرتا ہوں۔

اردو ایک بدنصیب زبان ہے جب سے پیدا ہوئی، ملک کی سرکاری زبان کوئی اور ہی......زبان رہی۔ کبھی فارسی کبھی انگریزی ایک بڑے رقبے میں بولی جانے کے باوجود اگر وہ کبھی سرکاری زبان بنی بھی تو اس بڑے رقبے کے محدود اور مختصر حصوں میں۔ ۱۹۳۶ء میں مجھے سرینگر میں بتایا گیا کہ اردو کشمیر کی سرکاری زبان ہے لیکن جب میں نے وہاں سرکاری افسروں، ہی نہیں قوم پرست، باغیوں سے پوچھا کہ اگر آپ کوئی جامعہ قائم کریں تو آیا ذریعہ تعلیم اردو میں ہوگا؟ اس سے قطعی انکار کرنے اور عذر پیش کرنے والوں میں ایک وہ صاحب بھی تھے جو بعد میں وہاں کی قوم پرست وزارت میں وزیر تعلیم بنے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو کی علمی صلاحیت جامعہ عثمانیہ کے باعث ساری دنیا میں مُسلّم ہو چکی تھی۔

یہ دوعملی ہی شاید اردو کی بدنصیبی کا اصل باعث ہے۔ اسے بولنے والے چاہتے ہیں کہ دوسرے اسے بولیں، خود نہ بولیں۔ میں کراچی کے ایک مشہور اہلِ قلم سے واقف ہوں جن کی اردو پرستی ایک تعصب ہی نہیں جنون کی حد تک پہنچ چکی ہے لیکن گھر میں

ملاقات کے لیے آنے والے اہل علم ہی نہیں خود اپنی بیوی بچوں بچیوں سے بھی ہمیشہ صرف انگریزی شریف میں بات کیا کرتے ہیں (گھر میں کوئی انگریزی بیوی بھی نہیں کہ کوئی عذر سمجھا جائے۔)

عبدالحق صاحب مرحوم عالم جوانی ہی سے اس بدنصیب زبان کی خدمت اور دفاع میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ میں جب پیدا ہوا تو کہنا چاہیے کہ وہ بوڑھے ہو چکے تھے مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ ان کو دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا ناظم بنایا گیا تھا۔ بعض کتابوں کا پیش لفظ ان کا لکھا ہوا اور نام کے ساتھ ان کا عہدہ بیان ہوا تھا اس طرح مجھے اس سے آگاہی ہوئی۔ خود جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ان کا کیا حصہ رہا، ظاہر ہے کہ یہ اس سے بھی قدیم تر چیز ہے جس کی بھنک بھی میرے کان میں نہ پڑ سکتی ہے۔

مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ انجمن ترقی اردو کس طرح اور کب اورنگ آباد (دکن) آئی۔ میں جب کالج کے درجوں میں پہنچا تو عبدالحق صاحب وہاں تھے اور ان کا سہ ماہی رسالہ اردو میں چھپتا تھا۔ مجھے اس کی یہ بات تو بہت پسند تھی کہ اس رسالہ کی طباعت عہد حجری سے گزر کر عہد آہنی تک پہنچ چکی تھی لیکن اس کا ٹائپ بہت بھلا تھا۔ مصر کے عربی رسائل کی (طباعتی حد تک) وہ گرد تک بھی نہیں پہنچتا تھا بہر حال اپنا رسالہ تھا۔

اس زمانے میں مولوی وحید الدین سلیم اردو کے پروفیسر تھے اس لیے اس کی ضرورت نہ تھی کہ مولوی عبدالحق تدریس کا بار اپنے سر لیں۔ ویسے بھی وہ اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل تھے اور بالواسطہ اردو کی خدمت ہی میں مشغول تھے۔ شیخ چاند مرحوم (جو بعد میں جامعہ میں میرے ہم جماعت بنے) اورنگ آباد ہی میں عبدالحق صاحب سے (اردویات) کی تربیت پاتے رہے۔

بہر حال جب مولوی وحید الدین سلیم کا انتقال ہو گیا تو میں نے سنا تھا کہ حیدری صاحب مرحوم نے (جو اُن دنوں وزیر فینانس تھے) بڑے اصرار سے مولوی عبدالحق صاحب کو حیدرآباد آنے پر مجبور کیا۔ مولوی صاحب نے اسے منظور تو کیا لیکن اس شرط سے کہ ان کے اورنگ آباد کام یعنی انجمن ترقی اردو میں کوئی حرج نہ ہو۔ چنانچہ انہیں اجازت تھی کہ جب چاہیں حیدرآباد آئیں، جتنے چاہیں جامعہ میں درس دیں پھر جب

Marfat.com

چاہیں اورنگ آباد چلے جایا کریں۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم دوسرے شعبوں والے طلبہ تو کیا خود اردو کے طلبہ بھی ان کو کم ہی دیکھا کرتے تھے مگر ان کی سفید گھنی داڑھی، ان کے پروقار انداز، اور ان کی کم گوئی سے ان کا احترام ہی نہیں ان کا رعب بھی ہم لوگوں کے دلوں میں تھا۔

۱۹۲۷ء میں طلبہ جامعہ عثمانیہ کے لیے ایک سہ ماہی رسالہ، مجلہ عثمانیہ نکلا (اس کے پہلے نمبر میں میرا مضمون ڈاک کے ٹکٹ اشاعت کے لیے منظور ہوا تھا)۔ غالباً عبدالحق صاحب مرحوم اس رسالہ کے نگراں اڈیٹر تھے۔ ایک سال بعد ٹیپو سلطان اور اردو کی ترقی بھی اسی رسالہ میں چھپا۔

دوری کے باوجود قربت کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں جرمنی اور فرانس میں تعلیم کے بعد ۱۹۳۵ء کے آغاز میں واپس ہوا۔ غالباً مجھے ابھی جامعہ عثمانیہ میں کوئی ملازمت بھی نہ ملی تھی کہ مرحوم کا ایک پیام ملا وہ یہ کہ ان کی مجوزہ کتاب حبشہ کا ایک باب عرب اور حبشہ لکھوں جب میں نے عذر کیا کہ خلافت راشدہ کے بعد کے روابط سے مجھے واقفیت نہیں تو فرمایا کہ جتنی واقفیت ہے وہی لکھوں، ماقبی کی تکمیل وہ خود کریں گے چنانچہ میں نے کچھ چیزیں لکھیں، لیکن اڈیٹر کے کچھ سہو سے پورا باب ہی میری طرف منسوب ہو گیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ میں میری ملازمت کے بعد مجلہ عثمانیہ میں (جو طلبہ کا رسالہ تھا) اور مجلہ تحقیقات علمیہ میں (جو اساتذہ سے مخصوص تھا) اگر میرے مضامین زیادہ چھپنے لگے تو نہ اس پر حیرت ہو اور نہ اسے کوئی خاص اہمیت دی جائے لیکن ایک چھوٹی سی بات یاد آرہی ہے عبدالحق مرحوم اپنی کتاب قواعد اردو کے باعث مشہور ہیں صرف ونحو پر وہ گویا سند تھے مجھے اب یاد نہیں آرہا ہے کہ اپنے کس مضمون میں بہرحال ایک مضمون کے حاشیے میں اردو صرف ونحو کے ایک قاعدے پر میں نے کچھ خیال آرائی کی تھی مرحوم نے اسے من وعن شائع کر دیا۔ مجھے اس پر بڑی خوشی اس لیے ہوئی تھی کہ اردو ادبیات سے مجھے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

اولاد آدم میں زندگی نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ آپس میں جھگڑتے رہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں مولوی عبدالحق اور مولوی سید سجاد دونوں اردو کے اساتذہ تھے نہ معلوم کیوں

ان میں آپس میں بنتی نہ تھی۔ ایک مرتبہ اس اختلاف نے طول کھینچا اور انتظامی پیچیدگیوں کا باعث بن کر اساتذہ ہی نہیں طلبہ تک یہ خبریں پہنچ گئیں۔ سید سجاد صاحب موٹر کے ایک حادثے میں زخمی ہوئے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ کافی عرصہ کے بعد رجوع بہ کار ہوئے تو بیساکھیوں پر جماعت میں آئے تھے وہاں اساتذہ کو رجسٹر حاضری میں ہر درس کے دن دستخط کرنے پڑتے تھے۔ ایک دن سجاد صاحب بھول کر دستخط کیے بغیر چلے گئے جب یاد آیا تو موٹر میں دوبارہ جامعہ آئے لیکن اپنے کمرے تک جانے کی تکلیف سے بچنے کے لیے چپراسی کو کہا کہ رجسٹر لائے اور موٹر ہی میں دستخط کر دیے معلوم ہوتا ہے کہ اسے عبدالحق صاحب نے دیکھ لیا اور دفتر میں شکایت کر دی مگر انہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔

اس زمانے کی ایک اور بات یاد آ رہی ہے جامعہ عثمانیہ میں ایک انگریز مسٹر اسپیٹ Speight انگریزی ادب کے جونیر پروفیسر تھے سینئر پروفیسر ایک دیسی شخص حسین علی خاں صاحب تھے۔ آدمی بہت شریف تھے اور طلبہ سے بڑی محبت سے ملتے تھے مجھ پر خاص کر مہربان تھے غالباً اوروں سے بھی ویسا ہی برتاؤ ہوگا بہرحال ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کی ایک مثال درج کرتا ہوں۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک مضمون شائع کیا مضمون تو انگریزی میں تھا لیکن اس کا عنوان عربی میں تھا لحیۃ طیبہ یعنی اس کی داڑھی خوبصورت ہے۔ اس سے مراد عبدالحق صاحب مرحوم تھے۔ مضمون میں پروفیسر اسپیٹ صاحب نے لکھا تھا کہ میں حیدرآباد میں بنجارہ ہل نامی ایک سنسان مقام پر رہتا تھا جہاں آس پاس دور دور تک کوئی مکان نہ تھا۔ عبدالحق صاحب جب بھی مجھ سے ملتے تھے چھیڑا کرتے اور کہتے کہ انسان بنو اور انسانوں کے ساتھ رہو۔ آخر میں نے ان کی بات مان لی اور بیگم پیٹ کے زیادہ آباد محلے میں منتقل ہو گیا (اور پروفیسر سید سجاد صاحب کے ہمسایہ بنے) پھر ایک دن محض استعجاب کی خاطر میں اور میری بیوی بنجارہ ہل کی طرف سیر کے لیے موٹر میں گئے اور معلوم کرنا چاہا کہ اس سنسان مکان کا اب کیا حشر ہوا ہے۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ اب اس میں مولوی عبدالحق صاحب فروکش ہو چکے ہیں۔ (مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ عرب ممالک میں لحیۃ طیب زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ لحیۃ طیبہ کہیں) ایک محاورہ ہے جو تعریف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

حیدر آباد میں مرحوم سے میری ملاقات ایک دو بار سے زیادہ نہ رہی وہ بھی عزلت پسند تھے اور میں بھی۔ پھر روابط بڑھیں بھی کیسے اس کے بعد مرحوم حیدر آباد چھوڑ دہلی چلے گئے۔ اس پر ہم سب کو بڑا رنج ہوا تھا کیونکہ اب انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی حیدر آباد کی جگہ دہلی منتقل کر دیا جانے والا تھا۔

پھر ملک کی خوں فشاں آزادی عمل میں آئی جس کے زخموں سے ابھی جسم مندمل بھی نہ ہو سکا ہے اپنی اٹل عزیمت کے باوجود مولوی صاحب دہلی میں نہ رہ سکے اور بے خانماں کراچی پہنچے سنا کہ ان کی ساری عمر کی کمائی یعنی انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ وہاں ضبط ہو گیا جس کے صدمہ سے مرحوم گویا جانبر نہ ہو سکے۔

میں ۵۰-۱۹۴۹ء میں چند ماہ کراچی میں رہا وہاں دو ایک بار مرحوم سے ملاقات ہوئی خاص کر الوداعی ملاقات کے لیے گیا تو انہوں نے درد بھرے الفاظ میں فرمایا۔ تم بھی چلے جاتے ہو؟ لیکن میرا آب ودانہ پاکستان کا نہ تھا۔

اس کو تقریباً دس سال گزر گئے پاریس میں اردویات کے ایک طالب علم کو کچھ علمی مدد دینے کے سلسلے میں مجھے خطبات و مقالات گارساں دتاسی کی اصل اور اردو ترجمہ کے مقابلے کا موقع ملا اور یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی کہ اردو ترجمہ بارہا اصل سے مختلف ہے۔

اس پر میں نے مرحوم کو لکھا کہ اگر وہ چاہیں تو میں ترجمے کی نظر ثانی کروں انہوں نے پہلی جلد مجھے بھیجی اور جب چند ماہ بعد میں نے نظر ثانی کر کے وہ نسخہ واپس کیا تو انہوں نے پُر جوش شکریے کا خط لکھا اور حیرت ظاہر کی۔ میں نے ایک سطر ہی نہیں ایک ایک لفظ کو جانچنے پرکھنے کا صبر آزما کام کس طرح انجام دیا۔ پھر دوسری جلد آئی اور وہ بھی واپس کی تو مرحوم نے شکریہ نامہ لکھوا بھیجا اس کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا اور تیسری جلد ان کی وفات کے بعد مکمل ہو سکی (اردو کی اور بھی کتابیں ہیں مثلاً سید علی بلگرامی نے تمدن عرب اور تمدن ہند کا فرانسیسی ہی سے ترجمہ کیا ہے کاش ان کی بھی نظر ثانی کرا کر کوئی ناشر انہیں مکرر شائع کرے۔ اردو کے ترجمہ کا معیار جب پست نظر آتا ہے تو طبیعت شرمندہ اور منغض ہو جاتی ہے۔)

یہ ہیں کچھ باتیں مرحوم کی یاد پر یاد آتی ہیں اسی ماحضر و ما تیسر پر اکتفا کرتا ہوں۔

(قومی زبان کراچی- بابائے اُردو نمبر- ۱۶ اگست ۱۹۶۲ء)

Marfat.com

تاریخ

Marfat.com

اسلامی فلاحی ریاست کا قیام

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد کی تاریخ میں ۲۸ اپریل ۱۹۹۲ء ایک بابرکت اور قیمتی دن تھا جب عالم اسلام کے نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب یونیورسٹی میں جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے اسلامی فلاحی ریاست کے قیام سے متعلق چندزریں کلمات ارشاد فرمائے۔ چونکہ اس وقت کے صدر مملکت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی اور ڈاکٹر صاحب کے پاس وقت بہت قلیل تھا، اس لیے آپ نے نہایت مختصر اور اشاراتی گفتگو فرمائی۔ اس مختصر گفتگو میں ڈاکٹر صاحب کا نکتہ ارتکاز فلاحی ریاست میں عوام اور حکمرانوں کی ذمہ داریوں سے متعلق تھا۔ فلاحی ریاست کے ان دونوں طبقوں کی اخلاقی تربیت، آپ کے نزدیک نہایت اہم معاملہ ہے بلکہ آپ کے خیال میں اخلاق حسنہ ہی اسلامی فلاحی ریاست کی بنیاد ہے۔ ریاستی ذمہ داروں اور عوام کے دلوں میں خوف خدا کا نہ ہونا، اخلاقی گراوٹ اور پستی کی علامت ہے۔ آپ کے خیال میں جب تک یہ علامت موجود رہے گی تب تک کوئی آدمی بھی اپنی ذمہ داریوں کو برلانے کا خیال نہیں کرے گا۔ نتیجتاً تمام تر وسائل کے باوجود فلاحی ریاست کا قیام ممکن نہ ہو سکے گا۔ دوسری طرف اگر حکمرانوں اور عوام کے دلوں میں

خوف خدا ہے تو اپنی ذمہ داریوں کا خیال رکھیں گے اور خدمت کے جذبہ سے کام کریں گے لہٰذا باوجود کم وسائل کے، اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی فلاحی مملکت اس کو کہیں گے جس میں اس کی رعایا کے جان، مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا خاطر خواہ انتظام موجود ہو۔ ریاستی دفاع کے لیے ملکی فوج کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ آپ کے خیال میں ملک کی فوج کا طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ نظم وضبط کا پابند ہونا بھی ضروری ہے۔ تقریر کے اختتام پر سامعین کی طرف سے سوالات بھی پیش کیے گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ان کے جوابات دیئے۔ شاہ معین الدین ہاشمی، لیکچرر، شعبہ حدیث وسیرت نے ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کو ٹیپ سے منتقل کیا۔ (مدیر)

متن تقریر:

اساتذہ کرام، علماء کرام، عزیز خواہران و برادرانِ محترم اور عزیز طلبہ! یہ میرے لیے ایک شرف کا باعث ہے کہ آپ کے ہاں مجھے دعوت دی گئی۔ میں پہلی دفعہ اس یونیورسٹی کے نام سے واقف ہوا ہوں۔ تین چار دن پہلے تک مجھے اس نام سے واقفیت نہیں تھی جس سے معلوم ہوا کہ میں کتنا جاہل شخص ہوں۔ میرا قصور معاف کریں۔ بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ کے شہر میں اب ایک نہیں تین یونیورسٹیاں ہیں گو کہ میں اس سے زیادہ متاثر نہیں اس لیے کہ شہر پیرس میں کوئی بیس یونیورسٹیاں ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے یہ کوئی بڑی چیز نہیں معلوم ہوتی، لیکن اسلامی ممالک سے مقابلہ کریں تو یہ ایک بڑی چیز ہے کیونکہ کم اسلامی ملکوں میں ایک ہی شہر میں ایک سے زیادہ یونیورسٹیاں پائی جاتی ہیں۔ وقت چونکہ کم ہے اس لیے اصل موضوع کی طرف رجوع کرنا زیادہ مناسب ہے۔

جو موضوع مجھے دیا گیا ہے وہ مشکل ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ہم میں سے ہر آدمی کی خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرقی ہو یا مغربی، ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ فلاں چیز ہو

لیکن اگر خود اس کو ذمہ دار بنایا جائے تو وہ اس کام کو نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں حکومت یہ ضرور چاہے گی کہ رعایا کو فلاح کی سہولتیں ہوں لیکن اس میں جو دشواری پیدا ہوتی ہے وہ وسائل کی ہے۔ ایک ملک اگر بہت مالدار ہو تو اس کے پاس وسائل زیادہ ہوتے ہیں لیکن جو ملک مقابلتہً فقیر ہے وہ اپنی خواہش کے باوجود اپنی خواہشات کو بر نہیں لا سکتا۔ لیکن میں اس کو زمانہ حال کی بجائے اوپر لے جاتا ہوں عہد رسالت تک۔ کیونکہ میرے نزدیک اسلام کی ہر چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے مطابق ہو تو ہی قابل قبول ہے۔ اس سے کوئی اہمیت نہیں کہ اسلامی حکومت کا رقبہ کتنا ہو؟ اس کی فوج کتنی ہو۔ اس میں کتنے ہوائی جہاز ہوں۔ مقابلتہً عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا آغاز ہوتا ہے تو فلاحی مملکت ہی کے لیے ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کی تیئس ۲۳ سالہ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ بتدریج ہوتے ہیں۔ پہلے دن ہی سے وہ ساری چیزیں مسلمانوں میں نظر نہیں آتیں جو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت نظر آتی ہیں، مثلاً: ایک بہت چھوٹی چیز لیجیے کہ اسلام کے جو اصل ارکان ہیں شہادت توحید و رسالت کے علاوہ وہ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ ہیں۔ یہ چاروں ارکان ایک وقت میں مسلمانوں پر نافذ نہیں کیے گئے۔ ان کے احکام ایک وقت نازل نہیں ہوئے۔ اوّلاً ایک چیز آتی ہے، پھر دوسری، پھر تیسری، پھر بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حجۃ الوداع میں جو آیت مبارکہ نازل ہوئی اور جس میں مسلمان ہی نہیں غیر مسلموں کو بھی بہت تاثر ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَاَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی
وَرَضِیتُ لَکُمُ الاسلَامَ دِیناً۔ (۱)

''کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر لیا اور تم پر اپنی نعمتیں مکمل کر لیں اور تمہارے لیے اسلام کا جو دین دیا گیا ہے اس سے میں بہت خوش ہوں، میں راضی ہوں۔''

میں ابھی کہہ رہا تھا کہ اس آیت سے غیر مسلم بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ان کے پاس ایک

Marfat.com

یہودی آتا ہے اور کہتا ہے!''اے امیر المؤمنین تمہارے قرآن میں ایک واقعہ کا ذکر ہے اگر وہ ہم یہودیوں کے متعلق ہماری دینی کتابوں میں ہوتا تو ہم اسے ایک دن مناتے ایک عید مناتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں Curiosity تھی۔ پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے؟ یہودی نے اسی آیت کو دہرایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں واقف ہوں، کس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہمارے لیے عید ہے۔ (۲) ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں چنانچہ وہ آیت نازل ہوئی عید الاضحیٰ کے موقع پر یعنی حج کے موقع پر، جو ہماری بڑی عید ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ فرانسیسی زبان میں روزہ توڑنے کی عید اور بڑی عید، دو نام استعمال ہوتے ہیں۔ عید کبیر کا ترجمہ ہم نے ''بڑی عید'' کیا ہے۔ اور وہ اسی حج کے متعلق ہے۔ اس معنی میں شاید کہا جاتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ویسے عید الفطر کے موقع پر شہر کے لوگ اور شہر کے اردگرد کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان موضوعات کی مزید تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔

اصل میں عرض کرنا یہ ہے کہ فلاحی حکومت ایک آئیڈیل چیز ہے اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک چیز ہمیں نظر آتی ہے کہ ایک طرف انسان کو آزادی دی جائے لیکن دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ اللہ کا ڈر اس کے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ آدمی پولیس کے، حکومت کے، عدالتوں کے خوف سے، شرارتوں سے باز نہ آئے بلکہ اللہ کے ڈر سے باز آئے۔ جب رعایا میں یہ جذبہ پھیل جائے کہ مجھے صرف اللہ سے ڈرنا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اللہ کی ناانصافی سے نہیں بلکہ اللہ کے انصاف سے ڈرنا ہے۔ میں شاید ایسے واضح کروں کہ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (صحیح بخاری وغیرہ میں یہ حدیث ملتی ہے) کہ اگر اللہ حساب کتاب کے دن آخرت میں نرمی سے کام نہ لے۔ بلکہ ہر چیز کی گویا شدت کے ساتھ نگرانی رکھتے ہوئے حساب لے تو کسی شخص کو نجات نہیں ملے گی۔ ایک صحابی نے جرأت کی۔ اُٹھ کر پوچھا ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم کیا آپ کو بھی''، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی یہی ہے اگر اللہ نرمی نہ کرے حساب لینے میں تو میری بھی نجات ممکن نہیں (۳) کیونکہ ہم

Marfat.com

انسان ہیں۔ کمزور ہیں۔ بشر ہیں۔ تو عرض کرنا ہے کہ اسلام میں ایک طرف رعایا کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائیں۔ یہ نظریہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈسپلن کا جذبہ بھی ہے وہ یہ کہ رعایا کو آزادی ملے تو شرارتیں کرنے کی آزادی نہ ہو۔ بلکہ اچھے کام کرنے کی سہولتیں ہوں۔ اس میں جذبہ ہو کہ میں زیادہ سے زیادہ اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں کی خدمت کرسکوں۔ بہرحال عرض کرنا صرف یہ ہے کہ جہاں تک فلاحی حکومت، فلاحی مملکت کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ زمانہ حال کی مثلاً فرنگی حکومتوں کو لیں یا اسلامی حکومتوں کو یا غیر مسلم دیگر حکومتوں کو لیں، ان میں سے کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں ہماری رعایا کی فلاح، ہماری رعایا کی سہولت وآسائش کی ہم زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ لیکن اس خواہش کو بر لانے کے وسائل ہر شخص کے پاس نہیں ہوتے۔

بہرحال شاید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ رعایا کی اور آسائشوں میں سے ایک اس کا امن اور خطرے سے محفوظ رہنا ہے۔ اگر مجھے بڑی رقم ملتی ہے لیکن مجھے وہ چیزیں نہیں ملتیں جس کی میں خواہش کرتا ہوں تو بھی وہ رقم بے کار ہوگی۔ مثال کے طور پر آج کل کے روس کو لیجیے کہ جہاں کھانے پینے کی چیزیں بھی نہیں ملتیں۔ اگر بہت روپیہ بھی میرے پاس ہو تو میں وہ چیز حاصل نہیں کرسکتا۔ دوسرے الفاظ میں رعایا کو امن وآسائش اور بیرونی واندرونی خطرات سے محفوظ رہنا اس کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ضرورت ہوگی کہ خرچ کریں مثلاً فوج ہماری طاقتور اور ڈسپلنڈ ہو اور شاید ایک چیز (آپ میرا قصور معاف فرمائیں) کہ فوج میں یہ جذبہ نہ ہو کہ وہ موجودہ صدر جمہوریہ اور وزراء کو باہر نکالیں اور قبضہ کریں۔ ایسا جذبہ نہ ہو بلکہ مقصد اور ان کی تمنا اور ان کے وجود کی غرض وغایت صرف یہ ہو کہ ملک کو بیرونی واندرونی خطرات سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کے لیے فوج میں ڈسپلن کی ضرورت ہوگی۔ فوج میں اسلحہ کی ضرورت ہوگی۔ اسلحہ کے بارے میں ایک تجربہ بتاتا ہے کہ اگر ہم خود وہ اسلحہ پیدا نہ کریں بلکہ باہر سے خریدیں تو وہ کام نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ اتفاق سے میرے ذہن میں آیا کہ حیدرآباد (دکن) کی حکومت نے جب بھارت کے حملہ کا خدشہ محسوس کیا تو بہت رقم خرچ کی اور اسلحہ خریدا۔ اٹلی، فرانس

Marfat.com

اور جرمنی سے جو بھی لوگ اسلحہ فروخت کرنے پر آمادہ تھے، منہ مانگی قیمت دے کر ہم نے اسلحہ خریدا، لیکن جس وقت بھارت کا حملہ ہوا تو وہ اسلحہ کام نہیں آیا کیونکہ وہ خراب تھا۔ جنگ میں استعمال شدہ جو اسلحہ ردی تھا وہ ہمیں بیچا گیا تو جب تک اسلحہ ہم خود نہ بنائیں تو ہمیں یہ خدشہ ہوگا کہ شاید یہ اسلحہ ہمارے دوستوں کی طرف سے اتنا اچھا نہ ہو جیسے وہ خود استعمال کرتے ہیں۔

دوسری طرف جب ہمیں یہ احساس ہو کہ ہمارا ملک خطرے سے محفوظ رہنے کے لیے وسائل رکھتا ہے تو اس کے لیے یقیناً ہم رعیت کے لوگوں کو کوئی جھجک، کوئی تامل نہیں ہوگا کہ منہ مانگی رقم ٹیکس کے طور پر حکومت کو دیں تاکہ یہ ضرورتیں ہماری پوری کی جائیں۔ اسی طرح رعایا کی یہ خواہش ضرور ہوگی کہ ٹیکس کم از کم ہوں اور ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا ہوں لیکن اگر رعایا میں ڈسپلن ہے رعایا میں یہ احساس ہے کہ کون سی چیز درست ہے؟ اور ساتھ ہی کون سی چیز ممکن ہے؟ تو پھر بغیر کسی دشواری کے وہ وقت پر حکومت کی مدد کرتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر روم نے مسلمانوں کے خلاف کچھ حرکتیں کیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں کوئی چالیس ہزار سپاہی تھے۔ اتنی بڑی فوج عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس کے ٹرانسپورٹس، اس کے لے جانے کے وسائل اور دیگر جنگی ضروریات کے لیے رقم کی ضرورت تھی اور وہ اسلامی حکومت کے پاس نہ تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں منبر پر چڑھ کر اپنے صحابہ سے مخاطب ہو کر بتایا کہ:

''ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے اس لیے تم چندے دو۔''

تین مثالیں میں دوں گا جس سے یہ معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے باعث اچھا مسلمان کون ہوتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کہ آج کل کے حساب سے کتنے ملین روپیہ وہ پیش کرتے ہیں جو ان کی ثروت کے لحاظ سے شاید بڑی چیز نہ ہو یعنی انہوں

Marfat.com

نے اپنا سارا مال پیش نہیں کیا بلکہ ایک بہت بڑی رقم چالیس ہزار دینار یا کچھ اس طرح،
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوش ہوئے ہونا چاہیے تھا اور کہا کہ:
"اے عثمان آج سے تم جو بھی کرو گے اللہ نے تمہیں معاف کر دیا۔"

اس کے فوراً ہی بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُٹھتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک رقم پیش کرتے ہوئے کچھ فخر کرتے ہیں کہ میں ایک بڑی رقم دے رہا ہوں۔ دس ہزار درھم، ان کے ذہن میں ایک بڑی رقم تھی۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کتنی رقم ہے؟ کیا گھر میں تمہارے پاس کوئی مزید رقم ہے؟ یا کچھ اس طرح کی چیزیں ہیں؟

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صورتِ حال بتائی۔ اس پر بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوتے ہیں۔

اب تیسرا حصہ سنیے۔ ان دونوں کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آتے ہیں اور مجھے یاد نہیں کہ شاید پانچ سو درہم یا پانچ ہزار درھم کی رقم پیش کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا رقم ہے؟ اور پھر یہ پوچھا کہ گھر میں کتنی رقم چھوڑی ہے تو ابوبکر نے جواب دیا کہ اور گھر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ (۴)

ظاہر ہے عثمان رضی اللہ عنہ کے چالیس ہزار دینار ایک طرف اور یہ جملہ کہ پانچ ہزار درھم کی حقیر رقم کے سوا اس شخص کے گھر میں کوئی چیز نہیں۔

تو جو فرق ان مثالوں سے ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ مقدار کو ہم نہیں دیکھتے ہم دیکھتے ہیں اس کی کوانٹٹی اور اس کی کوالٹی کو کہ کس قسم کا ہے؟ کس ماحول میں ہے اور کس کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

یہ چند چیزیں میرے ذہن میں ہیں جو میں نے آپ سے عرض کیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اسلام اس سے ہمیں منع نہیں کرتا کہ غیر مسلموں کی اچھی چیزوں سے استفادہ کریں۔ اگر آپ نیوکلیئر بم بنانا چاہتے ہیں تو آج کل کے فرنگی ملکوں سے سیکھیں گے۔ غیر مسلم ممالک سے سیکھیں گے۔ پھر اسے اپنی طرف سے اور ترقی دیں گے۔ دوسری طرف

Marfat.com

میں کہہ سکتا ہوں کہ رعایا کی فلاح و بہبود کے متعلق غیر مسلم حکومتوں کو بھی انکار نہیں ہے۔ وہ بھی یہی چاہتی ہیں چاہے ضمناً مختلف حکمران اپنی ذاتی نمائش کے لیے کوئی چیزیں کریں جیسا کہ ہم زیادہ تر فرانس میں دگول کے زمانے میں دیکھتے تھے کہ بہت سی ترقی ہوتی ہے لیکن اپنے نام و نمود کی خواہش بھی اس میں بہت ہوتی ہے۔ ہمارے حکمران اسلامی ممالک میں جو بھی کریں وہ اللہ کے لیے کریں۔ کیونکہ خدا عالم الغیب ہے جب ایک دن ہمارا حساب و کتاب ہوگا تو وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ تم نے کتنے ملین روپے سڑک کی آرائش کے لیے خرچ کیے۔ یہ دیکھے گا کہ اس سے پبلک کا کیا فائدہ تھا؟ اور کس نیت اور کن وسائل کے ساتھ تم نے یہ کام انجام دیا۔

یہ چند چیزیں میرے ذہن میں آئیں اور میں نہیں سمجھتا کہ اس سے آپ کو تشفی ہوئی ہوگی۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جس کی خواہش ہر کسی کو ہوتی ہے۔ لیکن اس کے وسائل ہر کسی کے پاس نہیں ہوتے۔ چاہے وہ امریکہ جیسا مالدار ملک ہو یا وسطی افریقہ کے نہایت ہی مفلس ممالک سے متعلق ہو۔ ہر حکومت کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرے لیکن وہ اپنے وسائل کے لحاظ سے اس کو بَرلا سکتے ہیں۔ اگر ہم اصل بنیادی چیز پر توجہ کریں یعنی رعایا میں خدا کا ڈر، خدا کے ظلم کا نہیں (میں دوبارہ دہراتا ہوں) خدا کے انصاف کا ڈر، ہماری حکومت کے اعلیٰ ترین افسر، صدرِ جمہوریہ، وزراء وغیرہ اس جذبے کے مطابق عمل کریں تو اس کا اثر رعایا پر پڑے گا میں اس کو اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ملک میں چاہے وہ پاکستان ہو یا دیگر اسلامی ممالک، رعایا کی خواہشیں بہت سی ہیں۔ لیکن افراد کے طور پر خود وہ اس پر عمل نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں امن ہو لیکن ہمیں موقع ملتا ہے تو ہم چوری بھی کرتے ہیں۔ ہم زنا بھی کرتے ہیں۔ دوسرے قسم کے ناجائز اور نامناسب کام بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم رعایا کے ذہنوں میں پہلے ہی دن سے ماں باپ، اُستاد اور ماحول کی طرف سے یہ جذبہ داخل کر دیا جائے کہ مجھے خدا کی ناانصافی سے نہیں، خدا کے انصاف سے ڈرنا چاہیے۔ اس خدا سے جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی جو ہمارے ظاہر نہ کردہ خیالات سے بھی واقف ہوتا ہے۔ جو ہمارے اقوال سے بھی واقف ہوتا ہے، ہمارے اعمال سے بھی واقف ہوتا ہے۔ جب

یہ جذبہ عام ہو جائے گا تو وہی میرے نزدیک صحیح فلاحی مملکت ہے۔ فلاحی مملکت یہ نہیں کہ اس کے پاس مفت علاج کا انتظام کتنا ہے اور دیگر سہولتیں کیا ہیں۔

سوال: موجودہ زکوٰۃ کا نظام جس کے تحت بنکوں سے زکوٰۃ جبراً کاٹی جاتی ہے، اس سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیجیے اور زکوٰۃ خرچ کرنے کے موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ نیز کیا زکوٰۃ فلاحی کاموں میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے جیسے کہ ایدھی فاؤنڈیشن وغیرہ ہے؟

جواب: سوال اہم ہے اور ظاہر ہے کہ چند لمحوں میں اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس پر کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ بہر حال زکوٰۃ کے بنیادی اصولوں میں دو چیزیں ہیں:

ایک تو یہ کہ شریعت نے ایک کم ترین مقدار مقرر کی ہے جس سے زیادہ ہو تو زکوٰۃ لی جائے۔ دوسری چیز جو بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ آمدنی پر نہیں بلکہ غیر استعمال شدہ رقم کا ہمارے پاس ایک سال تک بغیر استعمال کے رہنے کی صورت میں زکوٰۃ ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں اگر مجھے ایک لاکھ روپے آمدنی ہوتی ہے لیکن میرے اخراجات بھی ایک لاکھ روپے ہیں تو مجھ پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔ اسی طرح مثلاً فرض کیجیے کہ پانچ سو روپے پر زکوٰۃ لگ سکتی ہے تو یہ ضروری ہوگا کہ وہ پانچ سو روپے میرے پاس ایک سال تک فالتو رقم کی طرح رہیں اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ ہو تو اس پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ جہاں تک موجودہ بنکوں کا نظام ہے تو مجھے یہاں کے نظامِ زکوٰۃ سے واقفیت بالکل نہیں۔ ممکن ہے کہ اس نظام میں ان دونوں اجزاء کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ وہ یہ کہ رکھی جانے والی ہر رقم سے زکوٰۃ نہیں کاٹی جاتی اور یہ کہ وہ آمدنی پر نہیں بلکہ ایک سال تک غیر مستعمل رہنے کی حالت ہو تو اس سے زکوٰۃ لی جاتی ہے۔

دوسری چیز جو سوال میں بھی موجود ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے متعلق قرآنی احکام۔ قرآن میں آٹھ مدوں پر زکوٰۃ کو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلفُقَرَآءِ وَالمَسَاکِینِ وَالعَامِلِینَ عَلَیهَا وَالمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُم وَفِی الرِّقَابِ وَالغَارِمِینَ وَفِی سَبِیلِ اللّٰهِ وَابنِ السَّبِیلِ (۵)

Marfat.com

"حقیقت یہ ہے کہ صدقات، فقراء، مساکین اور جو مامور ہوں
صدقات کے کام پر اور جن کی تالیف قلب مطلوب ہو اور گردنوں
کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے اور اللہ کی راہ میں اور
مسافروں کے لیے ہیں۔"

مصارفِ زکوٰۃ سے متعلق قرآن مجید میں حکم ہے اس میں آٹھ مدوں کا ذکر ہے کہ اس پر خرچ کی جائے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی ہے غیر مسلم رعیت سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی لیکن اخراجات غیر مسلموں پر بھی ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی مشہور مثال ہے کہ ایک دن مدینے میں ایک یہودی بھیک مانگ رہا تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ تم کیوں بھیک مانگ رہے ہو تو اس نے جواب دیا کہ مجھ سے جزیہ لیا جاتا ہے اور رقم میرے پاس نہیں ہے لہٰذا مجبور ہو کر بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ صرف فوراً یہ احکام دیے کہ ان غیر مسلموں سے جزیہ نہ لیا جائے جن کی یہ حالت ہے۔ اس حکم پر ہی آپ نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اسی وقت خادم سے کہہ کر کچھ رقم منگوائی اور اس یہودی کو دی۔ یہ رقم مسلمانوں کی زکوٰۃ کی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ تھے کہ:

"هذا من مساكين اهل الكتاب" (٦)

"یعنی یہ غیر مسلموں کے مسکینوں میں سے ہے لہٰذا اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

خود قرآن میں آٹھ کی جو لسٹ دی ہے اس میں اتنی گنجائش ہے کہ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت بھی پیش نہ آئے۔ بہرحال فلاحی کاموں میں زکوٰۃ یقیناً خرچ ہو سکتی ہے۔

(معارف اسلامی اسلام آباد- اشاعت خاص بیاد ڈاکٹر محمد حمید اللہ
جولائی 2003ء تا جون 2004ء)

Marfat.com

حواشی وحوالہ جات

(۱) المائدہ:۲

(۲) البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب "الیوم اکملت لکم دینکم" باب رقم ۱۰۹ حدیث رقم: ۴۳۳۰۔

(۳) البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل، حدیث رقم ۶۴۶۷، مزید ملاحظہ ہو مسند احمد عن ابی ہریرہ، ج:۲، ص: ۲۳۵ (حدیث کے الفاظ یہ ہیں:
عن عائشة، عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: سددوا وقاربوا وابشروا، فانه لایدخل احداً الجنة عمله قالوا! ولا انت یا رسول اللّٰہ؟ قال: "ولا أنا، الا أن یتغمدنی الله، بمغفرة ورحمة"۔

(۴) واقدی، محمد بن عمر بن واقد، المغازی، موسسۃ الاعلی للمطبوعات، بیروت، ج ۳، ص: ۹۹۰-۹۱۔

(۵) التوبۃ: ۶۰۔

(۶) ابوعبید، القاسم بن سلام، کتاب الاموال، فقرہ نمبر ۱۱۹۔

Marfat.com

شہری مملکتِ مکہ
(۱)

ہر زمانہ اور ہر ملک میں قدیم مصر سے لے کر جدید امریکہ تک، انسانی ذہنیت کی عظیم ترین ترقی، جدت پسندی اور کارگزاری شہری زندگی بسر کرنے والوں ہی میں نظر آتی رہتی ہیں۔ جب تک لوگ چرواہوں یا کسانوں کے پیشوں پر اکتفا کرتے رہے اس وقت تک معاشی فرائض کی تقسیم کے لیے کوئی خاص ترغیب نہیں پائی جاتی تھی اور لوگوں کی توانائیاں تمامتر غذا حاصل کرنے کی کوشش میں صرف ہو جایا کرتی تھیں، جب سے ''شہر'' وجود میں آیا تقسیم کار بھی ہونے لگا۔ معاشی بچت کے امکانات بھی پیدا ہو گئے اور یہیں سے دولت، فرصت، تعلیم، ذہنی ترقی اور علوم وفنون کی توسیع ہونے لگی۔ (۱)

اس مقالہ (۲) کا منشاء صرف یہ ہے کہ علمی دنیا کو ایک ایسی زرخیز زمین کی تحقیق کے لیے متوجہ کیا جائے جسے اب تک بالکل ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اسلام نے جس حیرت انگیز تیزی سے توسیع حاصل کی اور اس کے آغاز ہی میں شہری مملکت مکہ کے غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ باشندوں سے جتنے کثیر غیر معمولی طور سے قابل مدبر پیدا ہوئے اور ایسے حقائق ہیں جن کا کچھ نہ کچھ پس منظر ہونا ناگزیر ہے، نپولین (ناپولیون) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب مسلمانوں کی بہادری کا راز غالباً اس واقعہ میں پوشیدہ تھا کہ اسلام سے پہلے ان میں بڑے طویل عرصہ سے خانہ جنگیاں ہوتی رہی تھیں، جنہوں نے ان میں بعض اوصاف پختہ کر دیے ہوں گے (۳)۔ ۱۹۳۵ء میں سوربون (پیرس) میں ایک پبلک لیکچر دیتے ہوئے میں نے یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آغازِ اسلام کے وقت پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق قائم ہو چکا تھا، جس کا باعث وہاں کے

Marfat.com

سالانہ میلے اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ نظام خفارہ (بدرقہ) تھے، بہ ظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ فال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیوتاؤں کو وہ مشترکہ طور سے مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم و رواج بھی یکساں تھے، اس لیے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کے لیے بہت کچھ زمین ہموار کر دی، اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نما عرب کے مزاج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کر دی۔ اب میں ایک دوسرا نظریہ اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شہر مکہ کے باشندوں نے اپنی شہری مملکت کے لیے ایک ترقی کناں دستور، اسلام سے خاصا عرصہ قبل بنا لیا تھا جس کے ذریعہ سے ان کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ آئندہ اسلامی دور میں عربی شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں، یہ شہنشاہیت بیس ہی سال کے عرصہ میں مدینہ کی چھوٹی سی شہری مملکت سے پھیلتے ہوئے رومی ایرانی اور دیگر حکومتوں پر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں میں چھا گئی تھی، یورپ کے سلسلے میں یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۲۷ھ مطابق ۶۴۷ء میں خلیفہ سوم حضرت عثمان کے زمانہ میں اسلامی فوجیں اسپین میں گھس چکی تھیں اور کئی نسلوں کے بعد طارق کے آنے اور فتح کو مکمل کرنے تک وہیں قابض و مقیم تھیں۔ (۴)

عرب کی شہری مملکتوں کا مطالعہ ابھی کچھ سنجیدہ طور سے شروع نہیں کیا گیا ہے، اس غرض کے لیے میں مکہ کے سوا کسی اور شہر کا بھی انتخاب کر سکتا تھا مثلاً طائف، دومتہ الجندل، تیماء، سبا، عدن، صحار، وغیرہ لیکن مکہ کے انتخاب کے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں، مثلاً مکہ کے متعلق ہماری معلومات دیگر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ یقینی اور زیادہ کثیر ہیں۔ مکہ اسلام کا گہوارہ تھا۔ یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا اور بڑے ہوئے تھے، یہیں آپ کی تبلیغی زندگی کا بڑا حصہ صرف ہوا تھا، اور اولین اسلامی شہنشاہیت کی قریب قریب تمام نمایاں ہستیاں اسی شہر میں پیدا ہوئیں، اور یہیں تربیت پائی تھی، مزید براں یہی وہ شہر تھا جس پر قبضہ کے لیے تین ہمعصر شہنشاہتوں میں رقابت چلی آ رہی تھی، رومی، ایرانی، اور حبشی تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند تھے۔ اگر کتاب التیجان کے مؤلف ابن ہشام کی بات پر یقین کیا جائے تو سکندر ذوالقرنین (۵) نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد یعنی

Marfat.com

کعبہ کی زیارت کرے۔(۶)

ابھی بیان ہوا کہ رومی، ایرانی اور حبشی تینوں سلطنتیں مکہ پر قبضہ کی خواہشمند تھیں، چنانچہ رومیوں کے سلسلہ میں یہ ایک واقعہ ہے کہ ایلیوس گالوس کے زمانہ سے نیرو کے زمانہ تک ہر رومی شہنشاہ کی یہ تمنا رہی کہ اپنا اثر ونفوذ کسی طرح مکہ تک پھیلا دے، چنانچہ اس کے لیے متعدد کوششیں عمل میں لائی جاتی رہیں۔(۷) ابن قتیبہ کی بات پر اگر اعتبار کیا جائے تو قیصر روم نے خود قصی کو مدد دی تھی کہ مکہ پر وہ قبضہ کر لے(۸) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قصی نے خود مختاری برتنی شروع کر دی اور رومی مفادات نظر انداز کرنے شروع کر دیے، چنانچہ نسلوں بعد جب مکہ کے عثمان بن الحویرث الاسدی نے عیسائیت قبول کی تو قیصر روم نے اسے ایک تاج شہر یاری سے سرفراز کیا اور ایک فرمان دے کر مکہ روانہ کیا جس میں حکم تھا کہ مکہ والے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں، عثمان کے لیے بڑے اچھے مواقع حاصل تھے، کیونکہ مکہ والے غلہ اور دیگر ضروریات اور نیز اپنے تجارتی کاروانوں کے لیے مصر، فلسطین اور شام کے رومی صوبوں کے دست نگر تھے اور وہ آسانی سے فرمان قیصری کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لیکن عین لحۂ آخر میں عثمان ہی کے ایک رشتہ دار نے جلسہ میں اٹھ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ مکہ کے آزاد باشندے بادشاہت اور امرائیت کی بدعتوں کو کیسے قبول کر سکتے ہیں اور اس خیال کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور دم کے دم میں جلسہ کی رائے بدل گئی۔ عثمان بیزار ہو کر شام واپس چلا گیا اور قیصر روم نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اپنی قلمرو مکہ والوں کے لیے بند کر دی اور ان کے جو تاجر اس وقت وہاں تھے ان کو قید کر لیا۔(۹) (یہ واقعہ غالباً اس کے بعد پیش آیا ہوگا جب قیصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کو اس بات کا منشور عطا کیا تھا کہ وہ تجارت کے لیے شام آیا کریں، نیز ایک سفارشی خط نجاشی حبش کے نام دیا تھا کہ وہ بھی مکہ والے کاروانوں کو اپنے ملک میں آنے دیا کرے)(۱۰)۔ قیصر اس وقت اس سے زیادہ اور کچھ نہ کر سکا کیونکہ ایران سے جنگ چھڑ گئی۔ الواحدی نے کتاب اسباب النزول (۱۱) میں بیان کیا ہے کہ مدینہ کا ابو عامر راہب وہاں والوں کو یہ کہہ کر دھمکایا کرتا تھا کہ میں قیصر کی فوجیں بلوا لوں گا۔

دیکھیے نقشہ نمبرا

Marfat.com

ایرانیوں کے سلسلہ میں تاریخیں بتاتی ہیں کہ یمن کی فتح کے بعد وہ خیال کرنے لگے تھے کہ مکہ خود بخود ان کے اقتدار میں آ چکا ہے، چنانچہ خسرو ایران نے ایک مرتبہ گورنر یمن کے نام حکم لکھ بھیجا تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ایران جا کر شہنشاہ سے ملنے کی ہدایت کرے اور اگر رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے انکار کریں تو آپ کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔ (۱۲)

حبشیوں کے سلسلہ میں یہ مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے مکہ پر ایک چڑھائی کی تھی، (۱۳) جس میں ابرہہ اپنے مشہور ہاتھی محمود (۱۴) کے ساتھ کمان کر رہا تھا۔

اس قسم کے بے شمار تذکرے عرب مولفین کے ہاں ملتے ہیں کہ مکہ کے اور دیگر اقطاعِ عرب کے معززین قیصر روم، کسرٰے ایران، نجاشی حبش وغیرہ بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوا کرتے تھے، ان واقعات سے بھی اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ حکمراں جزیرہ نما عرب کے اندرونی حصہ میں مسالمانہ ذرائع سے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

قریش کا رحلۃ الشتآء والصیف
کاروانی راستے

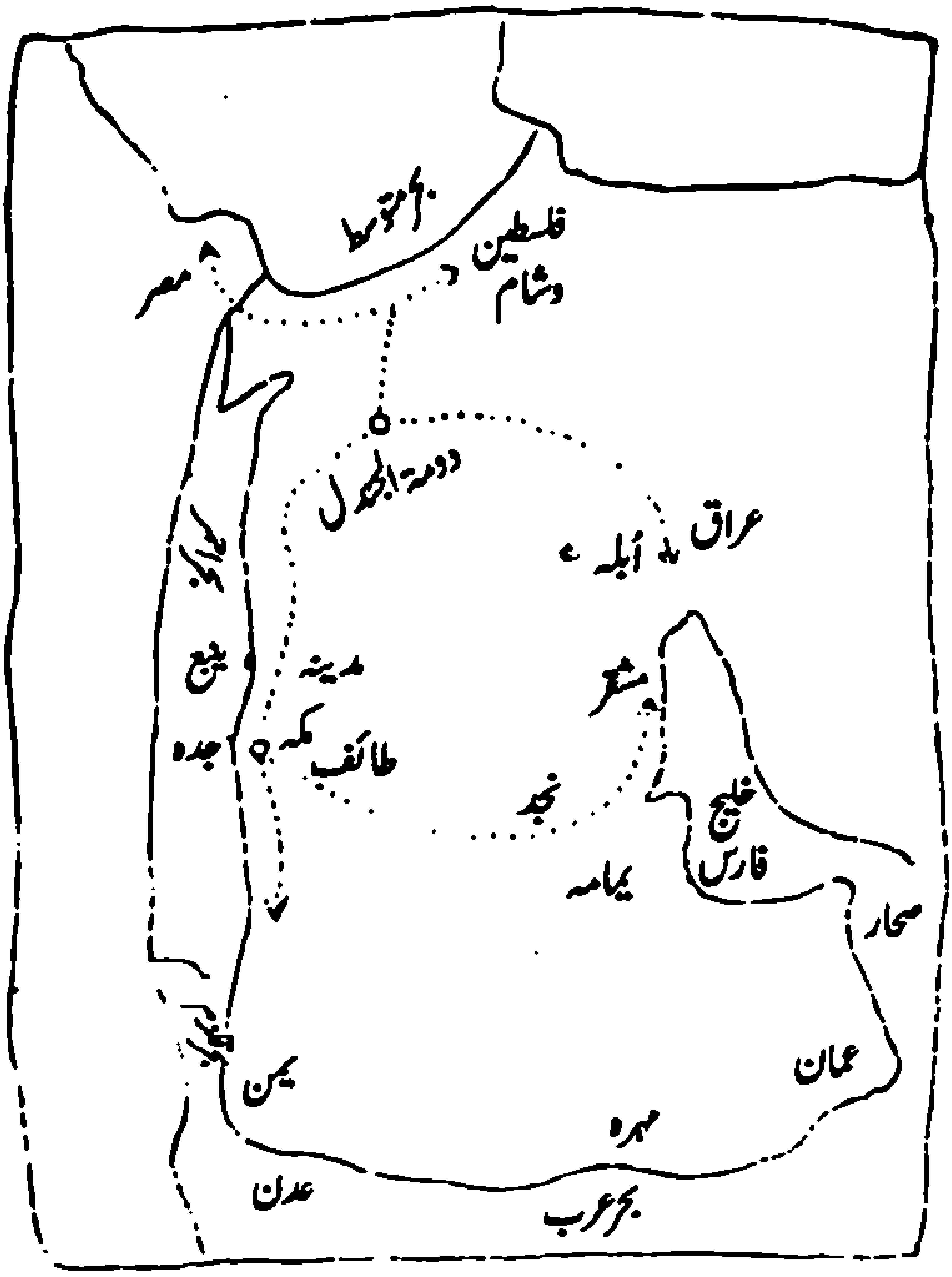

Marfat.com

نقشہ شہر مکہ

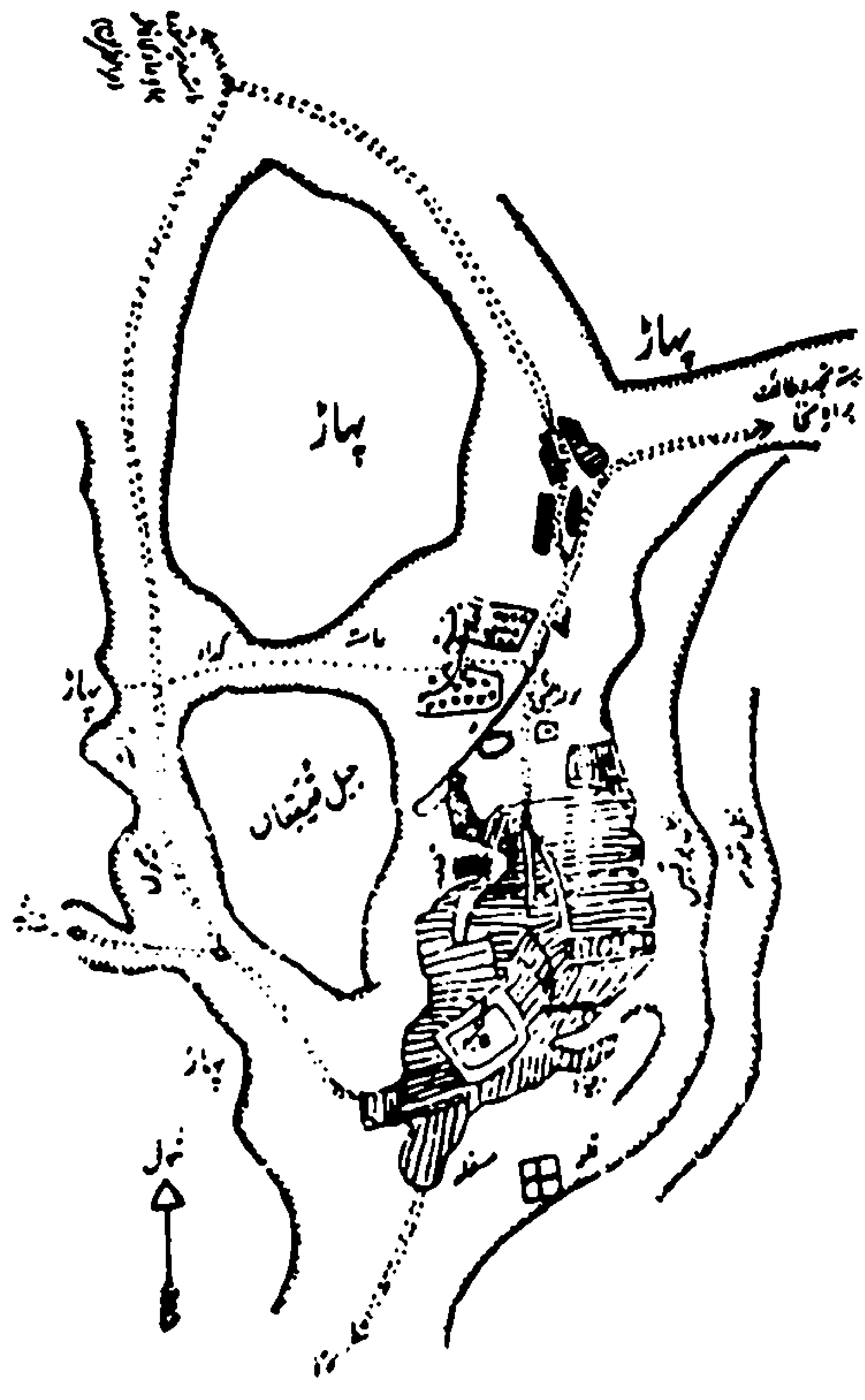

Marfat.com

جغرافیہ شہر:

جزیرہ نمائے عرب کا شمالی اور مغربی حصہ زیادہ تر بنجر اور صحرا ہے، ایک چھوٹا سا نخلستان اور چشمہ بھی ہو تو لوگوں کو وہاں آ کر بس جانے کے لیے کافی ہوتا ہے اور اگر کسی تجارتی راستہ پر ایسے قدرتی انتظامات پائے جائیں تو وہاں کسی بستی کے بس جانے کے لیے اور بھی زیادہ سہولت ہوتی ہے، مکہ، کاروانی راستوں پر ایک اہم اسٹیشن تھا اور کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں یہ ایک آباد شہر تھا جہاں وہ آیا جایا کرتے تھے، عرب مولف (۱۵) ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس زمانہ میں گھنے جنگل اور اچھی چراگاہیں اسی وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں مکہ بسا ہوا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ قصّی نے جنگل کا بڑا حصہ صاف کر دیا (۱۶) تاکہ اپنے اور اپنے قبیلہ والوں کے گھروں کے لیے معبد کعبہ کے اطراف جگہ فراہم کی جائے، بعد کے زمانوں کے متعلق بھی ہمیں اسی طرح کے ثبوت ملتے ہیں۔ (۱۷) خود آج بھی بواہیر کی رباط مکہ معظمہ میں اتنی شاندار ہے کہ وہ وادی غیر ذی زرع (۱۸) کے کسی مکان کی جگہ بمبئی کی ملیبار ہل کے کسی قصر سے مشابہ ہے، مکہ تجارت کے لیے شام، یمن اور طائف ونجد جانے والے کاروانوں کا جنکشن تھا اور چشمہ زمزم کے قریب آباد ہوا تھا، اور ہر طرف بلند اور ناقابل تسخیر پہاڑوں نے اسے جنگی نقطہ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا، اس کی ابتدائی تاریخ بہت دھندلی ہے، وہاں کی سیاسی زندگی سے آئندہ باب میں بحث ہوگی، جس مقام پر اور جس طور سے شہر بسا تھا اس کی کچھ تفصیلیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

قدیم یونانی شہروں کے دو حصے ہوتے تھے ''پولس'' اور ''استو'' یعنی بلند اور پست حصہ ہائے شہر، نامعلوم زمانہ سے مکہ بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے معلات اور مسفلہ، اور یہ تقسیم آج تک پائی جاتی ہے۔ کسی قدیم تر زمانہ میں ان دونوں حصوں کا نام بکہ اور مکہ رہا ہوگا، چنانچہ ازرقی (۱۹) نے اپنی تاریخ مکہ میں بیان کیا ہے کہ بکہ وہ مقام ہے جہاں معبد تعمیر ہوا ہے اور مکہ پوری بستی کا نام ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تائید ہوتی نظر آتی ہے، چنانچہ ایک آیت میں ہے ''وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے (بغرض عبادت) بنایا گیا وہ وہ ہے

Marfat.com

جو بکہ میں ہے'' (۲۰) اور ایک دوسری آیت میں ہے ''یہ وہی تھا جس نے ان کو تم پر حملہ کرنے سے اور تم کو ان پر حملہ کرنے سے وادی مکہ میں روک دیا تھا'' (۲۱) مکتین (۲۲) (دو مکے) کی اصطلاح، قریتین (۲۳) (دو شہر) کے معنوں میں ابن ہشام نے استعمال کی ہے جس سے مکہ اور طائف کی دو ہمشیر بستیاں مراد لی گئی ہیں، اس سے بھی اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ معززین معلات میں رہتے تھے اور شہر کی عبادت گاہ اور قبرستان بھی وہیں آباد تھے۔ تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے (۲۴) کہ جب قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو اپنے تمام رشتہ داروں کو ظواہر یعنی مضافاتِ شہر سے بطحاء یعنی مرکز شہر میں منتقل کر دیا تھا اور عبادت گاہ یعنی کعبہ کے سامنے ہی دار البلد تعمیر کیا جس کا نام دار الندوہ یعنی مشورہ گاہ رکھا گیا (۲۵)۔ مکہ کی عبادت گاہ (یعنی کعبہ) دیوتاؤں کا ایک آماجگاہ (دیو ستھان **Pantheon**) بن گیا تھا جہاں (۳۶۰) (۲۶) بت تھے، جو مختلف قبائل (۲۷) کے معبودوں کی نمائندگی کرتے تھے، لات اور عزیٰ (۲۸) اصل میں علی الترتیب طائف اور نخلہ کے لوگوں کی دیویاں تھیں اور کعبہ کے احاطہ میں بھی انکے مثنی **(Duplicate)** پائے جاتے تھے اور مکہ والوں کے نزدیک بھی ان دیویوں کا بڑا احترام تھا۔ (۲۹)

یونانی شہروں ہی کی طرح (۳۰) مکہ کے اطراف بھی ایک ماتحت سرزمین تھی جسے حرم کہتے تھے اور جو تخمیناً سوا سو مربع میل پر مشتمل تھی (۳۱)، اسلام نے حدودِ حرم میں مزید توسیع کر دی، اور شہر کی وہ سرحدیں قرار دیں جو اب ''میقات'' کہلاتی ہیں اور جہاں سے حاجیوں کو اپنا معمولی لباس اتار کر احرام پہننا پڑتا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس زمانہ میں مکہ میں کوئی بازی گاہ، گھوڑ دوڑ کا میدان، کسی مہم پر روانہ ہونے کے لیے فوج کی اجتماع گاہ اور محصورہ و محفوظ چراگاہیں (حمیٰ) تھیں یا نہیں، مدینہ وغیرہ دوسرے شہروں کی حد تک البتہ ان چیزوں کا کافی پتہ چلتا ہے۔ مکہ کے ایک محلّہ کا نام ''اجیاد'' ہے جس کے معنی اچھی نسل کے گھوڑوں کے ہیں، اگرچہ یاقوت وغیرہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ اور بتاتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ اس کو گھوڑ دوڑ سے بھی کچھ تعلق رہا ہو۔

پروفیسر ہیالیڈے نے یونانی شہری مملکتوں پر اپنے دلچسپ مضمون میں لکھا ہے کہ:

Marfat.com

"جب وہ پُر آشوب دور ختم ہو گیا جس میں ترکِ وطن کے عظیم الشان سلسلے جاری تھے تو بجائے اس کے کہ جنگ ایک عادتی حالت سمجھی جائے، ہمہ گیر امن کا دور دورہ ہو گیا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیوں میں توطن اختیار کیا جانے لگا۔ لیکن یہ شہر کس طرح وجود میں آئے؟ قدیم ترین بستیاں بے شبہہ گاؤں میں ہوئی ہوں گی ...... بہر حال عام طور پر چند دیہات کے مجموعہ نے اس چیز کو مناسب پایا ہوگا کہ کسی پہاڑ یا خود میدان میں اچھی طرح مدافعت کیے جانے کے قابل مقام کو قلعہ بنا کر مستحکم کر لے تا کہ اگر کسی موسم گرما کی لوٹ کے لیے نکلی ہوئی ہمسایوں کی ٹکڑی ان پر ٹوٹ پڑے تو اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو وہاں حفاظت کے لیے بھیج سکیں...... اس قلعہ میں دیوتا کا مندر اور بادشاہ کا محل بھی عموماً ہوا کرتے تھے، اس کے بعد ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ عوام اپنے دیہات کو چھوڑ کر پناہ لینے کے لیے شہر کے قریب رہنے لگیں اور وہاں سے روزانہ اپنی کھیتیوں کو جانے لگیں، معززین کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ بادشاہ کے آس پاس اور حکومت کے مرکز میں رہیں، اس طریقہ سے بلند حصہ شہر یا قلعہ کے اطراف ایک پست حصہ شہر آباد ہونے لگا، اور رفتہ رفتہ پست حصہ شہر کے اطراف ایک شہر پناہ یا فصیل بھی تعمیر ہونے لگی" (۳۲)۔

قریب قریب یہی صورتِ حال حجاز کی بھی تھی۔

مکہ جس مقام پر آباد ہے وہاں ایک گہری وادی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اور ناقابل عبور پہاڑ ہیں، شہر میں صرف ایک شاہراہ ہے جو ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف نکل جاتی ہے، ذیلی راہیں شہر میں آنے جانے کے لیے صرف دو ہیں (۳۳) یہاں کے باشندوں کو اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ کوئی فصیل بھی تعمیر کریں، اس کے باوجود ہمیں قطب الدین کی تاریخ مکہ میں حسب ذیل ذکر ملتا ہے:

Marfat.com

"قدیم زمانوں میں مکہ میں بھی شہر پناہ کی دیواریں پائی جاتی تھیں، چنانچہ معلات کے رخ جبل عبداللہ بن عمر اور اس کے سامنے کے پہاڑ کے مابین ایک وسیع دیوار پائی جاتی تھی۔ اس میں ایک دروازہ تھا جس پر لوہے کے پتر جڑے ہوئے تھے، یہ ہندوستان کے ایک بادشاہ نے امیر مکہ کے پاس بطور تحفہ روانہ کیا تھا...... ایک اور دیوار مسفلہ کے رخ میں بھی درب الیمن نامی محلّہ میں تعمیر کی گئی تھی...... تقی الفاسی نے بیان کیا ہے کہ 'معلات میں مذکورہ بالا دیوار کے علاوہ ایک اور دیوار بھی تھی ...... لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مکہ کی یہ دیواریں کب تعمیر ہوئی تھیں نہ یہ کہ ان کو کس نے تعمیر کیا تھا اور نہ یہ ہی کہ ان کی مرمت کس نے کی تھی، میں نے بعض تاریخوں میں دیکھا ہے کہ عباسی خلیفہ المقتدر کے زمانہ میں ایک دیوار پائی جاتی تھی'۔ (۳۴)

یہ دیواریں غالباً اسلام سے پہلے کی انہی بھدی دیواروں کی جگہ نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہوں گی، وادی مکہ میں سب سے کشادہ اور مسطح مقام شروع ہی سے قومی عبادت گاہ کے لیے محفوظ رہا، عرب مولف (۳۵) ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس وادی کے پرانے باشندے اتنے وہمی تھے کہ بیت اللہ (کعبہ) کے قریب اپنے رہنے کے لیے کوئی عمارت تعمیر کرنی روا نہیں رکھتے تھے، مکانات انہوں نے مضافات شہر میں بنوائے اور کعبہ کے قریب صرف خیمے لگائے جاتے تھے، مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ وہ پہلا شخص جس نے عبادت گاہ کے اطراف گھر تعمیر کیے وہ قصی تھا، اس جدت یا بدعت پر عوام کو آمادہ کرنے کے لیے اس نے یہ استدلال کیا کہ "اگر تم عبادت گاہ کے اطراف رہنے لگو تو لوگ تم سے ڈرا کریں گے اور لوٹ مار کے لیے تم پر حملہ کرنے سے باز آ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر قصی نے سب سے پہلے خود ہی اپنے لیے مکان تعمیر کیا جس میں قومی مشورہ گاہ یعنی دارالندوہ بھی تھا، یہ کعبہ کے شمال رخ تعمیر ہوا..... اور کہتے ہیں کہ وہ اس جگہ تھا جہاں آجکل حنفی مصلی بنا ہوا ہے (۳۶)۔ مکہ کی اس عبادت گاہ کے باقی تین طرف جو

Marfat.com

زمین تھی وہ قصی نے قریشی قبائل میں بانٹ دی جہاں انہوں نے اپنے رہنے کے گھر تعمیر کر لیے۔(۳۷)

سیاسی نظام:

مکہ پر جُرہمیوں کی حکومت تھی، قصی نے ان کے سردار کی بیٹی سے شادی کی اور جب وہ مر گیا تو قصی سرداری کی وراثت کا دعویدار بن گیا، قصی کا تعلق قبیلہ قضاعہ سے تھا چنانچہ اس خانہ جنگی میں قبیلہ قضاعہ نے قصی کی مدد کی، اور اگر ابن قتیبہ کی بات پر یقین کیا جائے تو خود قیصر روم نے بھی قصی (۳۸) کو مدد دی، جس کا منشا بظاہر یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندوستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کی گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے۔

سرداری حاصل کرنے کے بعد قصی (۳۹) کو وہاں متعدد سیاسی ادارے موجود ملے ہوں گے، مثلاً معبد کعبہ کی تولیت کا عہدہ وغیرہ۔ کوئی تعجب نہیں جو اس ذہین شخص نے خود بھی چند نئے ادارے قائم کیے ہوں تاکہ اپنے اقتدار کو محفوظ و مستحکم کرے، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ قصی کے زمانہ میں جن دس (۴۰) سرکاری عہدوں کا مکہ میں پتہ چلتا ہے ان میں سے کتنے قصی کے قائم کردہ تھے اور کتنے قدیم ادارے ہی تھے، شہر میں ایک دارالندوہ (۴۱) بنانا اور رفادہ (۴۲) کے نام سے ایک سالانہ محصول باشندگان شہر پر عائد کرنا صراحت کے ساتھ قصی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نسی، اجازہ، اور افاضہ کے ادارے قدیم خانوادوں ہی کے ہاتھ رہنے دیے گئے تھے (۴۳)، بہر حال عام طور پر قصی کے ہاتھ میں چھ عہدوں (۴۴) کا ہونا بیان کیا جاتا ہے، یہی عہدے اہم تر بھی تھے اور آمدنی کا ذریعہ بھی اُن ہی سے تھا۔

ابن عبدربہ (۴۵) اور دیگر مولف بیان کرتے ہیں کہ مکہ میں دس ہی سرکاری عہدے تھے، جن کو دس قبائل کے سردار موروثی طور سے انجام دیا کرتے تھے، ممکن ہے کہ یہ عہدے ابتداء میں دس ہی رہے ہوں جیسا کہ وینس اور پالمیرا میں تھا چنانچہ شابو (۴۶) کے حوالے سے لانس (۴۷) نے بیان کیا ہے کہ:

"دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خانوادوں کے

Marfat.com

سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی، کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اس طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا مجلس دہگانہ اور سینیٹ قانون بناتے، قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے......"۔

جس کے بعد لانس نے بیان کیا ہے کہ:

"یہ لاحاصل کوشش ہوگی کہ اس کے مماثل کسی ادارے کی تلاش ہم مکہ کے نظام میں کریں"۔

حقیقت میں ہمیں دس سے بہت زیادہ اداروں کا پتہ چلتا ہے جن کی تفصیل عرب مولفوں کی کتابوں کی ورق گردانی پر معلوم ہو سکتی ہے، خود ابن عبدربہ نے اگرچہ صراحت سے بیان کیا ہے کہ مکہ میں سردار دس ہی تھے لیکن خود اسی مولف نے سترہ عہدوں کے نام گنائے ہیں اور بعض سرداروں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر مامور بتایا ہے۔ ان سترہ عہدوں پر ہم موجودہ مواد سے چار پانچ اور عہدوں کا بڑی آسانی سے اضافہ کر سکتے ہیں، چنانچہ ان کی فہرست یہ ہے۔

(۱) ندوہ (۲) مشورہ (۳) قیادہ (۴) سدانہ (۵) حجابہ (۶) سقایہ (۷) عمارۃ البیت (۸) افاضہ (۹) اجازہ (۱۰) نسی (۱۱) قبہ (۱۲) اعنہ (۱۳) رفادہ (۱۴) اموال محجرہ (۱۵) ایسار (۱۶) آشناق (۱۷) حکومہ (۱۸) سفارہ (۱۹) عقاب (۲۰) لواء (۲۱) حُلوان النفر۔

مجلس دہگانہ کے الجھے ہوئے مسئلہ کو نظر انداز کر کے میں چاہتا ہوں کہ شہری مملکت مکہ کے دستور کی ساخت اور کارکردگی کو اپنے طور پر واضح کروں۔

چنانچہ اولاً آبادی یا شہریوں کو "جماعہ" (۴۸) کا نام دیا جاتا تھا، یہ لفظ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی برقرار رکھا اور اس سے مراد آپ کے زمانہ میں آپ کے متبعین کی پوری جماعت ہوتی تھی، جو باقی دنیا سے ممتاز ایک وحدت تھی اور بحرین کے حکمران کے نام جو مکتوب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم گیا (۴۹)، اس میں بھی اسے دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس "جماعت" میں شریک ہو جائے، "ملت" (۵۰) کا لفظ سیاسی سے زیادہ

Marfat.com

مذہبی مفہوم رکھتا تھا۔ قرآن مجید میں ''قوم'' (۵۱) کا لفظ ایک وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے، اوراس میں نہ صرف عام رائے دہندگانِ شہر بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنین ملک شامل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو حق رائے دہی حاصل ہوتا تھا اور وہ شورائے عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے تھے اُن کو قرآن میں ہمیشہ ''ملأ'' (۵۲) کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور یہ ''ملأ'' کی ''تراضی'' یعنی رضا مندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمران فیصلہ کرتا، چنانچہ قرآن مجید میں بھی لفظ تراضی استعمال ہوا ہے (۵۳)۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کی ''ملأ'' کا ذکر ہے اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے ہیں جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں جو عزیز مصر تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں جو ملکہ سبا تھی ان کے ہاں بھی قرآن مجید (۵۴) کے مطابق جو مجلس شوریٰ تھی اس کا نام ''ملأ'' ہی تھا، اس مجلس میں ''اولواقوۃ'' یا اہل حل وعقد ہی ہوا کرتے تھے، اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آتی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے (۵۵)۔ پالمیرا میں جو مجلس شوریٰ تھی اس کے متعلق بھی ایسا ہی مواد ملتا ہے (۵۶)۔

مکہ میں جو دارالندوہ تھا اس میں صرف معمر اہل مکہ شریک ہو سکتے تھے، چنانچہ ازرقی (۵۷) اور ابن دُرید (۵۸) نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم از کم چالیس سال کی ہو، صرف حکمرانِ شہر قصی کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے، (۵۹) غالبًا اسی حق رائے کی عمر چہل سالگی ہی کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید نے ''حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً'' (۶۰) کے الفاظ میں بیان کیا ہے، یہ قصی کے زمانہ کا ذکر تھا، بعد کے زمانوں میں مختلف نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل (۶۱) کو تیس ہی سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے (لجودرایہ) کے باعث دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم بن حزام (۶۲) کو تو بیس یا پندرہ ہی سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہو گئی تھی، یونان کے شہر سپارٹا میں تو مجلس شوریٰ واقعی مجلس معمرین تھی، چنانچہ ساٹھ سال سے کم عمر (۶۳) کا کوئی شخص وہاں کا مقامی مجلس شوریٰ

Marfat.com

(Gerousia) میں شریک ہی نہیں ہوسکتا تھا (۶۴)۔

قصی سے پہلے مکہ والے یا تو کسی کھلے مقام پر مشورے کے لیے جمع ہوا کرتے ہوں گے یا اپنے سردار کے خیمے میں۔ اس غرض کے لیے ایک مستقل عمارت بنانا قصی کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ قصی ہی نے اسے دارالندوہ نام دیا تھا، اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ملک الشعراء حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس نام کی یاد اپنے اشعار میں باقی رکھی ہے (۶۵)۔ یہ مشورہ گاہ کعبہ کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن زمانہ اسلام میں اُسے منہدم کر کے کعبہ کے اطراف جو مسجد حرم بنی اس کی توسیع کے کام میں لایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس مجلس کا انعقاد معینہ اوقات پر نہیں ہوتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی ضرورت پیش آئے ہوتا (۶۶)۔

اسی دارالندوہ میں مشورے ہوا کرتے، جنگوں کا اعلان کیا جاتا یا مدافعتی تدبیروں پر بحث و غور ہوتا (۶۷)، یہیں شادیاں بھی رچائی جاتیں، اور تجارتی معاہدے طے ہوتے (۶۸)۔ بیرونی مہمان آتے تو ان کی ضیافت بھی یہیں ہوتی (۶۹)۔ انیلگری کے قدیم باشندوں کی طرح (۷۰) زمانہ قبل اسلام کے مکہ والے بھی ایک رسم کرتے جو لڑکی کے سن بلوغ کو پہنچنے پر انجام دی جاتی اور اسے ایک نئی اور پوری قمیص (ورع) پہنائی جاتی اور وہ بے نقاب آتی اور بے نقاب ہی جاتی گھر پہنچنے کے بعد اس پر پابندیاں عائد ہو جاتیں، اس رسم کا منشاء یہ تھا کہ لڑکی کے قابل نکاح ہونے کا اعلان کیا جائے اور خواہشمند آگاہ ہو کر رونمائی کے لیے آسکیں۔ یہ رسم بھی دارالندوہ ہی میں انجام پاتی (۷۱)۔

دارالندوہ شہر مکہ کا مرکزی دارالبلد تھا اُس کے علاوہ شہر میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنے ہی مجالس محلہ بھی تھے، ان کو "نادی" (۷۲) کہا جاتا تھا، جیسا کہ شہر مدینہ میں محلہ دار مجالس کو سقیفہ یعنی مسقف سائبان کا نام دیا گیا تھا، نادی اور دارالندوہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، چنانچہ مشہور محدث و لغت نویس ابو عبید (۷۳) نے نادی اور ندوہ دونوں کا مادہ "ندا" ہونا بتایا ہے۔ قرآن مجید نے لفظ نادی کو حیات جاوید عطا کر دی ہے اور فَلْيَدْعُ نَادِيَه (۷۴) اور "تاتون فی نادیکم المنکر" (۷۵)، دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور ماضی مضارع کے صیغے بھی ان کے علاوہ مستعمل ہوئے ہیں (۷۶)۔

Marfat.com

نقشہ مسجد حرم کعبہ

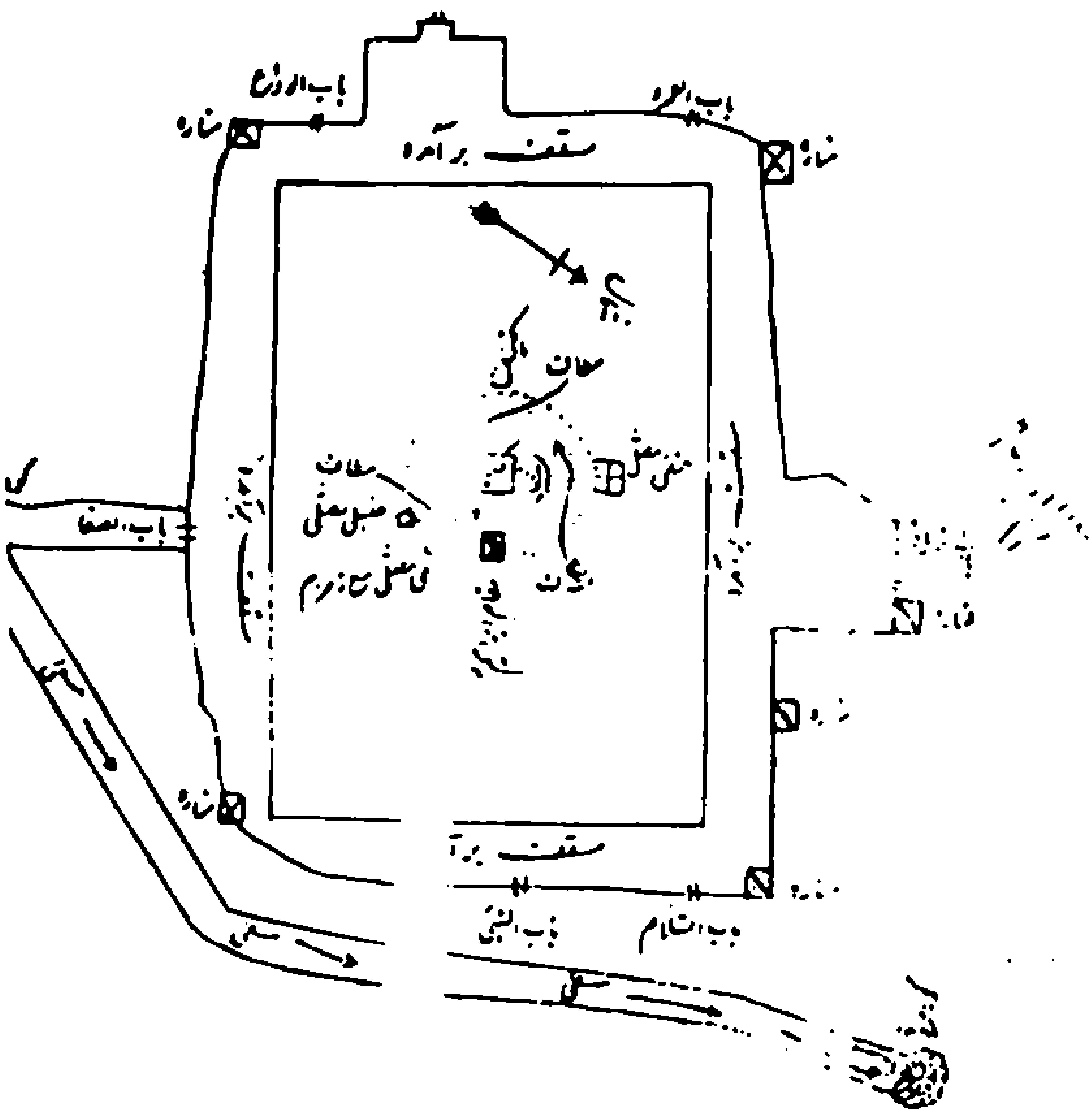

Marfat.com

نقشہ حدودِ حرمِ مکہ

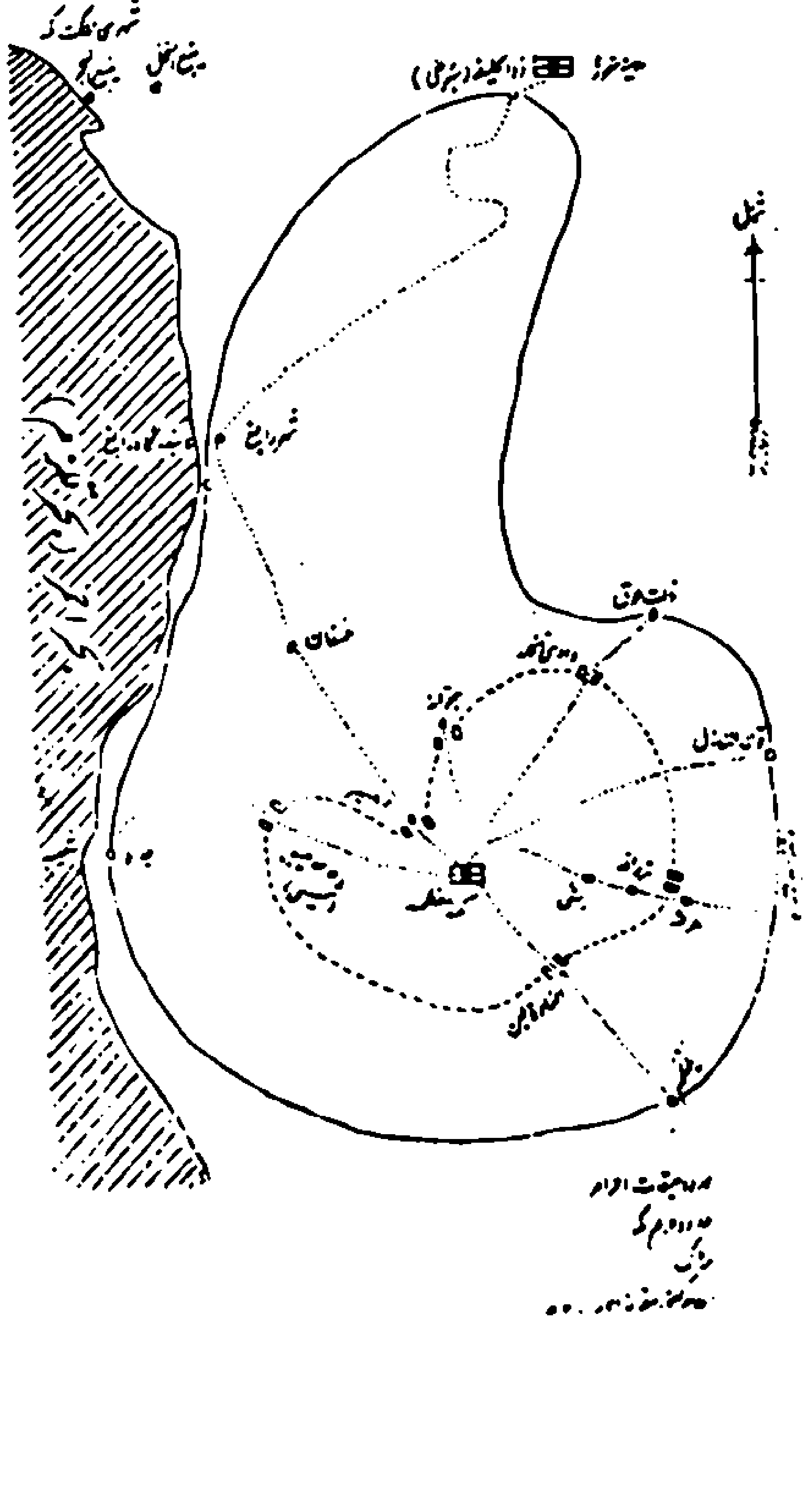

Marfat.com

ان نادیوں یا قبائلی مجالس محلہ میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ سے مولا یعنی فرد خاندان بنانے کی رسم بھی انجام دی جاتی تھی (۷۷) اور کسی فرد خاندان کو بے راہ روی وغیرہ پر جات باہر (''طرد'' یا ''خلع'') کرنے کا اعلان بھی وہیں کیا جاتا تھا (۷۸)، محلہ والے اور بعض وقت دیگر محلوں کے دوست بھی چاندنی راتوں میں یہاں جمع ہوکر سامرہ یعنی شبانہ قصہ گوئی کیا کرتے تھے (۷۹)، تجارتی معاملات اور کاروانوں کی آمد یا روانگی بھی ان ہی قبائلی نادیوں سے ہوا کرتی تھی۔

ایتھنس (اثینا) کے متعلق جاوٹ (Jowett) نے اپنی کتاب Thueydides (۸۰) میں لکھا ہے:

''قرقروپ (Cererops) اور ابتدائی بادشاہوں کے زمانے میں حتیٰ کہ تیسیوس (Thesues) کے زمانے تک شہر اثینا مختلف محلوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک کے اپنے مجالس محلہ اور مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے۔ بجز اس کے کہ کوئی خطرہ درپیش ہو، پورے شہر کی آبادی کا اجلاس جو بادشاہ کی صدارت میں ہوتا، نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ لوگ اپنے معاملات کا انتظام اپنے مجالس محلہ ہی میں آپس کے مشورے سے طے کرلیا کرتے تھے۔

مکے کے نقیب کا عہدہ بھی پایا جاتا ہے جسے منادی اور مؤذن کہتے تھے (مؤذن اپنے ان ابتدائی معنوں میں اب تک شامی بدویوں میں مستعمل (۸۱) ہے) جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے (۸۲)۔ ہر قبیلے کے سردار کے پاس اس کے اپنے خصوصی ایک یا زاید منادی بھی ہوا کرتے تھے (۸۳)۔ یہ منادی نہ صرف غیر معمولی انعقاد مجالس کی اطلاع مشتہر کرتے تھے بلکہ کسی تقریب یا دعوت میں دعوتیں پہنچانا اور کسی فرد خاندان کے جات باہر کیے جانے کی اطلاع اور محلوں میں بھی کرنا انہیں سے متعلق تھا۔ غیر معمولی صورتوں میں منادی کے علاوہ دیگر عام لوگ بلکہ اجنبی

اشخاص بھی مجالس بلدیہ کے انعقاد کی اطلاع کے مجاز تھے۔ ایسی صورتوں میں اجنبی لوگ اپنے تمام کپڑے اتار دیتے اور کسی اونچے مقام پر بالکل برہنہ ہو کر دہائی دیا کرتے۔ عربی داں ''النذیر العریاں'' کی اصطلاح سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ بدر میں قریش کے کارواں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حملے کے خطرے کی اطلاع مکے میں ابوسفیان کے قاصد نے اسی طرح دی تھی۔

مورخین کے بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی پورے شہر کا ایک واقعی مطلق العنان اور با اقتدار بادشاہ تھا، جس کا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا تھا (۸۴)۔ بعد کی نسلوں نے شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ اس کی یاد باقی رکھی۔ اور اسے ''مجمع'' کا خطاب (۸۵) عطا کر دیا تھا کیونکہ اسی نے جملہ قریشی قبائل کو جمع اور متحد کر کے شہر میں انہیں دیگر آبادی میں ایک اعزازی حیثیت عطا کر دی تھی۔ قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی کیونکہ خود قصی نے مختلف انتظامی عہدے اپنے مختلف بیٹوں میں بانٹ دیے تھے (۸۶)۔ اور غالباً مشہور مجلس دہگانہ (۸۷) کا آغاز اسی طور سے ہوتا ہے جو زمانہ اسلام تک باقی نظر آتی ہے، اس سے ہمیں انکار نہیں کہ قصی کو مطلق العنان اختیارات حاصل رہے ہوں گے اور اس کا کوئی حریف و مدمقابل نہ ہوگا کیونکہ اس نے اپنی قوم کے لیے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، لیکن بعد کے زمانوں میں سیدالناس (۸۸) وغیرہ کے القاب سے کہیں ہم یہ نہ خیال کریں کہ مکے میں بھی مثلاً دے نیس (وینس) کی طرح دوجے یا قائد و سردار ہوا کرتا تھا۔ شہر مکے کے عہدوں میں ایک قیادہ (۸۹) بھی بیان کیا جاتا ہے، لیکن اس کا منشا کیا تھا پوری طرح معلوم نہیں ہوتا۔

ولہاوزن بھی اپنے عالمانہ اور دلچسپ مقالے **Geminwesen**

Marfat.com

ohne obr jgkeit (یعنی ایک سیاسی اجتماعیت بغیر سرداری کے) میں اسی نتیجے پر پہنچا ہے کہ شہر مکہ میں کوئی فردی حکومت نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چکی تھی، چنانچہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان بن الحویرث (۹۰) نے مکے میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی۔ مدینے میں عبداللہ اُبی بن سلول کے لیے تو تاجِ شہریاری (۹۱) کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لیے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کر سکیں، اسپرنگر کو یقین تھا کہ "یہ لوگ یعنی عرب کے بدوی اپنی بدویانہ زندگی کے باوجود فردیت یعنی بادشاہت کی طرف میلان رکھنے لگ گئے تھے" (۹۲)۔

Marfat.com

حواشی

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس تحت عنوان سٹی City (شہر) از ولیم منرو۔

(۲) مقالہ جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں ٹریونڈرم میں اورینٹل کانفرنس میں سنایا گیا۔

(۳) نپولین کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت جزیرہ سینٹ ہیلینا جلد ۲، ص ۱۸۳

(۴) تاریخ طبری ۱۹۲۷ء ص ۲۸۱۷ نیز دیکھیے گبن کی انگریزی تاریخ انحطاط و زوال روما جلد ۵ ص ۵۵۵ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

(۵) میرے خیال میں ''ذوالقرنین'' (یعنی دو سینگوں والا) کا لقب سکندر اعظم کو عربوں کی طرف سے دیے جانے کا اصلی باعث یہ تھا کہ مقدونیہ والے ایک ٹوپی پہنا کرتے تھے جس پر دو سینگیں ہوتی تھیں ان کا یہ قومی لباس اب تک باقی ہے، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جب یوگوسلافیا کے بادشاہ الگزنڈر کو مارسیلز میں قتل کر دیا گیا تو اس کی لاش کے بازو اس کے تمام شاہی زیوروں وغیرہ کے ساتھ اس کی دو سینگوں والی ٹوپی بھی رکھی گئی تھی (''الروم ذات القرون'' کی اصطلاح کے لیے دیکھیے بلاذری کی فتوح البلدان طبع مصر ص ۵۱)۔

(۶) نیز دیکھیے عینی شرح بخاری ۳۶۵/۷ اور ازرقی کی اخبار مکہ بر موقع۔

(۷) لامنس فرانسیسی کتاب مکہ ہجرت سے پہلے، صفحہ ۲۳۹، ۲۴۳۔

(۸) معارف ابن قتیبہ، طبع یورپ میں ص ۳۱۳۔

(۹) الفاسی طبع یورپ، ص ۱۴۴، سہیلی کی الروض الانف ۱۴۶/۱، لامنس کی مذکورہ بالا کتاب مکہ ص ۲۶۷، اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدی جلد اص ۸۹ تا ۹۰۔

(۱۰) تاریخ یعقوبی ۲۸۰/۱ تاریخ طبری ص ۱۰۸۹، طبقات ابن سعد جلد ۱ حصہ اول ص ۴۳، ۴۵، لسان العرب تحت کلمہ ''ایلاف'' لامنس کی مذکورہ کتاب مکہ ص ۱۲۸ وغیرہ، تفسیر طبری وغیرہ میں سورہ ایلاف کی تشریح۔

(۱۱) اسباب النزول ص ۱۹۵۔

(۱۲) تاریخ طبری ص ۱۵۸۲ و مابعد۔

(۱۳) دیکھیے کسی تفسیر میں سورہ فیل نیز فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۱ء ص ۵ تا ۳۶، اور ایطالوی رسالہ R.S.O. جلد ۹ ص ۸ ۷۲ و مابعد میں کونتی روسینی کے مضامین عرب میں حبشیوں

Marfat.com

کی خانہ جنگیوں کے متعلق، نیز لامنس کی کتاب مکہ ص ۲۸۰ ومابعد۔

(۱۴) سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹، مابعد، معلوم نہیں کہ حبشیوں نے محمود کا عربی نام کیوں رکھا تھا، شاید یہ لفظ Mammoth کا معرب ہو، جو ایک گرانڈیل قسم کے ہاتھی کو کہتے ہیں۔

(۱۵) ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷ نیز کتاب الاغانی ۱۳/۱۰۸۔

(۱۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ص ۱۰۹۷، قطب الدین کی الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام ص ۳۴۔

(۱۷) جرہمی دور کے لیے دیکھیے ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷۔

(۱۸) قرآن مجید ۳۷/۱۴ میں مکہ کے جائے وقوع کو یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ وہاں کوئی زراعت نہیں ہوتی، اگرچہ عالیہ زمانوں میں نہر زبیدہ کے باعث شہر میں سرسبزی نظر آنے لگی یہ اور سعودی دور میں باغات بھی ترقی کرنے لگے ہیں۔

(۱۹) اخبار مکہ ص ۹۶ سطر ۱۲ ''مکتبہ موضع البیت ومکہ القریۃ''۔

(۲۰) قرآن مجید ۳-۹۶

(۲۱) ایضاً ۲۴-۴۸

(۲۲) سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۱، ۵۱۹

(۲۳) قرآن مجید ۳۰-۴۳ نیز کامل المبرد ص ۲۹۱، بلاذری کی کتاب (انساب الاشراف) بحوالہ لامنس (صفحہ ۳۴ و ۳۷)

(۲۴) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰

(۲۵) قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴

(۲۶) ارزقی کی اخبار مکہ ص ۷۵ تا ۷۶، ابونعیم کی المنتقی مخطوطہ بزم ادب، حیدرآباد دکن ورق نمبر ۲۰۵ تا ۲۰۶۔

(۲۷) دیورژے کی فرانسیسی کتاب عرب ص ۱۰۱ عمود اول

(۲۸) یہ بت بہت چھوٹے ہوں گے، چنانچہ تاریخ طبری ص ۱۳۹۵، اور کتاب الاغانی ۱۴/۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ احد کے دن ابوسفیان ان کو اٹھائے لیے جا رہا تھا۔

(۲۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵ کلبی کی کتاب الاصنام برموقع۔

(۳۰) فلپسن کی انگریزی کتاب ''قدیم یونان اور روما میں بین الممالک قانون اور رواج'' جلد ۱ ص ۲۸ وارڈ فولر انگریزی کتاب ''شہری مملکت'' برموقع، ہیالیڈے کی ہسٹری آف دی ورلڈ

شائع کردہ ہیامرٹن، باب یونانی شہری مملکتیں ص ۱۱۰۷۔

(۳۱) حدود حرم کا جوذکر ازرقی ص ۳۶۰ تا ۶۱، اور احمد ابن محمد الخضر اوی کی العقد الثمین فی فضائل البلد الامین (مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ھ) ص ۱۳ میں ہے اس سے یہ اندازہ کیا گیا۔

(۳۲) ہسٹری آف دی ورلڈ، ص ۱۱۰۔

(۳۳) مراۃ الحرمین ۱/۱۷۸ نیز دیکھیے کوئی نقشہ شہر مکہ۔

(۳۴) قطب الدین کی کتاب مذکورۂ بالا، ص ۷

(۳۵) تاریخ طبری، ص ۱۰۹۷، نیز قطب الدین کی کتاب مذکورہ ص ۳۴

(۳۶) قطب الدین کی کتاب مذکورہ، ص ۳۴

(۳۷) ایضاً

(۳۸) معارف ابن قتیبہ، ص ۳۱۳ (مطبوعہ یورپ)

(۳۹) قصی کے حالات کے لیے دیکھیے مارٹن ہارت مان کا مضمون جرمن رسالہ اشوریات **Z.F. Assyriologic** جلد ۲۸ ص ۴۳ تا ۴۹

(۴۰) ابن عبدربہ کی العقد الفرید، جلد ۲، ص ۴۵ تا ۴۶، اور زبیر بن بکار کی انساب قریش مخطوطہ استنبول جس کا حوالہ لامنس نے اپنی فرانسیسی کتاب مجلس سہ گانہ **(Friumvirat)** ص ۱۱۴ میں دیا ہے۔

(۴۱) ابن ہشام، ص ۸۰، ۸۳ طبری، ص ۱۰۹۹، ابن سعد جلد اول حصہ اول، ص ۴۹ اور اخبار مکہ مطبوعہ یورپ مولفہ ازرقی ص ۶۵

(۴۲) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری، ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد جلد حصہ اول، ص ۴۱، جغرافیہ۔

(۴۳) تاریخ طبری، ص ۱۱۳۴، سیرۃ ابن ہشام، ص ۶۷، ۷۶، ۷۷، ۷۸

(۴۴) ازرقی، ص ۶۶ (امورتہ)

(۴۵) العقد الفرید جلد ۲، ص ۴۵ تا ۴۶

(۴۶) شابو **(Chabot)** کی فرانسیسی کتاب پالمیرا کے کتبوں کا انتخاب ص ۲۴، وغیرہ

(۴۷) لامنس کی کتاب مکہ، ص ۶۹

(۴۸) مغازی واقدی، ص ۵۹ سطر ۳

(۴۹) طبقات ابن سعد جلد ۲ حصہ اول ص ۲۷ حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب ''اسلامی سیاست خارجہ بہ عہد نبویؐ وخلافت راشدہ'' ص ۴۷ نیز الوثائق السیاسیہ بر موقع۔

Marfat.com

(۵۰) دیکھیے قرآن مجید ۱۳۰/۲، ۴۵/۳، ۱۲۵/۴ وغیرہ

(۵۱) قرآن مجید ۶۰، ۶۶، ۱۰۹، ۱۲۷/۷، ۲۷، ۳۷/۱۱، ۲۴، ۳۳/۲۳ وغیرہ

(۵۲) قرآن مجید ۲۴۶/۲، ۲۰/۲۸

(۵۳) قرآن مجید ۲۳۳/۲، ۲۹/۴

(۵۴) قرآن مجید ۴۳/۱۲، ۲۹، ۳۲/۲۷

(۵۵) الفاسی کی اخبار مکہ، ص ۱۰۹

(۵۶) لامنس کی کتاب مکہ، ص ۷۹

(۵۷) ازرقی کی اخبار مکہ، ص ۶۴، ۶۵، ۴۶۵

(۵۸) کتاب الاشتقاق، ص ۹۷

(۵۹) ازرقی، ص ۶۴، ۶۵، ۴۶۵

(۶۰) قرآن مجید ۱۵/۴۶

(۶۱) ابن درید کی کتاب الاشتقاق، ص ۹۷ سطر (۶)

(۶۲) ابن عساکر کی تاریخ دمشق جلد (۴) ص ۴۱۹ سطر (۲)

(۶۳) اس کے مماثل ہندوستانی کہاوت ''ساٹھا پاٹھا'' کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے

(۶۴) پلوٹارک کی سوانح عمریاں دیکھیے لائیکرگس کے حالات، نیز وارڈ فاؤلر کی انگریزی کتاب ''شہری مملکت'' ص ۷۱ تعلیق نمبر ۲

(۶۵) دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ یورپ نظم نمبر ۱۴۵، ۱۸۳

(۶۶) کتاب الاشتقاق مؤلفہ ابن درید، ص ۹۷

(۶۷) چنانچہ مثال کے طور پر ہجرت سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قاتلانہ حملہ کرنے کی پخت وپز بھی یہیں ہوئی تھی۔

(۶۸) لامنس کی کتاب مکہ ص ۱۷۲

(۶۹) مغازی واقدی شائع کردہ فون کریمر ص ۲۳

(۷۰) کتاب نیلگری مؤلفہ حمید اللہ شائع کردہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد، دکن۔

(۷۱) سیرۃ ابن ہشام، ص ۸۰

(۷۲) تفصیلات کے لیے دیکھیے لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ ومابعد

Marfat.com

(۷۳) غریب الحدیث ورق نمبر ۱۹۱ (بحوالہ مکہ مولف لامنس ص ۷۳)

(۷۴) قرآن مجید ۱۷/۹۶

(۷۵) قرآن مجید ۲۹/۲۹

(۷۶) قرآن مجید میں تلاقی، نادوا، نادیتم، نادینا، نادت، ینادی، ینادون، نودی، تنادوا، ندا، ندیا، منادی، تناد کے لفظ بھی بار بار آئے ہیں۔

(۷۷) سیرۃ ابن ہشام، ص ۲۴۳، ۲۴۶، کتاب الاغانی ۹۹/۱۴

(۷۸) اغانی ۵۲، ۵۳/۸

(۷۹) ازرقی کی اخبار ص ۶۷، ۲۷، اغانی ۱۱۲/۱۳ اور لامنس کی کتاب مکہ ص ۸۸ و مابعد تعلیق ۸

(۸۰) دیکھیے جلد اول ص ۱۰۴ (بحوالہ وارڈ فاؤلر ص ۴۸ تا ۴۹)

(۸۱) دیکھیے لامنس کی کتاب مکہ ص ۱۶۰ تعلیق ۳ نیز قرآن ۱۲/۷۰، ۴۳/۷

(۸۲) ابوعبیدہ کی کتاب الاموال ص ۴۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ۹ھ تک بھی ایسا ہوتا تھا۔

(۸۳) تاریخ یعقوبی جلد (۱) سطر ۱۴ نیز ص ۲۹۰، ۲۹۲، لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۴، ۶۵، اسی مولف کی فرانسیسی کتاب ''گہوارہ اسلام'' جلد (۱) ص ۲۲۹، کتاب الاغانی جلد (۱۱) ص ۶۵ سطر ۵، ابن درید کی کتاب الاشتقاق ص ۹۴ مفضو یات مطبوعہ یورپ ۲/۳۔

(۸۴) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۴

(۸۵) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۰، تاریخ طبری ۱۰۹۵

(۸۶) مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۹۳

(۸۷) ابن عبدربہ کہ العقد الفرید جلد ۲ ص ۴۵ اور مسعودی کی مروج الذہب ۱۹۹ تا ۱۲۰/۳، ۱۲۱/۴

(۸۸) ازرقی کی اخبار مکہ ۶۴...... لامنس کی کتاب مکہ ۶۹

(۸۹) ازرقی ص ۶۴

(۹۰) روض الانف ۱۴۶/۱

(۹۱) (لتو جوہ) صحیح بخاری ۲۰/۷۹، تاریخ طبری ص ۱۵۱۱ و مابعد، سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷۷، نیز قرآن مجید ۸/۶۳ کی تشریح کسی تفسیر میں۔

(۹۲) اسپرنگر کی جرمن سیرۃ و تعلیمات محمدیہ ۲۴۹/۱

(معارف-اعظم گڑھ-جنوری ۱۹۴۲ء)

Marfat.com

شہری مملکتِ مکہ
(۲)

مذہبی نظام:

اس قدیم زمانہ میں جب ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرنے پر مجبور ہوا کرتا تھا، کسی ملک کا سب سے اہم کشوری انتظام وہاں کے معبد کا انتظام ہوا کرتا تھا۔ سدانہ، حجابہ، سقایہ اور عمارۃ البیت اسی سے متعلق تھے، ان کے علاوہ ایسار اور ازلام کے چرچے بھی ہم سنتے ہیں، جن سے ڈیلفی وغیرہ کے یونانی مندروں کی دیوبانیOracles کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اسی طرح وہاں ایسے بھی افراد پائے جاتے تھے جو مافوق الفطرت طاقتوں کے مالک ہونے کا زعم کرتے تھے، جیسے عائف، کاہن، عراف، خریت، منجم بلکہ خود ان لوگوں کی بھی خاصی تعداد جو شاعر کہلاتے تھے، اور ان لوگوں کی مزعومہ قابلیتوں سے وقت بوقت زود یقین اہل ملک فائدہ اٹھایا کرتے تھے، وہاں کے لوگوں کا ہاتف پر بھی اعتقاد تھا جو ایک نظر نہ آنے والے مگر آواز سے باتیں سنانے والے کا نام تھا، بھینٹ بھی چڑھائی جایا کرتی تھی، جسے قربانی کا نام دیا گیا تھا، ملک کے دیگر عام اوہام کا تفصیلی ذکر شاید یہاں غیر ضروری ہوگا۔

سدانہ سے مراد معبد کی رکھوالی اور حجابہ سے مراد معبد کی دربانی ہوتی تھی، اور دروازے کی چابی پاس ہونے سے جس کو چاہے معبد کے اندر جانے دیا جا سکتا تھا اور اس سلسلہ میں دربان کو خاصی آمدنی بھی ہو جاتی تھی، یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ قصی نے کعبہ کی دربانی کا عہدہ ایک مشک بھر شراب کے عوض خرید لیا تھا۔ (۱) اور یہ بھی ایک مشہور واقعہ ہے کہ کس طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد دروازہ کعبہ کی چابی وہاں کے قدیم موروثی دربان ہی کو واپس کر دینی مناسب خیال فرمائی تھی۔ (۲) یہ

Marfat.com

اب تک اسی خاندان میں چلی آرہی ہے اور سعودی دور نے بھی تبدیلی نہ کی۔

سقایہ سے مراد کعبے کی زیارت کے لیے حج یا عمرے کے زمانہ میں آنے والوں کو پانی پلانا، اور عمارۃ البیت سے مراد حرم کعبہ کا عام انتظام کرنا تھا، ان دونوں چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے (۳)۔ حجاج کو پانی پلانا مکہ میں بھی ایک منفعت بخش فریضہ ہو گا، کیونکہ وہاں پانی کی عام قلت ہے اور زمزم کے کنویں کا مقدس پانی ہر حاجی کو بھی درکار رہتا ہوگا، پالمیرا میں ایک مماثل فریضے کی انجام دہی سے سالانہ آٹھ سو طلائی اشرفیوں کی معقول آمدنی ہو جایا کرتی تھی (۴)۔ غالباً مکہ کے باشندے خود اس سلسلہ میں کوئی فیس ادا کرنے سے مستثنیٰ رہتے ہوں گے، ابن عبدربہ نے بیان کیا ہے کہ عمارۃ البیت کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ افسر متعلقہ وقت بوقت حرم کعبہ میں گھوم پھر کر نگرانی کیا کرے، اور دیکھے کہ کوئی شخص جھگڑے، گالی گلوچ، یا بلند شور اور پکار سے اس کے تقدس کو توڑ تو نہیں رہا ہے، اور یہ کہ ایک زمانہ میں یہ فریضہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ انجام دیا کرتے تھے۔ (۵)

مجھے معلوم نہیں کہ اسلام سے پہلے جو حج ہوا کرتا تھا، وہ بھی اتنے ہی ارکان و مراسم پر مشتمل ہوا کرتا تھا جتنا اب ہے، یا یہ کہ اس کی بعض چیزیں زمانہ اسلام کا اضافہ ہیں اور وہ چیزیں اسلام سے پہلے حج سے الگ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہوں، اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں طواف کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی دونوں کے لیے ایک لفظ تطوف یعنی طواف استعمال کیا گیا ہے (چنانچہ صفا و مروہ کے سلسلہ میں یطوف بھما وارد ہوا ہے (۶) تو طواف کعبہ کے لیے لیطوفو ابالبیت العتیق (۷) کے الفاظ آئے ہیں) اس کے باوجود صفا و مروہ کا طواف نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مابین سات مرتبہ آنا جانا پڑتا ہے، یہ چیز بھی قابل ذکر ہے، کہ صفا و مروہ کے سلسلہ میں قرآن مجید نے لاجناح علیہ ان یطوف بھما یعنی "کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں کا طواف کیا جائے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، شاید پہلے ان کا بھی طواف ہوا کرتا تھا، جس طرح کعبہ کا لیکن اب قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل سنت نبوی کی روشنی میں طواف کی جگہ سعی سے کی جاتی ہے حج کے سلسلہ میں افاضہ و اجازہ بھی (۸) دو عہدے تھے، اور ان کو یہ اہمیت

Marfat.com

حاصل تھی، کہ عہدہ داران متعلقہ اوران کے قبیلہ والے سب سے پہلے روانہ ہو سکتے تھے، جب کہ بھیڑ بھاڑ کم ہوتی تھی، لیکن مجھے نسی کے عہدے پر زیادہ تفصیل سے کچھ عرض کرنا چاہیے۔(۹)

اسلام سے پہلے مکہ والوں کا تمدن جس قدر افتادہ حالت میں تھا، اس کے باوجود انہیں، شمسی اور قمری سالوں کا فرق محسوس ہو چکا تھا، چنانچہ ایک سرسری اندازے کے مطابق وہ ہر تیسرے سال ایک تیرہواں مہینہ بھی قائم کرلیا کرتے تھے، جومحرم اور صفر کے مابین ہوا کرتا تھا، کبیسہ بنانے کا یہ کام مختلف مراسم کے ساتھ انجام پاتا تھا، اوراس کا اعلان جس افسر کے فرائض میں داخل تھا، وہ قبیلہ بنی تیم سے تعلق رکھا کرتا، اور قلمس (۱۰) یا قلنبس (۱۱) کہلاتا تھا، شاید یہ لفظ Calendus (یعنی کیلنڈر والا) کا بگڑا ہوا ہے۔

کبیسہ بنانے کے سلسلہ میں، ہمیں اشہر حرم یعنی حرام اور مقدس مہینوں کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہیے۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح معبد کعبہ کی عمارت کے لیے جو مذہبی حج ہر سال ایک معینہ زمانہ میں کیا جاتا، وہ ساتھ ہی ایک تجارتی میلہ کی بھی حیثیت اختیار کر لیتا، کیونکہ کچھ تو حج کے لیے آنے والے نو واردوں کی ضروریات خورد ونوش کے لیے درآمد کی بھی ضرورت ہوتی اور فروخت گاہوں کی بھی اور خود نو وارد حجاج بھی اپنے ساتھ تجارتی سامان لے کر حج کے ساتھ خانگی کاروبار بھی انجام دے لیتے، قرآن مجید نے بھی اس قدیم طرز عمل کو جاری رہنے دیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی اور قرار دیا کہ (۱۲) لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم یعنی "کوئی حرج نہیں، کہ تم اپنے رب کا فضل حاصل کرنے کی کوشش کرو" اور تجارتی کاروبار کے نفع کو خدا کا فضل قرار دیا، اس طرح ہر سال جو میلہ لگا کرتا اس سے میلہ لگنے کے مقام کے سردار کو جملہ تجارتی درآمد کا عشر یعنی دسواں حصہ محصول درآمد میں مل کر خوب آمدنی ہو جایا کرتی تھی، اس لیے وہ ہر ممکنہ ذریعہ سے اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ بیرونی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں آنے کی بڑی سے بڑی ترغیب ہو، بدرقہ یا خفارہ کا نہایت منظم اور ترقی یافتہ ادارہ بھی جس میں قریش مکہ کو کافی دخل تھا، اس بارہ میں خاصا مددگار ثابت ہوتا تھا، حرام مہینوں کا ادارہ بھی اسی غرض کے لیے وجود میں آیا تھا، کہ اس زمانہ میں لوٹ مار کو مذہبی نقطہ نظر سے ممنوع قرار

Marfat.com

دینے کے باعث اجنبیوں اور تاجروں کو اس میلہ میں آنے کی ترغیب ہو، امن کا سب سے طویل زمانہ جو تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے، وہ حج کعبہ کے سلسلے میں مسلسل تین مہینوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا، (۱۳) دیگر معبدوں کے حج نسبتاً کم مدت تک امن و امان قائم کرا سکتے تھے، اس سے لامنس (۱۴) اور اس کے ہم خیالوں کے مسلسل اور پُر اصرار انکار کے باوجود یہ بات صاف طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ، حج کعبہ کو کس طرح غیر معمولی اور امتیازی اہمیت حاصل تھی، اور وہاں نہ صرف پورے جزیرہ نمائے عرب بلکہ شام اور مصر تک (۱۵) سے حجاج آیا کرتے تھے، ضمناً یہ بھی بیان کر دیا جا سکتا ہے کہ قریش کے چند ممتاز خاندانوں کو مسلسل آٹھ مہینوں تک ''اشہر حرم'' حاصل رہتے تھے، اور تاریخ نے اس کو بسل کے نام سے یاد رکھا ہے (۱۶) غالباً یہ خانوادے طویل تجارتی سفر کے لیے قافلے لایا اور لے جایا کرتے ہوں گے، اور جن علاقوں سے گزرتے تھے، وہاں والوں کا سامان بھی کوئی معاوضہ و کمیشن لیے بغیر کاروبار تجارت کے لیے لایا اور لیجایا کرتے ہوں گے، جس کے باعث اہل قبائل بھی ان کے چھیڑنے سے باز رہتے ہوں گے، کمیشن کے بغیر قریش کا بعض قبائل کے سامان تجارت کو لانا اور لے جانا ایک تاریخی واقعہ ہے (۱۷)۔ بہر حال ان تمام چیزوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں امن و مسالمت کی جانب ایک بین رجحان پایا جاتا تھا، نہ کہ ہر شخص کا باقی تمام دنیا سے اپنے کو برسرپیکار خیال کرنا۔

یہ واقعی ایک بدبختی کی بات تھی گو عمداً اس کا ارادہ نہیں کیا گیا ہوگا، کہ ہر تیسرے سال جب قلمس حج کے مہینہ ذی الحجہ میں اعلان کرتا تھا کہ آئندہ مہینہ محرم الحرام نہیں ہوگا، بلکہ ایک معمولی اور غیر حرام مہینہ ہوگا جس کے دوران میں بدویوں کے لیے لوٹ مار سے باز رہنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اس طرح تین حرام مہینوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور نتیجتاً ان لوگوں کو دشواریاں پیش آتیں جو جلد رخصت ہونا چاہتے۔

مکہ والے تین مسلسل اور چوتھے ایک علیحدہ مہینہ کو مقدس تسلیم کرتے تھے، چنانچہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم عرفات کے حج اکبر (۱۸) کے لیے اور رجب حج اصغر یا عمرے (۱۹) کے زمانہ میں جب کہ لوگ کعبہ کی زیارت کو آتے، قریشی اثر سے ان مقدس مہینوں کا قریب قریب پورے عرب میں احترام کیا جاتا۔ دیگر مقامات کے حج اور میلہ کے سلسلہ

Marfat.com

میں بھی حرام مہینے ہوتے تھے۔ اور اسی لیے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجتہ الوداع میں ''رجب مضر'' کا محاورہ برتا گیا ہے (۲۰) تا کہ اس کو ''رجب ربیعہ'' سے ممتاز کیا جائے، یہ غیر قریشی حرام مہینے نسبتاً کم سختی سے ملحوظ رکھے جاتے تھے، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا قریشی حرام مہینوں کو عام طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا بجز اس کے کہ طے اور خثعم کے دو ضرب المثل لٹیرے قبائل اس حرمت و امتناع کی پروا نہیں کرتے تھے۔ (۲۱) عام عربوں کے برخلاف یہ دونوں قبیلے چونکہ عیسائیت بڑی حد تک قبول کر چکے تھے، اس لیے بدوی اوہام ورواجات کی وہ پروا نہیں کرتے ہوں گے، لیکن عیسائیت اور لوٹ مار کا میل کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، قریشی مہینوں کا احترام بے شبہ اس لیے تھا کہ قریشی کاروبار اور تجارتی تعلقات بہت پھیلے ہوئے تھے اور ان کی حلیفوں کا جال بھی خوب وسیع تھا، اس سلسلہ میں محمد بن حبیب کی کتاب المحبر کا ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا۔

''ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے (شمالی عرب کے میلے دومتہ الجندل کو) جانا چاہتا، تو جب تک مضری قبائل کی سرزمین سے گزرتا رہتا تو قریشی بدرقے حاصل کرتا، کیونکہ کوئی مضری قبیلہ نہ تو کسی قریشی تاجر کو ستاتا اور نہ کسی مضریوں کے حلیف کو۔ چنانچہ قبیلہ کلب والے کسی ایسے شخص کو نہیں ٹوکتے، کیونکہ وہ قبیلہ بنی الخثعم کے حلیف تھے، اسی طرح قبیلہ طے والے بھی ان کو نہیں ستاتے، کیونکہ ان کی بنی اسد والوں سے حلیفی تھی۔''

یہ چیز دوبارہ یاد دلائی جا سکتی ہے، کہ طے اور خثعم (۲۲) والے عرب کے حرام مہینوں کی پروا نہیں کرتے تھے، مگر قریشیوں کو اس حلیفی کے باعث سال بھر ہی ان سے امن رہتا، محمد بن حبیب نے مزید برآں بیان کیا ہے۔

''اگر مسافر بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کر لیتے، تو اس پورے علاقے میں جہاں قبائل ربیعہ بستے تھے، انہیں حفاظت حاصل تھی، ...... اگر بحرین کے سوق مشقر جانا ہوتا تو قریشی خفارہ ہی حاصل کیا جاتا، ...... اگر جنوبی عرب کے سوق مہرہ کو جانا ہوتا تو بنی محارب کا بدرقہ حاصل کیا جاتا، ...... حضر موت کے سوق رابیہ کو جانے کے لیے قریش قبیلہ بنی آکل المرار کا خفارہ حاصل کرتے، اور دیگر لوگ کندہ کے آل مسروق کا۔ اس طرح ان دونوں ہی قبائل کو عزت حاصل تھی، لیکن قریشی سرپرستی کے باعث آکل المرار کو اپنے حریفوں پر

Marfat.com

فوقیت حاصل ہوگئی (۲۳)...... عکاظ عرب کا سب سے بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور وہاں قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ولیش، ضبا، مصطلق، احابیش اور دیگر قبائل آیا کرتے تھے"۔(۲۴)

اگرچہ قبہ یعنی منڈپ یا شامیانہ اور اعنہ یعنی گھوڑے کی لگاموں کے اداروں کا منشاء عرب مولفوں (۲۵) نے یہ بیان کیا ہے کہ اول الذکر کا مطلب ایک ڈیرہ لگا کر کسی عام قومی ضرورت کے لیے چندہ جمع کرنا ہوتا، اور آخر الذکر سے مراد سوارہ فوج کی افسری ہوتا، لیکن غالباً لامنس کا خیال (۲۶) درست ہے کہ اصل میں قبہ سے مطلب وہ شامیانہ ہوتا ہوگا، جو جنگ یا عید کے موقع پر قابل حمل ونقل بتوں کے اوپر سایہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا، اور اعنہ سے مراد وہ امتیاز تھا کہ کسی بت کو گھوڑے پر رکھ کر جلوس سے لے جائیں تو اس گھوڑے کی لگام پکڑے چلیں۔

مقدس شامیانے کا ذکر عرب ادبیات میں کچھ شاذ ونادر نہیں ہے، یہ باور کرنا کافی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکی سماج جس پست اور ابتدائی حالت میں تھا، اس کے باوجود وہاں سپہ سالار فوج اور سوار فوج کا افسر دو الگ الگ عہدے پائے جاتے ہوں، (۲۷) اسلام آنے کے بعد جب زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں مٹ گئیں اور چند صدی بعد جو مولف پیدا ہوئے انہیں ان چیزوں کا کوئی علم نہ ہو سکا تو ذہانت سے کام لے کر انہوں نے اکثر قدیم اصطلاحات کا منشاء ان کے لغوی معنوں کو سامنے رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی، اور چونکہ انہیں ان اصطلاحات کا پس منظر معلوم نہ تھا، اس لیے بعض وقت وہ غلطی کر جاتے تھے بہرحال ہمارے مولف بیان کرتے ہیں کہ اعنہ کا عہدہ زمانہ جاہلیت میں خالد بن الولید ہی کو وراثت میں ملا تھا، یہ استنباط غالباً اس واقعہ کی بنا پر ہے کہ احد کی لڑائی میں خالد بن الولید ہی نے مکہ والوں کے رسالہ کی قیادت کی تھی، (۲۸) لیکن احد کو چھوڑ کر بدر یا خندق یا کسی اور لڑائی میں قریش کے ساتھ گھوڑے کبھی اتنی تعداد میں نہ تھے، کہ ان کا ذکر کیا جا سکے، عرب میں گھوڑے عام طور پر تعیش ہی کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ یوں بھی قبہ اور اعنہ دونوں عہدے عرب مولفین کے بیان کے مطابق ہمیشہ ایک ہی شخص کو حاصل ہوا کرتے تھے، (۲۹) اور ظاہر ہے کہ کسی شخص کا افسر رسالہ اور افسر چندہ دونوں ہونا کوئی ایسا ضروری

Marfat.com

امر نہیں، کیونکہ یہ چیزیں لازم وملزوم نہیں ہیں۔

نظام مالیہ:

کسی مملکت کے نظم ونسق میں مالیہ کی اہمیت قدیم ہی سے رہی ہے، ذہانت کے پتلے قصیّ (۳۰) نے، کہتے ہیں مکہ والوں پر ایک سالانہ محصول لگانے کا بہت اچھا بہانہ ڈھونڈ لیا تھا کہ حج کے زمانہ میں جو غریب حجاج آئیں، ان کی خبر گیری اور بلدیہ کی طرف سے حجاج کی عام "ضیعہ" یعنی ضیافت جس کا عرب کے دیگر حصوں میں بھی وہاں کے سرداروں کی طرف سے عام رواج تھا مصارف (۳۱) میں سب مل کر حصہ لیں، جو بچت ہوتی ہوگی، اس سے یقیناً سردار کا خزانہ معمور ہوتا جاتا ہوگا۔ قصیّ کا یہ عہدہ خاندانِ نوفل (۳۲) میں متوارث ہونے لگا تھا۔ اور شاید بی بی خدیجہ کی ضرب المثل دولت بھی اسی خاندانی اندوختہ کا نتیجہ ہوگی، یعقوبی (۳۳) نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ قصیّ نے جب بعض بدعتیں اختیار کیں، اور حرم کعبہ کے قریب رہنے کے لیے عمارتیں تعمیر کرلیں، تو باہر سے آنے والے حجاج کی ناراضی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے بلدی ضیافت کی تجویز پیش کی تھی، بہرحال یہ رواج پڑ گیا تو قصیّ اور اس کے جانشین اس سے فائدہ اٹھاتے رہے، یہ محصول رفادہ کہلاتا تھا۔

قصیّ کو مال لاوارث کا بھی مستحق تسلیم کرلیا گیا تھا اور جو اجنبی مکہ میں لاوارث مر جاتے ان کا مال قصیّ ہی کو مل جاتا (۳۴)۔ شہری مملکتوں اور خاص کر میلہ کے زمانہ میں جو عشر یا محصول درآمد لیا جاتا وہ بھی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا، کہتے ہیں کہ مکہ میں زمانہ قبل تاریخ کے عمالقہ (۳۵) بھی عشر لیا کرتے تھے، جرہم اور قطورا کے دو قبیلوں نے مکہ میں مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم کی تو بھی انہوں نے شہر کے دو حصے کر کے آپس میں بانٹ لیے تھے اور جس حصہ سے جو تاجر آتا، اس کا عشر اسی حصہ والے قبیلہ (۳۶) کو حاصل ہوتا، قصیّ کے زمانہ میں اس تقسیم کی ضرورت نہ تھی، اور پورے شہر کا وہ اکیلا سردار تھا (۳۷)۔ ظاہر ہے کہ خود شہر مکہ کے باشندے محصول درآمد سے مستثنیٰ تھے (۳۸)۔ محصولِ درآمد لینے کا یہ رواج عام طور پر عرب کے دوسرے شہروں میں بھی نظر آتا ہے، اور وہ عموماً سامان کی مالیت کا ۱/۱۰ ہوا کرتا تھا (۳۹)۔ ایک مرتبہ مکہ میں سامان بلا محصول درآمد کرنے کا ایک

Marfat.com

دلچسپ واقعہ ازرقی نے بیان کیا ہے (۴۰) کہ جب ایک مرتبہ کعبہ میں آتشزدگی ہوئی، اور پھر طغیانی نے اس کو بالکل منہدم کر دیا تو مکہ والوں نے شعیبہ (جدہ) کی بندرگاہ پر طوفان میں آ کر ٹوٹنے والے ایک جہاز کو خرید لیا تھا۔ اور جہازیوں کو اجازت دی تھی کہ اپنا بچا کھچا مال مکہ لا کر بیچیں اور ان سے کوئی عشر نہ لیا جائے۔

قومی معبد پر جو چڑھاوے ہوتے، ان کی حفاظت کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک افسر کی ضرورت ہوتی (۴۱) چنانچہ یہ عہدہ جو ''اموال محجرہ'' کہلاتا تھا، موروثی طور پر قبیلہ بنی سہم میں چلا آتا تھا۔

آمدنی کا ایک اور ذریعہ جو اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی تھا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی اجنبی شخص کعبہ کی زیارت کو آتا، تو اسے یا تو کسی مکہ والے کا لباس حاصل کر کے اس میں طواف کرنا پڑتا، ورنہ اپنے غیر مقدس اور گناہ آلود لباس کی جگہ کامل برہنگی کی حالت میں یہ رسم انجام دینی پڑتی، چاہے مرد ہو کہ عورت (۴۲) اور ظاہر ہے کہ مکہ والے اپنا لباس مفت نہیں دیا کرتے تھے مکہ والوں نے بیرونی حجاج کے قیام و طعام کے لیے بھی مصارف دہندہ مہمانوں کا طریقہ رائج کر لیا تھا، اور ان کے مہمان انہیں کپڑوں کا جوڑا قربانی کا جانور یا کوئی اور چیز اس کے معاوضہ میں دیتے تو اسے حریم (۴۳) کا نام دیا جاتا تھا۔

نظام عدل گستری:

مجلس حکومت (یا مجلس شورائے عمومی) اور عدالت میں باہم فرق کرنے کی ضرورت ہے آخر الذکر کا مقصد صرف جرائم کی ذمہ داری اور دعووں میں حقوق کا تعین ہوا کرتا تھا اور بس، دیگر ممالک کی طرح عرب میں بھی پنچایت اور حکومت دونوں کے لیے ایک ہی لفظ پایا جاتا تھا، چنانچہ لفظ حکم کے معنی حکومت کرنے اور مقدمہ کا فیصلہ کرنے، دونوں کے ہیں (۴۴)۔ ہر قبیلہ کا سردار اس کا پنچ ہوا کرتا تھا (۴۵) لیکن بین القبائل جھگڑوں میں بہرحال اس کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی دو قبیلوں کے لیے اجنبی ثالث سے رجوع کریں۔ چنانچہ مختلف معبدوں کی دیوبانی یا مشہور پنچوں کے پاس لوگ اپنے مقدمے پیش کرتے، عرب میں کاہن، ہاتف، عائف، ازلام اور ایسار (۴۶) کے جو تذکرے ملتے

Marfat.com

ہیں، ان سے ہمیں ڈیلفی وغیرہ یونانی مندروں کی دیوبانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قصی کے بعد پورے شہر مکہ کے لیے کوئی واحد حاکم عدالت نہیں ہو سکا۔ جس کا باعث مختلف قبائل کی رقابتیں اور جھگڑے تھے، انہیں کے سبب سے وہ مشہور رضا کاروں کی جماعت قائم ہوئی جس کا نام حلفِ الفضول تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر اس مظلوم کی مدد کی جائے جو شہر مکہ کے حدود میں پایا جائے، چاہے وہ وہیں کا باشندہ ہو یا کوئی اجنبی، (۴۷) یہ ممکن تھا کہ حلفِ الفضول کا ادارہ ترقی کر کے ایک مستقل نظام کی حیثیت اختیار کر لیتا، لیکن جلدی ہی اسلام کا زمانہ آ گیا، جس کے باعث یہ ادارہ غیر ضروری ہو گیا، کیونکہ اسلامی حکومت نے ایک نہایت منظم مرکزی نظام عدالت قائم کر دیا، اور خود عہد نبوی میں پورا جزیرہ نما عرب اور جنوبی فلسطین اس مرکزی نظامِ عدالت کے تحت آ چکے تھے۔ (۴۸)

اسی سلسلہ میں عہدہ اشناق کا ذکر کیا جا سکتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ موروثی طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ (۴۹) اس کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے (۵۰) کہ جو کوئی ایسے جرم یا قابل ضمان فعل کا ارتکاب کرے جو قابل راضی نامہ ہو تو عہدہ دار اشناق اس بات کا تعین کرتا کہ کس پر اور کتنی مالی ذمہ داری عائد کی جائے اور پورا شہر اس کے تصفیہ کو مان لیتا، اور ملزم کا خاندان اس ہرجانہ کی ادائی کے لیے چندہ کرتا، یہ رواج اور مقاموں پر بھی تھا، چنانچہ ہجرت کے بعد ہی شہری مملکت مدینہ کا جو تحریری دستور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب اور نافذ فرمایا......اور جس کا متن ایک طویل دستاویز کی صورت میں لفظ بہ لفظ ہم تک پہنچا ہے (۵۱) اس میں بھی اس طریقہ کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ لامنس (۵۲) نے یہ مضحکہ خیز رائے کس ماخذ کی بناء پر قائم کی ہے، کہ عہدہ دار اشناق وہ ہرجانہ یا خون بہا اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔

نظامِ سفارت:

مکہ کے کشوری نظم و نسق میں ایک آخری خاصا اہم عہدہ ''سفیر و منافر'' کا ہوا کرتا تھا (۵۳)۔ کہتے ہیں کہ یہ عہدہ موروثی طور پر بنی عدی یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان میں چلا آ رہا تھا، ابن عبدربہ نے مختصر اور جامع اور مانع الفاظ میں اس کی یوں تشریح

Marfat.com

کی ہے:

''جب کبھی کوئی جنگ چھڑتی تو وہ عمر کو اپنا سفیر مختار بنا کر بھیجتے، اور جب کبھی کوئی بیرونی قبیلہ قریش کی اولیت کو چیلنج دیتا، تو اس وقت بھی عمر ہی کو بطور ''منافر'' بھیجا جاتا تاکہ قریش کی طرف سے جواب دیا جائے اور اس جوابدہی میں جو کچھ کہا جاتا، اس کو قریش مان لیتے''۔ (۵۴)

نظامِ فوج:

جنگ اور فوج کے سلسلہ میں ہمارے ماخذ مختلف موروثی عہدوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ''شامیانہ'' اور ''لگام'' کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ان کے علاوہ عقاب لواء اور حلوان النفر کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

عہدہ دار عقاب کا مطلب جھنڈا لے جانے والے سے تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ عہدہ بنی (۵۵) امیہ میں متوارث تھا۔ بظاہر یہ وہ عہدہ دار تھا جو حالتِ امن میں قومی جھنڈے کا متولی و نگہبان ہوا کرتا تھا، اور ضرورت کے وقت اس کو اپنی نگرانی میں لہراتا تاکہ فوجی اجتماع عمل میں آسکے، ورنہ کسی مہم اور عین معرکہ کارزار میں علم برداری کے فرائض کسی اور کے بھی سپرد کیے جا سکتے تھے (۵۶)۔

ہمارے مولف (۵۷) عقاب اور لواء میں فرق کرتے ہیں، اگرچہ دونوں کے معنی جھنڈے ہی کے ہیں، لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ہر ایک ایک علیحدہ قبیلہ میں موروثی طور سے چلا آتا تھا۔ ممکن ہے عقاب سے مراد جنگی قومی جھنڈا ہو، اور لواء قبائلی جھنڈا ہو جس کا استعمال اس وقت ہوتا ہو، جب کہ قریش کے ساتھ دیگر حلیف قبائل بھی مہم میں شریک ہوں۔

ابن عبدربہ نے اپنے اس تذکرہ کو ایک عجیب و غریب عہدہ پر ختم کیا ہے، جس کا بیان ہمیں کسی دوسرے مولف کے ہاں نہیں ملتا۔

''حلوان النفر (فوجی اجتماع کا معاوضہ) چونکہ (مکہ کے) عربوں پر زمانہ جاہلیت میں کوئی منفرد بادشاہ حکمرانی نہیں کرتا تھا، اس لیے جب کبھی کوئی جنگ ہوتی تو

Marfat.com

وہاں والے اپنے قبائلی سرداروں میں قرعہ ڈالتے اور کسی ایک کا انتخاب کرتے، چاہے وہ کمسن ہو یا بڑی عمر کا، چنانچہ یوم فجار کی لڑائی کے موقع پر بنی ہاشم کی باری تھی، اور قرعہ میں حضرت عباس نکلے جو اس وقت بچہ تھے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کو ایک ڈھال پر بٹھایا اور اٹھا لے گئے''۔(۵۸)

مگر یہ توضیح کچھ دل کو نہیں لگتی۔ میرا خیال ہے کہ حلوان النفر سے مراد یہ فریضہ تھا، کہ اگر کسی مہم کے موقع پر کوئی شہری لڑائی میں حصہ لینے سے قاصر رہتا ہو، تو اس کو اجازت تھی کہ اپنا بدل کسی اور شخص کو روانہ کرے۔ (۵۹) ممکن ہے کہ اس اجازت اور بدل کا انتخاب اور اس کا معاوضہ اور ہتھیار اور سامانِ سفر کی فراہمی کی نگرانی حلوان النفر کے عہدہ دار کے فرائض میں داخل ہو، ورنہ اجتماع کے معاوضہ اور بادشاہ اور فوج کی سپہ سالاری میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

یہاں اس بات کا موقع نہیں ہے کہ قریش کے فوجی نظام (۶۰) اور قانونِ جنگ و ناطرفداری کے اصول و نظائر کی تفصیل دی جائے۔ یہاں صرف ایک سرسری اشارہ چند چیزوں کی طرف کیا جاتا ہے۔ ''مرباع'' سے مراد مالِ غنیمت کا چوتھا حصہ ہوتا تھا، جو مہم کے سردار کو ملتا، باقی تین چوتھائی عام سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ ''فضول'' سے مراد نا قابلِ تقسیم کسرات ہوتے تھے۔ ''نشیطہ'' سے مراد وہ مالِ غنیمت تھا، جو دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے حاصل ہو، اور ''صفی'' سے مراد وہ منتخب چیز مثلاً کوئی تلوار وغیرہ ہوتی تھی جو مالِ غنیمت کی تقسیم سے پہلے مہم کا سردار اپنے لیے چن لینے کا مجاز ہوتا تھا، اور مرباع، فضول، نشیطہ اور صفی وہ امتیازات تھے جو کسی قبائلی لوٹ مار کی مہم کے قائد کو حاصل ہوتے تھے۔(۶۱) راس الحجر الخشنی، القعقاع التمیمی، اور زرار بن الخطاب الفہری کا ذکر ابن درید (۶۲) نے ان لوگوں کی فہرست میں کیا ہے جنہیں زمانہ جاہلیت میں مرباع لینے کا حق حاصل ہوتا تھا۔

یہاں لامنس (۶۳) کے ان تمام دلائل کی نقل کی جانی ممکن نہیں جو اس نے اپنے دلچسپ دعویٰ کی تائید میں پیش کیے ہیں کہ مکہ والوں نے حبشی غلاموں اور تنخواہ یاب نوکروں کی ایک مستقل فوج قائم کر رکھی تھی۔ اس کے مقالے میں کافی حوالے دیے گئے ہیں لیکن

Marfat.com

اس قابل مگر بدقسمتی سے بے حد متعصب اور غیر ہمدرد یسوعی (Jesuite) پادری کا منشاء اس پوری کاوش سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ قریش ایک نہایت بزدل قوم تھی جو لڑائی سے جی چراتی تھی، لیکن چونکہ اس کے تجارتی مفادات بہت پھیلے ہوئے تھے، اس لیے اپنے مواصلات کی حفاظت کے لیے انہیں قوت کی ضرورت تھی، اس لیے انہوں نے غلاموں اور تنخواہ یاب لوگوں کی ایک فوج قائمہ مکہ میں تیار کر لی تھی۔ نپولین جیسے فاتح کو ابتدائی مسلمانانِ مکہ کی عظیم الشان فوجی فتوحات (۶۴) پر رشک آتا تھا۔ (۶۵) تو محض ایک متعصب یسوعی پادری کا خالد بن الولید، سعد ابی وقاص اور ابو عبیدہ جیسے مکہ والوں تک میں کسی بہادری کا نظر نہ آنا شپرہ چشمی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

سماجی نظام:

یونان والے اجنبیوں کو ''بار بار'' یعنی بربریت پسند کہتے تھے، اور یونانی زبان میں دشمن کے لیے جو لفظ پایا جاتا ہے۔ اس کے لیے لغوی معنی بھی اجنبی ہی کے ہیں (۶۶) اس کے برخلاف عرب اجنبیوں کا ذکر کرنا چاہتے تو ''عجمی'' کی بے ضرر اصطلاح استعمال کرتے جس کے لغوی معنی ہیں ''گونگا'' تا کہ اجنبیوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر لیں، چنانچہ لفظ عرب کے معنی فصیح اور من چلا، اس کے باوجود عرب میں بھی اور یونان میں بھی ہر جگہ اجنبی آتے رہتے، بلکہ بستے بھی رہتے۔

یونان میں وہ اجنبی جو وہاں آ کر مقیم ہو جاتے تھے، شہریوں اور غلاموں کے بین بین ایک خاص طبقہ قائم کرتے تھے۔ ان کو اصطلاحاً میٹک Matic کہا جاتا تھا۔ (۶۷) یہ لوگ اور ان کے خاندان ان تمام حقوق سے مستفید ہوتے تھے، جو شہریوں کو حاصل تھے، البتہ انہیں نہ تو کوئی سرکاری عہدہ مل سکتا اور نہ وہ شہری انتخابات میں کوئی رائے دے سکتے، اور نہ کسی اراضی کے مالک ہی ہو سکتے، ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ ضروری ہوتا کہ کسی شہری کو اپنا سرپرست بنائیں جو ان کے چال چلن کی ذمہ داری لے، ان کو سالانہ فی کس براہ راست بارہ درہم مرد کے لیے اور چھ درہم غیر شادی شدہ عورت کے لیے محصول بھی دینا پڑتا۔ ان چیزوں کو چھوڑ کر اور باتوں میں انہیں شہریوں کی برابری حاصل ہوتی تھی۔

چنانچہ وہ اپنی مسکونہ شہری مملکت کی فوج میں شریک ہو کر جنگ کر سکتے تھے اور اس کی تمام مذہبی پبلک تقریبوں میں حصہ لے سکتے تھے۔ (۶۸) عرب میں جو اجنبی آ کر سکونت گزین ہو جاتے ان کو "مولا" کا نام دیا جاتا تھا، عرب اور خاص کر مکہ والوں کے موالی کے ساتھ یونان کے مقابلہ میں کم سختی کا سلوک ہوتا تھا۔ چنانچہ ان پر کوئی خصوصی محصول عائد نہیں کیے جاتے تھے۔ ان کو اور ان کے سرپرستوں کو جملہ شہری حقوق حاصل رہتے تھے۔ مساوات کی حد یہ تھی کہ اجنبی اور اس کے سرپرست دونوں کے لیے ایک ہی لفظ مولا استعمال کیا جاتا تھا۔ البتہ یہ تحدید بداہتہً پائی جاتی تھی کہ کوئی اجنبی متوطن کسی اور نئے اجنبی کو اپنا مولا بنانے اور اپنی سرپرستی میں لینے کا مجاز نہ تھا۔ اس پابندی سے قطع نظر ہر اجنبی متوطن اپنے سرپرست کے خاندان کا ایک رکن بن جاتا اور اسے وہ سب حقوق حاصل رہتے جو کسی اصلی شہری کو حاصل تھے۔ البتہ کسی نئے اجنبی کو اپنی پناہ میں لینے سے پہلے اسے خود اپنے سرپرست کی اجازت ضروری ہوتی۔ (۶۹) اصل میں عرب یہ چاہتے تھے کہ اوروں کو اپنا لیں، اور عرب بنا ڈالیں (۷۰)۔ اس کے برخلاف یونانیوں کو ان کے فلاسفہ نے کہہ رکھا تھا کہ قدرت ہی کا یہ منشاء ہے کہ اجنبی یونانیوں کے غلام بنیں۔ (۷۱) مزید براں یونان میں:

"کسی سیاسی وحدت کے ارکان میں اتحاد ابتداً اس لیے ہوتا تھا، کہ وہ ہم جد ہوتے تھے، اور ہم مذہب ہوتے تھے، وہاں کا سماج برادریوں میں بٹا ہوا تھا، یعنی رشتہ دار خاندانوں کے گروہ الگ الگ وحدت بناتے تھے، اور یہ تمام برادریاں ایک مزعومہ ہم نسبی کے باعث ایک بزرگ تر اتحاد میں شامل ہو جاتی تھیں جسے قبیلہ کہا جاتا تھا، خون کا رشتہ مذہبی رشتہ کے باعث مستحکم تر ہو جاتا تھا۔ (۷۲)

مکہ کا اندرونی نظام اس سے بہت زیادہ پیچیدہ تھا۔ کیونکہ وہاں حسب ونسب کو غیر معمولی سماجی اہمیت حاصل تھی۔ ہر قبیلہ میں ہر دس دس آدمیوں پر ایک "عریف" ہوا کرتا (جس طرح روما میں Decurion) اور کہتے ہیں کہ ہر سو کا سردار قائد کہلاتا تھا۔ (جس کا مماثل روما میں Conturion ہو سکتا ہے) وہاں قبیلہ بطن، فخذ، شعب (۷۳) وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم وتقسیم پائی جاتی تھی جن کی تفصیل عرب مولفین کے حوالہ سے وستن فیلڈ

Marifat.com

نے اپنی جرمن کتاب "جدولہا سے نسب عرب کے" اشاریہ کے دیباچہ میں بھی دی ہے۔

اسلام سے پہلے مکہ والوں میں مذہبی وحدت نہیں پائی جاتی تھی۔ اسی طرح وہاں کوئی مقدس کتاب یعنی تحریری قانون بھی نہیں پایا جاتا جس کی تعمیل سب کرسکیں۔ چنانچہ مکہ والوں میں بت پرست، مشرک، ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے والے، خدا کو نہ ماننے والے، بلکہ خود لامذہب اور دہریے بھی پائے جاتے تھے، ان کے علاوہ مجوسی، یہودی یا عیسائی مذہب بھی مختلف لوگوں نے اختیار کرلیا تھا، بہرحال وہاں کے عوام تمدن کے اس درجہ تک ضرور پہنچ چکے تھے، کہ ایک مشترک اور سب سے بڑے خدا کو بھی مانیں، جو چھوٹے چھوٹے قبائلی دیوتاؤں سے بھی بزرگ و برتر ہو، اور اس کو وہ اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔

سیاسی شعور بھی اس حد تک ترقی کرگیا تھا کہ ہر شخص مملکتی مفاد کو شخصی مفاد پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ جب غیر متوقع طور پر مکہ والوں کو غزدۂ بدر میں شکست ہوئی تو انہوں نے اس قافلہ کا پورا منافع (جو عین اسی زمانہ میں شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں واپس آیا تھا، اور جس میں شہر میں بسنے والے تقریباً ہر قبیلے کا سرمایہ لگا ہوا تھا) جنگی تیاریوں کے چندے میں دے دینا منظور کرلیا۔ (۴۷)

مکہ والے اپنے نوزائیدہ بچوں کو کسی صحرا میں بدویوں کے ہاں بھیج دیا کرتے تھے جہاں وہ بدویوں کے ہاتھوں پرورش پاتے تھے، صحرا کی پاک وصاف اور سادہ زندگی میں پلتے تو ان میں بدویوں کی بہت سی خوبیاں آجاتیں اور شہریوں کی مخلوط آبادی کی بہت سے برائیوں سے وہ بچپن کی تاثر پذیر عمر میں محفوظ رہتے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ابتدائی زندگی کے چند سال اسی طرح گزارے تھے، یہاں مماثلت کے لیے ان قوانین کی یاد تازہ کرائی جاسکتی ہے جو مثلاً لائیکرگس نے یونان کے شہر اسپارٹا میں نافذ کیے تھے اور جو اگرچہ انتہائی وحشیانہ تھے مگر ان کا منشاء بھی نئی نسلوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت ہوتا تھا۔

کہتے ہیں کہ یونانی طبیعت کی امتیازی خصوصیت علم کی محبت تھی، جس طرح کہ فینیقیہ اور مصر والوں کا امتیازی خاصہ دولت کی محبت تھا۔ (ہندوستان میں بھی لکشمی یعنی

Marfat.com

روپے کی اب بھی باقاعدہ پوجا ہوتی ہے)۔اس کے برخلاف قریش یعنی باشندگانَ مکہ کی امتیازی خصوصیت فنونِ لطیفہ اور ادبیات کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہی فن نوازی تھی کہ عتبہ بن ربیعہ ابن عبدشمس نے مکہ میں ایک دارالقواریر (شیش محل Crystal Palace) تعمیر کیا تھا۔(۷۵) شعروشاعری ان کا اوڑھنا بچھونا ہو چلا تھا۔ چنانچہ بیت، مصرع، اسباب، اوتاد، فواصل کسی ڈیرے اور اس کے مختلف اجزاء کے بھی نام تھے اور بیت اس کے مختلف حصوں کے بھی۔

زندگی کا مقصد یونانی فلسفیوں کی نظر میں دنیاوی آرام تھا۔(۷۶) یہاں شاید قرآنی آیتوں کا حوالہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس میں اسلام سے پہلے کے عربوں کا مقصدِ زندگی اور خود اسلامی تصورحیات اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے:

''ان میں سے چند ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس دنیا میں بھلائی عطا کر، ان کو آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا لیکن ان میں سے بعض اور ایسے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو اس دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی اور ہم کو آتش دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ، ان کو ان کی کمائی کا حصہ ملے گا۔ خدا حساب وکتاب لینے میں بہت تیز ہے۔''(۷۷)

حواشی

(۱) تاریخ طبری ص ۱۰۹۴

(۲) دیکھیے سیرۃ نبوی کی کسی بھی کتاب میں فتح مکہ کے حالات

(۳) قرآن مجید ۹/۱۹

(۴) پالمیرا کے کتبوں پر شابو کی فرانسیسی کتاب ص ۳۰ بحوالہ مکہ مولفہ لامنس

(۵) العقد الفرید ۲/۴۶

(۶) قرآن مجید ۲/ ۱۵۸

(۷) قرآن مجید ۲۲/ ۲۹

(۸) سیرۃ ابن ہشام ص ۶، ومابعد

Marfat.com

(۹) نسی یعنی قمری مہینوں کو کبیسہ کر کے شمسی بنانا، عہد نبوی کی تاریخ پر جو اہم عملی اثرات ڈالتا ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا انگریزی مضمون ''اسلام کے سیاسی تعلقات ایران میں''۔ اس موضوع پر عام معلومات کے لیے دیکھیے محمود آفندی کا (جو بعد میں محمود پاشا فلکی کے نام سے مشہور ہوئے) (تحقیقی مقالہ فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۹ تا ۹۲ بعنوان ''عربی کیلنڈر پر ایک یادداشت''۔ یہ مقالہ عربی میں بھی چھپا ہے، موبرگ کا جرمن زبان میں جامعہ لونڈ واقع سوئیڈن میں چھپا ہوا مقالہ بعنوان ''نسی اسلامی روایت میں'' حوالوں اور اس موضوع پر شائع شدہ مقالوں و کتابوں کی تفصیل کے لیے مفید ہے۔

(۱۰) عام طور سے قلمس اس شخص کا لقب سمجھا جاتا ہے جس نے عرب میں کبیسہ سال رائج کیا لیکن محمد بن حبیب نے کتاب المحبر (مخطوطہ برٹش میوزیم) میں قلامسہ بصیغہ جمع بھی استعمال کیا ہے۔

(۱۱) یہ قلمس کا مترادف ہے دیکھیے لسان العرب تحت کلمہ قلمس

(۱۲) قرآن مجید ۲/ ۱۹۸

(۱۳) دیکھیے قرآن مجید ۹/ ۳۶ کی تشریح کسی تفسیر وغیرہ میں

(۱۴) دیکھیے لامنس کا مضمون ''مکہ کا فوجی نظام'' فرانسیسی رسالہ ژورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء

(۱۵) ازرقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۷، سیرۃ ابن ہشام ص ۲۸۲، طبقات ابن سعد ۱/ ۱، ص ۱۴۵

(۱۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۶، قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ ''البسل''

(۱۷) طبقات ابن سعد ۱/ ۲، ص ۴۹

(۱۸) جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے گورنر عمرو بن حزم کو جو ہدایت نامہ دیا تھا (متن کے لیے دیکھیے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۱ نیز قرآن مجید ۹/ ۳ کی تشریح تفسیر طبری میں) اس میں حج اصغر اور حج اکبر کی تشریح کی گئی ہے۔

(۱۹) ایضاً

(۲۰) خطبہ الوداع کے لیے دیکھیے سیرۃ ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۷۰، تاریخ طبری ص ۱۱۵۳ تا ۵۵، تاریخ یعقوبی ۲/ ۱۲۲ تا ۲۳، جاحظ کی البیان والتبیین ۲/ ۲۴ تا ۲۶، ابن عبد ربہ کی العقد الفرید باب خطب وغیرہ۔

Marfat.com

(۲۱) تاریخ یعقوبی ۱/۳۱۳ تا ۳۱۴، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۶

(۲۲) کوئی حیرت نہ ہو کہ ایک خشمی ہی نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ابرہہ نے اصحاب الفیل کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کرنی چاہی تو یہ اس کی رہنمائی کرے۔ دیکھیے ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۷۸

(۲۳) اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو **Clinder** کی کتاب **The Kings of Kinda of the family of Akilal marar** مطبوعہ جامعہ لونڈ واقع سوئیڈن ۱۹۲۷ء

(۲۴) ابن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب مخطوطہ برٹش میوزیم

(۲۵) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵

(۲۶) لامنس کا مضمون ''بت خانے اور مذہبی جلوس زمانہ جاہلیت کے عربوں میں'' جو اس کی فرانسیسی کتاب ''مغربی عرب'' میں بھی چھپا ہے۔

(۲۷) بہرحال یونان کے شہر اثینہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ''وہاں دس سالاران فوج ہیں، ہر ایک ایک قبیلہ کے لیے......، اور ہر ایک اپنے قبیلہ والوں کی سالاری کرتا ہے اور ان کی پلٹنوں کے افسر مقرر کرتا ہے، اسی طرح وہاں دو سالاران رسالہ پائے جاتے ہیں جن کا انتخاب تمام شہری مل کر کرتے ہیں اور جو سوار فوج کی سالاری کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے تحت پانچ پانچ قبائل (کے سوار) ہوتے ہیں'' دیکھیے ارسطو کا دستور اثینیہ ترجمہ انگریزی ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

(۲۸) حقیقت میں دائیں جانب کے رسالہ کی قیادت خالد بن ولید نے کی تھی اور بائیں جانب کے رسالہ کے عکرمہ بن ابی جہل نے، دیکھیے سیرۃ ابن ہشام ص ۵۶۱

(۲۹) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۷

(۳۰) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۳، تاریخ طبری ص ۱۰۹۹، طبقات ابن سعد ۱/۱ ص ۴۱، جغرافیہ یاقوت تحت کلمہ مکہ۔

(۳۱) محمد بن حبیب کی کتاب المحبر باب اسواق العرب، مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۱ تا ۱۶۶۔

(۳۲) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/۴۵۔

(۳۳) تاریخ یعقوبی ۱/۲۷۵ تا ۲۷۶۔

(۳۴) بلاذری کی انساب الاشراف بحوالہ مکہ مؤلفہ لامنس ص ۴۴۔

(۳۵) دیکھیے منائح الکرم بحوالہ مراۃ الحرمین ۱/۶۹

Marfat.com

(۳۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۷۲، ازرقی کی اخبار مکہ ص ۴۷، کتاب الاغانی ۱۳/ ۱۰۸۔

(۳۷) طبقات ابن سعد ۱/ ۱ ص ۳۹

(۳۸) ایضاً

(۳۹) محمد بن حبیب اور مرزوقی کی مذکورہ بالا کتابوں میں باب اسواق العرب

(۴۰) مرزوقی کی اخبار مکہ ص ۱۰۶ تا ۷

(۴۱) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۶

(۴۲) قرآن مجید ۷/ ۳۱ کی تشریح کسی تفسیر میں خاص کر تفسیر طبری ۷/ ۱۲۰

(۴۳) ابن دُرید کی کتاب الاشتقاق ص ۱۷ تا ۲۷

(۴۴) تفصیلات کے لیے دیکھیے مجلہ عثمانیہ جلد (۱۱) میں مضمون ''عدل گستری ابتدائے اسلام میں''

(۴۵) دیکھیے تاریخ یعقوبی ۱/ ۳۰۰

(۴۶) محمد بن حبیب نے کتاب المحبر میں ایک پورا باب عربی دیوانی کے طریقہ کی تفصیل پر دیا ہے

(۴۷) سیرۃ ابن ہشام ص ۶۵ تا ۶۶ سہیلی کی الروض الانف ۱/ ۹۰ تا ۹۴، طبقات ابن سعد ۱/ ۱ ص ۴۲، مسند ابن حنبل ۱/ ۱۹۰

(۴۸) تفصیل کے لیے دیکھیے مجلہ عثمانہ جلد (۱۱) یا اسلامک کلچر اپریل ۱۹۳۷ء میں مضمون 'عدل گستری ابتدائے اسلام میں' اول الذکر زیادہ مفصل ہے۔

(۴۹) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵

(۵۰) ایضاً

(۵۱) متن کے لیے دیکھیے سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴، ابوعبید کی کتاب الاموال ص ۵۱۷، ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ۳/ ۲۲۴ تا ۲۲۶ وغیرہ اور عام تحلیل کے لیے مجلہ طیلسانئن جولائی ۱۹۳۹ء میں مضمون ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور''۔

(۵۲) لامنس کی کتاب مکہ ص ۶۷ تا ۶۸

(۵۳) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۵

(۵۴) ایضاً (۵۵) ایضاً (۵۶) ایضاً (۵۷) ایضاً

(۵۸) ابن عبدربہ کی العقد الفرید ۲/ ۴۶

(۵۹) سیرۃ ابن ہشام وغیرہ میں جنگ بدر کے سلسلہ میں ابولہب کا اپنی جگہ کسی اور کو بھیجنا اور دیگر

Marfat.com

مواقع پر دیگر تغائر کا پیش آنا مروی ہے۔

(۶۰) اس نظام کی چند تفصیلوں کے لیے دیکھیے مسعودی کی التنبیہ والاشراف ص ۲۷۵ تا ۱۸۰

(۶۱) مرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۲/۲۳۰

(۶۲) کتاب الاشتقاق ص ۶۴، ۱۴۵، ۳۱۸

(۶۳) لامنس کا مضمون ''احابیش اور مکہ کا فوجی نظام قرن ہجرت کے وقت'' فرانسیسی رسالہ زورنال آزیاتیک ۱۹۱۶ء نیز اسی مولف کی فرانسیسی کتاب ''مغربی عرب'' ص ۲۳۷ تا ۹۳ میں۔

(۶۴) دیکھیے اوپر اس مضمون کی تمہید میں۔

(۶۵) دیکھیے نپولین کی نوشتہ فرانسیسی یادداشت، جزیرہ سینٹ ہیلینا ۲/۱۸۳

(۶۶) انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس کی جلد اول کا دیباچہ نیز **F. Roth** کا جرمن مضمون لفظ بار بار کا مفہوم اور استعمال مطبوعہ نورمبرگ ۱۸۱۴ء۔

(۶۷) ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۱۲۴۔

(۶۸) انسائیکلوپیڈا آف سوشل سائنس جلد اول کا دیباچہ فصل ''شہری مملکت کا تسلط''

(۶۹) سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۱، تاریخ طبری ص ۱۲۰۳

(۷۰) تفصیلات کے لیے دیکھیے حمید اللہ کی فرانسیسی کتاب ''اسلامی سیاست خارجہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں'' ۱/۷۴

(۷۱) ارسطو کی کتاب سیاسیات ۶۱۲/۱ جس کا حوالہ لارنس نے اپنی انگریزی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول'' میں بھی دیا ہے۔

(۷۲) ہیالیڈے کی مذکورہ بالا کتاب ص ۱۱۰۸ تا ۹۔

(۷۳) یہ اصطلاحات جسم انسانی کے مختلف اعضاء کے بھی نام ہیں اور شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''بنی آدم اعضائے یکدیگرند''

(۷۴) سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵۵، طبقات ابن سعد ۲/۱، ص ۲۵، و مابعد

(۷۵) بلاذری کی فتوح البلدان مطبوعہ مصر، ص ۶۳، ۶۴

(۷۶) ارسطو کی کتاب ''سیاسیات'' ۱/۳۱۲۔

(۷۷) قرآن مجید ۲۰۰ تا ۲/۲۰۲

(معارف - اعظم گڑھ، فروری ۱۹۴۲ء)

Marfat.com

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں

یہ مقالہ انجمن طیلسانیین (گریجوئیس) جامعہ عثمانیہ کی تیسری سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ اگر چہ رسالہ اسلامک کلچر (حیدر آباد) میں چھپ رہا ہے لیکن اس اصل میں اس کے بعد متعدد چیزیں بڑھائی گئی ہیں۔ (م ح ا)۔

حیدر آباد کی مجلس وضع قوانین (۱) کے ضابطے اور عدالت عالیہ کے متعدد فیصلوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ممالک محروسۂ سرکار عالی (حیدر آباد) کی عدل گستری کے اصول کو بہتر طور سے سمجھنے کے لیے ہمیں اسلامی عدل گستری کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلام پہلے عرب سے شروع ہوا۔ عرب اپنی جاہلیت کے زمانے میں بھی عدل گستری کو جو اہمیت دیتے تھے اس کی شاہد ولہاوزن کے الفاظ میں (۲) خود ان کی زبان ہے جس میں "حکومت کرنے" اور "مقدمے کا فیصلہ کرنے" کے لیے ایک ہی لفظ (حکم) پایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کا اگر واحد نہیں تو سب سے بڑا مقصد اور فریضہ عدل گستری سمجھا جاتا تھا۔

یاداؤد انّا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق

اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں نائب بنایا ہے اس لیے لوگوں میں
حق طور سے فیصلے کیا کر۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دیگر ممالک میں بھی عدل گستری کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ (۳) اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسے

انسانیت کا عین اقتضا اور "خدا کی نیابت" کا پہلا فریضہ قرار دیا۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ حق رسانی میں مدد دینے کیلیے بن بلائے بھی آگے بڑھنا اور اپنے معلومات کی حد تک سچ سچ گواہی دینا ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔ (۴)

قدیم عربوں کے پاس عدلیہ اور تنفیذیہ کے ادارے تو تھے لیکن تشریعۃ (یعنی ادارۂ قانون سازی) نہ تھا۔ یہ کمی اسلام نے آ کر پوری کی جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ عرب میں عدلیہ اور تنفیذیہ اگرچہ تھے لیکن بہت ہی ابتدائی حالت میں۔ ان میں اسلام نے جس کی تحریک سنہ ۱۳ ق/ھ ۶۱۰ء میں شہر مکہ میں شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کے اغراض اور ضرورتوں کے لیے اصلاح و ترمیم کی اگرچہ بعض قدیم چیزیں جو بُری نہ تھیں برقرار رہیں۔ خود رسول کریم کا ارشاد ہے کہ "اسلام میں زمانہ جاہلیت کی اچھی چیزوں پر عمل کیا جائے گا"۔ (۵)

اسلام سے پہلے عرب میں جو عدالتی نظام تھا اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس ادارے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو خاص شہر مکہ میں قائم کیا گیا تھا۔ جرہمی دَور میں اس کا آغاز ہوا مگر اس وقت کی زیادہ تفصیلیں ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ حرب فجار کے بعد اس ادارے کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کی حلف گیری کے ابتدائی جلسے میں اس ہونہار نوعمر نے باوجود کم سنی کے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا تھا جسے کچھ دنوں بعد دنیا پیغمبر اسلام کے محترم نام سے جاننے لگی۔ اس "حلف الفضول" میں ایک رضا کار جماعت شریک ہوئی جس کا مقصد حدود شہر میں ہر مظلوم کی خواہ وہ شہری ہو یا کہ اجنبی۔ مدد کرنا اور اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک ظالم حق رسانی نہ کرے۔ (۶)

نبوت ملنے کے بعد بھی آنحضرت اس جماعت کے کام میں فاعلانہ حصہ لیتے (۷) اور اس پر فخر کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس "حلف الفضول" کی دہائی سے بڑے بڑے سرکش گھبراتے تھے۔ اور اس رضا کار جماعت نے جس نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے وہ عہد بنی امیہ کی ابتدا تک انجام دیتی رہی۔ نئے ارکان کے بھرتی نہ کیے جانے کے باعث ابتدائی ارکان کے مرجانے پر یہ ادارہ آخر برخاست ہوگیا۔

Marfat.com

یہ تو غیر معمولی اور خصوصی طریقہ تھا۔ معمولی اور عام طور سے انصاف ستانی اور فیصلہ یابی کے ملک میں تین مسلمہ طریقے تھے:

(۱) سب سے پہلے قبیلہ داری پنچ تھے۔ جب باہمی گفت وشنید سے معاملہ طے نہ ہوتا تو مستغیث اور ملزم یا مدعی اور مدعا علیہ ان قبیلہ داری پنچوں کے سامنے حاضر ہوتے جن کا فیصلہ قطعی ہوتا۔ اور بہت سی صورتوں میں جرم کو اصطلاحی الفاظ میں ''دفن'' کر دیا جاتا (۸)۔ اور پھر اسی بنیاد پر انتقام طلبی جائز نہ ہوتی۔

(۲) اگر اندرونی طور سے یوں فیصلہ نہ ہوسکتا اور خاص کر اگر کسی قبیلے کی الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں جھگڑا ہوتا تو کاہنوں سے رجوع کیا جاتا۔

''کاہن'' (۹) عبرانی زبان میں اور یہودیوں کے ہاں عبادت گاہوں کے منتظم کو کہتے ہیں۔ ابتداً لوگ ان مذہبی پیشواؤں کی غیر جانبداری اور بے لاگ فیصلوں کی توقع میں ان سے رجوع کرتے ہوں گے۔ یہ عرب کاہن بھی یونانی مندروں کے پجاریوں کی طرح عموماً ذومعنی اور مسجع مقفی عبارت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ غالباً یہ صحیح نہیں کہ عرب کے کاہن سب کے سب یہودی رہے ہوں۔ بہر حال عرب میں کچھ لوگ غیب دانی کے مدعی پائے جاتے تھے ان کو کاہن کہا جاتا تھا۔ مشکل مقدموں میں ان سے رجوع کیا جاتا اور پرانے قصوں کے مطابق بعض وقت وہ فریقین سے ایک لفظ سنے بغیر صحیح صحیح فیصلہ گنگنانا شروع کر دیتے (۱۰)۔ ان فیصلوں کی عدم تعمیل پر کسی قوت تنفید یہ کے تدارک کی عدم موجودگی کے باوجود لوگوں کے توہمات ہی تہدید کا کام دیتے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ ''کاہن'' کے تحت لکھا ہے کہ ''اپنی خانگی حیثیت میں کاہن خاص کر جھگڑوں اور ہر طرح کے قانونی مسائل میں فیصلہ کنندوں کا کام دیتے۔ غرض ''کاہن'' اور ''حکم'' کے تصورات باہم بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں (الحطیہ نظم ۱۷ بیت ۷۔ نیز الابشیہی مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۳۲۱ھ ج ۲ ص ۷۳)۔ ان کے فیصلوں کو ایک طرح خدائی فیصلہ سمجھا جاتا جن کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہوسکتا۔'' (۱۱)

کہتے ہیں کہ یہ لوگ رنگین لباس نہیں پہنا کرتے تھے (الكاهن لا يلبس المصبغ). (۱۲)

Marfat.com

زمزم کا چشمہ دریافت کرنے کے بعد اس کی ملکیت کا تصفیہ کرانے کے لیے عبدالمطلب اور دیگر مکے والے ایک کاہن کے پاس گئے تھے۔ عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت مانی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیر معلوم کرنے کے لیے بھی ایک کاہنہ عورت ہی سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس قسم کی نظیریں بکثرت عربوں کی تاریخ جاہلیت میں مل سکتی ہیں۔

(۳) تیسرا اور شاید سب سے اہم ادارہ ''تحکیم'' کا تھا۔ عامر بن الظرب العدوانی کے پاس عربستان کی ہر جگہ سے تحکیم کے لیے مقدمے اس کی عمر بھر آتے تھے۔ (۱۳)

قبیلہ تمیم کے سرداروں کا موروثی طور پر پورے عرب کا حکم ہوا کرتا۔ عربیات کا ہر طالب علم جانتا ہے (مثلاً مرزوقی جلد۲، ص ۱۶۷) بازار عکاظ میں تو کثرت کار کے باعث دو سردار ہونے لگ گئے تھے جن میں سے ایک خالص عدالتی کام کے لیے مخصوص تھا (نقائض جریر و فرزدق ص ۴۳۸)۔ یہ سردار سال میں ایک بار کسی بڑے میلے مثلاً عکاظ میں جاتے اور اس جگہ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات کو بن کر فیصلہ کرتے۔ لوگ ان ''عدالتوں'' کے اجلاس کے انتظار میں رہتے اور دُور دُور سے آتے (نقائض جریر ص ۱۳۹) علاوہ اور مسائل کے قرض کے مقدمات کی بھی یہاں نظیر ملتی ہے (کتاب الاغانی ۱۹/۷۴) یہاں جگ ہنسائی کا خوف اور حکم کے پس پشت پورے میلے کی اخلاقی قوت، تہدید کا کام دیتی۔ ان موروثی حکموں میں سے چند کا ذکر ابو عبید وغیرہ نے کیا ہے۔ (۱۴)

اور ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ (۱۵) غیلان بن سلمہ ثقفی کی عادت تھی کہ ایک دن اپنے ذاتی معاملات پر توجہ کرتا، ایک دن شعر شاعری کے علمی جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن ''حکم'' بن کر جھگڑے چکاتا۔ قبیلہ داری حکم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ خود شہری مملکت مکہ کے دس اداروں میں سے ایک حکم کا بھی تھا۔ (۱۶) وقتی طور پر بھی کسی کو حکم بنایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قصی اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک فرد شداخ کو حکم بنایا گیا تھا۔ (۱۷) زمانہ جاہلیت کے ان حکموں میں ایک نے مقدمے کی سماعت اور فیصلے کی غرض سے اپنے لیے لکڑی کا ایک تخت نشست گاہ کے طور پر بنایا تھا جس پر سائبان یا چتر کے طور پر لکڑی ہی کا ایک قبہ تھا۔ اس لیے اس کو ذو الاعواد (لکڑیوں والا) کہنے لگے۔ (۱۸) لیکن یہ

خصوصی صورت ہے ورنہ عام طور پر حکم کمبل اوڑھے، عمامہ باندھے اور شاید کسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے فیصلہ صادر کیا کرتے تھے۔ (۱۹)

''منافرت، مفاخرت، میراث، چشموں کی ملکیت، خونی مقدمات'' غرض ہر قسم کے مسائل میں ان حکموں سے رجوع کیا جاتا۔ (۲۰) عرب میں بنو الدیان کا ایک قبیلہ بھی تھا۔ ان کے جد اعلیٰ کو بھی عدل گستری سے ضرور کوئی تعلق رہا ہوگا۔

یہ تو اس زمانے کا ذکر ہے جب عرب میں اسلام شروع ہونے کو تھا یہ نظام بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا لیکن خود اس حالت تک پہنچنے کے لیے بھی عرب میں کم و بیش وہی ارتقا عمل میں آیا ہوگا جو اور ملکوں میں۔ یعنی فطری احساس مدافعت نے شروع میں خود انتقامی کی بجھائی ہوگی جس میں ملزم ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار بیٹے بھائی وغیرہ سے بھی بدلہ لیا جاتا تھا۔ (اس سلسلے میں جنگ تغلب کی نظیر سے کون واقف نہیں) اس کے بعد اندرون قبیلہ جرم یا تعدی، داخلی امن قائم رکھنے، جھگڑا چکانے، ظالم کو سزا دینے اور مظلوم کی فریاد رسی کرنے کے لیے خود قبیلہ اپنے سرداروں یا انصاف کے لیے مقرر شدہ خصوصی افسروں کے ذریعے سے دخل دہی کر کے عدل گستری کرنے لگا ہوگا۔ یہ شروع میں ''آنکھ کے بدلے آنکھ'' سے کم نہ ہوتا ہوگا لیکن رفتہ رفتہ جب بعض صورتوں میں ضرر کی مالی یا رقمی قدر و قیمت کی جانے لگی اور بالآخر متعین بھی ہوگئی تو ملزم کے سماجی درجے، عمر اور جنس کے لحاظ سے فرق بہرحال باقی اور جاری رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظیریں عام طور سے ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے مثلاً دگنا ہوتا (ابن ہشام ص۸۰۲ تا ۳) یا آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ یا کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا بھی تھا۔ اور اسی قاعدے کو قرآن نے اسلامی دور میں منسوخ کیا۔

"الحر بالحر والعبد بالعبد والانثی بالانثیٰ (۲:۱۷۸)
آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت
ہی قتل کیے جائیں (نہ کم نہ زیادہ)

Marfat.com

یہ سب سزائیں تو اس وقت دی جا سکتی تھیں جب ملزم، قبیلے کی دسترس میں ہوتا۔ اگر ملزم فرار ہو جاتا تو یہ محدود وسائل والے، خانہ بدوش، بعض صورتوں میں خاص کر بین القبائل جرم کے موقع پر، ملزم کو ''طرد'' یعنی جات باہر کر دیتے اور وہ اپنے قبیلے کی ہر قسم کی اخلاقی و مادی مدد سے محروم ہو کر اپنی حفاظت خود ہی تنہا کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اکثر بے بسی و بے کسی سے غربت میں جان دیتا۔ ممکن ہوتا تو وہ دُور دراز کے کسی اجنبی قبیلے میں جا کر پناہ گزیں ہوتا اور انہیں سے بھائی چارہ کر کے انہیں کا ایک فرد بن جاتا۔ ایسے لوگ دخیل، مولا اور حلیف کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے اور یہ اس زمانے کا طریقہ توطن Law and mode of the domicile and Naturalisation تھا۔(۲۱)

اب تک صرف تاریخی پس منظر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد، جیسا کہ بیان ہوا ۶۱۰ء سے اسلام شروع ہوا۔ اس کے آغاز اور ترقی سے یہاں بحث نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہجرت سے پہلے اور بعد، زندگی بھر، اپنے پیرووں کے لیے انتہائی عدالت کا کام دیتی رہی۔ لیکن ایک واقعی مملکت کی بنیاد ہجرت کے بعد ہی پڑی۔ ہجرت کر کے مدینہ آتے ہی آنحضرت نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا تھا۔ (۲۲) اور ہماری خوش قسمتی سے یہ دلچسپ اور اہم دستاویز بجنسہ وبلفظہ ہم تک نقل ہوتی آئی ہے۔ (۲۳) اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جا سکتا ہے۔ (دیکھیے باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور'')

اس تاریخی دستاویز کے دو حصے ہیں۔ فقرہ ۱ تا ۲۳ میں مہاجرین اور انصار کی وحدتوں کا ذکر ہے اور فقرہ ۲۴ تا ۴۷ میں ان قواعد کا ذکر ہے جو مضافات مدینہ میں بسنے والے حلیف یہودی قبائل اور بستیوں سے متعلق تھے ان ہر دو حصوں کے عدالتی فقرات کی تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

حسب سابق ہر قبیلہ انصار اپنے افراد کے مواخذہ جات کا اجتماعی طور سے ذمہ دار ہوگا۔ اگر کوئی فرد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو تو اس قیدی کے قبیلے کے سب افراد مل کر فدیہ ادا کریں گے (ف ۴ تا ۱۱)۔

اس سلسلے میں انصار کے قبائل تو معین تھے لیکن مہاجرین مکہ سب مل کر ایک قبیلہ

Marfat.com

تصور کیے جائیں گے۔(ف ۱۲)

انصاف رسانی متضرر کے ہاتھوں میں نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ سمجھی جائے گی اور اس میں کسی رشتہ داری اور قرابت کے باعث پاس ولحاظ نہیں کیا جائے گا (ف ۱۳) اور کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکے گا (ف ۲۲)۔

کسی مسلمان کا قتل عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا البتہ مقتول کے ولی مسلمان ہوں تو انہیں چاہیے (۲۴) کہ قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں (ف ۱۴)۔

ہر قسم کے جھگڑے کے لیے آنحضرت کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔ (۲۵) (ف ۲۳) اسی طرح یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ:

فدیہ، دیت، ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رہیں گے (ف ۲۵، ۳۱، ۳۵، ۴۰) مگر کوئی شخص قریش اور ان کے مددگاروں کو اپنے جوار یعنی پناہ میں لینے کا مجاز نہ ہوگا۔ (ف ۴۳)

عدل گستری ایک مفاد عامہ کا معاملہ ہے اور کوئی شخص خود اپنے رشتہ داروں کی بھی پاسداری نہ کر سکے گا (ف ۳۶ ب، ۳۱) آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ کریں گے (ف ۴۲) دیگر جزئی تفصیلوں کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے (۲۶)۔ گو اس عظیم الشان اور انقلابی اصلاح کی جانب خصوصی اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا ادارہ وجود میں آ گیا اور یہ اختیار افراد ہی نہیں قبائل سے بھی چھین کر حکمران کے سپرد کیا گیا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ کم از کم اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے دو مقدموں کا اکثر مورخوں نے ذکر کیا ہے جن میں توریت پر عمل کرایا گیا (۲۷)۔ قرآن مجید میں اس مسئلے سے کافی طویل بحث کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے۔ یہودی توریت پر عمل کریں تو نصرانی انجیل پر اور مسلمان قرآن پر اور یہ کہ خدا ہی نے ہر ایک کو الگ الگ شریعتیں دی ہیں ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی ''امت'' بنا دیتا۔ (۲۸) آنحضرت کا

Marfat.com

یہ طرز عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا سے ان کا شخصی قانون ہی متعلق ہو اوراس غرض کے لیے خصوصی عدالتیں بنائی جائیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں اس چیز نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان ملی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت ہی مقرر ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ ہو کہ سخت تر شخصی قانون والی ''ملتیں'' ہمسایہ وہم شہری مسلمانوں کی ''الحنيفية السمحة'' کی سہولتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے سکون کے لمحوں میں اس کو قبول کرنے کی خاموش ترغیبیں پاتے رہیں۔ بہر حال ایک ابتدائی اور فوری اور بہت اہم فائدہ اسلامی مملکت کو اس سے یہ پہنچا کہ جدید مفتوحہ علاقے میں اقلیتوں کی ....جن پر وہاں کی سابق حکومت سخت مظالم توڑا کرتی تھی .... پر خلوص تائید حاصل ہوگئی جن سے اس کو اپنی تازہ فتح کے مستحکم اور مکمل کرنے میں کافی مدد ملی۔

چنانچہ مشہور پادری کارالفسکی لکھتا ہے:

''علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے .... یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا.......... مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جن کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خودمختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدار عطا کیے جائیں۔ (۲۹)

ایک اور غیر مسلم شہادت جو ہمعصر ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے، قابل ذکر ہے، چنانچہ شام کی فتح کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عمر کے زمانے میں ایک نسطوری پادری نے ایک دوست کے نام جو خط لکھا تھا وہ موجود ہے اور اس میں لکھا ہے:

''یہ عطائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں، لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجوں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔ (۳۰)

یہ یاد رہے کہ کم از کم انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ میں ہر ایک کا ایک ایک نقیب مقرر کر دیا تھا جو اپنے قبیلے کی

Marfat.com

نمائندگی کرتا اور اندرونی نظام اور باقاعدگی کا ذمہ دار تھا۔ اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرت کے پاس آتا۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر ہوتا تھا جسے عریف کہتے تھے (۳۱)۔ اس نظام سے وقت ضرورت استصواب عامہ میں بھی مدد لی جاتی تھی (۳۲)۔ مدینے کی حد تک آنحضرت پورا عدالتی کام خود انجام دیتے تھے لیکن جب اسلامی عملداری میں وسعت ہو کر انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرت نے چند مفتی (یعنی قاضی) (۳۳)" مقرر فرما دیے تھے (۳۴) جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرت کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا (۳۵)۔ مدینے میں مستقل قاضیوں کے علاوہ کسی خاص شخص کو کسی خاص مقدمے کی سماعت کے لیے موقتی (۳۶) قاضی بنایا جایا کرنے کی بھی عہد نبوی میں متعدد نظیریں ملتی ہیں نیز ان کے آنحضرت کے پاس مرافعوں کی بھی (۳۷)۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ دارالحکومت کے باہر صوبوں اور ضلعوں میں بھی علیحدہ افسروں کی ضرورت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ دار عامل (گورنر) بھی بیک وقت سپہ سالار اور افسر مال (تحصیلدار) اور قاضی و محتسب (نگران اخلاق و مال تجارت وغیرہ) ہوتے تھے۔ ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرت کے پاس مرافعے آیا کرتے تھے (۳۸)۔ ان قاضیوں کو مستقر کی جانب روانگی کے وقت جو ہدایتیں دی جاتی تھیں ان میں سے چند کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل عہد نبوی کے عدالتی حلقے میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے حالات سے عام کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:

"معاذ بن جبل و بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم قاضياً الى الجند يعلم الناس القرآن و شرائع الاسلام و يقضي بينهم و جعل اليه قبض الصدقات من العمال الذين باليمن." (۳۹) معاذ بن جبل کو آنحضرت نے قاضی بنا کر جند (جو یمن میں ہے) بھیجا تا کہ لوگوں کو قرآن اور احکام اسلام سکھائیں اور ان کے مقدموں کا فیصلہ کریں اور یمن کے تحصیلداروں سے جمع شدہ محاصل سرکاری اپنی تحویل میں لیں۔

جب معاذ بن جبل یمن روانہ ہونے لگے تو آنحضرت نے آخری باریابی کے موقع

Marfat.com

پر ان سے جو گفتگو فرمائی وہ بھی اسلامی عدل گستری اور قانونیات کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

''ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعث معاذ الی الیمن فقال کیف تقضی؟ قال بمافی کتاب اللہ. قال فان لم یکن فی کتاب اللّٰہ؟ قال فبسنة رسول اللّٰہ. قال فان لم یکن فی سنة رسول اللّٰہ؟ قال اجتهد برائی. قال الحمد للّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ لما یحب رسول اللّٰہُ (۴۰)

''آنحضرت نے معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا کس طرح فیصلے کرو گے؟ کہا اس کے مطابق جو اللہ کی کتاب (قرآن) میں ہو۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو؟ کہا تو رسول اللہ کی سنت کے موافق۔ فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ ملے؟ کہا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو ایسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔''

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ (۴۱) جب عمرو بن حزم یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تھے تو ان کو آنحضرت نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا تھا۔ یہ اسلامی تاریخ انتظام مملکت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس طویل اور ہمہ گیر دستاویز میں انہیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور ظلم وستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۴۲) عمرو بن حزم کے لیے لکھے ہوئے ہدایت نامہ میں تفصیل سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجہ دلایا جائے گا (۴۳)۔ اس قسم کا ایک قانون آنحضرت کے حکم سے حضرت ابوشا کو بھی لکھ کر دیا گیا تھا۔ (۴۴)

بدلے اور انتقام کا تصور حمورابی کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بھی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جائے اور اصل قاتل محفوظ رہے۔ (۴۵) قانون حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص اعضا کا کچھ حصہ (۴۶) قانون حضرت موسیٰ (توریت) میں بھی ملتا ہے جس میں آنکھ کے عوض آنکھ اور کان کے عوض کان کا طریقہ قائم کیا گیا تھا (۴۷)۔ مگر یہ عہد اسلام کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی ترقی ہے کہ عمد،

مشابہ عمد اور خطا میں فرق کیا جانے لگا (۴۸) اور نیت سب سے پہلے دیکھی جانے لگی (۴۹)۔ اس کے علاوہ بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی ٹارٹ مقرر کر دیا گیا اور ہر جے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دلایا جانے لگا (۵۰) اور سخت قانونی انصاف کی جگہ استحسان یا نصفت کو عدالتیں روا رکھنے لگیں (۵۱)۔ مطلب یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ رحم کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا اور حالات و واقعات کے لحاظ سے برموقع مناسب رعایت بھی کی جا سکتی ہے اور ذمہ داری کو ''شخصی'' قرار دیا گیا، نیابتی نہیں کہ ایک کا بار دوسرے پر لاد دیا جائے (۵۲)۔ اس طرح شبہے کا فائدہ ملزم کو دینا اور غلطی سے سزا دینے کی جگہ غلطی سے رہا کرنا، اصول قرار دیا گیا۔ (۵۳)

ایک نئی ''(جدت)'' یہ کی گئی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوقات کو ذمہ داری سے بری کر دیا گیا ورنہ اب تک عرب میں کوئی گڑھا اور کوئی جانور بھی کسی آدمی کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا (۵۴)۔ چنانچہ امام ابو یوسف نے بیان کیا ہے کہ:

كان اهل الجاهلية اذا عطب الرحل فى القليب جعلوا القليب عقله و اذا قتله دابة جعلوها عقله و اذا قتله معدن جعلوه عقله فسال سائل رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال العجاء جبار والمعدن جبار و البئر جبار. (۵۵)

زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی گڑھے میں گر کر مر جاتا تو وہ گڑھا، اس کا خون بہا قرار دیا جاتا (اور ہلاک شدہ شخص کے وارثوں کی ملک قرار پاتا)۔ اگر کوئی جانور کسی کو قتل کرتا تو وہی اس کا خون بہا قرار دیا جاتا اور اگر کوئی کسی کان میں ہلاک ہوتا تو وہ کان اس کا خون بہا قرار دی جاتی۔ کسی نے اس بارے میں آنحضرت سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بے زبان جانور اور کان اور کوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری نہیں پیدا ہوتی۔

ابھی بیان ہوا کہ مختلف صوبوں پر جو عامل اور قاضی بھیجے جاتے تھے انہیں خاص احکام اور ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ مرکز حکومت مدینہ میں عدالت ابتدائی ہر قبیلے کے عریف اور نقیب ہوتے یا مفتی اور قاضی۔ عدالت مرافعہ اور عدالت انتہائی خود جناب

Marfat.com

رسالت مآب کی ذات تھی۔ ''مرافعہ'' اور ''استصواب'' آنحضرت کے پاس بعض وقت اضلاع اور صوبہ جات سے بھی ہوتا (۵۶)۔ ''تصحیح'' کی بھی متعدد نظیریں تاریخ نے اس عہد کے متعلق محفوظ کی ہیں اور جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرز عمل کا پتہ چلتا تو آپ (بصیغہ تصحیح) دخل دہی فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ حضرت خالد بن الولید اور واقعہ بنی جذیمہ اس کی ایک انتہائی مثال ہے۔ تصحیح اور مرافعے کا نظام حضرت عمر کے زمانے میں ایک بہت ہی ترقی یافتہ ادارہ بن گیا تھا اور انہوں نے حج کے موقع کو ایک عدالتی اور انتظامی تنقیح کا مقام بھی قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ جملہ والیان صوبہ اور حکام عدالت اس وقت مکہ معظمہ آتے اور حضرت عمر ان کے خلاف دعوے اور مقدمے، خود سنتے اور حق رسانی کرتے۔ اگر سرکاری افسروں سے کوئی لغزش ہوئی ہوتی تو بڑی سختی سے دارو گیر کرتے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے، ثبوت مانگے بغیر اگر ہر دعوے کو صحیح مان لیا جایا کرے تو لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں (۵۷)۔ اسی لیے امور تنقیح طلب اور شہادت پیش شدہ کی جانچ (۵۸) کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اصولی اور ذیلی احکام حدیث میں ملتے ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

انصاف رسانی کے قاضی کو چاہیے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنے خانگی معلومات کو دخل نہ دے (۵۹)۔ ایسا حکم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قاضیوں کو بددیانتی کی ہمیشہ زبردست ترغیب ہوتی رہتی۔ ناحق فریق کی جادو بیانی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حدیث قابل ذکر ہے، جو صحاح ستہ (۶۰) میں آنحضرت سے مروی ہے۔

"انما انا بشر وانکم تختصمون الی ولعلی بعضکم ان یکون الحن بحجته من بعض فا قضی له نحو ما اسمع منه فمن قضیت له بشئی من حق اخیه فلایا خذ منه شئیا فا نما اقطع له قطعة من النار."

''بے شبہ میں صرف ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دلیل بہ نسبت دوسرے کے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ پیش کرے اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ صادر کروں۔ اگر کسی کو میرے (اس طرح کے)

Marfat.com

فیصلے سے (ناحق) کچھ ملے تو وہ اس سے استفادہ نہ کرے کیونکہ میں جو کچھ دیتا ہوں وہ آگ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں۔"

جس سماج میں پیشہ ور وکیل اور اڈوکیٹ نہ ہوں اور جو قانونی حق سے زیادہ قدرتی حق پر زور دیتا ہو، اس کے لیے حضرت علی کو دی ہوئی اس ہدایت نبوی سے بہتر اور کیا ہدایت دی جاسکتی ہے کہ:

اذا جلس بين يديک الخصمان فلا تقض بينهم حتى تسمع من الآخر کما سمعت من الاول فانه احرى ان تبين لک القضاء. قال فما زلت قاضيا و ما شککت في قضاء بعده (٦١).

جب تیرے پاس دو جھگڑنے والے آئیں تو تو اس وقت تک ان کا فیصلہ صادر نہ کر جب تک کہ تو پہلے اور دوسرے دونوں کا بیان نہ سن لے۔ تجھے، اس طرح صحیح فیصلے کا بھائی دینا زیادہ ممکن ہے۔ (حضرت علی فرماتے ہیں) اس کے بعد سے میں ہمیشہ فیصلے کرتا رہا ہوں اور فیصلے کرنے میں مجھے کبھی شک اور ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون اور انصاف رسانی کا یہ اہم قاعدہ مقرر فرما دیا تھا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے اور اگر مدعی ثبوت نہ پیش کر سکے (٦٢) تو دعوے کے منکر یعنی مدعا علیہ کو قسم دی جائے (٦٣)۔ اس قاعدے کو بدلنے کی اب تک کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ مزید براں، مدعی اپنے ناکافی ثبوت کی تلافی (جب کہ مدعا علیہ کے پاس بھی جوابی ثبوت نہ ہو) قسم کے ذریعے سے بھی کرتا اور عہد نبوی میں اس کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں (٦٤)۔ ایک نسبتاً فروتر اخلاق کے زمانے میں ثبوت میں پیش شدہ گواہوں کے علاوہ، قاضی شریح مدعی کو قسم بھی دیتے تھے کہ اس کا دعویٰ سچا ہے۔ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا:

رایت الناس اهد لوا فاحدثت (٦٥) جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں نت نئی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں تو مجھے بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے۔

اسی سلسلے میں حضرت علی کی ایک نئی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کرائی جا سکتی ہے وہ یہ کہ گواہوں کی پیشی پر ان کا "تزکیہ" یعنی معتبر ہونے کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کا

Marfat.com

اظہار قدیم سے رائج تھا لیکن اس تحقیقات کو قاضی شریح نے مخفی طور سے کرانا شروع کیا (٦٦) اور جھوٹے گواہوں کا انسداد کرنے کے لیے حضرت علی ایک گواہ کا اظہار لیتے وقت دوسروں کو عدالت کے کمرے سے ہٹا دیتے تھے اور ان کا قول مشہور ہے کہ "انا اول من فرق بین الشھود" (٦٧) ورنہ اس سے پہلے سب گواہ کمرہ عدالت میں حاضر رہتے اور ایک دوسرے کے بیانات سنتے رہتے تھے۔

قاضی شریح کا ذکر اب تک کئی بار آیا ہے فصل خصومات ان کا موروثی پیشہ تھا۔ اور انکے والد ھانی اپنے بے لاگ فیصلوں کے باعث زمانۂ جاہلیت میں ابوالحکم کے معزز نام سے مخاطب کیے جاتے تھے (٦٨)۔ خود شریح ان مادرزاد قاضیوں میں سے ہیں جن کی تعداد تاریخ عالم میں بھی بہت کم ہے اور جن پر ہر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ بچے سے تھے کہ انہوں نے ایک پیچیدہ قانونی مقدمے میں جس میں خلیفہ حضرت عمر پریشان تھے ایک بہترین اصول اس پیچیدگی کے حل کا بتایا۔ مردم شناس و قدردان حضرت عمر اس قدر خوش ہوئے کہ باوجود لوگوں کی مخالفت کے اس کمسن بچے کو عراق کے اہم صوبے کا قاضی بنا کر کوفہ روانہ کیا۔ قاضی شریح کو وہاں جو کامیابی ہوئی اس کے لیے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ تقریباً پچھتر سال تک مسلسل اسی کام کو انجام دیتے رہے اور کسی خلیفہ مابعد کو ان کی اہلیت کے متعلق بدگمانی نہیں ہوئی (٦٩) انہیں قاضی شریح کو حضرت عمر نے جو ہدایت نامہ دیا تھا اس کے چند فقرے خود ان کی زبانی سنیے:

ما استبان لک من کتاب اللّٰہ فلا تسئل عنہ فان لم یستبن فی کتاب اللّٰہ فمن السنۃ فان لم تجدہ فی السنۃ فجتھدوایک (٧٠) اگر تجھ کو کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو پھر اس کے متعلق کسی اور سے رجوع نہ کر۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت میں اور جو سنت میں بھی نہ ملے تو پھر اپنی رائے کو کام میں لا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

قال الشعبی عن شریح قال قال لی عمر اقض بما استبان لک من کتاب اللّٰہ فان لم تعلم کل کتاب اللّٰہ فاقض بما استبان لک فی قضاء رسول اللّٰہ فان لم تعلم (کل) قضاء رسول اللّٰہ فاقض بما استبان لک من

Marfat.com

(قضاء) ائمة (الائمة؟) المهتدين فان لم تعلم كل ماقضته ائمة (الائمة؟) المهتدين فاجتهدرایک واستشر اهل العلم والصلاح. (۷۱)

شعبی نے شریح سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا، مجھ سے حضرت عمر نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر پوری کتاب اللہ میں بھی وہ مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ کے فیصلوں میں جو چیز ملے اس کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر رسول اللہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو راہ یاب اماموں کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر راہ یاب اماموں کے فیصلوں میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو اپنی رائے کو کام میں لا اور علم وصلاح والوں سے مشورہ کر۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے یہی طرز عمل اور حکم آنحضرت کا تھا اور بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ (۷۲) بلکہ یہاں تک پتہ چلتا ہے (۷۳) کہ قاضیوں کے لیے مشیران قانون بھی جزء لاینفک بنا دیے گئے تھے اور عرصۂ دراز تک اس پر عمل رہا جس کے باعث نئے قاضیوں کی ناتجربہ کاری قانون کی مکمل تعمیل میں حارج نہ ہوئی۔ شاید یہ متاخر قانون روما کے ''کونسیلیم'' سے مشابہ ہے۔ اس کے کچھ اشارے بدائع کاشانی جلد ۷، ص ۱۲، میں ملتے ہیں اور تفصیل کے لیے ایل تیان کی مذکورہ کتاب جلد ۱، ص ۳۱۴ ومابعد۔

حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں مختلف صوبوں کے قاضیوں کو ہدایتیں دی تھیں ان میں سے چند تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں۔ (۷۴) ان میں سے ایک جو ''کتاب سياسة القضاء وتدبير الحكم'' کے موزوں نام سے مشہور ہے (۷۵) سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو انہوں نے حضرت ابوموسیٰ الاشعری کو بصرے کا قاضی بنانے کے بعد بھیجا تھا اور آج بھی حکام عدالت کے لیے دستور العمل بن سکتا ہے۔ اس کی اہمیت نے آکسفرڈ کے پروفیسر عربی ڈاکٹر مارگولیوث کو ۱۹۱۰ء میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس پر ایک بسیط مضمون لکھے۔ (۷۶) مگر بدقسمتی سے اصل دستاویز کا انگریزی ترجمہ جو مارگولیوث نے کیا ہے، حد درجہ ناقص ہونے سے اس کی اہمیت کا کوئی صحیح اندازہ پڑھنے والے کو بالکل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی مولفوں نے بھی قدیم سے اس دستاویز کو

بڑی اہمیت دی ہے اور اس پر شروح لکھے ہیں۔(۷۷) اس کافی طویل دستاویز کا یہاں خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن بکثرت مولفوں نے محفوظ کیا ہے۔(۷۸)

قضاءت ایک خدائی فریضہ ہے اور آنحضرت کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل۔ اگر آپ کے پاس کوئی مقدمہ رجوع ہو تو غور وفکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کیجیے اور اسکی تعمیل کرائیے۔ بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے۔ فریقین سے برابری کا برتاؤ کیجیے تاکہ کمزور آپ کے عدل سے مایوس نہ ہو جائے اور قوی ظالم اس سے بے جا فائدہ نہ اُٹھائے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر صرف قسم۔

اگر فریقین صلح کر لینی چاہیں تو وہ جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں صرف شرط یہ ہے کہ اس طرح کوئی حرام چیز حلال نہ ہو جائے اور حلال چیز حرام۔

فیصلہ کر چکنے کے بعد نظر ثانی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل تو حق رسانی اور انصاف ہے۔

اگر کسی بات کے فیصلے میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور وفکر کیجیے اور نظائر اور مشابہ امور کو ڈھونڈھ کر اس پر قیاس کیجیے اور ایسا فیصلہ کیجیے جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔ اگر مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے یا شہادت فراہم کرنے میں مہلت درکار ہو تو وہ دی جائے۔

شہادت سے اگر وہ دعوٰی ثابت کر دے تو اس کے موافق ورنہ اس کے مخالف فیصلہ صادر کیا جائے۔

شہادت کے اغراض کے لیے سب مسلمان قابل اعتماد ہیں، سوائے بدچلنی میں سزا یافتہ (مجلود فی حد) اور ایسے لوگوں کے جن کا جھوٹی گواہی دینا اس سے پہلے ثابت ہو چکا ہو۔

کسی مدعی کے رشتہ دار کی خاص اس مقدمے میں شہادت قابل اعتماد نہیں۔ مجلس عدالت میں غرور وتکبر، لوگوں کو جھڑکنا اور حق بات پر ناگواری نہیں ظاہر کرنی چاہیے، خدا سب کو دیکھتا ہے اور سنتا ہے، اسی سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہیے۔

اس عہد کا اسلامی قانون شہادت اتنا وسیع موضوع ہے کہ ایک مستقل مقالے کے

Marfat.com

بغیر یہ بتانا ناممکن ہوگا کہ تفتیش کس طرح ہوتی تھی، تنقیح شہادت اور جرح کے کیا قواعد تھے، گواہوں کی تعداد، عمر، مرد اور عورتیں، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت، غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق وغیرہ کے کیا قاعدے تھے۔

قاضیوں کی تنخواہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اسلام میں اس اصول کو شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قاضیوں کو معقول بلکہ بیش قرار تنخواہیں دے کر رشوت کے لالچ سے بچایا جائے۔ آنحضرت طالب عہدہ لوگوں کو بھی گورنر یا قاضی نہیں بناتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے حکام عدالت کے لیے ماہواریں بھی مقرر کرنی شروع فرما دی تھیں اور اس بارے میں حضرت عتاب بن اسید کا نام بطور نظیر پیش کیا جاتا ہے، جن کو کہتے ہیں کہ، ماہانہ تیس درہم تنخواہ دی جاتی تھی۔ (۷۹) سلیمان بن ربیعۃ الباہلی کو حضرت عمر ماہانہ پانچ سو درہم دلاتے تھے اور کم سن قاضی شریح کو ماہانہ ایک سو۔ حضرت علی اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس اپنے ایک مقدمے کے لیے رجوع ہوئے اور اپنے بیٹے امام حسن کو بطور گواہ پیش کیا۔ حضرت علی کے، باوجود خلیفہ ہونے اور امام حسن کی خصوصی شخصیت بتا کر اصرار کرنے کے، قاضی شریح نے بیٹے کی گواہی کو باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت علی نے قاضی شریح کی بھی ماہوار پانچ سو درہم مقرر کر دی۔ (۸۰)

متعدد نظیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت فوجداری مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لیے حوالات میں رکھتے تھے۔ (۸۱) نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیتے تھے۔ (۸۲) خلافت راشدہ میں قید خانوں کے لیے مستقل عمارتیں ہونے لگ گئی تھیں۔ اس غرض کے لیے حضرت عمر کا مکان خریدنا مشہور ہے۔ حضرت علی کے بنائے ہوئے دو قید خانے نافع اور مخلیس کے نام سے معروف ہیں۔ (۸۳)

انگریزی قانون کا ایک اہم اصول ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر کیا جا سکتا کیونکہ King can do no wrong لیکن اسلام کسی انسان کو خطا سے مبرا نہیں سمجھتا اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات کے خلاف ٹارٹ اور دیوانی دونوں قسم کے متعدد مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کیے۔ (۸۴)

Marfat.com

حضرت عمر نے نہ صرف اضلاع بلکہ مستقر حکومت، مدینہ منورہ میں مستقل اور پورا وقت دینے والے قاضی مقرر کر دیے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خود خلیفہ کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو خلیفہ کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی کیونکہ کوئی اپنے آپ فریق اور حاکم دونوں نہیں بن سکتا۔ (''علی ان الامام لایکون قاضیا فی حق نفسه'' مبسوط سرخسی جلد ۱۶، ص ۷۳، مزید تفصیل کے لیے میری انگریزی تالیف ''مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ ص ۸۰ تا ۸۳)۔ اس قسم کی نظیریں نہ صرف حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کے زمانے میں ملتی ہیں۔ (۸۵) بلکہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس تک اس سے اپنے کو مستثنیٰ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور عبدالملک اور منصور کو عدالت میں مدعا علیہ بن کر جواب دہی کے لیے حاضر ہونا (۸۶) مثال کے لیے کافی ہے۔ اس کی نظیریں حال کے حیدرآباد کی تاریخوں تک میں ملتی ہیں۔ مستقل قاضیوں کے سلسلے میں ایک بعد کے زمانے کا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مورخ ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ عبیداللہ ابن الحسن العنبری اور عمر بن عامر بصرے میں پہلی مرتبہ ایک عدالت میں مشترکہ قاضی مقرر کیے گئے اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مل کر مقدمے سنیں اور متفقہ فیصلے صادر کریں۔ (۸۷) (عورت کے قاضی ہو سکنے کے متعلق مباحث ماوردی باب ششم میں دیکھیے) قاضی یا حاکم عدالت کا اجلاس شروع میں عموماً مسجد میں ہوتا تھا جو شہر کے ٹاؤن ہال کا کام دیتی تھی۔ ان مسجدوں میں مسلم اور غیر مسلم سب بے تکلف آ سکتے تھے۔ ابن عساکر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک عمارت دارالقضاء کے نام سے بن چکی تھی۔ (۸۸) سلطان نورالدین زنگی کا ایک دارالعدل تعمیر کرانا البتہ ایک بعد کا واقعہ ہے۔

چونکہ مقدمات ہر قسم کے پیش ہوتے ہیں اس لیے ان کے تصفیے کے لیے ماہرین کی امداد حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تعمیرات (۸۹) غلے اور زرعی پیداوار کا اندازہ (۹۰) قیافہ شناسی (۹۱) اور اسی طرح کی چند چیزوں کے ماہر خود عہد نبوی میں عدالتی اغراض کے لیے برسر موقع بھیجے جایا کرتے تھے اور ان کی رائے پر آنحضرت فیصلہ کرتے اور فیصلہ نافذ کراتے۔

Marfat.com

قاضی کا تقرر شروع سے مرکزی حکومت سے متعلق رہا ہے خاص کر صوبوں کے صدر قاضی۔ البتہ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اور خود حضرت عمر اپنے گورنروں کو اجازت دیتے تھے کہ اپنے علاقے میں حسب ضرورت حکام عدالت خود مقرر کریں اور انہیں کافی تنخواہ دے کر مستغنی بنا دیں۔(۹۲)

قاضیوں کا سخت غصے کی حالت میں فیصلے نہ کرنا، پیچیدہ مقدموں میں مشورے کرنا، جھوٹے دعوے، جھوٹی شہادت اور جانبدارانہ فیصلوں پر سخت وعیدیں، رشوت اور سفارش کی ممانعت، مبہم فیصلوں (قضاء بقضائین) کی ممانعت، وغیرہ زیادہ تر ادب القاضی سے متعلق ہیں۔(۹۳) ان پر اس مختصر اشارے کے بعد ایک اہم تر چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عدل گستری کے لیے حق و ناحق میں امتیاز کرنے کے لیے ایک معیار یعنی ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ فیصلوں میں ہر جگہ یکسانی رہے اور لوگوں کو اپنے حقوق و فرائض پہلے ہی سے معلوم رہیں اور ساتھ ہی ان احکام کی خلاف ورزی کے لیے ایک تدارک اور ایک تہدید بھی مقرر کر دی جائے تا کہ ان کی پابندی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

تدارک کے لیے عام طور پر صرف حکومت کی قوت کام میں لائی جاتی ہے لیکن پوشیدہ جرائم خاص کر جھوٹی تاویلوں کی اس سے روک تھام نہیں ہوتی۔ اسی لیے اسلام نے برائیوں کی اصل جڑ پر وار کیا اور احکام کو ایک تقدس دے دیا تا کہ ہر فرد رعیت خوف سے نہیں بلکہ بہ رضا و رغبت اور نہ صرف ظاہر بلکہ باطن میں، حکومت کی دار و گیر سے بالکل باہر بھی، ہر جگہ اپنے فرائض بجا لائے اور جرم و گناہ سے بچے۔ حشر و حساب کا عقیدہ بھی اس کو موثر بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن اصلی اور سرچشمہ احکام صرف خدائے حکیم و قدیر کی ذات ہے جس کا کوئی حکم نامناسب یا ظالمانہ نہیں اور جو انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اس کے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اسی کے مطابق سزا دے گا۔ آنحضرت ایک پیغمبر تھے اور خدا کا پیغام بندوں تک پہنچاتے تھے، اپنے دل سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحیٌ یوحٰی" (۹۴)

غرض خدا نے اپنے احکام کچھ تو اپنی "کتاب" (۹۵) یعنی قرآن کی صورت میں

Marfat.com

دیے جو ابتدائے اسلام سے تھوڑا تھوڑا نازل ہو کر آنحضرت کی زندگی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے سوا کچھ اور احکام آنحضرت کے قول و فعل کے ذریعے سے پہنچائے گئے اور قرآن ہی میں ان کے واجب التعمیل ہونے کی صراحت کر دی گئی۔ (۹۶)

یہ تو راست قانون سازی تھی۔ فقیہ، مجتہد، قاضی وغیرہ اسی قانون موضوعہ کے پابند ہوتے ہیں گو جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر یمن کے سلسلے میں بیان کیا گیا، اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے لیے گنجائش رکھ کر قانون میں ضرور لچک پیدا کر دی گئی۔

قرآن و حدیث اور آرائے مجتہدین یعنی اجماع و قیاس سے قانون اسلام کا انتخاب، استنباط، تدوین اور ترقی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ اس مختصر خاکے کے آخر میں ان حقوق اساسی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع (۱۰ھ) کے موقع پر اپنے جبل الرحمۃ کے مشہور پہاڑی خطبے میں (۹۷) حلقہ بگوشان اسلام کے لیے مقرر فرمائے۔ یہ خطبہ مسلمانوں کی تاریخ تمدن میں ایک منشور انسانیت کا کام دیتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

☆ ہر شخص کے تین بنیادی حقوق یعنی جان، مال، آبرو محفوظ اور قابل احترام ہیں۔

☆ امانت (اور قرض) واپس ادا کیے جائیں۔

☆ زمانہ جاہلیت کا سود ممنوع کیا جاتا ہے اور فی الوقت واجب الادا سود بھی نہیں دلائے جائیں گے، صرف اصل واپس ملے گا۔ خود حضرت عباس کے سود بھی کالعدم کیے جاتے ہیں۔

☆ زمانہ جاہلیت میں کیے ہوئے خون لوگ اب بھول جائیں اور ان کے بدلے اور انتقام کا خیال نہ کریں۔ خود آنحضرت اپنے چچازاد بھتیجے کا خون معاف کرتے ہیں۔

☆ زمانہ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دیے جاتے ہیں سوائے خانہ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے پانی کے انتظام کے۔

☆ قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا اور شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا دیا جائے گا۔ سال کبیسہ کی تقویم برخاست کی جاتی ہے اور قمری سنہ رائج کیا جاتا ہے جس میں

بارہ مہینے ہوتے ہیں۔

☆ میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق ہوتے ہیں۔ شوہر کا حق یہ ہے کہ بیوی پاکدامن رہے اور ان لوگوں کو گھر میں داخل ہونے نہ دے جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کا حق یہ ہے کہ شوہر اسے اچھا کھلائے اور پہنائے۔ عورتیں ایک امانت ہیں۔ ان سے سلوک میں خدا سے ڈرو اور اچھا برتاؤ کرو۔

☆ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلا رضامندی کوئی کسی کا مال نہ لے اور نہ آپس میں لڑائی کرے۔

☆ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان کو تھامے رہو گے، تم بھٹکو گے نہیں۔ وہ قرآن اور سنت ہیں۔ اور میں تمہیں میرے اہل بیت سے سلوک کے متعلق بھی تاکید کرتا ہوں۔

☆ سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک ہی ہے۔ تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سے محترم ترین وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، اور کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

☆ وراثت کے لیے حصے خدا نے مقرر کر دیے ہیں۔ وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی روا نہیں۔

☆ بچہ فراش (عورت) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔

☆ نسب اور ولا میں جھوٹے دعوے اور کوششیں ایک ملعون فعل ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو ابتدائے اسلام کے، زیادہ تر طرز عمل اور نظائر کی روشنی میں، مرتب کیا گیا۔ اور یہی طرز عمل بعد کے زمانوں میں ہمیشہ تمام دنیائے اسلام کے لیے ایک قابل عمل نمونے اور ایک واجب التعمیل نظیر اور حکم کا کام دینے لگا۔ اسلامی تصور عدل کے متعلق چند آیتوں کی تلاوت سے اسے ختم کرتا ہوں۔

☆ **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ولا یجر منکم شنان قوم علی الاتعدلوا اعدلوا ھوا قرب للتقوی۔** خدا انصاف اور احسان دونوں کا حکم دیتا ہے کسی کی شخصی مخالفت کے باعث ناانصافی کے مجرم نہ بن جاؤ بلکہ عدل کرو

Marfat.com

اور یہ متقی کی شان ہے۔

☆ جَزآء سیئة مثلها فمن عفاو اصلح فاجره علی الله۔ برائی کا بدلہ مساوی برائی ہے (زیادہ نہیں) لیکن اگر کوئی عفواور صلح سے کام لے تو خدااس کا اجر دے گا۔

☆ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عو قبتم به ولئن صبرتم لهو خیر للصابرین۔ اگر بدلہ لینا چاہو تو اتنا ہی لو جتنا تمہیں نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اگر صبر کرلو تو یہ بہتر ہے۔

حواشی

(۱) ۱۸۹۴ء میں قائم شدہ اور دیسی ریاستوں میں سب سے پہلی (دیکھیے اخبار ہندو مدراس، مورخہ ۱۱رفروری ۱۹۳۷ء ضمیمہ سنگور جوبلی ص ۵ مضمون راجہ کرشنما چار سابق معتمد مجلس وضع قوانین ومشیر قانون، حیدرآباد۔)

(۲) Gemeinwesen ohne obrigkeil Ein Regieren beisst Richten
حکومت کرنے کے معنی ہی ہیں انصاف کرنا۔

(۳) قرآن مجید ۳۸/۲۷ (یہ ایک ابتدائی مکی سورت ہے)

(۴) قرآن مجید ۶۵:۲ و۲۸۳:۲: :۱۴۰ و ۲۸۲:۲ و۲۲:۱۳ و ۵:۶۷ وغیرہ وغیرہ

(۵) "یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلیة" (مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۲۵، حدیث بھی ہے۔)

(۶) سیرۃ ابن ہشام ص ۸۵ تا ۸۶۔ روض الانف للسہیلی ج ۱ ص ۹۰ تا ۹۴۔ طبقات ابن سعد ج ۱/۱ ص ۴۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۹۔ نیز محمد بن حبیب کی کتاب المحبر اور کتاب المنمق، برموقع۔

(۷) علاوہ اس قول کے (دیکھیے حوالہ بالا) کہ اگر مجھے اس کی دہائی دے کر بلایا جائے تو میں اب بھی مدد کو دوڑوں یہاں اراشی شخص کے واقعے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کا ابن ہشام میں صفحہ ۲۵۷ تا ۲۵۸ پر ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

(۸) (صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۱۳ص ۳۵۲

(۹) یہ ایک عبرانی لفظ کا معرب ہے۔

(۱۰) مثلاً دیکھیے صبح الاعشیٰ ج ۱ص ۳۹۸ تا ۹۹

(۱۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تحت "کاہن" نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۶ بیان جاحظ ۱/۱۱۳۔

(۱۲) امیل تیان کی فرانسیسی تالیف "ممالک اسلامیہ کی تاریخ نظام عدلیہ" جلد اول ص ۲۸۸ (غالباً بحوالہ جاحظ۔ حوالہ واضح نہیں ہے)۔

(۱۳) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۲ ص ۲۰۶، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۸ تا ۷۹۔ الاشتقاق لابن درید ص ۱۲۴، "تحاکموا الیه حتی خرف وھو الذی قرعت له العصا۔ نیز اغانی ۳/۸۹ (طبع جدید)

(۱۴) نقائض جریر وفرزدق ص ۱۰۵، ۱۳۰، ۴۲۸ وغیرہ۔ نیز کتاب الازمنہ والامکنہ للمرزوقی ج ۲ ص ۲۷۳ تا ۲۷۴۔ الاشتقاق ابن درید ص ۱۷۲ (ہرم بن قطبہ، کے متعلق کہ عامر بن الطفیل اور علقمہ بن علاثہ نے اسی سے رجوع کیا تھا)۔

(۱۵) کتاب المعارف برموقع۔ نیز مرزوقی ۲ ص ۷۹ تا ۸۰۔

(۱۶) عقد الفرید لابن عبدربہ، ج ۲، ص ۴۵ تا ۴۶۔ نیز ابن حبیب کی کتاب المحبر کا باب "قریش کے حکم"۔

(۱۷) ابن کثیر کتاب مذکور ج ۲، ص ۲۰۷۔ ابن ہشام ص ۷۹ تا ۸۰ (نجران کے ایک عیسائی سردار کی عدالتی مراجعت کے لیے اشتقاق ابن درید ص ۲۱۸)

(۱۸) ابن حبیب کی کتاب المحبر (مطبوعہ حیدرآباد) ص ۱۳۴ نیز تاریخ یعقوبی جلد اول، حکام العرب۔

(۱۹) مزید تفصیلوں کے لیے دیکھیے **Emil Tyan Histoire del, organisation Judiciael En Pays Dslam, Paris, 1983 Vol. I inloco** در تحت تحکیم کے لیے نقائض جریر وفرزدق ص ۴۳۸۔ حکم کی اونی پوشاک کے لیے بیان جاحظ (۳/۶۶: الحکم لایفارق) "السید المعمم" اور "العمائم تیجان العرب" سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے۔

(۲۰) تاریخ یعقوبی جلد (۱) ص ۲۹۹۔ خونی مقدمات کی مزید نظیروں کے لیے دیکھیے اشتقاق ابن درید، ص ۲۶۶۔ معارف ابن قتیبہ ص ۱۸۹۔ اغانی ۳/۱۹۔ مالی معاملات کے نظائر کے لیے نویری کی نہایۃ الارب ۳/۱۲۹۔ معارف ابن قتیبہ ص ۹۲، ۹۶ سیرۃ ابن ہشام ۷۷ آبرو، مفاخرہ وغیرہ کے لیے نویری ۳/۱۲۷، اغانی ۳/۱۷۳، مستطرف الشمہی ۲/۷۳، بیان جاحظ ۱/۱۱۷۔ نیز عبدالمطلب کی مفاخرت اور جیت کے لیے محمد بن حبیب کی کتاب المحبر، ص

Marfat.com

۱۷۳اور کتاب المنمق بر موقع۔
ایسی نظیریں ملتی ہیں کہ لوگوں نے حکم بنائے جانے سے انکار کیا ہو اور یکے بعد دیگرے متعدد لوگوں سے درخواست کے بعد بالآخر کسی نے قبول کیا ہو مثلاً اغانی ۱۵/۵۷، نقایض جریر ص ۱۳۹، اشتقاق ابن درید ص ۱۷۳۔
عورتیں بھی حکم بنتی رہی ہیں۔ عامر بن الظرب کی بیٹی، ''من حکیمات العرب'' کہلاتی تھی۔ عورتیں کاہنہ بھی ہوتیں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔
یہاں کے اکثر حوالوں کیلیے میں امیل تیان کی مذکورہ فرانسیسی تالیف کا ممنون ہوں۔

(۲۱) یاد رہے کہ دخیل، مولا اور حلیف افراد کا یہ طبقہ (جسے دیگر اصلی افراد قبیلہ سے عام حقوق کچھ کم حاصل ہوتے مثلاً وہ کسی اجنبی کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا جیسا کہ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہ کے ص ۲۵۱ پر بیان کیا ہے) صرف ان فرار شدہ پناہ گزینوں ہی پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں آزاد شدہ غلام اور غیر قبائل بلکہ غیر عرب کے عام افراد بھی باہمی رضا مندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ رواج اسلام نے بھی بہت کچھ باقی رکھا اور غیر کو عرب بنانے میں اس سے عرب مسلمانوں نے بڑی مدد لی۔

(۲۲) ابن ہشام ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۵۱۷ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔ نیز ابن سید الناس وغیرہ۔

(۲۳) ہابس، روسو وغیرہ کے ''معاہدہ عمرانی'' میں بادشاہت اور مملکت کا آغاز بیعت کے ذریعے سے ہونا قیاس کیا گیا ہے بیعت عقبہ اور زیر ذکر معاہدے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چاہے اور بستیوں میں بھی یہی طریقہ رہا ہو یا نہ ہو، اسلام میں واقعی یہی ہوا۔ کوئی تعجب نہیں جو ان اہل یورپ کے قیاس کا ماخذ یہی اسلامی بیعتیں رہی ہوں۔

(۲۴) ملاحظہ ہو یہ کہا گیا کہ ''انہیں چاہیے کہ مطالبہ نہ کریں'' اور یہ نہیں کہا گیا کہ ''وہ مطالبہ نہیں کر سکتے'' اس پر طویل اور اہم بحث کہ غیر مسلم ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے اور خود فعل نبوی بھی ابن رشد کی هداية المجتهد میں ''کتاب القصاص'' میں مذکور ہیں حنفی مذہب بھی یہی ہے اور مذکورہ ممانعت حربیوں سے متعلق کی جاتی ہے۔

(۲۵) ''اس کے ساتھ ملاحظہ ہو قرآن مجید (۳۳:۳۶) وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله و رسوله امرا ان يكون لهم الخيره من امرهم ومن يعص الله و رسوله فقد ضل ضلا لا مبيناً (یہ سورہ احزاب کی آیت ہے جو مدنی ہے) قبیلہ واری، افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کے لیے علاوہ ایک خاص شخص کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کرنے کے مرکزی حکومت کو زکات (جائدادی ٹیکس) دینا اور مرکزی حکومت کی جبری فوجی

Marfat.com

خدمت (بذریعہ جہاد) اور مرکزی حکومت کے تمام قوانین کی تعمیل یہ تین اہم اصول اختیار کیے گئے تھے۔ نتیجہ کی کامیابی کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔

(۲۶) اس دستاویز کی غیر معمولی اہمت کے باعث متعدد مولفوں نے اس سے خصوصی بحث کی ہے جس کی تفصیل اوپر متعلقہ باب میں دی جا چکی ہے اس لیے یہاں حذف کی جاتی ہے۔

(۲۷) پہلے مقدمے کیلیے دیکھیے بخاری ۶۱:۲۶۔ ۹۵:۱۵۱ ابن ہشام ص ۳۹۳ تا ۳۹۵ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵۴ التنبیہ للمسعودی ص ۲۴۷۔ دوسرے مقدمے کے لیے تفسیر طبری ج ۲۷ ص ۴۴ تا ۵۰۔ نیز بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی دارمی، احمد بن حنبل وغیرہ جن کے صفحوں کے حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں لفظ قصاص کے تحت مل جائیں گے۔ اول الذکر مقدمے میں مسلمان مولفوں نے اس الزام کو دہرایا ہے کہ یہودیوں نے توریت کی تحریف کی ہے اور لکھا ہے کہ زنا پر رجم کی سزا کا حکم یہودیوں نے چھپا دیا تھا۔ اس کا ثبوت اب دیگر ذرائع سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی شرقیانی پروفیسر (تارے کی تالیف جوئش فاؤنڈیشن آف اسلام) ہی نے یہ ناقابل تردید ثبوت ڈھونڈ نکالا ہے کہ ایک زانیہ کے گرفتار ہو کر آنے پر حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا توریت میں تو اس کی سزا رجم ہے اب آپ کیا حکم دیتے ہیں (دیکھیے انجیل یوحنا ۸/۵) توریت کے موجودہ ایڈیشن اس حکم رجم سے یکسر خالی ہیں۔

نجران کے عیسائیوں سے آنحضرت نے جو معاہدہ کیا تھا (اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ میں ہے) اس میں بھی ان کی داخلی عدالتی خودمختاری برقرار رکھی گئی تھی۔

(۲۸) قرآن مجید ۵:۴۲ تا ۵۰۔

(۲۹) کارالفسکی کا مضمون فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا "قاموس تاریخ وجغرافیہ کلیسا" عنوان انطاکیہ، عمود ۵۹۲ تا ۵۹۴۔

(۳۰) Assemani, Bible.. Orient. III, 2, P. XCVI نیز دخویے کی فرانسیسی "یادداشت فتوح الشام" ص ۱۰۶۔

(۳۱) یہ روما کے ڈے کورین سے مشابہ معلوم ہوتا ہے اور نقیب سنٹورین کے مماثل کہا جا سکتا ہے۔ عہد نبوی میں دس کا افسر عریف کہلاتا تھا تاریخ طبری ص ۲۲۲۴۔

(۳۲) سیرت نبوی کی کسی کتاب میں جنگ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اس وقت نقیبوں اور عریفوں سے مدد لی گئی تھی۔

(۳۳) "قد کان القاضی فی الصدر الاول یسمی مفتیا (المبسوط السرخسی ج ۱۶ ص ۱۰۹)

Marfat.com

(۳۴) "التراتیب الادرایه للکتانی" ج ا ص ۵۶ بحوالہ ابن جوزی

(۳۵) ایضاً بحوالہ موطا

(۳۶) مثلاً مبسوط سرخسی جلد ۱۶ ص ۷۶ میں ہے کہ "ایک مرتبہ آنحضرت نے حضرت عمرو بن العاص سے فرمایا کہ ان دونوں کا قضیہ چکاؤ۔ کہا کہ کیا آپ کی موجودگی میں میں فیصلہ کروں؟ فرمایا کہ ہاں۔ تو کہا کہ کس صورت پر؟ فرمایا کہ اس طور پر کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پر پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی۔"

(۳۷) مسند احمد بن حنبل ص ۲ ص ۱۸۷۔ ج ۴ ص ۲۰۵۔ ج ۵ ص ۲۶۔

(۳۸) مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۲۵

(۳۹) مثلاً الاستیعاب نمبر ۱۰۰۱

(۴۰) ترمذی ۱۳:۳:۱۰۳ ابو داؤد کتاب الاقضیہ ۲۳:۱۱۔ اعلام الموقعین لابن القیم ج ا ص ۴۳۔ طبقات ابن سعد ج ۲/۲ ص ۱۰۷ تا ۱۰۸۔

(۴۱) "من عمل عملا لیس علیه امنا فهورد" (مسلم ۳۰:۱۷ تا ۱۸) من استعملناه علی عمل فلیات بقلیله و کثیره فما اوتی منه اخذ وما نهی عنه انتهی". (ابو داؤد ۲۳:۵)

(۴۲) متن کے لیے دیکھیے ابن ہشام ص ۹۶۱ تا ۶۲ طبری ص ۲۷ تا ۲۹۔

(۴۳) موطا باب العقول۔ نیز سنن نسائی بر موقع۔

(۴۴) بخاری باب کتاب العلم۔

(۴۵) قانون حمورابی دفعات ۱۱۶، ۲۱۰، ۲۳۰ (یہ بابل کا بادشاہ تھا اس کا قانون ایک کتبے پر ملا ہے)

(۴۶) ایضاً دفعات ۱۹۶ و ۱۹۷، ۲۰۰۔

(۴۷) تائید کے لیے قرآن مجید ۵:۴۵ نیز

Hammrabi. Code, P, IX, III. 143. anleya. Cook, The Moses and The Code of nmurapi, in Loco, The (Reviewed in o12, Berlin 904, by kohler)

(۴۸) خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(۴۹) حدیث: انما الاعمال بالنیات، صحاح ستہ میں۔

(۵۰) موطاء وغیرہ میں باب العقول ملاحظہ ہو۔

(۵۱) ان الله یامر بالعدل والاحسان (قرآن مجید ۵:۴۵) نیز استحسان اور استصلاح کا ذکر اصول فقہ کی کسی کتاب میں۔

Marfat.com

(۵۲) قرآن مجید ۶:۱۶۴، ۱۵:۱۷، ۱۸:۳۵، ۳۹:۷، ۳۵:۲۸۔

(۵۳) حدیث: ''ادروا الحدود بالشبهات'' (بدایۃ المجتہد لابن رشد ''کتاب القصاص'') نیز ''ادروا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلو سبیله فان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبة'' (ترمذی ۱۵/۲)

(۵۴) انگلستان میں ابھی گزشتہ انیسویں صدی کے وسط تک کسی گاڑی، کسی درخت اور کسی دوسرے جاندار ''قاتل'' کو بھی قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی دیکھیے باب ہاوز کی انگریزی کتاب ''اخلاق ارتقاء کی حالت میں'' باب ''قانون وانصاف''۔ اس طرح جاہل عرب ہی کا زیادہ معقولیت پسند ہونا معلوم ہوتا ہے۔

(۵۵) کتاب الخراج ص ۱۳

(۵۶) استصواب کے سلسلے میں عتاب بن اسید گورنر مکہ نے جو مسلموں کو سابقہ قرض کا واجب الادا دلانے یا نہ دلانے کے متعلق آنحضرت سے دریافت کیا تھا (تفسیر طبری وخازن میں آیت ''مابقی من الربوا'' کے تحت) اسی طرح استصواب، مرافعہ، نگرانی یا تصحیح (معلوم نہ ہو سکا کس) کے سلسلے میں آنحضرت نے ایک افسر الضحاک بن سفیان کو لکھ بھیجا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کے شوہر کے خون بہا میں سے ورثہ دلائے۔ (الوثائق السیاسیہ)

(۵۷) مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۴۳، ۳۶۳

(۵۸) ورنہ قدیم عرب میں ملزم کا کھوج لگانے کے ''روحانی'' قوتوں سے مدد لی جاتی اور فال، قرعہ، جادو، ٹوٹکے، دیوبانی، ہاتھی جیسے غیر یقینی ذرائع برت میں آتے یا غیب دانی کے مدعی عراف، کاہنوں وغیرہ کی من گھڑت باتوں پر عمل کیا جاتا۔

(۵۹) اس مسئلے پر ایک مختصر بحث اور حضرت ابوبکر وعمر کے اقوال واعمال کے لیے دیکھیے الطرق الحکمۃ لابن القیم ص ۴ تا ۷۶۔

(۶۰) بخاری ۳۰:۴ تا ۷۔ ترمذی ۳:۱۱۷۔ ابوداؤد ۲۳:۱۷ ابن ماجہ ۱۲:۵ نسائی ۴۹:۱۳، ۲۳۔ ابن حنبل ج ۱۱ ص ۹۰ تا ۹۱۔ نیز اقضیہ رسول اللہ للقرطبی ص ۸۲۔ ابن القیم، الطرق الحکمہ ص ۲۶۶۔

(۶۱) ترمذی ۱۳:۵۔ ابوداؤد ۲۳:۶۔ ابن حنبل ج ۱ ص ۱۱۱، ۱۴۹، ۱۵۰، ۹۰، ۹۶۔ کتانی ج ۱ ص ۲۵۷ تا ۶۱۔

(۶۲) ابن حنبل ج ۱ ص ۲۸۸۔

(۶۳) البینة علی المدعی والیمین علی المدعی علیه (والیمین علی من انکر)

Marfat.com

بخاری ۴۸:۶،۵۲:۶،۲۰:۲۰۔ مسلم ۳۰:۱،۲:۱۔ ابوداؤد ۲۱:۱۳،۲۲:۲۳،۲۳:۲۴ ترمذی ۱۳:۱۲ نسائی ۴۹:
۳۶، ابن ماجہ ۳۶:۱۸ ابن حنبل ج ا ص ۳۴۲، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۶۳۔ المبسوط للسرخسی ج ۱۷
ص ۲۸۔ الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص ۹۴)

(۶۴) مسلم ۳۰:۱، ترمذی ۱۳:۱۳۔ ابوداؤد ۲۱:۲۳ (چنانچہ قطعی بشاہد و یمن)

(۶۵) الطرق الحکمیۃ ص ۱۲۸

(۶۶) المبسوط للسرخسی ج ۱۶ ص ۹۱ نیز محاضرۃ الاوائل ص ۹۷

(۶۷) الطرق الحمکمیة لابن القیم ص ۶۰

(۶۸) سنن نسائی میں کتاب آداب القضاۃ دیکھئے

(۶۹) المعارف لابن قتیبہ ص ۲۲۱، وفیات لابن خلکان برموقع، استیعاب لابن عبدالبر، نمبر ۳۱۵۹

(۷۰) اعلام الموقعین لابن القیم ج ا ص ۳۰۔ بعض اور تفصیلوں کے لیے دیکھیے المبسوط ج ۶ ص ۶۶
کنز العمال ج ۲ ص ۱۷۵)

(۷۱) اعلام ج ا ص ۷۳ تا ۷۴ آخری جملے کی تائید کے لیے دیکھیے، سنن نسائی کتاب آداب
القضاۃ۔ نیز القارنات ص ۴۲

(۷۲) بحوالہ السیاسۃ الشرعیہ بعبد الوھاب الخلاف ص ۴۷

(۷۳) تفصیل کے لیے امیل تیان کی مذکورہ بالا فرانسیسی تالیف، برموقع

(۷۴) بنام حضرت ابوعبیدہ (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۷) بنام حضرت معاویہ (المبسوط
للسرخسی ج ۱۶ ص ۶۵. العقد الفرید لابن عبدربہ ج ا ص ۲۵) دیگر بنام
شریح (مبسوط ج ۱۶ ص ۶۶۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۷۵) بنام حضرت ابوموسیٰ علاوہ اس کے
جس کا آگے ذکر ہے، (العقد الفرید ج ا ص ۲۶)

(۷۵) مبسوط ج ۱۶ ص ۶۰

(۷۶) جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن ۱۹۱۰ء ص ۳۰۷ تا ۳۲۳

(۷۷) مثلاً سرخسی نے مبسوط ج ۱۶ ص ۶۰ و مابعد میں اور ابن القیم نے اعلام الموقعین جلد اول
میں۔

(۷۸) عربی متن اور جلد عربی ماخذوں کے لیے دیکھیے مارگولیوث کا مذکورہ مضمون نیز میری تالیف
الوثائق السیاسیہ، دستاویز، ص ۳۲۷

(۷۹) کتانی ج ا ص ۲۶۴ بحوالہ ہدایہ۔ ("وفرض له اربعين او قية من فضة" المنتقى في
اخبار ام القرى للفاكهي ص ۴۰

(۸۰) مبسوط ج ۱۶ ص ۱۲۲

Marfat.com

(۸۱) ابوداؤد ۲۳: ۲۸ قرطبی ص ۴ تا ۵۔ کتانی ج ۱ ص ۲۹۶)

(۸۲) مبسوط ج ۲۰ ص ۷۵

(۸۳) مبسوط ج ۲۰ ص ۸۸ قاموس وغیرہ میں مادہ حبس

(۸۴) ابن ہشام ص ۴۴۴۔ ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۴۱، مسلم کانڈ خط آف اسٹیٹ ۸۲ تا ۸۴

(۸۵) مبسوط ج ۱۶ ص ۳، ۷۳، ۷۴، ۱۲۴۔ طبقات ابن سعد ۱/۲ ص ۹۷۔ کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۵

(۸۶) ولاۃ مصر للکندی ص ۳۵۶ تا ۳۵۷۔ الحکم بن ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل کے لیے دیکھیے مقری کی نفح الطیب۔ طبع یورپ، جلد ۱، ص ۵۵۷ میں اس حوالے کے لیے پروفیسر جمیل الرحمٰن مرحوم کا ممنون ہوں۔ اسی طرح ماوردی کی الاحکام السلطانیہ میں بھی مجھے کچھ واقعات ملے ہیں۔

(۸۷) کتاب الاذکیا، (مخطوطہ باڈلین) ورق ۳۳ نیز دیکھیے کتاب القارنات ص ۲۹

(۸۸) بحوالہ کتانی ج ۱ ص ۲۷۱ تا ۲۷۲

(۸۹) (بصیر بالبناء) کتانی ج ۱ ص ۲۸۰ تا ۸۱

(۹۰) (خراص) کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۱۴۳۵ تا ۸۶ نیز بکثرت دیگر حوالے

(۹۱) الطرق الحکمیہ لابن القیم ص ۱۹۶ مزید حوالوں کے لیے مفتاح کنوز السنہ عنوان قائف

(۹۲) الکتانی، التراتیب الاداریہ، ج ۱، ص ۲۶۰

(۹۳) ہر فقہی کتاب میں باب آداب القضاء ملے گا۔ نیز دیکھیے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص ۱۲۴ تا ۱۲۷ اور مفتاح کنوز السنۃ مولفہ فنسک میں متعلقہ احادیث کے لیے تحت لفظ ''قضاء''

(۹۴) قرآن سورۃ نجم آیت ۳۔۴

(۹۵) لفظ کتاب کے معنے فرض مقررہ کے بھی ہیں۔

(۹۶) قرآن ۲۳: ۲۱۔ ۵۹: ۷ وغیرہ

(۹۷) پورے متن کے لیے دیکھیے ابن ہشام ص ۹۶۸ تا ۷۰ تاریخ طبری ص ۱۷۵۳ تا ۵۵۔ البیان والتبیین للجاحظ ج ۲ ص ۲۴ تا ۲۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۴ ص ۱۲۲ تا ۲۳ العقد الفرید لابن عبدربہ باب خطب وغیرہ وغیرہ نیز میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ بر موقع۔

(مجلۂ تحقیقات علمیہ جامعۂ عثمانیہ سالنامہ ۱۹۳۶ء)

مرکزی سیاست اور قانونِ شخصی

قانون شخصی یعنی نکاح، طلاق، وراثت اور ان کے مماثل امور کے قواعد و احکام ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عام طور پر ہر مذہب بلکہ ہر فرقہ دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے، اس کے مختلف پہلو ہیں۔ مرکزی اور اساسی، سیاست میں ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس مختصر نوٹ میں صرف چند پر توجہ منعطف کرائی جائے گی۔

اس کا فلسفہ:

یہ تاریخی واقعہ قابل ذکر ہے کہ خلافت راشدہ میں مسلمان سیلاب کی رفتار سے دنیا میں پھیل گئے، ۲۶ ھ میں یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ میں دارالخلافہ کا رقبہ مدینہ سے ایک طرف اندلس (اسپین) تک، اور دوسری طرف ماوراء النہر میں چینی ترکستان تک وسیع ہو گیا، اس وقت رعایا کی بہت بڑی اکثریت غیر مسلم تھی، اور ان لوگوں کی تھی جو کل تک حکمران تھے، اور ''راتوں رات'' محکوم بن گئے تھے، لیکن اپنے ماضی کو بھولے نہ تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں جانشینی کے مسئلے پر خانہ جنگی شروع ہوئی جو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شکست اور عبدالملک بن مروان کی کامیابی تک عملاً بیس (۲۰) سال جاری رہی، تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اس خلفشار کے زمانے میں بھی کسی جگہ غیر مسلم رعایا نے بغاوت نہ کی حتیٰ کہ جب قیصر روم نے اپنی سابق رعایا کو جو ابھی تک عیسائی تھی، ترغیب دلائی اور فوجی مدد کا وعدہ کیا، اس وقت بھی یہ غیر مذہب والے (مسلمانوں) کی ماتحتی کو ترجیح دیتے رہے، اور اپنے ہم مذہب بیزنطینیوں کی حکومت میں دوبارہ آنا پسند نہ کیا۔

Marfat.com

اس کی وجہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام سے کچھ پہلے بیزنطینی حکومت میں عیسائیوں کے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ پادری کہتے تھے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کاملاً خدا ہیں، کچھ کہتے تھے کہ نہیں، ان میں بیک وقت دو طبیعتیں ہیں اور وہ نیم خدا اور نیم انسان ہیں، ایک تیسرے گروہ نے اس میں یہ تطبیق دی کہ ان میں طبیعتیں دو تھیں، لیکن مشیت صرف ایک تھی، شہنشاہ اس تیسرے عقیدے کی طرف مائل ہوا، اور ساری رعیت سے اس کو قبول کرانا چاہا، اس سلسلے میں بڑی سختی برتی، اور قتل وخون سے بھی دریغ نہ کیا۔

اسی زمانے میں اسلام کا ظہور ہوا، اور پیغمبر اسلام روحنا فداہ نے شہنشاہ ہرقل اور اس کے صوبہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی، ایک صوبہ دار مسلمان ہو گیا، لیکن دوسرے صوبہ دار نے اس دعوت کو ہتک سمجھ کر سفیر ہی کو قتل کر ڈالا، ہرقل نے نومسلم صوبہ دار کو پھانسی کی سزا دی، اور مجرم صوبہ دار کو نہ صرف کوئی سزا نہیں دی بلکہ رعایا کو ضمیر کی آزادی دینے سے بھی انکار کیا، اس پر جنگ چھڑ گئی، ہالینڈی مستشرق دخویے (De Goeje) اپنی کتاب "شام کی فتح پر یادداشت" صفحہ (۱۰۴ تا ۱۰۶) میں لکھتا ہے کہ "اس وقت یہ حیرت انگیز بات نظر آئی کہ بیزنطینی علاقے کے عیسائیوں نے مسلمانوں کا حملہ آوروں کی طرح نہیں بلکہ نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا، اور یہ بے وجہ نہ تھا، کیونکہ مسلمان فاتحوں نے خلیفہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے مطابق مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے جس نرمی کا سلوک کیا وہ ان کے سابق آقاؤں کے ذلیل ظلم کے بالکل برعکس تھا، ہرقل نے اس عیسائی رعایا کے جس نے سرکاری عقائد کو ماننے سے انکار کیا تھا، ناک اور کان کاٹے اور ان کے مکان ڈھائے، اس کے برخلاف عرب اپنے مفتوحوں کے ساتھ صلح جویانہ برتاؤ کرتے رہے، اپنے وعدوں کی شدت سے پابندی کی، اس زمانے کے ایک نسطوری پادری کا خط اب تک محفوظ ہے، وہ لکھتا ہے کہ "ہمارے نئے آقا عرب ہمارے عیسائی مذہب سے ذرا بھی نہیں جھگڑتے، اسکے برعکس ہمارے دین کی حفاظت اور ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کو عطیے دیتے ہیں۔"

مسلمانوں نے قرآنی احکام کی تعمیل میں مفتوحہ علاقوں میں اپنا قانون جاری نہیں کیا، بلکہ ہر طبقے کو قانونی اور عدالتی آزادی دیدی، مسلمانوں کے لیے اسلامی قانون اور

Marfat.com

غیر مسلموں کے لیے ان کے اپنے قانون پر عمل رہا، حتیٰ کہ حاکم عدالت بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اگر فریقین مقدمہ نسطوری فرقے کے عیسائی ہوتے تو قانون بھی نسطوری اور عدالت بھی نسطوری اور حاکم عدالت بھی نسطوری ہوتا تھا، جو نسطوری قانون کے مطابق فیصلہ کرتا تھا، اور ہر فرقے کے مذہبی پیشواؤں کو اجازت تھی کہ وہ اپنا حاکم عدالت خود مقرر کیا کریں۔

مسلمان حکومتیں ہزار سال سے زیادہ تک اس پر عمل کرتی رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم رعایا نے نہ کبھی مذہبی اساس پر بغاوت کی اور نہ اپنے ہم مذہب بیرونی حملہ آوروں کی مدد کی۔

یہ طریقہ مدینہ، دمشق، بغداد اور قسطنطنیہ ہی میں نہیں بلکہ دہلی اور حیدر آباد میں بھی تھا، کیا ہندو بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہزار سالہ دور حکومت میں حکومت نے کبھی ہندوؤں پر ان کے شخصی مسائل میں اپنا قانون جاری کیا ہو؟ نکاح، طلاق، وراثت، عقد بیوگان اور اس کے مماثل دوسرے معاملات میں ہمالیہ سے لے کر لنکا تک ہر فرقہ اور ہر مذہب اپنے قانون پر عمل کرتا رہا۔

جو حکومت اپنی قوت کے بل پر ساری رعایا کو ایک ہی قانون پر عامل بنانا چاہتی ہے اسے سوچ لینا چاہیے کہ وہ شہنشاہ ہرقل کا انجام چاہتی ہے یا خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا۔
یہ ہوا مسئلے کا فلسفیانہ رخ۔ اس کی عملی حیثیت! آدمی کو بعض وقت وہم ہو جاتا ہے اور وہ نامعلوم چیزوں سے متعلق قسم قسم کے مفروضے تراش لیتا ہے۔ اسلام میں طلاق کی آزادی ہے، انجیل میں طلاق کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مغرب نے طویل تجربے کے بعد مجبور ہر کر یورپ اور امریکہ دونوں میں کشوری قانون کے ذریعے طلاق کی اجازت دیدی، اور آج طلاقوں کا تناسب یورپ و امریکہ میں اسلامی ممالک سے اونچا ہو چکا ہے، اور چونکہ عدالتی طلاق گراں بھی ہے، طویل وقت بھی لگتا ہے اور قسم قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور چونکہ فرنگستان میں زنا بالرضا جائز ہے، اس لیے بغیر طلاق کے ہزاروں لاکھوں شادی شدہ مرد داشتاؤں کے ساتھ، اور شادی شدہ عورتیں اپنے دوستوں کے گھر میں روز افزوں رہنے لگی ہیں۔

فرنگی قانون میں طلاق کی صرف ایک صورت ہے، یعنی تفریق عدالتی، اسلام میں پانچ صورتیں ہیں:

(۱) یک طرفہ شوہر کی مرضی پر۔

(۲) یک طرفہ بیوی کی مرضی پر (عقد نکاح میں تفویض طلاق کے ذریعے سے)

(۳) طرفین کی رضامندی سے (خلع کے ذریعہ سے)

(۴) تحکیم اور ثالثی کے فیصلے پر۔

(۵) تفریق بحکم قاضی (یعنی حاکم عدالت)

مہر بھی جو اسلامی قانون سے مخصوص ہے طلاق میں ایک مؤثر مانع ہے، اور طلاق سے پہلے شوہر کو پوری طرح سوچنا پڑتا ہے، قرآن وحدیث میں طلاق کی شدید مذمت اور بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیم ہے اس کو فرنگی اور جمہوری دونوں زمانوں میں اس لیے کچلا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کو مدارس سے خارج رکھا گیا، اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں، اگر کسی درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئیں تو اس کو توڑنے کے بجائے جڑ کو دیکھنا چاہیے کہ اس میں کونسا کیڑا لگ گیا ہے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ مغلیہ دور کے اختتام پر جب انگریزوں نے مردم شماری کرائی تو مسلمانوں میں تعدد ازدواج کی تعداد دو فی ہزار تھی، اقوام متحدہ کی رپورٹ ہے کہ وحدت ازدواج پر عامل پاناما میں پچھتر فی صد بچے نکاح کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان ممالک میں مصر سب سے زیادہ "ترقی یافتہ" ہے، وہاں ایسے بچے صرف ایک فیصد ہیں، تعداد ازدواج کا کبھی یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ بہ کثرت مسلمان اس پر عامل ہوں، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ تعداد ازدواج سے نہیں بلکہ تبلیغ سے ہوا ہے، تبلیغ میں اس دین کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے، جو معقول اور انسانیت کے لیے مفید ہو، روپے پیسے سے مصیبت زدوں کا ایمان خریدا جا سکتا ہے لیکن نہ وہ راسخ ہوتا ہے اور نہ دیرپا۔

اسلامی ملکوں میں یتیم پوتے کو اسکے چچا کی موجودگی میں دادا خود ہی ہبہ میں وصیت کے ذریعہ سے بہت کچھ دے دیتا ہے، قانون کے ذریعہ اسکو دادا کی وراثت میں لازمی حصہ دلانے میں قباحت یہ ہے کہ یہ مسائل عقائد کا جز ہیں اور اسلام میں کوئی انسانی

Marfat.com

طاقت خدائی احکام کو بدلنے کی مجاز نہیں، جو حکومت اس میں دخل دینا چاہے تو اسے ہرقل کا انجام پیش نظر رکھنا چاہیے، اسلام میں ہر شخص کو آزادی ہے کہ اسکے فرقوں میں سے جس فرقے سے چاہے تعلق رکھے، سنی چاہے تو شیعہ بن جائے، شیعہ چاہے تو سنی بن جائے، اسے کوئی نہیں روک سکتا لیکن اگر کوئی مسلمان حکومت سنیوں پر شیعہ قانون اور شیعوں پر سنی قانون نافذ کرے تو اس سے رعایا کی دلشکنی اور حکومت سے نفرت پیدا ہوگی، آج پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں مسلمان اپنے دین پر راسخ ہیں۔ مصر اور الجزائر سے زیادہ روس کے مسلمان اپنے دین پر جمے ہوئے ہیں، اور پچاس سالہ دباؤ نے ان کو مذہب سے پھیرنے کے بجائے اس پر اور مستحکم کر دیا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۷۲ء)

Marfat.com

تالیفِ قلبی

(عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا ایک اہم اصول)

پہلی اسلامی مملکت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قائم ہوئی۔ اس کی خارجہ سیاست کے بہت سے اصول تھے ان پر الگ الگ بحث کیے بغیر نہ ان کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ان کا صحیح مفہوم۔ یہاں صرف ایک چیز پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ غیر ممالک کے باشندوں کا دل موہ لینا ہے۔

سوال کرنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اس کا کیا ثبوت کہ مملکت اسلامیہ کی خارجہ سیاست میں یہ اصول عہد نبوی میں ملحوظ رہا؟ مگر نظری احکام اور عملی نظائر کی روشنی میں اس استنباط کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

اولاً قرآن مجید میں سرکاری موازنے کے لیے خرچ کے جو مدات مقرر کیے گئے ہیں، ان میں عام محتاجوں، مسکینوں وغیرہ کے ساتھ ایک اہم مد "المولفة قلوبهم" کی دی گئی ہے کہ دلوں کے موہ لینے کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے۔

جو چیز قرآن مجید میں موجود ہو اور جناب رسالت مآب کا زندگی بھر اس پر عمل رہا ہو اور اس کی منسوخی کا اشارہ، کنایۃً تک کسی حدیث نبوی میں ذکر نہ ہوا ہو تو محض بعض متاخر فقہاء کا بیان کہ یہ منسوخ شدہ حکم ہے، کسی راسخ العقیدہ مقلد کے لیے قابل قبول نہیں رہتا۔ ان فقہاء کو حضرت عمر فاروق کے شاید ایک جملے سے دھوکا ہوا، سیاق و سباق سے بچھڑا ہوا بیان ایک خالص سیاسی معاملے کے متعلق بعض غیر سیاست داں (مگر نیک طینت و نیک نیت) فقہاء کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو اس سے رسول اللہ کے جاری و باقی رکھے ہوئے حکم

Marfat.com

قرآنی کو منسوخ کرنے کی ذمہ داری لینی کم از کم مجھے تو پسند نہیں۔ اصل میں حضرت عمر کی طرف یہ بیان منسوب ہے کہ "اب خدا نے اسلام کو عزت دی ہے اس لیے کسی کو اسلام لانے کی ترغیب دینے کے لیے رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ اگر چہ یہ روایت صحیح بھی ہے تو کیا اذا فات الشرط فات المشروط کی بنا پر یہ ناگزیر نہیں کہ دیگر زمانوں میں اور دیگر ممالک کی حد تک جہاں شوکت فاروقی کارفرما نہ ہو، یہ حکم پھر بحال ہو جائے؟ یوں بھی دل موہ لینے یا تالیف قلبی کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دینے کے لیے کسی کو انعام واکرام دیا جائے۔

پانچویں صدی ہجری کے وسط میں وفات پانے والے مشہور حنبلی امام ابویعلیٰ نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ (ص ۱۱۶ میں، جو حال میں چھپی ہے) آیت "المولفۃ قلوبھم" کی بڑی گہری اور دُور رس تشریح کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

واما المولفة قلوبهم وهم اربعة اصناف
رہے مولفۃ القلوب، سو ان کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ صنف تتالف قلوبهم لمعونة المسلمين
ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل مسلمانوں کو مدد دینے کے لیے موہ لیے جائیں۔

۲۔ وصنف تتالف للكف عن المسلمين
ایک قسم ان کی ہے جن کی تالیف قلبی اس لیے کرنی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں۔

۳۔ وصنف تتالف لیرغبهم فی الاسلام
ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام قبول کرنے کے لیے ترغیب دی جاتی ہو۔

٤۔ وصنف بتالفهم ترغيبا لقومهم وعشائرهم فی الاسلام
اور ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کی تالیف قلبی سے ان کی قوم اور

Marfat.com

خاندان والوں کو اسلام لانے کی ترغیب ہوتی ہو۔

فیجوزان یعطی کل واحد من ھذا الاصناف من سھم المولفۃ مسلما کان او مشرکا۔

چنانچہ یہ چیز جائز ہے کہ ان اقسام میں سے ہر ایک کو مولفۃ القلوب کی مد سے حصہ دیا جائے چاہے وہ مسلمان ہو یا مشرک۔

ابن رشد نے اپنی مستند تالیف بدایۃ المجتہد (کی کتاب الزکاۃ جملہ خامسہ، فصل اول، مسئلہ دوم) میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی بھی اسی کے قائل تھے کہ یہ قرآنی حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ اب تک باقی ہے، اور امام وقت اس سے مصالح اسلامی کا کام لے سکتا ہے۔

اہل سنت کے تین بڑے مذاہب کے مستند نمائندوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد یہ عقلی دلیل اضافہ کی جاسکتی ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر ملک میں متمدن سلطنتوں کو

۱۔ دشمن کو دوست اور مددگار بنانے کے لیے

۲۔ یا کم از کم غیر جانبدار ہو جانے کے لیے

۳۔ اور دوستوں کو انعام دے کر مزید اور عظیم تر کارگزاریوں پر آمادہ کرنے کے لیے

۴۔ نیز دیگر دوستوں کو ترغیب و تشویق دلانے کے لیے

۵۔ یا ڈھلمل لوگوں کو تائید میں مستحکم کرنے کے لیے

۶۔ یا مماثل مصالح کے لیے

اس کی ضرورت رہتی ہے کہ "سیکرٹ سروس" سے کام لیں اس اجمال کی بیسیوں تفصیلیں ہو سکتی ہیں۔

اب ہم سیرۃ النبی، کے حصہ نظائر پر نظر ڈالیں گے۔

ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا کہ ایک مرتبہ وہاں سخت قحط پڑا۔ آنحضرت نے بروایت فقیہ کبیر، سرخسی (مبسوط ۱۰: ۹۱، ۹۲ وغیرہ) ابوسفیان کے پاس پانچ سو اشرفیوں کی خطیر رقم بھیجی کہ مکے کے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرے، ابوسفیان نے بے بسی کے عالم میں جھنجلا کر کہا کہ۔ محمد چاہتا ہے کہ اب مکے کے غرباء اور نوجوانوں کو ورغلا کر ہمارے خلاف

Marfat.com

کھڑا کر دے۔

ابھی صلح حدیبیہ نہیں ہوئی ہے اور مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث قریش کی تجارت بند ہو کر روزگار پر آفت لا چکی ہے۔ ابو سفیان کا روزگار بھی تجارت ہی سے تھا۔ آنحضرت اسے مدینے کی اچھی کھجوروں کی ایک بڑی مقدار بھیجتے ہیں اور معاوضے میں طائف کا چمڑا طلب کرتے ہیں۔

ابو سفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہ سے آنحضرت نکاح فرما لیتے ہیں۔ کیا ان تمام خاموش دل دہیوں کا (ا) مجموعی اثر بالآخر کچھ بھی نہ ہوا ہوگا؟

مکے میں مذکورہ بالا قحط کا زمانہ ہے۔ وہاں غلے کی درآمد مشرقی عرب خاص کر یمامہ سے ہوا کرتی تھی، یمامہ کے ایک سردار ثمامہ بن اثال نے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت کی اجازت سے یہ حکم دیا کہ اس کے علاقے سے اب غلہ مکے کو برآمد نہ کیا جائے۔ مکے والے پیٹ سے مجبور ہو گئے اور جناب رسالت مآب کو اپنی رشتہ داری اور صلہ رحمی کا واسطہ دے کر خط لکھا کہ یمامہ سے غلے کی مکے کو برآمد کی ممانعت منسوخ کر دی جائے۔ آنحضرت نے ایسا ہی کیا۔ کیا یہ سب ہی اہل مکہ پر بے اثر رہا ہوگا؟

یہ غیر مسلموں کو اسلام کے حق میں متاثر کرنا تھا۔ اس کے علاوہ نومسلموں کو بھی بڑے بڑے انعام و اکرام دیے جاتے، ان کے اعزاز ملحوظ رکھے جاتے، اور ہر طرح انکو محسوس کرایا جاتا کہ صرف روحانی اور اخروی ہی نہیں، دنیوی اور مادی حیثیت سے بھی ان کا جدید مذہب ان کے لیے سراسر مفید ہے۔ علاوہ اور مواقع کے فتح مکہ کے بعد ابو سفیان وغیرہ نومسلموں کو سینکڑوں اونٹ فی کس بطور انعام دیے گئے۔ بخاری شریف میں ہے:

خیارکم فی الجاهلیة خیارکم فی الاسلام اذا فقهوا

جو زمانہ جاہلیت میں معزز تھے وہ اسلام میں بھی ویسے ہی معزز رہیں گے جب وہ اپنے دین سے واقفیت (میں کمال) پیدا کر لیں۔

حاتم طائی کا بیٹا مدینہ آیا تو آنحضرت نے اس کے لیے مسند بچھائی۔ ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔

Marfat.com

سفیروں کو انعام و اکرام دینے میں جناب رسالت مآب کو یہاں تک اہتمام تھا کہ مرض الموت کی وصیتوں میں سے ایک اسی کے متعلق تھی کہ آپ کا طرزِ عمل مسلمان آیندہ بھی جاری رکھیں۔

یہ ظاہر ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جا سکتے ہیں۔ کبھی انعام فوراً دے دیا جا سکتا تو کبھی وعدے ہی پر اکتفا کرنی ہوتی۔ مثلاً ابو ثعلبہ خشنی نے آنحضرت سے درخواست کی کہ اگر رومی (بیزنطینی) علاقہ فتح ہو تو مجھے فلاں علاقہ جاگیر میں دیا جائے۔ آنحضرت نے اسے منظور فرمایا۔ (کتاب الاموال لابی عبید ص ۶۷۹) اسی طرح ایک شیبانی شخص نے آکر اسلام قبول کیا اور کہا۔ یا رسول اللہ! اگر شہر حیرہ فتح ہو تو مجھے وہاں کے امیر بُقیلہ کی بیٹی مال غنیمت سے بطور انعام عطا فرمائیے۔ آنحضرت کے وعدے کی خلافت راشدہ میں حضرت خالد بن الولید نے تعمیل کی عزت حاصل کی (ایضاً ۴۸۷)۔ ایسا ہی ایک معاملہ تمیم داری کا ہے۔ کہتے ہیں ہجرت نبوی سے بھی قبل یہ آ مسلمان ہوئے اور وعدہ لیا کہ اگر فلسطین فتح ہو تو حبرون، عینون اور بیت ابراہیم نامی گاؤں ان کو جاگیر میں دیے جائیں بہ ترک تفصیل، مختصر یہ کہ اس کی تعمیل کا موقع خلافت فاروقی میں مل سکا۔ (الوثائق السیاسیہ دستاویزاتِ متعلقہ نیز مقریزی کی الضوالساری لمعرفۃ خبر تمیم الداری مخطوطہ ۔ پاریس و لانڈن)۔

تالیف قلبی کے ایک اور پہلو سے بحث کر کے آج کی صحبت ختم کی جاتی ہے شہر طائف کا وفد مدینہ آتا ہے، اور مسلمان ہونے پر آمادہ ہے، شرط یہ پیش کرتا ہے کہ انہیں نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، ان کے لیے زنا حرام نہ رہے، ان کے شہر کو بھی مکے کی طرح ایک حرم قرار دیا جائے جہاں کے درخت کاٹنا اور جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہو، آنحضرت نے جو عام جبری فوجی خدمت نافذ فرمائی تھی اور جہاد کو فرض قرار دیا تھا اس سے ان کو مستثنیٰ کیا جائے، اور زکاۃ سے بھی وہ بری رہیں۔ آنحضرت نے نماز اور زنا کی شرطوں کو رد فرما دیا اور آخری دو شرطیں منظور کر لیں اور یہ رعایت بھی کہ طائف کا بت خانہ توڑنے کے لیے اہل طائف کو مجبور نہ کیا جائے بلکہ مدینے سے سرکاری افسر جا کر اسے منہدم کرائیں۔

اور جب وفد چلا گیا تو حیرت زدہ صحابہ سے آنحضرت نے فرمایا کہ جہاد اور زکاۃ

Marfat.com

کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ یہ رعایت ان کو دی گئی ہے لیکن جب اسلام ان کے دل میں گھر کرلے گا تو وہ خود بخود جہاد بھی کریں گے اور زکات بھی دیں گے اور ہوا بھی بعد کو یہی۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تالیف قلبی کس حد تک کی جاسکتی ہے اور کن باتوں میں اسے مادی فائدوں کے باوجود روا نہیں رکھا جاسکتا۔

غرض "والمولفة قلوبهم" اور "الانفال لله والرسول" کے ذریعے سے قرآن مجید نے عملی سیاسیات کی جو نہایت اہم اور دُور رس تعلیم دی اور حکمراں کو صوابدید کا جو وسیع حق دیا، اس کی عہد نبوی کی نظیروں سے کافی تشریح اور توضیح ہوتی ہے۔ زندہ قوموں میں اجتماعی مفاد کے لیے تالیف قلبی کے لیے خصوصی وزارت قائم ہوتی ہے تو مردہ قوموں میں رشتہ داری اور انفرادی مفاد کے لیے مملکت کا نقصان روا رکھا جاتا ہے۔ ایک جیتتا اور نفع حاصل کرتا ہے اور دوسرا کھوتا اور نقصان اٹھاتا ہے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔

حواشی

(۱) یہ لکھ کر عرصہ ہوا۔ اب اس کی طباعت ثانی کے وقت ایک بڑے پرانے مولف کے ہاں اس کی تائید نظر سے گزری۔ محمد بن حبیب کی کتاب المحبر ۸۸تا۸۹ میں بی بی ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے متعلق لکھا ہے:

"چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ الضمری کو حبشہ بھیجا اور انہوں نے بی بی ام حبیبہ کا (وہاں) رسول اللہ سے نکاح کردیا یہ فتح مکہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی کہ (عسى الله ان يجعل بينكم وبين الذين عاديتم منهم مودة) ممکن ہے کہ (اس سے) خدا تم میں اور تمہارے ساتھ عداوت رکھنے والوں میں دوستی پیدا کردے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بی بی ام حبیبہ بنت ابی سفیان سے نکاح کرنا ہی دوستی تھا اور اسی باعث ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نرم پڑگیا اور یہی دوستی تھی (جس کا آیت میں اشارہ ہے)۔

(رسالہ نظامیہ، حیدرآباد دکن ربیع الانور ۱۳۵۷ھ)

Marfat.com

تصادم قوانین کا اسلامی تصور اور عمل

قانون کی ایک شاخ ہے جسے خانگی یا شخصی قانون بین الممالک بھی کہتے ہیں اور ''تصادمِ قوانین'' بھی، اگرچہ تصادمِ قوانین اصل میں اس شعبہ علم کے ایک باب کا نام ہے، لیکن اس جزء کا کل پر بھی بلا امتیاز اطلاق عام طور سے ہوتا ہے، اس کی اہمیت میں روز بروز اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جس تناسب سے دنیا کی خود مختار اور مقتدر قوموں میں خود اکتفائی کی جگہ باہمی احتیاج نیز ثقافتی نقطہ نظر سے روشن خیالی اور وسعت قلب بڑھ رہی ہے، اس علم میں زیادہ تر اجنبیوں کی قومیت اور ان کے مسائل شخصی اور ان پر اختیارِ سماعت سے بحث ہوتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عمومی قانون بین الممالک اور خانگی قانون بین الممالک میں کوئی مکمل حد فاصل نہیں قائم کی جا سکتی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض مسائل سے ان دونوں علموں میں بحث ہوتی ہے، غالباً یہی وجہ تھی کہ مسلمان فقہائے سلف نے ان دونوں سے الگ الگ ابواب میں بحث کرنے کے بجائے فقہ کی کتابوں میں ایک ہی باب میں دونوں کا ذکر مناسب خیال کیا تھا، لیکن ہماری موجودہ ضروریات کا تقاضا ہے کہ اس کی کوشش کی جائے کہ متعلقہ مواد کو چن کر الگ کر کے ایک مستقل شکل دینے کی سعی کی جائے۔ یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب لکھی جائے، اس موضوع پر مواد کی بھی کوئی کمی نہیں، لیکن آج کی صحبت میں صرف اس کے خط و خال پر عام روشناسی کافی ہوگی۔

میں نے یہاں ''اسلامی تصادم قوانین'' کی اصطلاح عمداً استعمال نہیں کی ہے،

۱۔ ''معارف''، جنوری ۱۹۴۶ء، شمارہ نمبر ۲، جلد ۵، دار المصنفین اعظم گڑھ، (انڈیا)

Marfat.com

کیونکہ اس سے یہ گمان ہوسکتا تھا کہ مختلف مذاہب فقہ میں تصادم ہو، مثلاً ایک فریق مقدمہ سنی ہو اور دوسرا شیعہ، تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ یہاں میں اس سے زیادہ وسیع مفہوم سے بحث کرنا چاہتا ہوں، مسلمانوں کے تصور تصادم قوانین سے بحث کرتے وقت حسب ذیل قسم کے مسائل کا ذکر کرنا ہوگا:

1. مسئلہ قومیت اور
2. مستامنون یعنی امن لے کر ہمارے ملک میں عارضی طور سے آئے ہوئے غیر ملکیوں ہی سے بحث نہ ہوگی، بلکہ
3. تصادم قوانین سے،

(الف) جب کہ ایک فریق مقدمہ مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہو۔
(ب) جب کہ دونوں غیر مسلم ہوں لیکن الگ الگ ملتوں کے ہوں۔
(ج) جب کہ فریقین مسلمان تو ہوں لیکن الگ الگ مذہب فقہ کے پیرو ہوں۔
(د) بر بنائے تبدیل دین.........نیز

4. اسلامی مملکت کی مسلم رعایا کی حیثیت سے بھی جب کہ وہ

(الف) کسی دوسرے اسلامی مملکت میں
(ب) کسی غیر مسلم مملکت میں ہوں

ایک مختصر مضمون میں سرسری خاکے کے سوا اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں، اس کے علاوہ اس مضمون میں صرف راسخ العقیدہ لوگوں کے خیالات سے بحث کی جائے گی۔ ان قدیم یا جدید رواجوں سے بحث نہ ہوگی جو مسلمانوں کی مملکتوں میں پائے تو جاتے ہوں لیکن جن کی اسلامی قانون اجازت نہ دیتا ہو۔

(ا) قومیت:

جس چیز کو آج کل ہم قومیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا آغاز خونی رشتہ سے ہوا ہوگا اور انسانی تمدن میں ترقی پر دیگر عوامل بھی سیاسی وحدتوں میں استحکام پیدا کرنے میں حصہ لیتے رہے ہوں گے۔ چنانچہ ہمیں جغرافی، لسانی، نسلی، رنگی، قبائلی اور دیگر

Marfat.com

عصبیتوں سے سابقہ پڑتا ہے، اور مختلف زمانوں اور مختلف اقلیموں میں انہی عصبیتوں میں سے کسی نہ کسی کو قومیت کا اثر انداز اور علمی نام دیا جاتا رہا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس قسم کا شعور ان سیاسی وحدتوں میں پایا جاتا رہا ہے۔

گہوارۂ اسلام یعنی عرب میں بھی زمانہ جاہلیت میں یہی چیز رہی ہوگی، یہ قدرت الٰہی کا کرشمہ تھا کہ عرب کے قبائلیت زدہ علاقے کے سب سے زیادہ مغرور اور خود پسند گروہ آبادی یعنی قریش کے ایک فرد کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس غرض کے لیے ہو کہ وہ پیغمبر اسلام کی حیثیت سے خدا کی طرف سے یہ اعلان کرے کہ:

''لوگو! ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا، اور تمہیں قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن یاد رہے کہ تم میں سے سب سے زیادہ معزز خدا کے پاس وہی ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہو، بے شک خدا جاننے والا اور باخبر ہے۔'' (قرآن مجید سورۃ نمبر ۴۹، آیت ۱۳)

اس اعلان نے قومیت کے مسئلہ پر تصور انسانی میں ایک انقلاب اور ایک نئی مرکزیت پیدا کر دی۔ آیت بالا کو اسلامی نظریہ قومیت کا منشور اساسی قرار دیا جا سکتا ہے، اس پر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور اس کے بعد سے آج تک ہر زمانہ میں عمل ہوتا رہا اور روئے زمین پر جہاں کہیں حلال کا پھریرا اڑاتا، اس کے معنی انسانوں میں مساوات اور پرہیزگار کے تقدم کے رہے۔

اس بیان سے بعضوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام میں دین اور قومیت میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ دین کے وہ معنی جو آج کل یورپ میں لیے جاتے ہیں وہ مسلمانوں کا معہود ذہنی نہیں، اس لیے غالباً یہ کہنا محفوظ تر اور صحیح تر ہوگا کہ نسلی، جغرافی، لسانی یا کسی اور مروجہ مفہوم کی رشتہ داری نہیں بلکہ ایک ہی مطمح نظر یا تصور حیات میں شرکت وہ چیز ہے، جسے اسلامی نقطۂ نظر سے قومیت خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ اگر فہم دین سے مراد انسان اور اس کے خالق کے تعلقات لیں تو اس معنی کے لحاظ سے اسلام محض ایک دین نہیں رہتا، بلکہ اس سے کہیں وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ اسلام اپنے پیروؤں کو ہر شعبہ حیات میں چاہے وہ روحانی ہو یا مادی و سماجی، مکمل رہنمائی کرتا اور قواعد و احکام بتاتا ہے، اس نقطہ

نظر سے اسلام اس برہمنیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے مطابق نجات صرف ان لوگوں کو حاصل ہوسکتی ہے جو برہمنوں کے موروثی طبقے میں پیدا ہوں۔ اسلام اس مسیحیت کے خلاف بھی احتجاج تھا، جس کے لحاظ سے انسان فطرۃً گناہ گار ہے اور اپنے اعمال کے لیے انفرادی طور پر جواب دہ نہیں ہے، بلکہ اس کی نجات کے لیے کسی اور کو قربان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ اس مجوسیت اور مزدکیت اور بت پرستی وغیرہ کے خلاف بھی احتجاج تھا جو انسانوں سے اس کا اختیار سلب کر لیتے ہوں۔

کوئی شخص اپنی نسلی قومیت کو اصولاً بدل نہیں سکتا، (زمانہ حال میں جو اختیار دیا جانے لگا ہے وہ ذیلی چیز ہے) اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی اصولاً اپنی لونی یا رنگی قومیت کو بھی بدل سکے، چنانچہ ہندوستانی اور یورپی گو ایک ہی نسل سے سمجھے جاتے ہیں، لیکن جنوبی افریقہ کی سیاسیات میں رنگ کا فرق جو معنی رکھتا ہے وہ اس مفہوم کو اچھی طرح واضح کر سکتا ہے، کسی کے لیے اپنی لسانی قومیت کا بدل دینا بھی تقریباً اتنا ہی مشکل ہے، اگر آدم و حوا کے ایک ہی جوڑے کی اولاد میں دوبارہ اتحاد پیدا کرنا اور ان کے مرکز گریز رجحانات کو بھی ضمناً روکنا ہے تو اس کا ذریعہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ قومیت کو ایک قدرتی حادثہ کی جگہ اختیاری چیز قرار دیا جائے، اور اسلام نے جس رشتہ کو قومیت کے لیے چنا ہے وہ ایمان یا تصور حیات ہے اس کے علاوہ دیگر اساس ہائے قومیت کے متعلق اسلام نے یہ قرار دیا ہے کہ:

''تمہاری زبانوں اور رنگوں میں اختلاف تو اس میں بے شک (خالق کے کمال کی) نشانیاں جاننے والے لوگوں کے لیے ہیں) (قرآن مجید سورۃ نمبر ۳۰، آیت ۲۲)

ایمان کے سوا دیگر اساس ہائے قومیت اسلام کے نزدیک کوئی اور معنی نہیں رکھتیں، تقریباً ایک صفحہ پہلے جو آیت نقل کی گئی تھی، اس میں نسلی بنیاد کو اسلام نے ٹھکرا دیا تھا، یہاں لسانی اور لونی فرق کو بہت ہی غیر اہم حیثیت پر پہنچا دیا گیا ہے اور انسان کے اختیار یا ایمان کی ہمہ گیر اہمیت پر زور دیتے ہوئے اسلام نے ایک طرح کا ''بنیادی عقیدہ'' (Basic faith) بھی مرتب کر دیا یعنی وہ کم سے کم چیز جس کا ماننا کسی سچے اور اچھے انسان کے لیے ضروری ہے اور جس کا قبول کرنا انسانوں کی اکثریت کے لیے آسان بھی ہے،

چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

"جو لوگ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی ہوئی چیزوں پر) ایمان لائے اور جو یہودی ہیں اور نصرانی اور صابی ...... جو بھی خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے، تو یقیناً ایسے لوگوں کا بدلہ ان کے آقا کے پاس ملے گا اور انہیں نہ کوئی خوف کرنا چاہیے اور نہ ہی وہ افسوس کریں گے۔" (قرآن مجید ۲، ۶۲، نیز ۵، ۶۵)

لیکن ناظرین کو ایک چیز بتا دینی چاہیے ورنہ مجھ پر تاریخ سے ناواقف ہونے کا الزام لگایا جائے گا، میں جانتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں خود مسلمانوں میں خاصے پرانے زمانہ سے سیاسی، ذیلی قومیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا آغاز شیعہ سنی اختلاف سے ہوا اور دیگر شاخوں کا پھوٹنا محض وقت آنے کی بات تھی، کچھ عرصہ بعد تو خود راسخ العقیدہ سنی ائمہ بھی تسلیم کرنے لگے کہ:

"لانّ الدارین فی الاصل ما امتازا الاباجراء الاحکام و تنفیذالولایات وکذٰلك الولایات المختلفة فی دار الاسلام بین ملوك الاسلام التمتاز الابالغلبة واجراء الاحکام۔"

(کتاب الاسرار للدبوسی ورق نمبر ۱۵ اب مخطوطہ کتب خانہ ولی الدین استانبول)

"جس طرح دارالاسلام اور دارالحرب میں امتیاز احکام کا اجراء اور نفاذ اقتداء کے سوا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا، اسی طرح دارالاسلام کے اندر بھی مختلف علاقوں میں جو اسلامی بادشاہوں کے قبضہ میں ہوتے ہیں، تسلط اور اجرائے احکام ہی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔"

یہ مشہور حنفی امام ابوزید الدبوسی کا بیان ہے جن کی وفات ۴۳۰ھ میں خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی تھی، یہاں جس ذیلی تقسیم اور دارالاسلام کے تجربہ کا ذکر ہے، وہ بھی قومیت کے متعلق ذیلی انتخاب ہی کہا جا سکتا ہے، کوئی اٹل اور قدرتی حادثہ نہیں کہا جا سکتا، میں شاید یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی بادشاہتوں کے یہ اختلافات معمولی اور ضمنی چیزیں یا گھریلو جھگڑے ہیں، نہ کہ ایک دوسرے سے جدائی اور علیحدگی واجنبیت۔

Marfat.com

مجھے اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کہ جدید مغربی تمدن کے تصادم اور تمارس کے باعث اسلامی مبادیات قابل لحاظ حد تک متاثر ہوئی ہیں۔ اور حالات سے مجبور ہو کر وہ آج کل قومیت کے لیے ایسے قوانین وضع کر رہی ہیں جو ولادت اور سکونت پر مبنی ہیں، لیکن یہ اصل میں بین الممالک زندگی کی سیاسی ضرورتیں اور اقتضا آت ہیں (جن کو میرے اس دعویٰ سے کوئی تضاد نہیں ہے کہ اسلامی تصور کے متعلق قومیت کے معنی ایمان میں اشتراک کے ہیں، ولادت یا رنگ، زبان یا وطن میں اشتراک کے نہیں)۔

اس لیے یہ دیکھ کر حیرت نہ ہونی چاہیے کہ انگلستان میں ایک عیسائی ملک ہونے کے باوجود بعض عیسائی اجنبی ہوں لیکن مسلمان شہری مانے جاتے ہوں، اس کے برخلاف افغانستان میں اجنبی افغانی حقوق شہریت سے بہرہ ور ہندوستانی مل سکیں (اگر مسلمان افغانستان میں اسلامی قانون قومیت نافذ ہو)۔

اس لیے یہ بات قدرتی ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس امر کے متعلق لمبی اور تفصیلی بحث کی ہے کہ ہم وطن اجنبیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے، یعنی ان ہم وطنوں سے جو حکمران جماعت سے ایمان و عقائد کے اختیاری مسئلہ میں اشتراک رکھنا پسند نہ کریں، اسی طرح کے "ہم وطن اجنبیوں" یا ان لوگوں کے جن کی حفاظت کا اسلامی حکومت ذمہ لیتی ہے (یعنی ذمی یا اہل ذمہ) کے ساتھ برتاؤ کرنے کے متعلق جو قواعد پائے جاتے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، اسلامی مملکت کی سرزمین میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ عام طور پر حسب ذیل اقسام کے ہوتے ہیں:

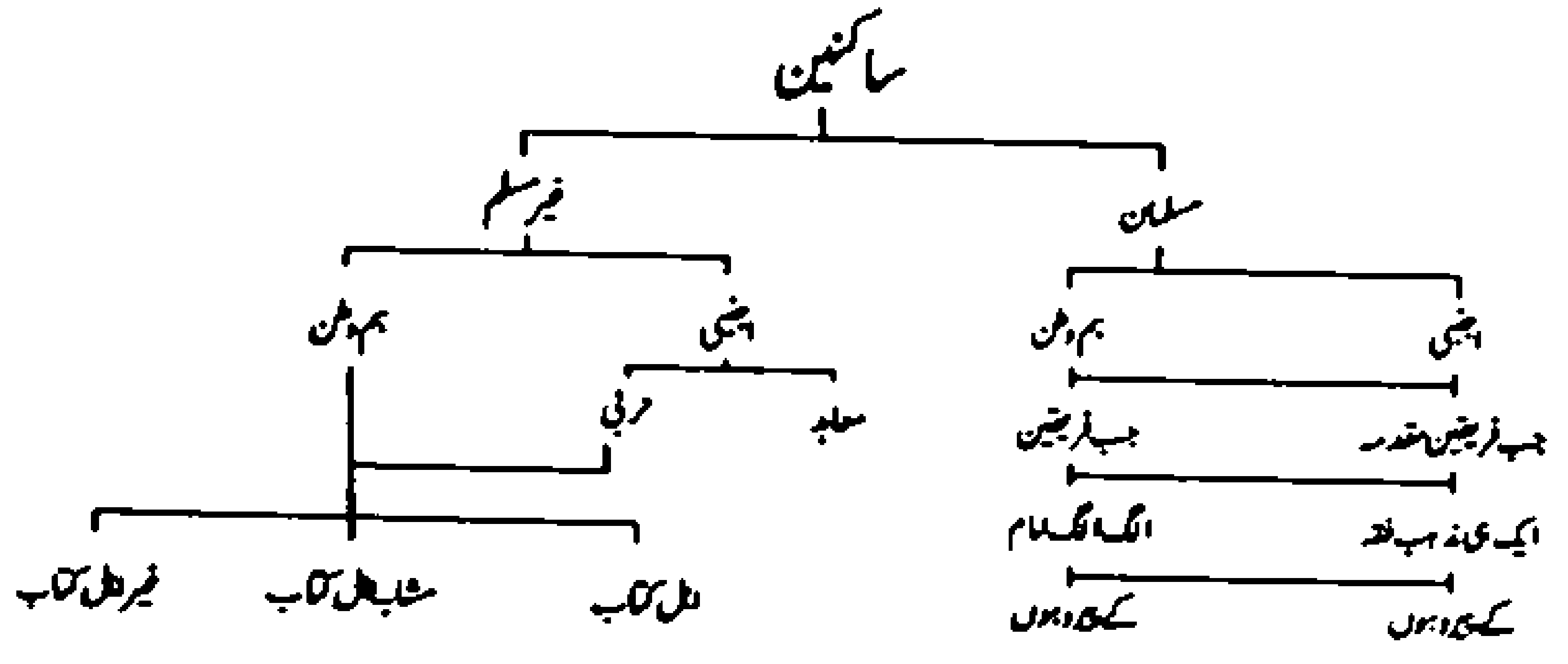

مسلمانوں میں باہم مکمل مساوات پائی جاتی ہے اور اسلامی قانون میں کوئی طبقہ یا درجہ بندی تسلیم نہیں کی جاتی ہے، جملہ مسلمان ایک ہی امت یعنی قوم سے تعلق رکھتے ہیں، چاہے وہ جہاں بھی ہوں، ایک ہی قانون کے وہ تابع ہوتے ہیں، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ "المسلم ملتزم احکام الاسلام حیث ما کان" (بحوالہ مبسوط سرخسی ۱۰، ۹۵) لیکن قرآن نے یہ قرار دیا ہے کہ اسلامی مملکت ان مسلمانوں کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہے، جو غیر مسلم علاقہ میں رہنا پسند کریں اور اسلامی عدالتیں بھی مسلمانوں کے افعال بلکہ مصائب پر جو بیرونی ممالک میں پیش آئیں، کوئی اختیارِ سماعت نہ تو جتاتی ہیں اور نہ عمل میں لاتی ہیں۔

اس بچہ کی امت یا قومیت کا فیصلہ کرنے میں کچھ دشواری پیدا ہوتی ہے، جو لقیط یعنی کہیں پڑا ہوا مل جائے، یا اس کا باپ تو مسلمان ہو لیکن ماں غیر مسلمہ ہو یا باپ ذمی ہو اور ماں اجنبی یا حربیہ ہو۔ اس سلسلہ میں اسلامی قانون نے یہ عام مقرر کیا ہے کہ بچہ اس کا سمجھا جائے گا جو اس کے حق میں مفید تر ہو، چنانچہ جو لقیط اسلامی سرزمین میں پایا جائے اور جس بچہ کا باپ مسلمان ہو وہ خود بھی مسلمان سمجھا جائے گا اور جس بچہ کے والدین میں سے ایک کا تعلق اہل ذمہ سے ہو، اور دوسرے کا اجنبی غیر مسلموں سے، تو بچہ ذمی یعنی اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت قرار دیا جائے گا، لیکن یاد رہے کہ یہ محض بادی النظری قیاس ہوگا جس کی تردید ثبوت پیش کر کے کی جا سکے گی، اسلام ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری برتتا ہے ان کو رعیت بننے کی اجازت دیتا ہے، زبان، رنگ، نسل، دین کے کوئی امتیازات تسلیم نہیں کیے جاتے، صرف ایک چھوٹا سا استثناء ہے اسلام کے روحانی مرکز یعنی جزیرہ نمائے عرب میں مستقل سکونت کے متعلق کچھ پابندیاں ہیں کہ غیر مسلموں کو وہاں بسنے کی اجازت نہ دی جائے، اس سیاسی و سماجی ضرورت سے قطع نظر، عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں، بت پرستوں، کالوں، سانولوں، گوروں، سب ہی کو بطور ذمی قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ اطاعت شعار رہ کر اسلامی سرزمین میں سکونت اختیار کرنا چاہیں، چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الخراج (ص ۷۳) میں صراحت سے بیان کیا ہے کہ مشرک، بت پرست، اہل کتاب، آتش پرست، سنگ پرست اور دیگر تمام

Marfat.com

اقسام کے غیر مسلموں کو رعیت اور ذمی بنایا جا سکتا ہے۔

غیر مسلم رعایا اور غیر مسلم اجانب میں بہر حال کچھ فرق پایا جاتا ہے، آخر الذکر کو اسلامی سرزمین میں آنے کے لیے اوّلاً امان یعنی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے، یہ اجازت حکومت ہی نہیں بلکہ ہر مسلم شہری حتی کہ غلام اور عورتیں بھی عطا کر سکتی ہیں، اس طرح کا اجنبی غیر مسلم اسلامی سرزمین میں اپنے قیام کے دوران میں امان نامے کے شرائط کے تابع ہوگا، لیکن اس سے قطع نظر وہ غیر مسلم رعایا ہی کے برابر حقوق و فرائض کا حامل ہو گا، ابتداً امان کا حق ہر مسلم فرد کو حاصل سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد کے فقہاء نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر حکومت چاہے تو صراحت سے اعلان کر کے اس عام حق کو عارضی طور پر معطل اور ایسی شرطیں عائد کر سکتی ہے جن کی تعمیل عام افراد کے لیے ضروری ہوگی۔

دورِ خلافت کی ابتدائی صدیوں میں غیر مسلم اجنبی کا قیام اسلامی سرزمین میں زیادہ سے زیادہ ایک سال کے لیے ہو سکتا تھا، اور اگر وہ اس سے زیادہ عرصہ تک رہنا چاہتا تو یہ تصور کر لیا جاتا کہ وہ توطن کا ارادہ رکھتا ہے اور اس پر وہی محاصل اور واجبات عائد کر دیے جاتے جو غیر مسلم رعیت کے لیے مقرر ہیں، لیکن حالیہ زمانوں میں غیر ملکی ساکنین (جن کو اصطلاح میں مستامن کہا جاتا ہے) سیاسی وجوہ سے یہ چاہنے لگیں کہ طویل قیام کے باوجود اپنی سیاسی قومیت برقرار رکھیں، اس کے معنی مراعات خصوصی کے دور میں ترکی میں خاص کر امتیازی حیثیت رکھنے کے ہوتے تھے، چنانچہ اب سے کوئی چار سو سال قبل ۱۵۳۵ء میں ترکی اور فرانس میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ایک سال کے بجائے دس سال سے زیادہ قیام پر غیر مسلم اجنبی کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ رعیت بننا چاہتا ہے، مراعات خصوصی چونکہ ترکی کے سر جبراً تھوپے گئے تھے، اس لیے مسلمان فقہاء نے کبھی ان کو تسلیم نہیں کیا، اور اپنی کتابوں میں وہ آج تک بدلے ہوئے حالات کے باوجود یہی لکھتے چلے آ رہے ہیں، کہ ایک سال سے زیادہ کا قیام رعیت بننے کے ارادہ کو ظاہر کرتا ہے۔

(۲) غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی حیثیت قانونی:

اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعیت ذمی کہلاتی ہے، ذمی بنانا مسلمان فقہاء کی رائے

Marfat.com

کے مطابق ایک باضابطہ دو فریقی معاہدہ ہوتا ہے، جو رعیت بننے کے متمنی غیر مسلم شخص اور اسلامی جماعت کے مابین عمل میں آتا ہے، اگر ذمی وفاداری سے رہے اور محصول حفاظت جسے جزیہ کہتے ہیں، ادا کرتا رہے تو اسے سکونت کی آزادی ضمیر کی آزادی اور جان و مال و آبرو کی حفاظت حاصل ہوتی ہے، ذمی بننے کا معاہدہ حسب ذیل صورتوں میں ختم ہو جاتا ہے:

1. بغاوت،
2. جزیہ کے وجوب سے انکار،
3. حکومت کی اطاعت سے انکار،
4. کسی آزاد مسلمان عورت سے زنا،
5. اسلامی مملکت کے کسی دشمن کو پناہ دینا، اور اس کے لیے جاسوسی کرنا،
6. خدا اور رسول اور خدا کی کتابوں کی بے حرمتی کرنا،
7. کسی مسلمان کو مرتد بنانا،
8. لوٹ مار اور ڈاکہ زنی میں مشغول ہونا،
9. اسلام جن چیزوں کو اپنا امتیاز سمجھتا ہے اس کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرنا،
10. سودی کاروبار میں مشغول ہونا،

اور اسی طرح کی چیزیں،

یہ امر البتہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ان میں سے بعض امور کی حد تک مختلف مذاہب فقہ میں اتفاق نہیں ہے، جن فقہاء کو اعلیٰ سرکاری خدمات کے سلسلہ میں عملی تجربہ حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، وہ بہ نسبت ان علماء کے جو درس گاہوں کے تخلیہ میں نظری خیال آرائی کرتے تھے، عام طور پر نرم تر رائے رکھتے ہیں۔

کسی مسلمان شہری کو سزا میں بھی اسلامی سرزمین سے جلاوطن نہیں کیا جاسکتا، البتہ نظر بندی اور شہر بدری اس کے معارض نہیں، لیکن کسی غیر مسلم شہری کو نہ صرف سزائے موت اور دوسری چھوٹی سزائیں دی جاسکتی ہیں، بلکہ اسے اسلامی سرزمین سے ملک بدر بھی کیا جاسکتا ہے اگر وہ اپنی مفسدانہ سرگرمیوں کے باعث ایک ناپسندیدہ شخص بن گیا ہو۔

Marfat.com

قرآن وحدیث کے احکام اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک ہر زمانہ میں متواتر وغیر منقطع رواج کے باعث اسلامی سرزمین میں غیر مسلموں کو عدالتی خود مختاری حاصل رہی ہے، عیسائی یہودی اور دیگر ادیان کے پیروؤں کی الگ الگ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، جہاں انہی کے قوانین کا نفاذ انہی کے ہم مذہب حکام عدالت کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے، البتہ یہ عدالتیں صرف اسی صورت میں کام دے سکتی ہیں، جب فریقین کا دین ایک ہی ہو، غیر مسلموں کو اس کی ممانعت نہیں کہ اپنا مقدمہ اگر خود چاہیں تو اپنی خوشی سے اپنی ملی عدالت کے ذریعہ اسلامی عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اگر فریقین مقدمہ الگ الگ دین کے پیرو ہوں مثلاً ایک یہودی اور دوسرا عیسائی تو بھی غالباً اسلامی عدالت ہی میں رجوع ہونا پڑتا اور اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ عمل میں آتا لیکن اس بارے میں باوجود تلاش کے مجھے ابھی تک کوئی تصریح اور تفصیل نہیں مل سکی، اگر فریقین ایک ہی دین کے پیرو ہوتے، اور اسلامی عدالت میں آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل قتل اور زنا جیسے مقدمات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ فریقین ہی کے شخصی قانون کے مطابق فیصلہ صادر کیا جائے جیسا کہ بخاری اور ابن ہشام وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

مجھے یہاں اختلافات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، جو غیر مسلم رعیت اور غیر مسلم اجانب کی شخصی حیثیت کے متعلق تصادم قوانین کے مختلف پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں، البتہ چند نمایاں خصوصیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

مسلمان فقہاء یہ رائے رکھتے ہیں کہ ”اختلاف دین اور اختلاف دار“ وراثت کے مانع ہوں گے، چنانچہ کوئی مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے نکاح تو جائز طور پر کر سکتا ہے لیکن نہ تو ایسے شوہر کی وفات پر بیوی کو، اور نہ بیوی کی وفات پر شوہر کو ترکہ میں سے وراثت میں کوئی حصہ ملے گا، بلکہ پورا ترکہ متوفی فرد کے ہم دین قریبی رشتہ داروں (باپ، ماں، بھائی، وغیرہ) میں تقسیم کیا جائے گا اور دوسرے دین کے پیرو رشتہ داروں کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، البتہ مرنے والا شخص اپنے رفیق زندگی یا دیگر رشتہ داروں کے لیے جو دوسرے دین کے پیرو ہوں وصیت ضرور کر سکتا ہے، وصیت ان لوگوں کے لیے بھی کی جا سکتی ہے جو غیر ملک کی سکونت اور غیر ملک کی رعیت ہونے کے

Marfat.com

باعث وراثت سے محروم ہو رہے ہیں، البتہ یہ وصیت جائز اغراض کے لیے ہونی چاہیے، چنانچہ ہمارے فقہاء بیان کرتے ہیں کہ مثلاً عیسائی بیوی کی یادگار میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے گرجا وغیرہ بنانے کے لیے مسلمان شوہر وصیت نہیں کر سکتا، وصیت اور وقف کے لیے غرض کا جائز ہونا ضروری ہوگا، صلہ رحمی، پرورش، خیرات وغیرہ جائز اغراض سمجھے جائیں گے۔

محصول بچت یعنی زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر لگائی جاتی ہے لیکن اس سے استفادہ صرف مسلمان نہیں کرتے، چنانچہ علاوہ تعمیرات عامہ سڑکوں، سراؤں وغیرہ کے جو (مثلاً ابن السبیل اور فی سبیل اللہ کی مدوں کے تحت) تعمیر کیے جائیں گے، غیر مسلم استفادہ کر سکتے ہیں، خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مستند اور واجب التعمیل تعبیر کے باعث قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کی مدوں کے سلسلہ میں جو لفظ مساکین آیا ہے، اس میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے ہیں۔ (مسلمانوں کے لیے فقراء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور لفظ مسکین کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ ایک ایسا اجنبی ہوتا ہے جو ہمارے علاقہ میں سکونت رکھتا ہے، اسلامی سرزمین میں صرف غیر مسلم ہی مسکین ہو سکتا ہے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی تعبیر کے تحت یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے اسلامی خزانہ سے روزینے مقرر فرمائے، جیسا کہ امام ابو یوسف رضی اللہ عنہ نے کتاب الخراج میں تحریر فرمایا ہے، جو محصول غیر مسلموں سے ان کے ملی انتظامات کے تحت وصول کریں، وہ متعلقہ ملت ہی کے افراد کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ یہاں شاید یہ بھی بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اسلامی سرزمین میں ہر شخص کی کھانے پینے اور رہنے سہنے کی ناگزیر ضرورتیں پوری کرنا حکومت کے فرائض میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں سے عام طور پر بچت کا ڈھائی فیصد سالانہ وصول کیا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی آمدنی اور دیگر سرکاری آمدنی کافی ثابت نہ ہوں تو (جیسا کہ ابن حزم نے پوری تفصیل کے ساتھ اور مدلل لکھا ہے) اسلامی حکومت کو حق ہوتا ہے کہ مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ زائد محصول بھی وصول کر سکتی ہے، جس کی حد امام ابن حزم نے یہ بتائی ہے کہ سدرمق چھوڑ کر باقی ہر چیز جبراً ٹیکس میں وصول کر لی جا سکتی ہے تا کہ ضرورت پر ملک کے بھوکوں اور ننگوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں، البتہ یہ اختیاری

Marfat.com

اور ضروری کی چیز ہے، لازمی اور ہمیشہ عادت کی نہیں۔

انصاف کا بلند تصور حنفی فقہاء کو اس رائے پر آمادہ کرنے کا باعث بنا کر اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کو عمداً قتل کر دے تو قاتل کو سزائے موت دی جائے گی، (اگر چہ بعض دیگر ائمہ اس سے اختلاف کرتے ہیں لیکن حنفیوں کے ہاں اپنی تائید میں ایک صریح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے، اور یہ بھی یاد رہے کہ دنیائے اسلام میں حنفیوں کی تعداد اسی نوے فی صدی سے کم نہیں سمجھی جا سکتی ہے)۔

حکومت کے عہدوں پر غیر مسلموں کے تقرر کی ممانعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے کا ایک واقعہ مخالفوں کے لیے ایک بڑا بہانہ بنا رہا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل گورنر کو حکم دیا تھا کہ اپنے کاتب (پرائیویٹ سیکرٹری) کو فوراً اس کی خدمت سے الگ کر دے، تحقیق پر واقعہ یوں معلوم ہوا ہے کہ اس کاتب کی جو عیسائی تھا، عربی بہت کمزور تھی اور وہ سرکاری مراسلوں میں صرفی و نحوی غلطیاں کرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس ذمہ دار خدمت کے لیے زیادہ قابل اشخاص کی ضرورت تھی، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محض غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بھی علیحدہ کیا ہوتا تو بھی آپ حق بجانب ہوتے، کیونکہ اپنے زمانہ میں جب کہ اسلامی فتوحات کو شروع ہوئے چند سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے، اہم ذمہ دار عہدوں پر غیر مسلموں کا تقرر خاص کر ایسے علاقے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی بے حد قلیل تھی، یقیناً ہزاروں خرابیوں کا باعث ہوتی، (اور آج چودھویں صدی ہجری میں بھی مغرب کی روشن خیال سے روشن خیال حکومتیں بھی اپنی نوآبادیوں میں اہم عہدوں کے متعلق جس قسم کی اجارہ داری برتتی ہیں اس کی موجودگی میں ہمیں کسی معذرت یا ندامت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا ایک واقعہ سے قطع نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا کوئی اور واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس میں غیر مسلموں کو سرکاری ملازمت سے الگ رکھا گیا ہو بلکہ اس کے برخلاف قریب قریب پورا محکمہ مالگزاری اور بعض دوسرے محکمے غیر مسلموں ہی کا اجارہ رہے اور ہزاروں عیسائی، یہودی اور پارسی وغیرہ انتہائی اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں پر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعد کے زمانوں میں مامور رہے، حتی کہ دفتری زبان بھی فاتح

Marfat.com

عربوں نے عربی کی جگہ مالگزاری وغیرہ کے محکموں میں فارسی، یونانی وغیرہ ہی رہنے دی اور یہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک یہودی...... کی کچھ زمین جبراً لے کر وہاں مسجد تعمیر کی تو اس کی اطلاع ملنے اور شکایت موصول ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً وہ مسجد توڑ وادی اور زمین یہودی کو واپس دلوادی۔ چنانچہ اس جگہ "بیت الیہودی" آج تک پایا جاتا ہے، جیسا کہ لبنان کے ایک سابق وزیر عدالت شکری کرواہی نے جو ایک عیسائی ہے بیان کیا ہے۔

اگرچہ غیر مسلم رعایا کو حجاز میں مستقل سکونت اختیار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، لیکن خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو مکہ اور مدینہ میں مسجدوں کے اندر خلیفہ کے خطبہ کے وقت شکایتیں پیش کرنے کی مثالیں ملتی ہیں اور اس میں کوئی ممانعت اور رکاوٹ عائد نہیں کی جاسکتی تھی، اس قسم کے متعدد واقعات اور ان کا فوری تسویہ تاریخوں نے محفوظ رکھا ہے۔

اسلامی اصول یہ ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی کسی کو اس کی مرضی کے خلاف دوسرے دین کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور جس طرح کا حکم یمن میں اسلام سے پہلے ایک مرتبہ نجرانی عیسائی حکمرانوں نے دیا تھا کہ کوئی یہودی عورت کسی عیسائی کے سوا دوسرے سے خاص کر یہودیوں سے نکاح نہیں کرسکتی تاکہ یہودیت ایک ہی نسل میں ناپید ہو جائے جیسا کہ مشہور فرانسیسی مورخ دے جنس (Desvegens) نے بیان کیا ہے، اس طرح کا کوئی حکم اسلامی دور میں ناممکن ہے، قرآن وحدیث میں غیر مسلم رعایا پر سختیوں کی اتنی شدید ممانعت ہے کہ آج بھی روشن خیال سے روشن خیال مغربی ملکوں کو وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ ایک بہت ہی چھوٹی چیز کو بطور نمونہ بیان کر کے ہم اس ذکر کو ختم کریں گے، وہ یہ کہ غیر مسلموں کے قبور تک کو اسلامی حکومت میں چھیڑا نہیں جاسکتا، اور اس کو ذمیوں کے حقوق کی خلاف ورزی شمار کیا جائے گا۔ جیسا کہ ہر فقہ کی کتاب میں مذکور ہے۔ (مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولین تعمیر کے وقت جس نبش قبور کا ذکر ملتا ہے، وہ زمینوں کے متعلق نہیں ہے)۔

Marfat.com

(۳) قوانین میں باہم تصادم:

(الف) اسلامی اور غیر اسلامی قوانین میں تصادم:

اگر فریقین مقدمہ میں سے ایک غیر مسلم اور دوسرا مسلمان ہو اور بنائے دعویٰ اسلامی سرزمین ہی میں پیدا ہوئی ہو تو مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش ہوگا اور عام طور پر اسلامی قانون کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا، اس سلسلہ میں دیوانی مقدموں کی حد تک کچھ زیادہ دشواری نہیں، لیکن فوجداری مقدموں میں چند استثناء اور شرائط پائے جاتے ہیں، جو زیادہ تر غیر مسلم افراد کی سہولت کے لیے ہیں۔ مثلاً چند افعال، شراب نوشی، محرم عورتوں سے نکاح، اور اسی طرح کے امور کا ارتکاب اگر غیر مسلم کریں تو کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا، دوسرے قتل انسان کے سلسلے میں اگر چہ بعض ائمہ کی یہ رائے ہے کہ مسلمان قاتل سے جب مقتول غیر مسلم ہو، قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اسے صرف خون بہا ادا کرنا ہوگا۔ لیکن حنفی مذہب میں مسلمان اور غیر مسلم رعیت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس رائے کی تائید میں ہے لیکن حنفیوں کے نزدیک بھی اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم مستامن یعنی امن لے کر آنے والے اجنبی کو قتل کر دے، تو مسلمان سے قصاص نہیں لیا جائے گا، مگر حنفیوں میں بھی اس پر پورا اتفاق نہیں ہے، اور ان کے ایک ممتاز فرد یعنی امام محمد شیبانی یہ رائے رکھتے ہیں کہ غیر مسلم مستامن جب تک امان اور اجازت لے کر اسلامی سرزمین میں مقیم رہے اس وقت تک وہ حقوق اور واجبات میں ذمیوں کے برابر ہوگا، اس اصول کے ماتحت مستامن کے قتل پر بھی مسلمان قاتل سے قصاص لازم آتا ہے۔

اسلامی اصول قانون اختیارِ سماعت کے الگ ہونے کے متعلق بہت شدت رکھتا ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی مسلمان جو اسلامی مملکت کی رعیت بھی ہو بیرون ملک میں قتل کر دیا جائے یا لوٹ لیا جائے یا کسی اور طریقہ پر اسے کوئی ناجائز نقصان پہنچایا جائے، اور مجرم غیر مسلم ہو اور مقامِ جرم بھی غیر مسلم علاقہ ہو جہاں وہ مسلمان جائز اغراض کے لیے وہاں کی حکومت کی اجازت اور رضامندی سے گیا ہوا ہو اور پھر وہ مجرم اسلامی سرزمین کو

Marfat.com

اجازت لے کر آئے تو بھی اسلامی سرزمین کی کسی عدالت میں اس کے خلاف اس بارے میں کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ فقہاء کا استدلال یہ ہے کہ بنائے نالش کی ابتداء چونکہ ایسے مقام پر ہوئی جہاں اسلامی اختیار سماعت نہیں پایا جاتا تھا، اس لیے اسلامی عدالتیں اس مقدمہ کی سماعت کی مجاز نہیں، جیسا کہ سرخسی نے (مبسوط ۱۰، ۹۵ تا ۹۷ میں) لکھا ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک اور ارشاد وارد ہوا ہے کہ:

اذاهرب الرجل وقد قتل اوزنیٰ اوسرق الی العدوثم أَخذا أمَانا علی نفسِہٖ فانہ یقام علیه مافرمنه و اذاقتل فی ارض العدوا وزنیٰ اوسرق ثمَّ اخذا مَانا لم یقم علیه شیء بِمَّا احدِث فی أرض العدو، (شرح السیر الکبیر جلد نمبر ۴ ص ۱۰۸، عن عطیة ابن قیس الکلابی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال)۔

جو کوئی (ہماری سرزمین میں) قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب کرے اور فرار ہو جائے لیکن پھر اجازت و امان لے کر واپس آئے تو اس پر مقدمہ چلا کر اسے اس چیز پر سزا دی جائے گی جس سے بھاگنے کی اس نے کوشش کی تھی لیکن اگر اس نے قتل یا زنا یا چوری کا ارتکاب دشمن کے علاقہ میں کیا تھا، اور پھر اجازت لے کر (ہمارے ہاں) آئے تو اسے اس جرم کی جواب دہی کرنی نہیں پڑے گی، جس کا ارتکاب اس نے دشمن کی سرزمین میں کیا تھا۔

(ب) دو غیر مسلم قوانین میں تصادم:

اگر فریقین مقدمہ دو الگ الگ غیر اسلامی ملتوں سے تعلق رکھتے ہوں مثلاً ایک یہودی ہو اور دوسرا عیسائی تو اسلامی عدالت میں اس پر توجہ نہیں کرتی کیونکہ مسلمان فقہاء کی رائے کے مطابق جملہ غیر اسلامی ملتیں ایک ہی وحدت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ

Marfat.com

کے الفاظ میں اہل الشرک کلھم ملۃ واحدۃ اور امام محمد شیبانی کے الفاظ میں الکفر ملۃ واحدۃ دیکھو کتاب الاصل، امام محمد شیبانی کے ۲، ۱۴۱ تا ۱۴۲ مخطوطہ کتب خانہ عاطف، استنبول) لیکن اگر مختلف الادیان فریقین مقدمہ اس پر باہم متفق نہ ہوسکیں کہ ان دونوں میں سے کس کی ملی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے تو پھر اسلامی عدالت کو مقدمہ کی سماعت کر کے فیصلہ کرنا ہوگا جیسا کہ مشہور مالکی امام خلیل نے بیان کیا ہے، اس بارے میں دیوانی اور فوجداری مقدموں میں کوئی فرق نہیں، یہ معلوم نہیں کہ مسلمان قاضی کا فیصلہ اس صورت میں کیا ہوگا، جب کہ نزاع مثلاً کسی قرض کے متعلق ہو، جس میں سود دینے کا اقرار ہو، یا کسی بیع کے متعلق اور شراب مہیا کرنے کا اقرار ہو، چونکہ سود اور شراب اسلام نے منع کردیئے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ فریقین مقدمہ کے ادیان نے بھی ان کو ممنوع قرار دیا ہو اس لیے پیچیدگی پیدا ہوگی۔

(ج) دو اسلامی مذاہب فقہ میں تصادم:

اسلامی مذاہب فقہ متعدد ہیں۔ اگر فریقین میں ایک سنی اور دوسرا شیعہ ہو، بلکہ خود دونوں کے سنی ہوتے ہوئے بھی ایک حنفی اور دوسرا شافعی ہو تو متعدد مسائل میں تصادم قوانین وقوع میں آجاتا ہے، اور اس کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ قاضی کس فریق کے مذہب کے مطابق حکم صادر کرے، عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابتدائی خلفاء کے زمانہ میں اس طرح کا تصادم عملاً پایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جلدی ہی اختلاف رائے کی صورتیں فقہاء میں پیش آنے لگیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی اور اس کے بعد بھی لیکن چونکہ اس وقت تک قاضیوں پر اس کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ کسی خاص فقہ کی رائے کی تقلید کریں، بلکہ قاضی خود اپنی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور اپنے ذاتی اجتہاد کے مطابق فیصلہ کرنے کی پوری آزادی رکھتے تھے، اور اس کا نفاذ بھی کرایا کرتے تھے، اس لیے یہ سوال فقہاء کے اختلاف رائے کے باوجود پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہاں تک ممکن تھا کہ دارالخلافہ کے صدر قاضی کا فیصلہ الگ ہو اور اسی زمانہ میں یا اس کے بعد کسی ضلع یا علاقہ کے قاضی کا فیصلہ الگ ہو، لیکن عباسی دور میں اس کا واضح ذکر ملتا

Marfat.com

ہے کہ امام ابو یوسف نے جو قاضی القضاۃ تھے، اپنے ماتحت افسران عدالت کو مامور کرتے وقت یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ حنفی مذہب کے ہوں، بعد کے زمانوں میں پوری مملکت میں ایک ہی قانون ہونے کی ضرورت تسلیم کرتے اور باقی رکھتے ہوئے بھی تقررات کے لیے ایک حل نکالا گیا تھا۔ چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ بعض اوقات خلافتِ عباسیہ میں زیدی شیعوں کو بھی قاضی مقرر کیا جاتا رہا، لیکن وہ مذہب السلطان یعنی حنفی مذہب کے مطابق فیصلہ صادر کرنے کے پابند تھے۔

اسلامی مذہب فقہ میں تصادم کا مطلب واضح کرنے کے لیے بعض مثالیں شاید مفید ہوں، فرض کرو کہ ایک شخص مرتا ہے اور اپنے قریبی رشتہ داروں میں ایک بھتیجا اور ایک نواسا چھوڑے تو حنفی قانونِ وراثت کی رو سے پورا ترکہ بھتیجے کو ملے گا اور نواسا بالکل محروم رہے گا لیکن اگر شیعہ قانون وراثت کے مطابق فیصلہ صادر کیا جائے تو نتیجہ بالکل الٹا ہوگا یعنی پوری جائیداد نواسے کو ملے گی اور بھتیجا محروم رہے گا اور یہ صورت بآسانی ممکن ہے کہ وارث اور مورث الگ الگ مذاہب فقہ کے پیرو ہوں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والے کے مذہب کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا وارثوں کے مذہب کے مطابق یا اگر وارثوں میں بھی اختلاف مذاہب ہو تو کس وارث کے مذہب کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں قاضی اس امر کے پابند ہیں کہ سرکاری مذہب کے مطابق ہی فیصلہ صادر کریں، (خواہ فریقین مقدمہ کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو) تو دشواری نہیں پیدا ہوتی لیکن اگر حکومت زیادہ روادار اور فراخ دل ہو، اور ہر فرد رعیت کو اس کا حق دیا گیا ہو کہ اس کے مذہب کے مطابق اس کے حقوق اور واجبات متعین ہوں، خاص کر ان معاملات کے متعلق جنہیں آج کل مسائل شخصی کہا جاتا ہے، یعنی نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ تو واقعی تصادم قوانین پیدا ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر سلطان صلاح الدین اعظم کے زمانے میں مصر میں وقت واحد میں چاروں سنی مذاہب کی عدالتیں اور چار چار قاضی القضاۃ پائے جاتے تھے، یعنی شافعی، حنفی، مالکی، اور حنبلی، لیکن اس انتظام سے بھی دشواری حل نہیں ہوتی۔ فریقین مقدمہ ایک ہی مذہب کے پیرو ہوں تو یہ انتظام کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک فریق مثلاً شافعی اور دوسرا حنفی ہو تو بہت سے مسائل میں تصادم باقی رہتا ہے،

Marfat.com

قدیم فقہاء اس کا شاذ ہی کہیں ذکر کرتے ہیں، بعد کے زمانہ میں البتہ یہ قرار دے دیا گیا کہ مدعا علیہ اور متوفی ہی کے مذاہب کا لحاظ کر کے فیصلہ صادر کیا جائے گا۔ حنفی، شافعی اور مالکی مملکتوں میں یہی چیز مروج ہے۔ برطانوی ہند میں بھی اسی کو قبول کر لیا گیا ہے تونس اور شام و مصر میں بھی اسی پر عمل ہے۔

ہندوستان اور بعض دوسرے اسلامی ممالک میں اس کے مواقع پیش آتے رہتے ہیں کہ حکمران اپنا مذہب بدل دیں اور سنی سے شیعہ یا شیعہ سے سنی ہو جائیں لیکن تا حال میری تلاش اس امر کے متعلق ناکام رہی ہے کہ اس کا پتہ چلایا جائے کہ مذہب کی اس تبدیلی سے عدل گستری پر کوئی اثر پڑا یا نہیں۔

(د) تبدیل دین کے باعث تصادمِ قوانین:

اگر میاں بیوی دونوں ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ان کا سابقہ عقد نکاح برقرار رہتا ہے۔ بشرطیکہ اسلامی قانون کے تحت وہ روا رکھا جا سکتا ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو مثلاً اگر میاں بیوی خویذ وگدس پر عمل کرنے والے پارسی ہوں اور بہن بھائی نے یا باپ بیٹی نے آپس میں نکاح کر لیا ہو یا لامذہب لوگوں نے چار سے زیادہ بیویوں سے ایک ساتھ نکاح کر رکھا ہو یا مہر کے بغیر نکاح کیا ہو، یا ملیبار کے نایر، نیلگری اور تبت کے باشندے جو تعدد شوہران پر عامل ہوں اور میاں بیوی ایک ساتھ اسلام قبول کر لیں تو ظاہر ہے کہ ان کا نکاح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، پارسی بیوی کو فوراً اس کے شوہر سے تفریق کرا دی جائے گی، تعدد ازدواج پر عامل شوہر چار بیویاں رکھ کر بقیہ سے بے تعلق ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ بے مہر نکاح کرنے والی عورت کو مہر کا حق حاصل ہو جائے گا، تعدد شوہران پر عمل کرنے والی عورت کو جملہ شوہروں سے (بجز اپنے منتخبہ ایک کے؟) علیحدگی اختیار کرنا پڑے گی۔

اسی طرح اگر صرف شوہر اسلام قبول کرے، اور بیوی نہ کرے تو معاملہ میں اچھی خاصی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر بیوی اہل کتاب سے مثلاً عیسائی یا یہودی ہو تو شوہر کے اسلام لانے اور کتابیہ بیوی کے اپنے دین پر قائم رہنے سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور ان کا سابقہ ازدواج برقرار رہے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ دور میں

ہندوستان میں ہندوؤں کو بھی اہل کتاب تسلیم کرلیا گیا تھا۔اوران سے مسلمان مرد خاص کر شہزادے اور بادشاہ بڑی کثرت سے شادیاں کرنے لگے تھےاوراس کا واضح ذکر ملتاہے کہ ایسی متعدد ہندو بیویاں اپنے مذہب پر رہیں اوران کے پوجا پاٹ کے لیے شاہی محلات میں مندر تک تعمیر کیے گئے۔

لیکن اگر بیوی کتابیہ نہ ہوتو اس سے خواہش کی جائے گی کہ مسلمان شوہر کی زوجیت میں رہنے کے لیے تبدیل مذہب کرے، یہ ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے بجائے عیسائی یا یہودی بن جائےلیکن اگر وہ اسلام لانے اور کتابیہ بننے دونوں سے انکار کرے،تو تفریق کرادی جائے گی۔

اگرصرف بیوی اسلام قبول کرےتو شوہر سے مطالبہ کیا جائے گا کہ تین مہینوں کے اندر وہ بھی اسلام قبول کرلے (اوراس مدت میں تعلقات زنان شوئی غالبًا برقرار نہیں رکھے جاسکیں گے)اگرشوہر تبدیل دین سے انکار کرےتو تفریق عمل میں آجائے گی۔

ظاہر ہے کہ اگر مسلمان شوہر کی کوئی یہودی بیوی مثلاً عیسائیت قبول کرلےتو اس کا اثر ازدواج پر نہیں پڑتا، کیونکہ عیسائیت اور یہودیت دونوں اسلام کے نزدیک بیوی میں گوارا کیے جاسکتے ہیں۔

(۴) مسلمان رعایایا بیرونی ممالک میں:

(الف) کسی دوسری اسلامی مملکت میں:

قدیم زمانہ میں بظاہراس کوزیادہ اہمیت حاصل نہ تھی کہ مسلمان کہاں کا رہنے والا ہے،اگر وہ محض اتنا ہی ارادہ کرلیتا کہ دوہفتوں تک قیام کرے گا تو وہ مقامی باشندہ بن جاتا اور مسلمانوں کوسفر کے دوران میں نماز کے قصر کرنے وغیرہ کی جورعایتیں ملتی ہیں، ختم ہوجاتیں۔

مشہور سیاح ابن جبیر نے البتہ بیان کیا ہے کہ اس نے قاہرہ میں دیکھا کہ سلطان صلاح الدین اعظم نے مغرب (یعنی تونس ومراکش) کے باشندوں کے لیے جومصر میں مقیم تھے، ایک عریف ان ہی میں سے مقرر کیا تھا جو اپنے ہم وطنوں کے مقدموں میں

Marfat.com

فیصلہ کرتا تھا، ابن جبیر نے اس رعایت پر بڑی تعریف کی ہے اور میرے علم میں ایک اسلامی ملک کے مسلمانوں کے لیے دوسرے اسلامی ملک میں مراعات خصوصی کی یہ واحد مثال ہے۔

موجودہ زمانہ میں البتہ سیاسی قومیت اثر انداز ہوگئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپی مملکتیں یہ گوارا نہیں کرتیں، ان کی مسلمان رعایا کسی اسلامی مملکت میں جائے تو اپنے آپ کو اس یورپی ملک کی سیاسی رعیت کے سوا کوئی اور حیثیت دے، اب تو ابن سعود کی ہی قدامت پسند وراسخ العقیدہ حکومت میں بھی قوانین قومیت نافذ ہو گئے ہیں اور ان مسلمانوں پر نافذ ہوئے ہیں جو سعودی عرب کی رعیت بننا چاہتے ہیں۔ ایران، ترکی، افغانستان میں تو عرصہ دراز سے سیاسی قومیت کے لیے قواعد پائے جاتے ہیں۔ البتہ وحدت دینی کو اسلام نے جس قدر مستحکم کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بدنام ترکی میں بھی اجنبی مسلمانوں کے ساتھ اتنی محبت کا سلوک ہوتا ہے کہ دیکھنے والے رشک کرتے ہیں اور یہ بیان میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر دے رہا ہوں۔

(ب) مسلمان جو غیر اسلامی ممالک میں ہوں:

پرانے زمانہ میں مسلمانوں کو بہت سے ملکوں میں خارج الارضی مراعات خصوصی حاصل رہے ہیں، اس سلسلے کا آغاز ان مہاجرین حبشہ سے ہوتا ہے جنہوں نے عہد نبوی میں مکہ سے حبشہ ہجرت کی تھی اور تقریباً بارہ سال نجاشی کے ملک میں مقیم رہے، مراعات خصوصی مسلمانوں کو قدیم چین، ترکستان ملیبار (جنوب مغربی ہند) اور دوسرے بہت سے ملکوں میں حاصل رہے ہیں۔

اس موضوع پر میں نے مجلہ عثمانیہ ۱۹۴۳ء میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کی تفصیل کو دہرانے کے بجائے اس کا حوالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے، ان مراعات کا منشا اس زمانہ میں زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف عبادت کی آزادی حاصل رہے بلکہ ان کے آپس کے معاملات ان کے اپنے قانون کے مطابق طے ہوں، جس کے لئے ان کا حاکم عدالت ان ہی میں سے چنا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو فریقین ہی نہیں، بلکہ صرف ایک

فریق کے مسلمان ہونے کے صورت میں بھی مقدمہ مقامی سرکاری عدالت کی جگہ اسلامی عدالت میں پیش ہو کر اس کا فیصلہ ہوتا تھا لیکن مسلمانوں کے لیے یہ مراعات حکمرانوں کے ذاتی رجحانات کے مطابق گھٹتے بڑھتے رہتے تھے، اگر ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ رعایتیں ہوتی رہیں تو ناروا سلوک کی مثالیں بھی کم نہیں۔ اس سلسلہ میں مورخ مسعودی نے ایک عجیب و دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ علاقہ خزر میں (جو آج کل انگریزی مین کیپین کہلاتا ہے) ایک خاص مقام کے کسی غیر مسلم حکمران نے مسلمانوں کو اپنی فوج اور اپنی ذات کے محافظ دستے (باڈی گارڈ) کے طور پر بھرتی کیا تھا، اور اپنے ملک میں ملی عدالتوں کا ایک وسیع نظام قائم کیا تھا۔ چونکہ اس کی رعایا میں مختلف ادیان وملل کے لوگ تھے، اس لیے ملی عدالتیں اور ملی حکام بھی مختلف تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے، مسعودی نے جو خاص دلچسپ بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی دوسرے ملی حکام عدالت کو کسی مشکل مسئلہ سے سابقہ پڑتا جس کا حل ان کے پاس نہ ہوتا تو وہ اسلامی عدالت سے رجوع کرتے اور اسلامی قانون کا اس بارے میں جو فیصلہ ہوتا اس کو قبول اور نافذ کرتے۔ (دیکھو مروج الذہب جلد ۲ ص ۱۰ تا ۱۲، طبع یورپ) میرے خیال میں اس ملک کے بین الملل قانونی تصادمات ایسے پیچیدہ ہوں گے جن کو ناقابل حل سمجھ کر مسلمان حکام عدالت سے استصواب کیا جاتا ہوگا اور ان کی ناطرفداری اور علمیت کے باعث ان پر اعتماد کیا جاتا ہوگا۔

خاتمہ:

مذکورہ بالا مشتے از خروارے سے معلوم ہو جائے گا کہ تصادم قوانین کے متعلق مسلمان فقہاء کا خیال اور عمل ایک ایسا میدان ہے جس میں ابھی تک کسی نے قدم نہیں رکھا ہے، اور اس میں تحقیقات کی بڑی گنجائش ہے، اور صبر وتحمل سے محنت اور تلاش کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی دلچسپ دریافتوں کی امید کی جا سکتی ہے۔

آخر میں اس تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ علامہ ابن القیم نے ''احکام اہل الذمہ'' کے نام سے ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھی تھی، اس کی پہلی جلد جو چھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے حیدر آباد میں دستیاب ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کتنی اور جلدیں تھیں،

Marfat.com

کتاب خانہ ہائے عالم کی جتنی فہرستیں دستیاب ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں اس کا ذکر نہیں ملا ہے۔ حتیٰ کہ ابن القیم کی سوانح عمریاں بھی اس تالیف کے ذکر سے ساکت نظر آتی ہیں، لیکن انداز اور اسلوب مجھے بالکل ابن القیم ہی کا سا نظر آتا ہے، اس میں ہمارے موضوع پر کافی مواد موجود ہے۔ کاش مکمل کتاب دستیاب ہو جائے۔ اگر ناظرین میں سے کسی کو اس کے متعلق کچھ پتہ چلے تو اس کے سننے کا اشتیاق یقیناً مجھے بھی رہے گا اور دوسرے اہل علم کو بھی۔

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔فروری ۱۹۴۶ء)

نہر سویز کا پراجیکٹ حضرت عمرؓ کے زمانے میں

اپنے زیر تیاری مقالے کا مواد فراہم کرتے ہوئے مختلف چیزوں سے دوچار ہونا ناگزیر تھا۔ ایسی ہی دو ایک باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

تاریخ کبیر ذہبی (غیر مطبوعہ) جلد اول دیکھ رہا تھا۔ ۱۷ھ کے واقعات پیش نظر تھے۔ یکایک یہ عبارت نظر سے گزری۔

"جاء کتاب عمرو بن العاص الی عمر فی الاستعانة ان البحر الشامی حضر لمبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حفیرا فصب فی البحر العذاب فافسدہ الروم القبط فان احببت ان یقوم سعر الطعام بالمدینة کسعرہ بمصر حضرت لهم نهرا وبنیت لهم قناطر۔ فکتب الیه عمر ان افعل وعجل ذلك۔ فقال له اهل مصر خراجك زاج وامرك زاج۔ هذا انکسر الخراج فکتب بذالك الی عمر فکتب الیه عمر اعمله وعجل حزب اللہ خراج مصر فی عمران المدینة فعاجله عمرو وهو القلزم فکان سعر المدینة کسعر مصر ولم یزد ذلك مصر الا رخاء حتی حبس عنهم البحر مع مقتل عثمان فذل اهل المدینة وتقاضروا ......"

ذہبی نے یہ روایت طبری کے حوالے سے لکھی ہے چنانچہ طبری (ج ۵، صفحہ ۲۵۷۷ طبع لائڈن) میں لفظ بہ لفظ اس عبارت کا ہونا مجھ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

Marfat.com

۱۔ بحر شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت (۱۳ھ قبل ہجرت) کے زمانہ میں ایک نہر کے ذریعہ سے ملایا گیا تھا۔ مگر اسے عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص فاتح مصر نے اپنے زمانہ میں ناکارہ پایا۔

۲۔ عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے تحریک کی کہ انہیں ایک نہر کھدانے کی اجازت دی جائے۔ اس سے مدینہ منورہ کو غلہ بھیجنے میں سہولت ہوگی۔

۳۔ مصریوں نے اس بناء پر مخالفت کی کہ اس سے مصر کی مال گزاری گھٹ جائے گی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفاد عامہ کو سرکاری آمدنی پر ترجیح دی اور بعد میں مصریوں کا یہ خوف بے جا بھی ثابت ہوا۔

۴۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے قلزم سے یہ نہر ملادی۔

۵۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخر عہد تک یہ نہر کارآمد رہی۔

دریائے نیل چونکہ بحر شام (متوسط یا میڈی ٹرے نین) میں گرتا ہے اس لیے اگر دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے ملا دیا جائے تو چھوٹے چھوٹے جہاز بہ آسانی بحیرۂ احمر آسکتے ہیں۔ راہ میں چند جھیلوں کی موجودگی نے اس کام کو آسان تر کر دیا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ قبل اسلام بھی دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے کئی بار ملایا گیا ہے۔ اس کے آثار اب تک موجود ہیں (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا عنوان ''سوئز کینال'')۔

از راہ کرم مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (طبری کے) راوی سے غلط فہمی ہوئی۔ بحر روم کو سوئز سے قلزم میں ملانے کی تجویز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رد کر دی تھی۔ اور بحر (؟ نہر) نیل کو دریائے (؟ بحر) قلزم سے ملانے کی تجویز پر عمل کیا گیا جس کا نام نہر امیر المومنین پڑا تھا.........''

اس کے بعد آپ نے وہی حوالے دیے جو شبلی کی الفاروق میں مجھے ملے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ دونوں میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں۔ یہ دریائے نیل اور بحیرۂ احمر (جو بحیرۂ قلزم بھی کہلاتا ہے) کے مابین قابل جہاز رانی نہر بنا دی جائے تو بھی دریائے نیل کے دہانے کی راہ وہی مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو براہ راست بحیرۂ احمر اور بحیرۂ متوسط کو ملانے

Marfat.com

ہے۔مگر یہ زیادہ مصارف چاہتا ہے۔

مگر ابھی کچھ فیصلہ کرنے سے قبل مزید تحقیقات کرنی چاہیے۔ سیوطی نے ''حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرہ'' جس میں رطب و یابس ہر قسم کی چیزیں جمع ہیں۔ ''ذکر حفر خلیج امیر المومنین'' کے عنوان کے تحت جو باتیں درج کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷ھ کے مشہور قحط کے زمانہ میں گورنر مصر عمرو بن العاص کو ''غوثاہ ثم یا غوثاہ'' ''مدد مدد'' کی پُر جوش اپیل دربارِ خلافت سے پہنچی۔ اس کے جواب میں عمرو بن العاص نے ''یا لبیک یا لبیک'' ''حاضر حاضر'' کہا اور لکھا کہ ''میں اتنے اونٹوں پر غلہ بھیج رہا ہوں کہ اس کی قطار کا پہلا اونٹ مدینہ منورہ پہنچے گا تو آخری اونٹ نکل رہا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد پھر خود ہی ایک نہر کی تجویز کی۔ اور یہ خط بھیجا۔

"یا عمرو" ان اللہ قد فتح علی المسلمین مصر وھی کثیرۃ الخیر والطعام وقد القی فی روعی لما احببت من الرفق باھل الحرمین والتوسعۃ علیھم ان احفر خلیجا من نیلھا حتی یسیل فی البحر فھوا سھل لما نرید من حمل الطعام الی المدینۃ والمکۃ فان حملہ علی الظھر یبعد و لا نبلغ معہ ما نرید فانطلق انت واصحابک فتشاور وافی ذلک حتی یعتدل فیہ رایکم"

(بحوالہ سیوطی ایضاً ص ۷۳، جلد اول)

عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص نے مصریوں سے تذکرہ کیا تو یہ ان پر گراں گزرا۔ انہوں نے کہا اس سے مصریوں کو نقصان ہوگا۔ آپ خلیفہ کو لکھ بھیجے کہ یہ نامناسب اور ناقابل عمل اور ناممکن ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع مل گئی تھی۔ انہوں نے قاصد سے کہہ دیا کہ کیا مصریوں نے ایسا نہیں کہا تھا؟ آخر دربار خلافت کی تاکید پر۔

"احتفر الخلیج الذی فی حاشیۃ الفسطاط الذی یقال لہ خلیج امیر المومنین ...."

Marfat.com

(فسطاط کے متعلق شبلی نے لکھا ہے کہ وہ جبل مقطم اور دریائے نیل کے درمیان واقع تھا (الفاروق) گویا قاہرہ کے قریب اور اس کے جنوب میں تھا) نیل سے قلزم کو ملایا گیا اور ایک سال کے اندر ہی کشتیاں آنے جانے لگ گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک یہ راستہ مستعمل رہا۔ (سیوطی)

سیوطی نے اسی کتاب میں ایک دوسری روایت میں لکھا ہے کہ پہلے عمرو بن العاص نے خط لکھا کہ "آپ واقف ہیں کہ اسلام سے پہلے ہمارے (عربوں کے) پاس کشتیاں آتی تھیں جن میں مصری تاجر ہوتے تھے۔ جب ہم نے مصر فتح کیا تو یہ "خلیج" یعنی نہر بند ہو گئی اور تاجروں نے اسے چھوڑ دیا۔ اگر آپ چاہیں تو ایک نہر کھدوا سکتے ہیں جس میں ہماری کشتیاں چلیں اور حجاز کو غلہ بھیجا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اچھا"۔

ایک تیسری روایت اسی کتاب میں ہے کہ ایک قبطی (مصری عیسائی) نے عمرو رضی اللہ عنہ بن العاص سے کہا کہ اگر اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے تو وہ بتا سکتا ہے کہ کس جگہ سے کشتیاں مصر سے حجاز تک لے جائی جا سکتی ہیں۔ انہوں نے مدینہ لکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا جزیہ معاف کرنا منظور کر لیا۔ بعد ازاں پہلی کشتی جو مصر سے آئی اسے دیکھنے کے لیے آپ مدینہ سے ساحل سمندر تک تشریف لائے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نہر سویز کے متعلق لکھا ہے کہ ہارون رشید بحیرۂ متوسط اور بحیرۂ احمر کو ملانا چاہتا تھا مگر اس خیال سے رُک گیا کہ (رومی) جہاز اس مخرج کو دیکھ کر فائدہ اٹھائیں گے اور وہ جنگی نقطہ نظر سے خطرے سے خالی نہیں۔

ممکن ہے ہارون رشید کے زمانے میں بھی ایسا ہوا ہو خود انگریزوں نے بھی دلاسپس کی اسکیم کی اسی بنیاد پر مخالفت کی تھی کہ ہندوستان کو خطرہ ہے آخر انگریزوں کی مخالفت کے باوجود نہر کھد گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی خیال تھا اور بحیرۂ احمر اور بحیرۂ متوسط میں راست نہر کے وہ مخالف تھے۔ چنانچہ ابو الفداء نے اپنی جغرافی تصنیف تقویم البلدان (ص ۱۰۶ طبع پاریس) میں شہر فرما کے تحت لکھا ہے:

الفرما بلدة علی شاطی بحر الروم خراب ...... وعن ابن سعید عند الفرما یقرب بحر الروم من بحر

Marfat.com

القلزم حتى يبقى بينهما نحو سبعين ميلا۔ قال و
كان عمرو بن العاص قدارا دان بخرق مابينهما فى
مكان يعرف الى الان بذنب التمساح فنها عمر بن
الخطاب رضى الله عنه وقال كانت الروم تتخطف
الحُجاج۔

خلاصہ مطلب اس کا یہ ہے کہ فرما بحر متوسط پر ایک غیر آباد شہر ہے۔ یہاں سے بحیرۂ احمر صرف ستر میل رہ جاتا ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ذنب التمساح نامی مقام سے نہر کھدوا کر دونوں سمندروں کو ملانا چاہتے تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں شاید رومی حاجیوں کو اُچک لے جائیں"۔

نہر سویز کی حالیہ تاریخ، اس کا بین الاقوامی معاملات پر اثر وغیرہ کا ذکر یہاں شاید غیر متعلق ہے۔

(مجلہ تحقیق، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۲۰۰۳ء)

Marfat.com

جاہلیت عرب کے معاشی نظام کا اثر
پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام پر

تمہید:

خدائے تعالیٰ نے قادر مطلق ہونے کے باوجود کم از کم انسانی دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور مشیتِ ایزدی کا کوئی کرشمہ یہاں جب پوری طرح جلوہ گر ہو کر اپنا مظاہرہ دکھاتا ہے تو اس کے پس منظر میں اسباب و مسببات اور علل و معلولات کا ایک کثیر و طویل سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

مشیتِ ایزدی یہ ہوئی تھی کہ اب سے پورے پونے چودہ سو سال پہلے پرانی دنیا کے جغرافیائی مرکز (اور اس طرح نافِ زمین) یعنی مکہ معظمہ سے انسان و خدا کے تعلقات میں ایک نئی مرکزیت پیدا کرائے۔ اور عرب سے شروع ہو کر اسلام اقصائے عالم تک پہنچ جائے۔ عہدِ نبوی میں جو پہلی اسلامی مملکت قائم ہوئی اس کے بیسیوں اسباب تھے۔ اخلاقی بھی، سماجی بھی، سیاسی بھی، معاشی بھی، اور ظاہری طور پر اس تحریک کی کامیابی میں جہاں سرورِ کائنات پیغمبر اسلام کی قابلیتوں اور کوششوں کو دخل تھا وہیں ان آلوں اور ہتھیاروں میں بھی صلاحیت کی ضرورت تھی جن سے رسول کریم کو کام لینا تھا۔ گیہوں سے روٹی بیشک بنتی ہے لیکن محض گیہوں سے نہیں۔ پہلے اسے کھلا کرنا اور پچھوڑنا ہوتا ہے پھر پیسنا، اور محض پسے ہوئے سوکھے آٹے سے بھی روٹی نہیں بنتی۔ اسے بھگونا اور گوندھنا اور بیلنا اور توے پر ڈال کر سینکنا بھی ہوتا ہے۔

پہلی مملکت اسلامیہ کو اگر ایک پکی پکائی روٹی سمجھا جائے اور حجازی عربوں کو

گیہوں، تو اب یہ دیکھنا ہمارے لیے دلچسپی کا باعث ہو گا کہ اس گیہوں کو کھلا کس طرح کیا گیا، پچھوڑا کس طرح گیا، پیسا کس طرح گیا، چھانا کس طرح گیا، گوندھا کس طرح گیا، بیلا کس طرح گیا، بھونا، الٹا پلٹا اور پھیرا کس طرح گیا، کتنا پانی ڈالا گیا، کتنا نمک ڈالا گیا، کتنی دیر کتنی تپش پر سینکا گیا، کسی کونے کو داغ نہ لگنے دینے کے لیے کیا کیا احتیاطیں ملحوظ رہیں وغیرہ۔

پہلی مملکت اسلامیہ کے لیے ایک نئی دنیا نہیں پیدا کی گئی بلکہ موجودہ دنیا کے موجودہ لوگوں ہی کو ان کے موجودہ مروج طرز زندگی کے ساتھ مملکت اسلامیہ میں مبدل کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اسلام سے پہلے بھی کھانا کھاتے، پانی پیتے، چلتے پھرتے، سوتے، مرتے، اور پیدا ہوتے تھے۔ اور اسلام کے بعد بھی ان امور میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کچھ چیزیں مثلاً بت پرستی، شراب خوری، سود خواری وغیرہ گھٹیں، کچھ چیزیں مثلاً نماز، روزہ، زکات بڑھیں۔ لیکن انسانی زندگی میں یہ سب جزئیات ہیں۔ انسان کی پیدائش کا طریقہ، زندگی گزارنے کا طریقہ اور مرنے کا طریقہ کبھی بدل نہ سکے۔ تصور حیات بدل دیا گیا، اس ایک تصور حیات کے بدلنے سے انسانوں کے افعال میں وہی فرق ہو گیا جو ایک رہزن ٹھگ کی خونریزی اور ایک سپاہی کے قتل و غارت گری میں ہوتا ہے کہ رہزن کو تو سماج کا بدترین مجرم اور سپاہی کو محسنِ اعظم ہیرو خیال کیا جاتا ہے۔ گو دونوں کرتے ایک ہی قسم کا کام ہیں۔ اس تصورِ حیات کے بدلنے سے پہلے کعبے کے سامنے سجدہ بدترین قسم کی بت پرستی اور جہالت تھی تو اب کعبہ کے سامنے سجدہ وحدانیت اور خدا پرستی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ بن گیا۔

تصور حیات کی اس تبدیلی میں مختلف امور اثر دکھاتے ہیں۔ پہلے ''کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ'' منتہائے مال اور منشائے اعمال تھا تو اب، اور تو اور کھانے پینے کا مقصد بھی یہ ہو گیا کہ اپنے بلند نصب العین اور مفوضہ مشن کی تکمیل کے لیے صحت و طاقت کے ساتھ جی سکیں۔

اس نئے مقصد حیات کا تعلق نہ صرف روحانی زندگی سے تھا بلکہ دنیاوی زندگی سے بھی۔ اور نہ صرف انفرادی زندگی سے تھا، بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی۔ نہ صرف اپنی زندگی

Marfat.com

سے تھا بلکہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اس نئے تصور سے بہرہ ور کرنے سے بھی۔
ان گوناگوں مقاصد کے لیے جہاں اور وسائل کے اختیار کرنے کے ضرورت تھی وہیں ایک مملکت کا قیام بھی درکار تھا، تاکہ یہ بتایا جاسکے کہ اس جدید تصورِ حیات یعنی اسلام یا ''خدا کی مرضی پر چلنے کے اصول'' کا اطلاق حکمرانی اور سیاست مدن پر کس طرح کیا جائے۔ جنگ و صلح، عدل گستری، محصول گیری، راعی و رعایا کے حقوق و واجبات، اجتماعی و انفرادی آزادیاں اور پابندیاں سب ہی میں ایک نئی مرکزیت، ایک نیا ولولہ، ایک نئی زندگی، ایک ہر جہتی اور بے پناہ انقلاب کس طرح برپا کر دیا جائے؟
کسی مملکت کے قیام کے لیے آدمیوں کی ضرورت ہے لیکن اس طرح جس طرح روٹی کے لیے گیہوں کی۔ پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام کے لیے جن نفسیاتی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی، تمدنی، معاشی اور دیگر مؤثرات کی ضرورت تھی ان سب کی تفصیل طویل ہوگی۔ یہاں صرف ایک امر یعنی معاشی ضرورت کی تحلیل مقصود ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کا معاشی نظام کیا تھا اور اس نظام نے پہلی مملکت اسلامیہ کے قیام میں کیا حصہ لیا؟

عرب کے مختلف علاقے:

اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اسلام سے پہلے عرب کے جزیرہ نما میں کبھی بھی ایک ملک گیر اور مرکزی حکومت قائم ہوئی ہو۔ اور قریب قریب ہندوستان کے برابر وسعت رکھنے والے اس صحرائی براعظم میں تمدنی ترقی چوطرف یکساں بھی نہیں رہی۔ ربع خالی آج چودھویں صدی ہجری میں بھی خالی ہی پڑا ہے۔ تو یمن وغیرہ میں حضرت مسیح سے بھی ہزاروں سال پہلے متمدن اور طاقتور مملکتوں کا پایا جانا ایک امر واقعہ ہے۔ کبھی کبھی خاصی وسیع سلطنتیں وجود میں آئیں مثلاً کندہ والوں نے حضرموت سے صراط ماجاسب (۱) وحیرہ تک یعنی عرب کے جنوب سے شمال تک کچھ دنوں ایک حکومت قائم کر لی تھی لیکن حجاز وغیرہ کے وسیع علاقے اس سے آزاد رہے۔ بحرین، عمان وغیرہ کے ساحلی علاقے بھی خاصے قدیم زمانے سے خانہ بدوش قبائل کی جگہ حضری زندگی رکھنے والی بستیوں پر مشتمل نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

بہرحال آغاز اسلام پر صورت حال یہ دکھائی دیتی ہے کہ کوئی مرکزی مملکت عربی قوم یا ملک عرب میں نہ تھی۔ سینکڑوں قبیلے تھے جو نیم حضری اور نیم بدوی زندگی گزارتے ہوئے مکمل خودمختارانہ طور سے رہتے تھے۔ ہر قبیلہ جنگ کا خود اعلان کر سکتا تھا۔ صلح نامہ خود طے کر سکتا تھا۔ اس کے خلاف کوئی بیرونی حاکم کسی طرح کا اختیار سماعت نہ رکھتا تھا۔ ان قبائل کے علاوہ بیسیوں شہر بھی تھے، مکہ، مدینہ، طائف، ینبوع (حجاز میں) جرش، صنعا، عدن (یمن میں) صحار اور دباء (عمان میں) ہجر (بحرین میں) یمامہ، فید (نجد میں) دومتہ الجندل، خیبر، فدک، وادی القریٰ (شمالی عرب میں) ایلہ، مقنا، صحرائے سینا کے مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم وبیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی ہیں۔ یمامہ، یمن وغیرہ بعض علاقوں میں غلے کی کاشت ہوتی تھی اور آس پاس کے عربی علاقوں میں برآمد بھی ہوتی تھی لیکن نہ اتنی کہ پورے ملک کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ کھجور اور اونٹ بکریاں ایک حد تک بدوؤں کی غذائی ضرورتیں پوری کر دیتی تھیں۔ لیکن لباس، برتن، ہتھیار (۲)، زیور اور دیگر ضرورتوں کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ صحرائے گوبی وترکستان اور جرمنی کے کالے جنگل کی طرح عرب بھی تاحال نامعلوم وجوہ سے بڑا مردم خیز خطہ ہے اور توالد و تناسل کی کثرت مقامی ذرائع معیشت سے اتنی کچھ زیادہ ہے کہ باوجود خانہ جنگیوں وغیرہ کے جلد ہی زندگی آبادی کے کثرت سے اضافے کے باعث ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چار ہزار سال قبل مسیح سے عرب مہاجرین کا واحد خشکی کے راستے یعنی شمال سے پھیلنا اور عراق وشام اور مصر تک میں جا جا کر آباد ہونا، سب جانتے ہیں ہجرت کے باوجود بھی جو آبادی بچ رہتی ہے وہ بیرونی درآمد کی محتاج ہوتی ہے۔ قدرت نے عرب میں کچھ ایسے زیادہ خام مواد بھی نہیں مہیا کیے ہیں اور آب وہوا کی عمدگی ہے کہ بیرون والے یہاں آئیں اور غلہ وغیرہ پہنچائیں۔ مجبوراً بیچارے عربوں ہی کو باہر جانا اور اپنی پونجی کے عوض ضروریات زندگی کا لانا ضروری تھا۔ بحرین وعمان کا بلوچستان اور سندھ سے اتنا قریبی جغرافی تعلق ہے کہ یہ لوگ ہندوستان اور ایران کے سوا کہیں اور جا نہیں سکتے۔ حجازی عربوں کے متعلق قرآن مجید کی شہادت رحلة الشتاء والصيف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہر سال دو مرتبہ جاڑوں اور گرمیوں میں کئی کئی ماہ کے

Marfat.com

سفر پر مجبور تھے۔ جاڑوں میں یمن جاتے اور گرمیوں میں شام و مصر۔ اونٹ، بکریاں، اونٹوں اور بکریوں کی کھالیں اور اون، گھوڑے، گوند، لوبان، روغن بلساں، عقیق وغیرہ کچھ قیمتی پتھر، اور اسی طرح کی کچھ چیزیں دساور کر سکتے تھے۔ اور تبادلے میں غلے، برتن اور ہتھیار اور کپڑوں کی درآمد ہو سکتی تھی۔

عربوں کے دو بڑے حصے تھے اور بعض وقت ایک ہی قبیلے میں بھی یہ تقسیم نظر آتی تھی کہ کچھ لوگ خانہ بدوش بدویانہ زندگی بسر کرتے ہیں تو کچھ بستیوں میں مستقل حضری زندگی گزارتے ہیں۔ بدویوں کی غذا کچھ تو شکار ہے، کچھ ان کے اونٹ، بکریوں سے اور کچھ شہروں میں لگنے والے میلوں میں تبادلہ اشیاء کرنے کے ذریعے سے مہیا ہوتی تھی۔ مزید برآں یہ کرائے پر حمل و نقل کا کام کرتے تھے لوٹ مار کی مہمیں بھی وقتاً فوقتاً اختیار کی جاتی تھیں دل جلے ابن خلدون نے ان میں سے بعض کی حالت یوں بیان کی ہے کہ اگر انہیں چولھے کے لیے پتھر درکار ہوتا تو کسی مکان کا پایہ کھود ڈالتے اور جلانے کے لیے لکڑی درکار ہوتی تو مکان کی چھت توڑ ڈالتے۔ (۴)

رہی شہری زندگی، سو اس میں بھی بڑی حد تک تمام عرب میں یکسانی نظر آتی ہے نخلستان چوطرف تھے۔ طائف، سوارقیہ وغیرہ میں انگور، انجیر، انار، شفتالو وغیرہ کے بکثرت باغ تھے۔ ۱۳۵۰ھ میں طائف میں میں نے انجیر کا ایک پرانا درخت دیکھا جو یقین نہ آئے گا کہ ہمارے ہاں کے کسی پورے تناور پیپل یا بڑ کے درخت کے برابر اونچا اور پھیلا ہوا تھا۔ چشموں کے ساتھ ترکاری، تربوز، ککڑی وغیرہ کی کاشت بھی ہوتی تھی، کہیں کہیں غلہ، جو وغیرہ بھی بویا جاتا تھا مرغیاں پالی جاتیں جسے کوئی ٹھیٹ بدوی آج چودھویں صدی میں بھی بڑا نفرت انگیز اور کمینہ کام سمجھتا ہے۔

ان مقامی وسائل کے بعد بھی ضرورتیں پوری نہ ہوتیں تو مختلف میلوں، منڈیوں میں جا کر تبادلۂ اشیاء کرنا پڑتا۔ یہ کام سب ہی عربی شہر اور عربی قبیلے کرتے لیکن مکے کے قریشیوں نے اسے ایک فن سے بھی گزار کر ایک علم بنا دیا تھا۔

مکے کے امتیازات عرب شہروں پر:

عرب میں ہر جگہ بستیاں اور قریے تھے لیکن مکہ ام القریٰ (یعنی قریوں کی ماں)

Marfat.com

کہلاتا تھا۔عرب کی ہر بستی میں معابد اور بت خانے تھے لیکن کعبے کے حج کے لیے جو لوگ آتے تھے ان میں بیعت عقبہ کے سال یمن کے لوگ بھی تھے، عمان کے لوگ بھی، بحرین کے لوگ بھی، طائف کے لوگ بھی، نجد کے لوگ بھی، طئی اور کلب جیسے شمالی عرب کے لوگ بھی۔عرب کی ہر بستی میں میلے لگتے تھے کہیں مقامی اور کہیں بین القاماتی۔ چھوٹے ہاٹ ہفتہ وار لگتے۔ بڑے بین القبائل اور بین القاماتی میلے سالانہ مقررہ ایام میں لگتے۔ لیکن جو اہمیت مکے کے عکاظ اور منیٰ کے میلوں کو حاصل تھی وہ انتہائی غیر جانبدار تحقیق و تلاش کے بعد بھی کسی اور میلے میں نظر نہیں آتی۔عرب کی ہر بستی والے اپنے کاروانوں کو باہر بھیجا کرتے تھے۔لیکن لایلاف قریش کا مفہوم محمد بن حبیب، یعقوبی وغیرہ کسی پرانے اور واقف کار شخص کی تالیف (۴) میں دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے ایلاف یعنی معاہدات قیصر روم سے، کسرائے ایران سے، نجاشی حبش سے، اور اقیال یمن سے تھے اور ان حکمرانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہاشم کو منشور اور اجازت نامے عطا کر رکھے تھے کہ ان کے علاقوں میں وہ تجارت کے لیے آزادانہ کارواں لایا کریں۔

عرب کی ہر بستی والے اپنے تجارتی کاروانوں کی حفاظت کے لیے کچھ تو خود ہتھیار بند ہو کر بطور محافظ دستہ جاتے اور کچھ ان علاقوں کے جہاں سے انہیں گزرنا ہوتا، قبائل سے حلیفی اور دوستی پیدا کر لیتے۔لیکن قریشی کاروبار شمال، جنوب، مشرق، مغرب، سب طرف پھیلے ہوئے تھے۔ وہ عراق بھی جاتے، یمن بھی، حبش بھی، شام بھی اور اندرون عرب بحرین وعمان، نجد و خیبر بھی۔ان کا نظام ناگزیر وسیع ہونا چاہیے۔اور واقعہ بھی یہی تھا۔انہوں نے ایک فوج قائمہ نوکر رکھ لی تھی (۵) جو تمام بدوی عرب میں اچھوتی چیز تھی۔انہوں نے خفارے یا بدرقے کے ضروریات کے لیے معاہدات کا جو وسیع اور ملک گیر جال پھیلا دیا تھا اس کا ذکر ابن قتیبہ کے استاد محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) سے سنیے جو کہتا ہے کہ:

> ''جو تاجر بھی یمن اور حجاز سے نکلتا تو وہ اس وقت تک قریشی خفارے یعنی محافظ دستے کا محتاج رہتا جب تک کہ وہ مضری قبائل کے علاقے میں رہے کیونکہ ایک مضری قبیلہ، دوسرے مضری قبیلے کے تاجروں کو نہ ستاتا۔مزید برآں مضریوں کی حلیفی جن جن قبائل سے تھی ان کے

Marfat.com

ہاں بھی ان کو امن رہتا۔ اور یہ ''باہمی امن'' کے اصول پر مبنی تھا۔
چنانچہ قبائل کلب ان کو مضری قبیلہ بنو تمیم سے حلیفی کے باعث نہ ستاتے اور قبائل طئی بھی ان کو مضری قبیلہ بنو اسد سے حلیفی کے باعث نہ چھیڑتے۔ اور مضری قبائل کہا کرتے تھے کہ قریش نے ہمارا وہ قرض ادا کر دیا جو حضرت اسماعیل سے ہم کو وراثتاً مذمت کی صورت میں ملا تھا۔ جب یہ آگے بڑھ کر عراقی سمت میں جاتے اور بنی عمرو بن مرثد سے خفارہ حاصل کر لیتے تو تمام قبائل ربیعہ میں وہ کافی ہوتا......... جو تاجر دومۃ الجندل جاتے ان کو بھی قریش ہی سے خفارہ حاصل کرنا ہوتا......... رابیہ جو حضرموت میں واقع ہے اگر وہاں جانا ہوتا تو قریش وہاں کے قبیلہ بنو آکل المرار سے خفارہ حاصل کرتے اور باقی لوگ آل مسروق سے لیکن قریشی حلیفی کے باعث آکل المرار نے غلبہ اور حکومت و سطوت حاصل کر لی اور سب کو زیر کر لیا۔'' (کتاب المحبر ص ۲۶۳،۱ الخ)

اس دلچسپ اقتباس سے معلوم ہو گا کہ خفارہ جو ایک معنے میں بین الاقوامی اجازت نامہ رہگزر کا مہیا کرنا تھا، عربوں کے ہاں ایک مستقل ادارہ بن گیا تھا جس کی قیمت مقرر تھی، عدنان و قحطان کے قبائل، مضر و ربیعہ کے قبائل سب اس میں داخل تھے اور عملاً پورا عرب اس نظام میں منسلک ہو گیا تھا، جو قریشی مواصلات کے لیے ضروری تھا۔ قریش نہ صرف اس نظام اور سلسلہ حلیفی سے خود فائدہ اٹھاتے بلکہ تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کو بھی بخوشی معاوضہ لے کر اپنا خفارہ مہیا کرتے۔ اس نظام کی برکت تھی کہ ہندوستان کا سامان عرب کی راہ یورپ میں پہنچ سکتا تھا مگر خود یورپ کا حال عرب کے اس ہمعصر زمانے ہی میں نہیں بلکہ اٹھارویں صدی تک یہ تھا کہ وینس اور جینوا ہو کہ اسپین و پرتگال، تجارت پر قومی اجارہ داری ضروری سمجھی جاتی تھی اور طوفان زدہ مصیبت کا مارا تک اگر اسپینی مقبوضات میں پہنچتا تو وہ نہ صرف مال سے ہاتھ دھو بیٹھتا، بلکہ جان کر صرف غلام بنتا، تو اسے ایک نعمت غیر مترقبہ ملتی۔ (۶) قریش نے خفارے کے اغراض کے لیے حلیفیوں

Marfat.com

کی جو طرح ڈالی تھی وہ مختلف اصول پر مبنی ہوتی، کبھی تو باہم امن کی شرط کافی ہوتی کبھی قریش یہ کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی غریب قبیلے کا مال بطور کارندہ تجارت کے لیے لے جاتے اور کوئی کمیشن لیے بغیر نفع مالکوں کے سپرد کرتے اور کبھی خفاروں پر نقد معاوضہ رقم یا جنس کی صورت میں دیتے۔ بہت سے قبیلوں کا روزگار ہی اس خفارکاری سے نکلتا۔ وہ رہبر مہیا کرتے جو راستے میں چوکس اور سینہ سپر رہتے اور عربوں ہی نہیں بلکہ حیرہ کے بادشاہ اور دیگر اجنبیوں تک کا مناسب معاوضہ لے کر ''تطیمہ'' یعنی تجارتی سامان منڈی تک بحفاظت لے جانے اور واپس لانے کا ذمہ لیتے اور یہ ذمہ داری علی العموم پوری ہوا کرتی ہوتی جبھی تو یہ ادارہ بقا واستحکام میں نظر آتا ہے۔

اسواق العرب پر محمد بن حبیب کی کتاب کا ایک اقتباس ہم ابھی سن چکے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک اور اقتباس سننے کے قابل ہے، جس میں کہیں کہیں ایک ہم ماخذ مؤلف، مرزوقی، کے بیان سے تکملہ کیا گیا ہے۔

''دومتہ الجندل میں جو شام وحجاز کے مابین ہے یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا اور مہینہ بھر چلتا پھر برخاست ہو کر آیندہ سال اسی زمانے میں لگتا۔ (قریش مکے سے اس کے لیے جاتے) .... پھر یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مستقر آتے جہاں یکم سے آخر جمادی الآخرہ تک میلہ لگتا اور دومتہ الجندل کی طرح بھی مقامی حکمران کو عشر یعنی دس فیصدی چنگی وصول ہوتی۔ ایران تک سے تاجر سامان لے کر یہاں آتے۔ اس کے بعد یہاں سے یکم رجب کو چلتے تو عمان کے شہر صحار کو آتے آتے بیس دن لگتے اور جو پہلے نہ آسکے ہوتے وہ اب آتے اور یہاں پانچ دن تک میلہ لگتا۔ یہاں کا عشر بادشاہ جلندی کو ملتا۔ اس کے بعد دبا کا میلا رجب کے آخر میں لگتا۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا، یہاں سندھ اور ہند اور چین اور مشرق اور مغرب کے لوگ آیا کرتے اور خشکی اور سمندر سے سامان لاتے۔ یہاں کا عشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا۔ اس کے بعد مہرہ کے شہر شحر میں .... جو آج کل ہمارے سلطان مکلا وشحر کے علاقے میں ہے۔ وسط شعبان سے میلہ لگتا، جہاں بری اور بحری تاجر سب دبا سے چل کر آتے یہاں کھالیں، کپڑے وغیرہ فروخت کیے جاتے اور ایلوہ، لوبان وغیرہ جو مقامی پیداوار ہے خرید کیے جاتے پھر

Marfat.com

عدن میں یکم رمضان سے بیس دن میلہ لگتا۔ یہاں بڑا اچھا انتظام تھا۔ کسی محافظ دستے کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ یہاں کا عشر ایرانی نو آباد کار افسر لے لیتے۔ یہاں سمندری راہ سے آنے والے لوگ جو دبا اور مہرہ آتے وہ نہ آتے بجز اس کے کہ کسی کے پاس کچھ سامان بچ رہا ہو اور اس سے پہلے کے میلوں میں اسے شرکت کا موقع نہ ملا ہو۔ عدن میں جو عطر بنتا اس کی دُور دُور تک شہرت تھی۔ سمندری راہ سے آنے والے تک اسے بطور تحفہ سندھ اور ہند تک لے جاتے اور اس پر فخر کیا جاتا، اور خشکی کی راہ آنے والے اسے ایران و روم تک لے جاتے .... (عطر سازی کے متعلق مرزوقی نے اپنی ۴۵۳ ھ کی تالیف میں لکھا ہے کہ اس وقت تک وہ صنعت وہاں کمال پر ہے)۔ عدن کے بعد صنعاء کا میلہ تھا جو وسط سے آخر رمضان تک ہر سال لگتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگ، لوہے وغیرہ کے سامان بکتے۔ یہاں کا عشر بھی ایرانی حکمران افسر لیتے، ان مختلف میلوں میں لوگ وہ سامان خریدتے جن کی ان کے اپنے ملکوں میں مانگ ہوتی۔ اس کے بعد رابیہ واقع حضر موت اور عکاظ قریب عرفات و مکہ میں بیک وقت وسط ذیقعدہ سے آخر ماہ تک میلہ لگتا۔ کچھ لوگ عکاظ آتے اور کچھ رابیہ جاتے۔ عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے چنانچہ عکاظ کے بعد یکم ذی الحجہ سے دس دن ذی المجاز میں میلہ لگتا پھر منیٰ میں جو مکے کے مضافات میں ہے، حج کے سلسلے میں میلہ جمتا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔ اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بصریٰ اور اذرعات کے میلے لگتے۔'' (دیکھیے نقشہ)

اس اقتباس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کس طرح شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب، جنوب سے مغرب، اور مغرب سے شمال، غرض پورے عرب کا سال بھر میں دورہ ہو جاتا ہے۔ کس طرح پورے عرب میں سیاسی تو نہیں لیکن معاشی وفاق قائم ہو گیا تھا۔ کس طرح ان میں ایک ربط و نظم پیدا ہو گیا تھا اور اگرچہ ہر جگہ مقامی خود مختاری اور محصول گیری وغیرہ رائج تھی لیکن پھر بھی کس طرح خفارے کے نظام اور میلوں میں حفاظت کے انتظام وغیرہ نے مرکز گریز اور افتراق پسند بدویوں میں بھی ایک یکجہتی پیدا کر دی تھی۔

عرب میلوں کی ترتیب زمانی ومکانی

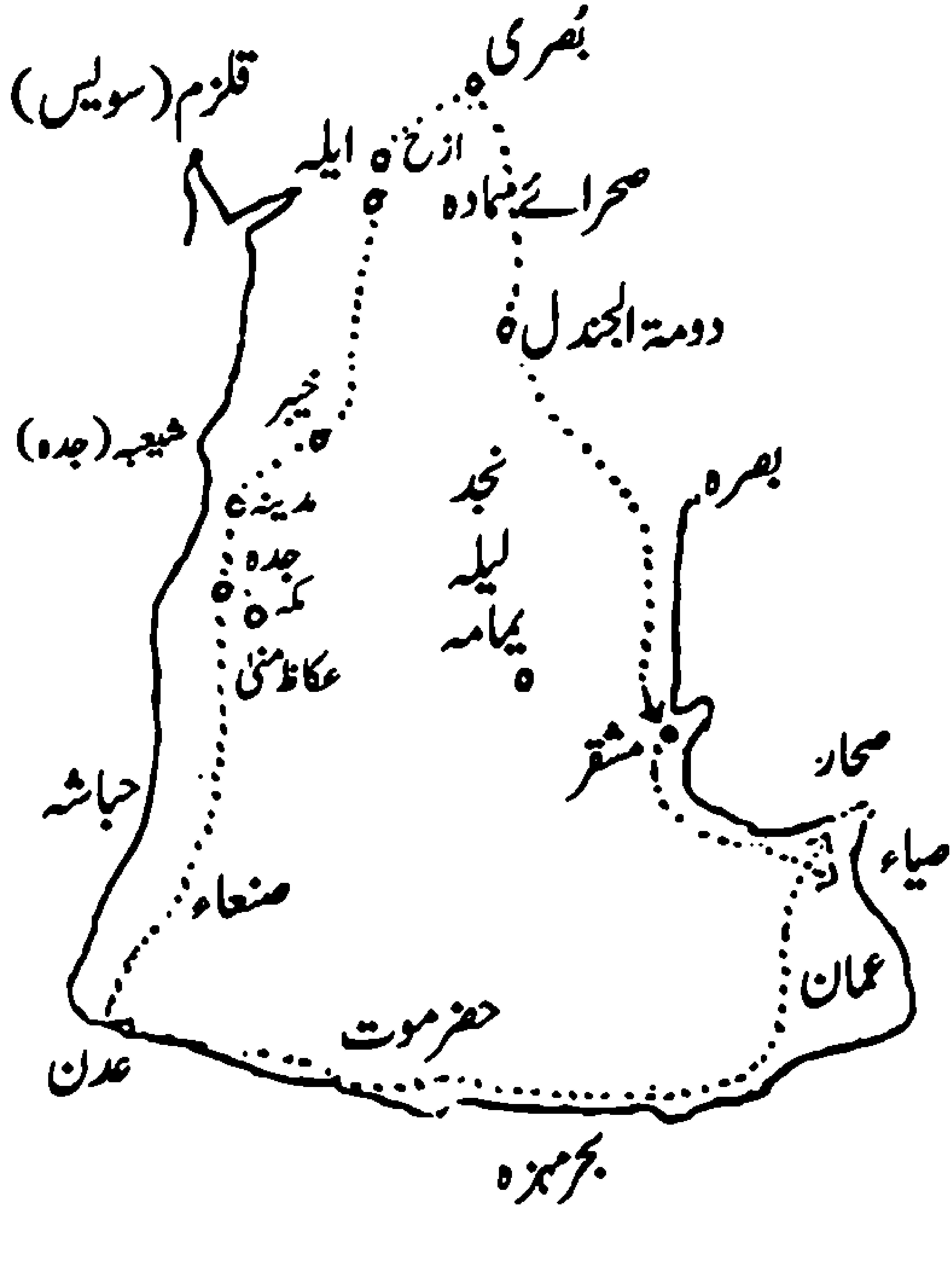

Marfat.com

اوپر عکاظ کے میلے کی کچھ اہمیت ہم نے بیان کی کہ وہاں کس کس حصے سے لوگ آتے تھے۔ ہمارے مولفوں نے ایک اور اہم بات بھی بیان کی ہے کہ عکاظ میں عام نگرانی اور جھگڑوں کا فیصلہ، نیز اس کے بعد ہی ہونے والا موسم حج، قبیلہ تمیم کے اہتمام میں ہوتا۔ قمری سال کو کبیسہ گری کے ذریعے سے فصلی شمسی سال بنانا بھی قبیلہ تمیم کے قلمس کا فریضہ تھا جو مکہ معظمہ میں کعبے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا اعلان کرتا۔ (۷) قبیلہ تمیم عرب کے انتہائی مشرق میں رہتا تھا اور عکاظ و مکہ انتہائی مغرب میں ہیں۔ حج کے زمانے میں مختلف فرائض مختلف قبائل میں چلے آتے تھے۔ علاوہ بنو تمیم کے آل صفوان، اجازہ یعنی عرفات سے روانگی کا حکم دینا بطور موروثی حق کے استعمال کرتے تھے۔ کعبے کے اطراف جو تین سو ساٹھ بت تھے وہ عرب کے ہر حصے کے قبائل کے معبود تھے۔ کہتے ہیں ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بی بی مریم علیہا الصلوٰۃ کے بھی بت تھے۔ کیا یہ سب کعبے کی مرکزیت اور مکے اور قریش کی خاموش مرجعیت پر دلالت نہیں کرتے؟

ان میلوں کے ساتھ ساتھ اشہر حرم یعنی محفوظ و محترم مہینوں کا ادارہ بھی قابل لحاظ اہمیت رکھتا ہے۔ نہ معلوم یہ عرب میں کیسے آیا اور کب سے رائج تھا۔ بہرحال حروب صلیبیہ کے زمانے میں فلسطین وغیرہ کے مسلمان عربوں سے اخذ کر کے پوپوں نے عیسائی یورپ کی نزاج کو کم کرنے کی اسی طرح کی ایک ناکام کوشش کی تھی جو خدائی امن (ٹروس آف گاڈ) کے نام سے مشہور ہے۔ عربوں کا یہ نظام زمانہ جاہلیت میں یوں تھا کہ ذی قعدہ ذی حجہ اور محرم کے مسلسل تین مہینے اور رجب کا ایک مہینہ محترم و محفوظ سمجھے جاتے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں ''رجب مضر'' کا جملہ آیا ہے، اس تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ مضر کے علاوہ قبائل ربیعہ کا بھی کوئی الگ زمانہ محفوظ مہینوں کا ہوتا ہوگا۔ اوپر پڑھی ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی جائے گی تو نظر آئے گا کہ رجب میں صحار اور دبا کے اہم میلے لگتے۔ جہاں خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت سے پہلے جانے اور طویل مدت گزارنے کا مسند احمد بن حنبل میں اشارہ ملتا ہے۔ (۸) اور ذی قعدہ، ذی حجہ اور محرم میں عکاظ، منیٰ، خیبر، اور یمامہ کے زبردست اجتماع ہوتے، یمامہ کا غلہ مکے تک آتا۔ ذی حجہ کا مکہ معظمہ میں حج اور منیٰ کا میلہ خاص کر خوش نصیب تھے کہ دُور دراز کے لوگوں کو پورے تین مہینے امن کا یقین

Marfat.com

رہتا کہ جا کر واپس آنے تک چاہے وہ عرب کے کسی حصے سے مکے تک کیوں نہ ہو، کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ ذی حجہ کے علاوہ اس سے ایک مہینہ پہلے اور ایک مہینہ بعد حرام زمانہ رہتا جو عرب کے بعید ترین گوشوں سے آنے اور واپس جانے کے لیے کافی تھا۔ اس نے ناگزیر محافظین کعبہ یعنی قریش کی جو عظمت تمام عرب کے ذہنوں پر نقش کر دی ہوگی وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ سیرۃ ابن ہشام (۹) کے مطابق اشہر حرم کے ساتھ ایک ادارہ بسل بھی تھا جس کے تحت قریش کے چند خاندانوں کو پورے عرب میں تین مہینے نہیں بلکہ مسلسل آٹھ مہینے محفوظ و مامون حالت میں ملتے۔

اس نظام کا اثر:

تمام عرب سے لوگوں کا مکہ آنا اور مکے والوں کا عرب اور عرب کے باہر عراق و شام اور مصر و حبشہ تک مسلسل آیا جایا کرنا.......... اس کے اثرات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہی ہوگا۔ اس نے پورے عرب کی مختلف علاقہ وار بولیوں میں قربت پیدا کر کے ایک مشترکہ معیاری بولی پیدا کرنے میں حصہ لیا ہوگا۔ اس نے عربوں میں احساس یگانگی کو تقویت دی ہوگی، اس نے تمام عرب کے رسم و رواج اور اخلاق و عادات میں مماثلت پیدا کی ہوگی۔ اس نے ان میں محنت پسندی اور کوچ کی عادت اور تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھنے کا میلان پیدا کیا ہوگا۔ اس نے ان کو عراق، شام اور مصر کی خاص کر جغرافی اور طبیعی حالت سے واقف کرا دیا ہوگا جس کے باعث عہد نبوی اور خلافت راشدہ کی فاتحانہ پیش قدمی کسی اجنبی امداد کی محتاج نہ رہی ہوگی۔ اسی نے بیرون، خاص کر متمدن ممالک کے آئے دن کے سفر سے ان میں روشن خیالی، جذبات اور امنگیں پیدا کی ہوں گی۔ ایرانی اور رومی دونوں ان کے ساتھ سخت بدسلوکی کرتے تھے۔ خاص کر رومی علاقوں میں عرب کے کاروانوں کی جس سختی سے جھڑتی لی جاتی اور ان کے ساتھ جرائم پیشہ اقوام سمجھ کر جس توہین اور درشتی کا سلوک کیا جاتا اور جس طرح ان کے لیے مختلف علاقے مقرر کر دیئے جاتے کہ ان کے سوا وہ شام و فلسطین میں کہیں اور نہ جائیں، اور سامان مقرر کر دیئے جاتے کہ ان کے سوائے اور چیزیں خرید کر نہ لے جائیں، ان پر شدید محصول چنگی عائد کیے جاتے (۱۰)

Marfat.com

وغیرہ وغیرہ، تو ان چیزوں کا اثر حساس دماغوں اور سوچنے والے ذہنوں پر جو کچھ پڑ سکتا ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایرانی بدسلوکیاں بھی کم نہ تھیں۔ ذی قار کے معرکے میں چند عرب قبائل نے ایرانی لشکر کو ایک دفعہ شکست دی تو اس کے متعلق خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس دن پہلی مرتبہ عربوں نے ایرانیوں سے بدلہ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے، متاخر کسرایان ایران کی عرب کش سیاست نے ایرانیائے ہوئے حیرہ کے عربوں اور شیبانیوں کو ایران کا جانی دشمن بنا دیا تھا اور زیادہ تر انہیں عربوں نے تاج کیانی کو مدینے کے گلی کوچوں میں لالڑھکایا تھا۔

اسلام کی آمد:

عرب کے معاشی نظام کی یہ عام کیفیت تھی کہ ربیع الاول ۱ھ میں تاریخ عالم کا ایک اہم اور عہد آفریں واقعہ پیش آیا۔ وہ یہ کہ تیرہ سال تک بے غرضانہ ایثار اور رضا کارانہ زحمت کشی کے ذریعے سے اہل مکہ کی اخلاقی و دینی اصلاح کی جو کوشش انہی کے ایک ہم وطن یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے تھے، اس کا انجام یہ نکلا کہ بیسیوں ساتھی مال و عیال کو چھوڑ کر بیک بنی و دو گوش ترک وطن کو غنیمت سمجھ چکے تھے اور خود اس بے غرض مصلح کو جان کے لالے پڑے تو غاروں میں چھپتے، نامانوس اور دشوار گزار راستوں سے چلتے، وطن سے سینکڑوں میل دُور مدینہ چلا آنا پڑا تھا۔ قریش مکہ نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ ایک تو جلا وطن مسلمانوں کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر مکے میں غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا، (۱۱) دوسرے اپنے معاشی اثرات کے تحت اہل مدینہ کو دھمکا کر لکھ بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں سے نکال دیں (۱۲) اور بزور اس کو منوانے کے لیے مدینے پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ہجرت کے اس ابتدائی زمانے میں تارکین وطن مسلمان ہتھیار بند سویا کرتے تھے۔

مدینہ آنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اس شہر کی کایا پلٹ ہوگئی یہاں کی قدیم آبادی میں جو خانہ جنگی اور چوکھا لڑائی ہو رہی تھی وہ ختم ہوگئی مہاجرین مکہ، مسلمانان مدینہ، مدینے کے غیر مسلم اور یہودی قبائل............ان چاروں عناصر نے ایک

Marfat.com

وفاقی شہری مملکت قائم کی جس کا تحریری دستور خوش قسمتی سے ہم تک محفوظ چلا آیا ہے۔ باون ۵۲ دفعات کے اس وفاقی دستور میں آخری اختیار سماعت مرافعہ، اور اعلیٰ اختیارات جنگ و صلح دونوں امور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دینے پر سبھوں نے اتفاق کیا اور اس پر بھی سب راضی ہو گئے کہ قریش سے نہ تو کوئی تعلقات رکھے جائیں اور نہ انہیں یا ان کے دوستوں کو کوئی مدد یا حفاظت مہیا کی جائے۔ اس سلسلے میں یہ امر شاید درخور التفات سمجھا جائے گا کہ اس زمانے میں جب یہود نہ صرف مدینے کے مقامی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے بلکہ شام سے یمن و عمان تک ان کی نو آبادیوں کا ایک زنجیرہ پڑا ہوا تھا اور بین الیہود باہمی تعاون خاصا مستحکم تھا تو مدینے کے یہودیوں سے اشتراک عمل نوخیز اسلامی مملکت کے لیے کم از کم یہ فائدہ ضرور رکھتا تھا کہ یہ معاشی قوت اس ابتدائی بے کسی کے زمانے میں مخالف پلڑے میں نہیں داخل ہو گئی۔ گھر سے فراغت ہوتے ہی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے ینبوع کا کئی بار سفر فرماتے ہیں ان مختلف قبائل سے جو اس راستے پر بستے تھے یا تو حلیفی کے نئے معاہدے کرتے ہیں یا اہل مدینہ کے ان کے ساتھ جو قدیم معاہدے تھے ان کی تجدید عمل میں لاتے ہیں۔ ایسے بعض معاہدوں میں مدامی فوجی حلیفی اور باہمی امداد کا ذکر ہے اور بعض میں باہم دوستی اور ایک کی جنگ میں دوسرے کی غیر جانبداری اور دشمن کو مدد نہ دینے کا حکم ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک معاشی قصہ ہے۔ قریش کا شام، مصر اور عراق جانے والا راستہ مدینے اور ینبوع کے بیچ میں سے ساحل کے کنارے گزرتا تھا۔ قریشی مواصلات تجارت اور روزگار کی یہ شہ رگ اب بیک جنبش لب کٹ گئی اور ادھر سے قریشی کاروانوں کا جانا بند کر دیا گیا۔ قریش نے تھوڑی سی کشمکش کی۔ بدر، احد اور خندق کے معرکے پیش آئے لیکن قریش کے رحلۃ الشتاء کا شمالی راستہ کھلنا تو کیا، اس کے لیے نجد وغیرہ سے ہو کر جانے والے نو ساختہ راستے بھی بند ہی ہوتے چلے گئے۔ (۱۴) قریش کی تجارت مفلوج ہوئی تو وہ بیسیوں قبائل جو انہیں کے کاروبار پر پل رہے تھے خواہی نخواہی قریش سے ٹوٹ کر مدینے سے جڑنے پر مجبور ہوتے چلے گئے اور تاریخوں میں صراحت

Marfat.com

سے ایسے نظائر کا ذکر آیا ہے۔ (۱۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست قریش کو تباہ و نابود کرنے پر نہیں بلکہ محفوظ رکھ کر بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی۔ پانچ چھ ہی سال کی کوشش میں مکے کے شمال، مکے کے مشرق، بلکہ مکے کے جنوب کے قبائل بھی اسلام کے زیر نگیں بنا لیے گئے۔ اور جب یہ گھیرا مکمل ہو گیا تو بجائے شرائط منوانے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی منہ مانگی شرطیں حدیبیہ میں منظور کیں۔ یہ سیاست کاری کا شہ کار تھا۔ قریش کا چڑھتا ہوا جوش اور بخار اس صلح کے سیفٹی ثالث (Safety Volve) سے خارج ہو گیا۔ عین اس لمحے خیبر کے یہودیوں اور مکے کے قریشیوں میں اتحاد ہو کر ایک نئے طاقتور محاصرہ مدینہ کی جو تجویز تیار ہو چکی تھی وہ روک دی گئی۔ کیونکہ قریش نے اپنی منہ مانگی شرطوں کے ملنے اور تجارت کا شمالی راستہ کھلنے پر وعدہ کیا تھا کہ وہ دس سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ تو خود جنگ کریں گے اور نہ کسی اور کو کوئی خفیہ یا علانیہ مدد دیں گے بلکہ مسلمانوں کی جنگوں میں کامل ناطرفدار رہیں گے۔ اسی صلح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فائدہ ہوا کہ خارجہ سیاست کے لیے ہاتھ کھل گئے۔ خطرے کے مرکز خیبر کو مہینے بھر میں ہمیشہ کے لیے مٹا دیا گیا۔ نینوٰی میں رومیوں کو ایران پر جو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر بحرین، عمان، وغیرہ کا ایران سے انقطاع اور مدینے سے الحاق کرا لیا اور قریش کے رہے سہے وسائل اور رفیق ان سے بچھڑا دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو (۲) ہی سال گزرے اور قریش نے ایک چھوٹا سا قصور کر کے معاہدہ شکنی کی اور مدینے سے دس ۱۰ ہزار قدوسیوں کا لشکر آیا تو مغرور قریش نے اپنے آپ کو اتنا بے بس پایا کہ بغیر ایک ہتھیار چلائے اطاعت قبول کرنے ہی میں خیر دیکھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قریش کو محفوظ رکھ کر مغلوب بنانے کی جو سیاست ملحوظ رکھی تھی اس کے باعث ان کے بیس سالہ مظالم کا جواب اس تاریخی جملے سے دیا کہ ''آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو''۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کے بین الممالک کاروبار کا پورا ڈھانچہ قریشی کاروبار کے سنگ زاویہ پر ٹکا ہوا تھا۔ اور جب قریش ایک مرتبہ ہم نوا ہو گئے (۱۵) تو دو ہی سال کے اندر پورا جزیرہ نمائے عرب ایلہ واذرح سے لے کر عمان تک اور سادہ سے لے کر معافر

Marfat.com

تک ایک ہی قبلہ کی طرف جھک رہا تھا، اور ایک ہی مرکز سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور جب ذی حجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع پر جبل الرحمۃ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شہرہ آفاق طویل الوداعی خطبے (۱۶) میں ایک منشور انسانیت پیش کیا کہ عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں، سب انسان آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے، اور قومیتیں اور قبائل صرف تعارف اور پہچاننے کی علامتیں ہیں ورنہ اصل عزت تو خدا سے ڈرنے کے مدارج پر مبنی ہے۔ جب یہ منشور عبدیت و انسانیت نہ صرف پیش کیا گیا بلکہ اس پر کامیاب عمل بھی کر کے دکھا دیا گیا تو پھر نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ختم ہو گیا اور تین ہی ماہ بعد آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اس اولین مملکت اسلامیہ کے قیام میں خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا جو کردار کارفرما رہا اور اس کے جو سیاسی، جغرافی، تمدنی، تاریخی، اخلاقی، نفسیاتی، وغیرہ وغیرہ عوامل رہے جنہوں نے عربوں کو اس زمانے میں اس انقلاب کے لیے تیار کیا اور اس انقلاب کے لیے مواقع فراہم کیے اور پھر عربوں کے کردار کی قبل اسلام کی صدیوں میں پرورش و پختگی اور عہد اسلام میں اس کا صیقل و جلا کاری وغیرہ وغیرہ یہ بیسیوں مسائل ہیں جو مستقل مقالوں کے محتاج ہیں۔ یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ایک ملک کا معاشی پس منظر اس کی قسمت سازی میں حصہ لیتا ہے اور کس طرح ایک ادارے کی سب سے بڑی قوت ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اور کس طرح اس کمزوری سے بروقت اور صحیح فائدہ اٹھانا اپنے مقصد کو پورا کراتا ہے اور کس طرح حریف کی صلاحیتوں کو تباہ و تاراج کرنے کی جگہ اس قوت کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا جائے تو دنیا میں وہ کارنامے انجام پاتے ہیں جو معجزہ اور عجوبہ کہے جاتے ہیں کہ عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ نراج اور طوائف الملو کی چھوڑ کر مرکزیت اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد کے پندرہ سالوں میں انہیں اصول پر عمل کر کے اس وقت کی دو عالمگیر سلطنتوں کو بیک وقت اپنے حملے کا ہدف بنا کر ۲۷ھ ہجری تک اپنا جھنڈا حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مغرب میں شمالی افریقہ سے گزر کر اسپین میں اور مشرق میں ترکستان سے گزر کر چین میں اور جنوب میں خراسان سے گزر کر بھروچ و تھانہ یعنی بمبئی میں

Marfat.com

اور شمال میں آرمینیا اور ممالک خزر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور یہ انسانیت کی شہنشاہیت (Imperialism of Humanity) تھی جس میں ہر حاجت مند فردِ رعیت کو حکومت روٹی مہیا کرتی اور کسی کی آزادی عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر اجتماعیت کا مظاہرہ کرتی تھی جس میں حکومت اور رعایا ایک ہی چیز تھے چنانچہ دونوں ایک دوسرے کے ظاہر و باطن میں بہی خواہ و معاون تھے۔

یہ چند اشارے ہیں جن سے سوچنے والے دماغ کچھ نہ کچھ غذائے فکر پا سکتے ہیں۔

حواشی

(۱) المحبر لابن حبیب ص ۳۶۹

(۲) مشرفی یعنی مشارف شام کی تلواریں عربی ادبیات میں ضرب المثل ہیں۔ دیکھیے ڈاکٹر عنایت اللہ کی ''جیوگرافیکل ڈاکٹرس ان ارے بین لائف اینڈ ہسٹری'' (طبع لاہور) نیز میرا مضمون ''عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے'' (مجلہ تحقیقات علیہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۵ء)

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے پروفیسر مارے کا افتتاحی مقالہ فرنچ اکاڈیمی میں ''اسلامی اور حضری زندگی'' کا ترجمہ (مطبوعہ روزنامہ رہبر دکن حیدرآباد ۱۹ تا ۲۳ رجب ۱۳۵۵ھ)

(۴) ایلاف کے معنی بھی معاہدے کے ہیں (محبر محمد بن حبیب ص ۱۶۲ الخ)

(۵) تفصیل اوپر باب ''شہری مملکت مکہ'' میں۔

(۶) نیس کی فرانسیسی تالیف ''جدید قانون بین الممالک کا آغاز'' ص ۶۶۶، ۶۲۴ (ترجمۂ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ)

(۷) محبر محمد بن حبیب، ص ۱۵۷

(۸) مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۰۶

(۹) ص ۶۶ نیز قاموس فیروز آبادی تحت کلمہ ''بسل''

Marfat.com

(۱۰) تفصیل کے لیے میرا مذکورہ مضمون ''عربوں کے تعلقات بیزنطینی حکومت سے''

(۱۱) دیکھیے باب ''دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور''

(۱۲) ابن حبیب (محبر ص ۲۷۱ تا ۲۷۳)۔ ابن ہشام ص ۲۹ تا ۹۹

(۱۳) سیرۃ ابن ہشام ص ۵۴۷

(۱۴) طبقات ابن سعد ۲/۱ ص ۴۹ (اشجع)

(۱۵) قریش کی ہمنوائی سے قبل جو علاقے مملکت اسلامیہ میں داخل ہوئے تھے، ان کو اس الحاق کی تشویق مختلف وجوہ سے ہوئی۔ چنانچہ اس کے مذہبی و روحانی وجوہ بھی ہیں، سیاسی اور فوجی وجوہ بھی ہیں، اور معاشی وجوہ بھی، ایک اہم معاشی وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کی ہر بستی اور ہر میلے اور بازار میں محصول چنگی لیا جاتا اور بیرون عرب جو کاروان عرب لے جاتے، ان سے بھی سخت شرح سے محصول لیا جاتا۔ عہد نبوی میں مختلف قبائل سے مملکت اسلامیہ کے جو معاہدے ہوئے ان میں سے اکثر میں صراحت سے عشر یعنی اس اندرونی محصول چنگی کی برخاستگی کا ذکر ہے۔ چنگی کے اس اتحاد سے اندرونی گردش مال اور تجارت کو غیر معمولی فروغ ہوا اور اس کے برکات نے سیاسی اتحاد کو قریب تر اور مستحکم تر کرنے میں یقیناً بڑا حصہ لیا ہوگا۔ جیسا کہ دیگر ممالک کی تاریخ میں مماثل امور نظر آتے ہیں، اور جس سلسلے میں جرمن مملکتوں اور قبیلوں کے (Zollverein) چنگی کے اتحاد کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔

(۱۶) اس کے متن کے لیے دیکھیے میری ''الوثائق السیاسیہ'' برموقع۔

(مجموعہ مقالات علمیہ حیدر آباد اکاڈیمی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء)

Marfat.com

عربی حبشی تعلقات اور مکاتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

قدیم زمانے میں حبش نامی ایک قبیلہ ہمیں یمن میں ملتا ہے۔ اسی بنا پر نیز علم کا منہ سر کے تحقیقاتی نتائج کے طور پر اب یہ خیال روز افزوں مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے کہ حبشی اصل میں یمن سے آئے ہوئے نوآبادکار ہیں۔ حبشہ (ابی سینیا) میں ایک صوبہ ''امہرہ'' بھی ہے۔ اس کا اب ''مہرۃ'' سے تعلق قائم کیا جا رہا ہے، جو جنوبی عرب میں حضر موت کے مشرق میں ایک بڑا علاقہ ہے۔ لسانیاتی تحقیقات نے بھی مہرہ اور امہرہ کی بولیوں میں بڑی قربت ثابت کر دی ہے اور میں نے ۱۹۳۳ء میں دیکھا تھا کہ جامعہ پاریس کے مدرسہ السنہ مشرقیہ میں اس مسئلے پر خاص طور سے توجہ کی جا رہی تھی۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ایک سو سال پہلے ذونواس نامی ایک یہودی بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے زمانے میں صوبہ نجران میں عیسائیت بہت عام ہو گئی تھی۔ طبری نے دو روایتیں بیان کی ہیں۔ ذونواس نے یہودیت میں غلو کے باعث نجرانیوں کو عیسائیت چھوڑنے اور یہودیت قبول کرنے کا حکم دیا(۱) یا یہ کہ ایک یہودی کے دو بچے نجران میں مارے گئے تھے اور ان کے باپ کی شکایت پر اس نے نجرانیوں کو نہایہ (الٹی میٹم) بھیجا۔(۲) اور جب نجرانیوں نے عیسائیت کو چھوڑنے سے انکار کیا تو ایک فوج لے کر ان کے صوبے میں پہنچا اور عیسائیوں کا بڑی بے رحمی سے قتلِ عام کیا۔ چنانچہ بڑے

(۱) تاریخ طبری صفحہ ۹۲۵۔

(۲) تاریخ طبری صفحہ ۹۲۶۔

بڑے کھڈے یا گڑھے کھدائے ان میں آگ جلا دی اور عیسائیت سے انکار نہ کرنے والوں کو ان میں زندہ جھونک دیا۔ (۱) دیا۔ مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن مجید (۸۵:۴ تا ۷) میں آیت (قتل اصحٰب الاخدود النار ذات الوقود) اسی واقعے کی جانب اشارہ ہے۔

بچے کھچے آدمیوں میں سے ایک حبشہ پہنچنے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گیا۔ اس نے جلی ہوئی انجیل (۲) نجاشی کو دکھائی اور فریاد و زاری کر کے انتقام پر توجہ دلائی۔ نجاشی نے جلی ہوئی انجیل بیزنطینی شہنشاہ کے پاس قسطنطنیہ بھیج دی اور کشتیاں مہیا کرنے کی استدعا کی ——— ابن اسحاق کا بیان ہے کہ نجران کا فریادی براہِ راست قیصر ہی کے پاس پہنچا تھا اس نے کہا کہ میرا ملک بہت دُور ہے میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ نجاشی کو میں خط لکھتا ہوں وہ بھی عیسائی ہے اور اس کا ملک تمہارے ملک کے قریب ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارا انتقام لے گا ——— قیصر کی مہیا کردہ کشتیاں حبشی بندرگاہوں میں پہنچ گئیں اور خود نجاشی نے سات سو کشتیاں تیار کرائیں اور مقامی بندرگاہوں میں تجارت کی غرض سے آئی ہوئی ایرانی اور دیگر تاجروں کی بھی بہت سی کشتیاں بیگاری کے لیے روک لی گئیں۔ ان سب پر عرب کی مقامی روایتوں کے مطابق ستر ہزار اور یونانی مورخوں کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی سوار کیے گئے اور آبنائے باب المندب کو عبور کر کے، اس اثناء میں بہت سی کشتیاں طوفان میں ڈوب گئیں، یمن کے ساحل پر جا اترے۔ ابن الکلبی کا بیان ہے کہ پہلے کچھ فوج بھیجی گئی جو بذاتِ خود اتنی کافی تھی کہ ذونواس کو مقابلے کی تاب نہ رہی۔ اس لیے اس نے بہت بڑی رقم پیش کرنے کے وعدے پر امان چاہی اور جب

---

(۱) اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے حیرہ کے حکمران کو بھی ترغیب دلائی کہ وہ اپنے علاقے میں عیسائیت کو ختم کر دے جیسا سریانی و دیگر حوالوں سے دیورژے نے اپنی فرانسیسی کتاب عرب صفحہ ۸۲ عمود دوم و صفحہ ۸۳ عمود اول تعلیق نمبر ۱ میں بیان کیا ہے۔

(۲) یہ لفظ عربی میں غیر مشدد جیم کے ساتھ مستعمل ہے۔ اس معرب لفظ کا حبشی اصل نگوس (NGOS) ہے۔ جس کے لفظی معنے بادشاہ کے ہیں۔ اس سے مراد کوئی علم نہیں بلکہ حبشہ کا بادشاہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

حبشی افسر رقم وصول کرنے آئے تو دھوکے سے انہیں قتل کرادیا۔ پھر بے سری فوج کا صفایا آسان کام تھا۔ اس شکست کا انتقام لینے کے لیے نجاشی نے ستر ہزار حبشی فوج بھیجی۔ لاطینی مورخوں کے مطابق پندرہ ہزار کا مقدمتہ الجیش پیاس اور تھکن کے باعث تباہ ہوگیا۔

لڑائی کا انجام یہ ہوا کہ ذونواس کو شکست ہوئی اور اس نے خودکشی کرلی۔ اس کے بعد یمن پر حبشی قبضہ ہوگیا اور یہ علاقہ نجاشی کے قبضے میں آگیا(۱)۔

ابرہہ کی گورنری:

کچھ دن بعد دو بڑے حبشی افسروں ارياط اور ابرہہ میں اَن بن ہوگئی اور اَرياط کو قتل کر کے ابرہہ یمن کا گورنر بن گیا۔ نجاشی کو بھی امر واقعہ کا گوارا کرنا اور ابرہہ کی گورنری کو تسلیم کرنا ہی بہتر معلوم ہوا تا کہ ملک میں مزید خونریزی نہ ہو۔

ابرہہ بڑا دیندار عیسائی تھا۔ اس نے ملک میں عیسائیت کے پھیلانے کی بڑی سرگرم کوشش کی اور یمن کے پائے تخت صنعا میں ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کرایا جس کا نام قلیس (یعنے کلیسا) رکھا۔ اس کی تعمیر میں بیزنطینی قیصر نے قسطنطنیہ سے بہت سے کاری گر، سنگِ رخام اور چینی کی منقش اینٹیں بھیجیں۔ جب کلیسا تعمیر ہوگیا تو اسکندریہ کے بطریق نے ایک اطالوی پادری گرے جن تیوس (Gregentius) کو وہاں روانہ کیا(۲)۔ نجران میں ایک گرجا اور ''شہداء'' کا قبرستان تعمیر کیا گیا۔

مأرب کے تالاب کا کتبہ:

ابرہہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رعایا پرور حکمراں ثابت ہوا۔ اسنے تالابوں کی تعمیر پر بھی توجہ کی۔ اس کے کتبے اب بھی یمن میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اور ان سے بہت سی تاریخی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مأرب کے تالاب کا کتبہ دلچسپی کی خاطر ارض القرآن مؤلفہ

(۱) تفصیلات کے لیے سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۴، مابعد طبقات ابن سعد ج ا صفحہ ۵۵ تا ۵۶۔ تاریخ طبری صفحہ ۹۲۵، مابعد معارف ابن قتیبہ صفحہ ۲۱۱ اخبار الطوال للد ینوری صفحہ ۶۲۔ دیورڑے کی فرانسیسی کتاب ''عرب'' صفحہ ۷۰۔

(۲) چنانچہ (۲۳) دفعات کا ایک دستور العمل اس نے ملک میں نافذ کرایا جس کی یونانی اصل اب بھی ویانا کے کتب خانے کے مخطوطوں میں محفوظ ہے۔ (ایورڑے کی فرانسیسی کتاب عرب صفحہ ۷۱ کالم دوم تعلیق)

Marfat.com

سلیمان ندوی سے نقل کیا جاتا ہے:

''مہربان رحم والے (رحمان و رحیم) اس کے مسیح اور روح القدس کی مہربانی سے اَبرہہ اکسومی حبشیوں کا رئیس اراحمیس ذبمیان شاہ حبش کا محکوم سبا، ذوریدان، حضرموت یمنات، تہامہ اور نجد کا بادشاہ یہ یادگار قائم کرتا ہے کہ اس نے اپنے عامل یزید بن کبشہ پر فتح پائی جس کو اس نے کندہ اور روئی پر حاکم بنایا تھا اور سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ اور روسائے سبا میں سے مرہ، ثمامہ، حنش، مرتد اور صنف ذو (یعنے قلعہ دار) خلیل اور آل یزن، روسائے معدی کرب بن سمسفیع اور ہفان اور اس کے رشتہ دار فرزندان اسلم اس کے ساتھ تھے۔

''بادشاہ نے اس کے مقابلے میں جراح قلعہ دار زبنور کو بھیجا۔ یزید نے اس کو مار ڈالا اور قصر کدار کو ڈھا دیا۔ اور کندہ، حریب اور حضرموت کے قبائل سے اپنے جمعیت اکٹھا کی...... بادشاہ کو خبر ملی تو اپنی حمیری اور حبشی فوج ہزاروں کی تعداد میں ماہ ذوالقیاط سنہ ۶۵۷ یمنی، مطابق سنہ ۵۴۳ء میں لے کر چلا۔ جب مآرب کی وادیوں میں پہنچا تو یزید خود آیا اور تمام سرداروں کے سامنے اس کی اطاعت قبول کر لی.........

''اس اثناء میں مآرب کے تالاب کی دیوار، حوض اور دروازے کے ٹوٹنے کی خبر ماہ ذوالمدرح سنہ ۶۵۷ (یمنی مطابق ۵۴۳ء) میں آئی۔ قبائل کو فرمان بھیجا کہ پتھر، لکڑی اور سیسہ بند کے درست کرنے کے لیے مہیا کریں۔ بادشاہ پہلے مآرب گیا اور وہاں کے کنیسے میں نماز ادا کی۔ پھر موقع پر گیا۔ نیو کھودی اور تعمیر شروع ہوئی.........

''بادشاہ ان رئیسوں سے معاہدہ کر کے واپس آیا۔ شہزادۂ اکسوم، قلعہ دار معاہر یعنے فرزند بادشاہ مرجزف قلعہ دار وزناج، عادل قلعہ دار فانش اور قلعہ داران شولمان، ''شعبان'' رعین، ہمدان وغیرہ ''مہربان (رحمان) کی عنایت سے نجاشی، قیصر روم، منذر (یعنے حیرہ کے بادشاہ) اور حارث بن حبلہ (غسان کے باشاہ) اور دوسرے بادشاہوں کی طرف سے دستی اور محبت کے اظہار کے لیے ماہ دوان ۶۶۷ (یمنی، مطابق سنہ ۵۴۳ء) میں سفیر آئے.........''

اصحاب الفیل:

مآرب ساگر کی اس مرمت کے ستائیس سال بعد ۵۷۰ء میں اس اَبرہہ نے مکہ

Marfat.com

معظمہ پر حملہ کیا، عرب مورخ اسے اصحاب الفیل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جدید یورپی مولفوں کا خیال ہے کہ ابرہہ حقیقت میں خشکی کی راہ سفر کر کے شام جانا اور بیزنطینی شہنشاہ کو ایران کے خلاف مدد دینا چاہتا ہوگا۔ مگر عرب مورخ (۱) اس کا باعث اپنے بعض ہم وطنوں کی شرارت بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ فلیس (کلیسائے صنعا) کی تعمیر سے بت پرست عربوں کو سخت غصہ آیا اور ان میں سے ایک من چلے کو جو سوجھی تو وہاں پہنچ کر چپکے سے ایک رات وہاں غلاظت کی اور بھاگ آیا۔ دریافت اور تحقیقات پر یہ قیاس کیا گیا کہ کسی مکے والے کی شرارت ہے اور کعبے کی خاطر فلیس کی تذلیل کی گئی ہے۔ غرض ابرہہ بہت سی فوج اور ایک ہاتھی لے کر روانہ ہوا۔ جب مکے کے قریب پہنچا تو قرآن مجید کے مطابق پرندوں کے جھنڈ (طیراً ابابیل) آئے اور پڑاؤ پر کنکریاں گرائیں۔ نہ معلوم یہ کنکریاں کن جراثیم سے متاثر تھیں کہ فوج میں وبا پھیل گئی۔ (۲) بہت سے لوگ مر گئے۔ کچھ ابرہہ کے ساتھ یمن واپس ہو گئے۔ اور کچھ جو بیمار ہو گئے وہیں رہ گئے۔ یہ لوگ سپاہی تھے۔ اس لیے یہ امر قرین قیاس ہے کہ بعد میں یہ مکے والوں کے ان محافظ دستوں میں کام کرنے لگے ہوں جو کاروانوں کی حفاظت کے لیے قافلے کے ساتھ آیا جایا کرتے تھے۔ ہاتھی کے اسی واقعے کے سال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ (۳)

یورپی مورخوں کا خیال ہے کہ چونکہ حبشہ بیزنطینی حکومت کے ماتحت نہیں تو زیر اثر ضرور تھا، اس لئے بیزنطینی حکومت کو توقع تھی کہ یمن پر حبشی قبضے سے اسے معاشی مدد ملے گی اور ہندوستان سے ریشم کی خریداری یمن کے ذریعے سے آسان ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں

---

(۱) اکثر مورخ یہی کہتے ہیں اور قرآن مجید میں اصحاب الفیل میں ''فیل'' کا لفظ واحد ہی آیا ہے گو بعض مورخین کہتے ہیں کہ متعدد ہاتھی تھے۔ ابن ہشام اور طبری (صفحہ ۹۴۵) نے ہاتھی کا نام ''محمود'' لکھا ہے۔ ایک حبشی ہاتھی کا نام خالص عربی ہونا قرین قیاس نہیں۔ ممکن ہے یہ لفظ Mammoth کا معرب اور یہ ہاتھی مموت نسل کا ہو۔ طبری کے مطابق یہ ہاتھی جو غیر معمولی قد و قامت کا تھا۔ ابرہہ کی درخواست پر نجاشی نے حبش سے یمن بھیجا تھا۔

(۲) عرب مورخ بیان کرتے ہیں کہ حجاز میں چیچک وغیرہ، وبائیں پہلی مرتبہ اسی وقت آئیں۔ اس سے پہلے لوگ ان سے واقف نہ تھے (طبری صفحہ ۹۴۵)

(۳) الازمنہ والامکنہ، باب اسواق العرب۔

کئی بیزنطینی سفارتیں بھی یمن آئیں۔ لیکن ایرانی تاجر اپنے وسیع کاروبار کے باعث منڈیوں پر چھائے رہے بلکہ خود عدن اور دیگر یمنی منڈیوں میں ایرانی اثر روز افزوں ہی ہوتا گیا۔ چنانچہ مرزوقی (۱) نے بیان کیا ہے کہ عدن میں عطر بنتا تھا جو اپنی لاجواب خوبیوں کے باعث ہند اور سندھ اور فارس و روم تک دساور ہوتا تھا ابھی ابرہہ کے انتقال کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایرانیوں نے یمن پر حملہ کیا اور حبشیوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ (۲)

حجازی عربوں کے تعلقات:

حجازی عربوں کے تعلقات حبشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت قدیم رہے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد حبشی الفاظ کا پایا جانا اس سلسلے میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم زمانے میں چین اور ہندوستان کا تجارتی مال یمن آتا اور خشکی کے راستے حجاز اور شام سے گزر کر یورپ جاتا تھا۔ جب رومیوں اور بیزنطینیوں نے بحر احمر میں نقل و حمل شروع کر دی تو حجازیوں کے روزگار پر خاص کر بہت اثر پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے سخت جدوجہد کی اور ہمسایہ ممالک سے تجارتی کاروانوں کے لانے کی اجازت حاصل کی۔ ابن سعد (۳) اور امام ابن حنبل (۴) وغیرہ (۵) کا بیان ہے کہ قیصر روم نے ہاشم کو شام آنے کا پروانہ عطا کیا اور اپنے زیر اثر فرمانروائے حبش کے نام بھی ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ ہاشم نے اپنے بھائی کو حبشہ بھیجا اور ان کو نجاشی نے قیصر کی سفارش کی بنا پر اس بات کا منشور عطا کیا کہ ان کا تجارتی کاروان حبشہ آیا کرے۔ وادیٔ غیر ذی زرع (مکہ) کے تجارت پیشہ اپنے اور آس پاس کے علاقے سے عموماً چمڑے، گوند، لوبان وغیرہ بیچنے کے لیے لے جاتے تھے۔ قریبی میلوں

---

(۱) الازمنہ والامکنہ، باب اسواق العرب۔

(۲) تاریخ طبری صفحہ ۹۵۲ و مابعد۔

(۳) طبقات جلد ۱/ اصفحہ ۴۳، ۴۵۔

(۴) مسند جلد اصفحہ ۲۶۱۔

(۵) تاریخ طبری صفحہ ۱۰۸۹، مابعد تاریخ یعقوبی جلد اصفحہ ۲۸۰۔ لسان العرب تحت کلمۂ ایلاف، نیز سورۂ ایلاف کی تفسیریں ایلاف کے معنے بھی امن نامے کے ہیں۔ دیکھیے کتاب المحبر لابن حبیب ورق نمبر ۵۸/ب

Marfat.com

میں گھی وغیرہ بھی بھیجتے تھے۔اونی کپڑے اور قبائیں بھی عرب کی مقامی پیداوار میں شامل تھیں۔ان چیزوں کے بدلے میں وہ زیادہ تر غلہ حاصل کیا کرتے تھے۔حکومت شام نے ہتھیار کی برآمد بند کر دی تھی۔موقع ملتا تو یہ لوگ اس کو بھی چوری چھپے درآمد کرلیا کرتے تھے۔(۱)۔حبشہ جانے کے دو راستے تھے۔حجاز سے خشکی کی راہ فلسطین اور مصر ہوتے جاتے یا بندرگاہ سے کشتیوں پر سوار ہو کر باب المندب سے ہوتے ہوئے کسی حبشی بندرگاہ میں جااُترتے ۔قرآن مجید میں سمندر کا نہایت مدققانہ تذکرہ اور کشتیوں کے چلنے،طوفان اور خراب موسم سے دوچار ہونے اور سمندری مسافروں کے پریشان ہونے کا نفسیاتی منظر اور سب سے بڑھ کر بحری اصطلاحات وغیرہ کے طور پر بعض حبشی الفاظ کا استعمال........... یہ تمام امور بتاتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مکی وحجازی مخاطب بحری سفر اور حبشی سمندر سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔اگر عربی مورخوں پر اعتماد کیا جائے تو مکی تاجر خود نجاشی سے شخصی تعارف رکھتے تھے اور اس کے دربار میں باریاب ہوا کرتے تھے۔ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کبھی نبوت سے پہلے اس کا موقع پیش آیا ہو، اگرچہ سیرت نگار اور سوانح نویس اس بارے میں خاموش ہیں۔لیکن جو شخصیت زیادہ تر اپنے تجارتی معاملات میں راست بازی کے باعث الامین کے قومی خطاب سے مخاطب ہوئی ہو، جس نے نہ صرف یمن اور شام کا بلکہ بروایت امام حنبل بحرین وعمان جیسے دور دراز ممالک کا خاصا تفصیلی سفر کیا ہو۔اس سے یہ بات اس زمانے میں عقلاً بعید نہیں معلوم ہوتی کہ کبھی حبشہ بھی گئی ہو۔جہاں اس کے ہم وطن ہر سال نہیں تو اکثر آیا جایا کرتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد بھائی کو حبشہ ہجرت کرتے وقت جو تعارفی خط عطا (۲)

---

(۱) لامنس کی فرانسیسی کتاب ''مکہ بوقتِ ہجرت'' صفحہ ۱۲۵ تا ۳۰ بحوالہ جرمن کتاب گوتر بوک، نیز ہفنسیگ کی جرمن کتاب ''اسلامی قانون'' خارجہ ''صفحہ ۱۰۷۔مجموعہ قوانین جسٹی نین (کتاب کوڈ حصہ چہارم باب ۴۱ ب ا، ۲ میں تلوار و دیگر ہتھیار، تیل اور شراب وغیرہ کی برآمد ''وحشی'' علاقے میں ہونے دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔اور قدیم رومی حکمرانوں کے احکام کا بھی ان دفعات میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان طویل لاطینی دفعات کا ترجمہ کرنے کی جگہ یہاں خلاصہ دیا گیا ہے۔

(۲) جیسا کہ آئندہ مفصل بیان ہوگا۔

Marfat.com

فرمایا تھا، اور جس میں نجاشی کو واقفانہ انداز میں لکھا تھا کہ ان نو آمدوں کا مہمان نوازانہ استقبال کرے وہ بھی اس گمان کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت:

۶۱۰ء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکۂ معظمہ میں اس بات کا اعلان فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اپنا پیغام رساں بنا کر بغرض ہدایت بھیجا ہے۔ بت پرست یا بے مذہب ہم شہریوں کو جب خدائے واحد پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا اور بتوں کی بے سودی کا بڑی شد و مد سے ذکر ہوا تو نامعقول جوش و خروش سے اس کی مخالفت ہوئی اور اکا دکا جو بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔

چار پانچ سال کی ان تھک اور بے لوث تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند درجن مکی مسلمان ہو گئے۔ شہر میں ہم وطنوں کے ہاتھوں جس فتنہ و فساد سے سابقہ تھا اُس کے باعث آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مشورہ دیا کہ ترکِ وطن کر کے حبش چلے جائیں۔ ”جہاں ایک منصف مزاج بادشاہ حکمران ہے اور جس کے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔“(۱) ان مہاجرین میں جو حبش گئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر طیار بھی شامل تھے۔

مکتوباتِ نبوی:

تاریخ نے ایسے کوئی دو ڈھائی سو خط محفوظ کیے ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائلی شیوخ، صوبجاتی افسروں اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے تھے۔ جو شخص پورے جزیرہ نمائے عرب کا حکمران بن چکا ہو۔ اس کے لیے یہ تعداد کچھ بڑی نہیں ـــــ اور انہیں خطوں میں سے ایک جسے طبری، ابن القیم، قسطلانی اور قلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول اللہ الی النجاشی الأصحم ملك

(۱) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۰۸۔

Marfat.com

الحبشه، الیٰ احمد الیك اللّٰه الذی لاالٰہ الاھوالملك القدوس السلام المؤمن المھیمن واشھد ان عیسی بن مریم روح اللّٰه وکلمته القاھا الیٰ مریم البتول الطیبة الحصینه ممتله من روحه ونفخه کما خلق اٰدم بیده۔ وانی ادعوك الی اللّٰه وحده لاشریك لہٗ وان تتبعنی وتومن بالذی جاء نی فانی رسول اللّٰه وانِیّ ادعوك وجنودك الی اللّٰه عزوجل وقد بلغت ونصحت فاقبلوا لنصحی وقد بعثت الیکم ابن عمی جعفراً و معه نفرمن المسلمین فاذاجاء ك فاقرھم ودع التجبر والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے نجاشی اصحم بادشاہ حبشہ کے نام میں اس خدا کی تعریف تمہیں لکھتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو مقدس سلامتی والا، امان دہندہ اور سلامت رکھنے والا ہے اور میں اقرار کرتا ہوں کہ مریم کے بیٹے روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جن کو پاک اور برائی سے محفوظ مریم بتول کی طرف ڈالا گیا تو وہ خدا کی روح اور پھونک سے حاملہ ہوئیں جیسا کہ خدا نے حضرت آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا۔ میں تجھے خدائے واحد لاشریک کی طرف بلاتا ہوں تاکہ تو میری اتباع کرے اور مجھ پر نازل شدہ چیز پر ایمان لائے۔ کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں میں تجھے اور تیرے لشکروں کو خدائے عزوجل کی طرف بلاتا ہوں میں نے پیام پہنچا دیا اور بہی خواہی کی ہے۔ اب میری بہی خواہانہ نصیحت کو قبول کرو۔ اور میں نے تیرے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفر کو بھیجا ہے جس کے ہمراہ چند مسلمان بھی ہیں جب وہ تیرے پاس آئیں تو ان کی مہانداری کر اور تکبر

Marfat.com

چھوڑ دے۔ سلام اس پر جو راہِ ہدایت پر چلے۔

عام طور سے اسلامی مورخ اس خط کو ۶ھ کے اواخر کے واقعات میں بیان کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ہمسایہ ممالک کے فرمانرواؤں کو دعوتِ اسلام کی تبلیغ کی۔ مگر اوپر نقل کیے ہوئے خط کا آخری فقرہ غور طلب ہے۔ ''میں نے اپنے چچازاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیجا ہے اور اس کے ساتھ کچھ مسلمان ہیں۔ جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمان داری کر............'' کیا یہ عبارت ۶ھ ہجری میں لکھی جا سکتی ہے، جب کہ ان مہاجرین کو حبشہ پہنچے ہوئے پندرہ سال ہونے کو آئے تھے؟ بہ ظاہر یہ خط تعارف کی غرض سے حضرت جعفر طیار کو دیا گیا تھا جب وہ حبشہ جا رہے تھے۔ اگر سیرت نگاروں کی خاموشی کو کوئی مانع نہ قرار دیا جائے تو خط کے واقف کارانہ انداز سے یہ گمان ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے آں حضرت خود حبشہ تشریف لے گئے اور مثل بعض دیگر ملکی تاجروں کے نجاشی سے شخصی تعارف حاصل کیا تھا۔ آپ کا مہاجرین سے چلتے وقت فرمانا کہ ''حبش میں ایک ایسے بادشاہ کی حکمرانی ہے جس کے دور میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا'' اس کی مزید تائید کر سکتا ہے۔ احادیث میں بعض وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے چند حبشی الفاظ بھی مروی ہیں۔

اتفاق سے ۱۹۳۹ء میں جب میں آکسفرڈ میں ''کتاباتِ مدینہ'' پر لیکچر دینے گیا تھا تو پروفیسر مارگولیوث آں جہانی نے میری توجہ اس جانب منعطف کرائی کہ اسکاٹ لینڈ کے ایک مستشرق کو حال میں یہ خط ملا ہے اور میری مراسلت موصوف کو بھیج دی۔ اس کے جواب میں مستشرق مذکور (ڈی-ام ڈنلاپ ساکن برائڈ کرک اسکاٹ لینڈ) کا جواب ملک شام سے ۲ جون ۱۹۳۹ء کا چلا ہوا مجھے حیدرآباد میں ملا جس میں لکھا تھا کہ بعض غیر معمولی حالات میں یہ خط فلسطین کے ایک پادری کے پاس سے حال میں خریدا گیا ہے اور یہ کہ وہ اسے جلد لندن کے رسالہ جے-آر-اے-ایس میں ایک مضمون کے ساتھ شائع کرانے والا ہے۔ مزید مہربانی سے اس نے خط کی ایک دستی نقل فوراً بھیج دی۔ فوٹو وطن واپسی پر بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس دوران میں جنگ عالمگیر چھڑ گئی۔ مذکورہ نقل یوں ہے:

Marfat.com

۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم
۲) محمد رسول الله الى النجا۔
۳) شی عظیم الحبشة سلام علی من۔
۴) اتبع الهدى إما بعد فانی احمد الیہ۔
۵) ك الله الذى لا الٰہ الا هو الملك۔
۶) القدوس السلام المومن المهيمن۔
۷) واشهدان عیسی بن مریم روح۔
۸) اللہ وکلمة القاها الى مريم البتو۔
۹) ل الطيبة الحصينة فحملت بعیسی من ر۔
۱۰) وحه ونفخه کما خلق آدم بيده و۔
۱۱) انی ادعوك الى الله وحده لا شر۔
۱۲) يك له والموالاة علیٰ طاعة وان۔
۱۳) تتبعنی وتومن بالذی جآء نی فانی۔
۱۴) رسول الله۔ وانی ادعوك وجنو۔
۱۵) دك الى الله عزوجل وقد بلغ۔
۱۶) ت ونصحت فاقبل ونصيحتی والسلام۔
۱۷) علیٰ من اتبع الهدی۔

محمد رسول الله

اس خط سے میرے عرصے کے اس گمان کی تائید ہوتی ہے کہ مذکورۂ صدر تعارفی خط میں دو خطوط کی عبارتیں مدغم ہو گئی ہیں۔ چنانچہ یہاں جعفر طیار کے تعارف کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی ''دع التجبر'' کا درشت اندازِ بیان۔

اس کے بعد مسٹر ڈنلاپ کا ایک اور خط گلاسگو سے آیا جس میں انہوں نے لکھا کہ ان کا موعودہ مضمون رسالہ جے-آر-اے ایس لندن بابت جنوری ۱۹۴۰ء میں چھپ گیا ہے اور اس میں مکتوب مبارک کا فوٹو بھی شامل ہے۔

Marfat.com

اصل نامۂ مبارک ایک جھلی پر ہے جو (۱۳ ۱/۲) انچ لمبی اور (۹) انچ چوڑی ہے۔ جس پر علاوہ مُہر کے سترہ سطریں خط جلی میں ہیں اور صاف پڑھی جاتی ہیں۔ مکاتیب نبویہ بنام مقوقس ومنذر کے خط سے اس کا خط بدلا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کاتب دوسرا ہوگا۔ لیکن اندازِ خط اور رسم الخط وہی قدیم ہے۔ مسٹر ڈنلاپ کے دوست ماہرین نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ مکتوبوں کے آخر میں جو مہر ہے وہ بہرحال ہم شکل اور ہم خط اور یکساں ہے۔ اور یہ امر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اوپر ہم نے مسٹر ڈنلاپ کے خط کے حوالے سے جو متن نقل کیا ہے اس میں اصلی خط دیکھنے پر خفیف ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ سطر نمبر ۱۳ میں تومن کی جگہ توقن پڑھا جائے اور سطر نمبر ۱۶ میں فاقبل ونصیحتی کی جگہ فاقبلو نصیحتی (بغیر الف جمع کے) اور سطر نمبر ۱۷ میں اتبع کی جگہ اتبع (دوت سے) لکھا ہوا ہے اور یہ آخری دونوں چیزیں میرے نزدیک فن تحریر کے آغاز کا زمانہ ہونے کی وجہ سے خط کے اصلی ہونے کی دلیل ہیں۔ زمانۂ مابعد کا جعل ہوتا تو کاتب ایسی ''غلطیاں'' نہ کرتے۔ اصل میں یہ غلطیاں نہیں ہیں بلکہ عہدِ نبوی میں ان کا رواج ہونا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ ماضی جمع کے صیغے میں بارہا بغیر الف کے قرآن میں الفاظ ملتے ہیں اور آیت والسماء بنینا ھا باید میں دوی لکھتے ہیں حالانکہ تلفظ ''باید'' ہے۔ نامہ مبارک کی روشنائی کھجور کے رنگ کی سرخ ہے۔ اسے دمشق میں کسی شخص نے ۱۹۳۸ء میں حبشہ کے ایک پادری سے خرید کیا اور اسے کچھ دن انگلستان بھیجا گیا تاکہ برٹش میوزیم وغیرہ کے ماہرین اسکی جانچ کریں اور پھر مسٹر ڈنلاپ کا بیان ہے کہ ''میں نے اسے واپس لے جاکر اس کے مالک کو پہنچا دیا جو دمشق کا ایک شہری ہے۔'' مضمون نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ جن ماہرین نے اسے دیکھا ان میں سے متعدد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جھلی کا نئے کی جگہ پرانا ہونا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے برٹش میوزیم کے ماہروں نے البتہ اس کا اتنا قدیم ہونا کہ عہدِ نبوی کا ہو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک عہد نبوی کی کسی اور اصلی اور مسلمہ جھلی سے اس کا مقابلہ نہ کیا جائے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ''یہ اتنی پرانی نہیں معلوم ہوتی۔''

کفارِ مکہ کا وفد حبشہ میں:

بہرحال جب متعدد جماعتیں مہاجرین کی حبشہ پہنچیں تو مکے والے اس کی روک تھام کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔ آخر انہوں نے ایک وفد بھیجا (۱) جو نجاشی سے ان ''ملزمین'' کی حوالگی کا مطالبہ کرے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو جوابدہی کا موقع دیا۔

انہوں نے کہا کہ ہم نے مکے میں کوئی جرم یا فعل ناجائز نہیں کیا ہے۔ ہم پہلے گمراہ تھے۔ اب خدا نے ہمارے پاس ایک نبی بھیج کر ہماری ہدایت کا سامان کیا ہے اور ہم ہموطنوں کے ظلم اور بے دردی سے مجبور ہو کر یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔ قریشی وفد کا سردار عمرو بن العاص جیسا زبردست موقع شناس سیاست دان تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً پہلو بدل کر نجاشی کے نازک اور حساس ترین جذبات پر وار کیا اور پوچھا ''مگر مسلمان یہ تو بتائیں کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا عقائد رکھتے ہیں؟ مسلمانوں کے نمائندے حضرت جعفر طیار نے قرآن مجید (۲) کی چند آیتیں پڑھیں جن میں حضرت عیسیٰ کو روح اللہ، کلمۃ اللہ، ابن مریم اور بن باپ کے پیدا ہونے والا کہا گیا ہے اور ان کے ابن اللہ ہونے کا انکار کیا گیا ہے۔ نجاشی فرقہ طبیعت واحدہ کا (مانوفزائسٹ) عیسائی تھا اور ان دنوں اس فرقے اور یونان و روما کے عیسائیوں میں بڑے سخت اختلافات تھے۔ آخر الذکر اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ میں بوقت واحد دو طبیعتیں تھیں، انسانی بھی اور خدائی بھی۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق سب عیسائی قائل ہیں کہ وہ روح اللہ، کلمۃ اللہ، ابن مریم اور بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نجاشی اور اس کے درباری پادریوں نے مسلمانوں کو بھی عیسائی خیال کیا ہو اور اس بنا پر بت پرست مکیوں کے حوالے کرنے سے انکار کیا ہو۔ مسلمان حضرت عیسیٰ کے متعلق ابن اللہ ہونے سے یک لخت انکار کرتے ہیں۔ ممکن ہے نجاشی جو فرقۂ طبیعت واحدہ کا پیرو تھا۔ مسلمانوں کے نقطۂ خیال کی طرف مائل ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ خیال کرتا ہو کہ مسلمان دراصل

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۱۷ و مابعد۔

(۲) سورہ مریم کی آیتیں۔

Marfat.com

عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ ہیں۔ (۱) اور رفتہ رفتہ حبشی ماحول میں وہ فرقۂ طبیعت واحدہ میں شامل ہو جائیں۔ اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان مسلمانوں میں سے جو اپنے مرکز اور ہادی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور جا پڑے تھے کم از کم دو نے عیسائیت قبول کر لی (دیکھیے ابن ہشام صفحہ ۷۸۳ تا ۷۸۴ تاریخِ طبری صفحہ ۱۷۶۷)

نجاشی کا سلام:

مسلمان مولف بہرحال اس کے قائل ہیں کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ کہ جب اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ مگر یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔

مکے میں بعض عجیب حالات میں عارضی طور سے چند دن کے لیے یہ مشہور ہوا کہ قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اب کوئی پرخاش نہیں رہی، تو فوراً حبشہ سے بہت سے مہاجر وطن واپس آ گئے۔ اس عرصے میں جب حالات کی توضیح ہو گئی تو یہ لوگ اور بعض دیگر مکی مسلمان پھر حبشہ واپس چلے گئے۔

مہاجرین کی واپسی:

اس کے بعد کئی سال تک کوئی اور خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقامی سلوک سے دل برداشتہ ہو کر مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ اور مقامی و مضافاتی قبائل سے سمجھوتہ کر کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرتے ہیں۔ اور پھر قریش پر جن کے تجارتی کاروان مسلمانوں کے زیر اثر علاقے سے گزر کر شام جاتے تھے۔ معاشی دباؤ ڈالتے ہیں اور نتیجۃً بدر وغیرہ کی جنگ ہوتی ہے جس میں عموماً قریش کو سخت شکست ہوتی ہے تو قریش کی ایک اور سفارت حبشہ جاتی ہے اور موقع دیکھ کر چاہتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ

(۱) اسلام کو شروع ہو کر اس وقت تک بہ مشکل پانچ سال گزرے تھے اور بجز عقائد کے بہت کم احکام نازل ہوئے تھے۔ مسلمان نماز میں بھی غالباً بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرتے تھے جو عیسائیوں کا مقدس ترین مقام ہے۔ ان حالات میں ان پر اجنبی کے لئے عیسائیت کا گمان کرنا تعجب کے قابل نہ ہو گا۔ بدقسمتی سے حبشہ کی ہم عصر تاریخیں محفوظ نہیں رہیں ورنہ ہمیں اسلامی مورخوں کے بیانات کا مقابلہ کرنے کا موقع ملتا۔

Marfat.com

وسلم کے خلاف اپنا غصہ مہاجرینِ حبشہ پر اتاریں۔ (۱) مگر انہیں اس دفعہ بھی ناکامی ہوتی ہے۔ مملکت اسلامیہ کی عام ترقی کے بعد اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ مسلمان غیر ممالک میں پناہ لیتے ہیں۔ اس لیے اس زمانے یعنی ۶ ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر حبشہ بھیجا کہ ان مہاجرین کو مدینہ لائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر نجاشی نے مہاجرین میں سے ایک نوجوان بیوہ کا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ عقد بھی کرا دیا تھا۔ ان بی بی کو ساتھ لے جانا بھی مقصود تھا۔ نجاشی نے دھوم دھام سے مسلمانوں کو رخصت کیا اور انہیں تحفے تحائف دے کر اپنے جہازوں میں مدینہ روانہ کیا۔ (۲)۔ مورخ لکھتے ہیں کہ نجاشی نے کئی کشتیاں اور بھی ساتھ کیں جن میں اس کا بیٹا اور بہت سے حبشی تھے۔ اور منشاء آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوستانہ سلام پہنچانا تھا۔

نجاشی کا خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام:

طبری اور ابن اسحاق نے نجاشی کا خط بھی محفوظ کیا ہے جس میں نجاشی نے اپنے پوشیدہ اسلام لانے اور اپنے بیٹے کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الی محمد رسول اللّٰہ من النجاشی الاصحم بن ابجر۔ سلام علیك یا نبی اللّٰہ و رحمة اللّٰہ وبرکاته من اللّٰہ الذی لا الٰہ الاھو الذی ھدانی الی الاسلام۔ امابعد فقد بلغنی کتابك یا رسول اللّٰہ فیما ذکرت من امر عیسیٰ۔ فورب السماء والارض ان عیسیٰ مایزید علیٰ ماذکرت ثفروقا۔ انه کماقلت ۔ وقد عرفناما بعثت به الینا وقد قرینا ابن

---

(۱) تاریخ طبری صفحہ ۱۶۰۲ و مابعد۔

(۲) طبقات ابن سعد ج ۲/ اف ۱۵ طبری صفحہ ۱۵۷۰ ابن ہشام صفحہ ۱۰۰۲

Marfat.com

عمك و اصحابه فاشهد انك رسول اللّٰه صادقاً مصدوقا۔ وقد بايعت ابن عمك واصحابه واسلمت علیٰ يديه لله رب العالمين۔ وقد بعثت اليك يابنى ارها بن الاصحم بن ابجر فانى لا املك الانفسى و ان شئت ان اٰيتك فعلت يا رسول اللّٰه فانى اشهدان ماتقول حق۔ والسلام عليك يا رسول اللّٰه

''بخدمت محمد رسول اللہ از طرف نجاشی اصحم بن ابجر، تجھ پر اے اللہ کے نبی سلام، اور اللہ کی رحمت اور برکتیں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی۔ یارسول اللہ آپ کا خط مجھے ملا جس میں حضرت عیسیٰ کا ذکر تھا۔ زمین اور آسمان کے مالک کی قسم کہ آپ کی بیان کردہ، چیز سے حضرت عیسیٰ رتی بھر بھی زیادہ نہیں ہیں ویسے ہی تھے جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادوں سے تعارف حاصل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی مہمان داری کی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے اور تصدیق یاب رسول ہیں۔ میں نے آپ کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی بیعت کی اور اس کے ہاتھوں خدارب العالمین کے سامنے سراطاعت تسلیم کیا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے بیٹے ارہا بن اصحم بن ابجر کو بھیجا ہے کیونکہ میں اپنی ذات کے سوا کسی کا مالک نہیں اگر آپ چاہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جاؤں تو آ جاؤں گا کیونکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ حق ہے۔ السلام علیک یارسول اللہ۔

Marfat.com

یہ وفد حبشہ سے چلا لیکن بعض مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ کشتیاں جن میں حبشی سوار تھے سب ڈوب گئیں۔ تو بعض دیگر مورخ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے چند سلامت رہیں۔ جب یہ سفارت مدینہ آئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفورِ اخلاق سے ان کی خود خدمت کرتے رہے۔ یہ حبشی سپاہی بعض جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک بھی رہے۔ تاریخِ مدینہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ نجاشی کے بیٹے نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موالات یا بھائی چارہ اختیار کر لیا اور حبشہ واپس جا کر تخت نشین ہونے سے انکار کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط نجاشی کے نام:

اس سفارت کے جواب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نجاشی کو کچھ تحفے بھیجے مگر اس عرصے میں اس نجاشی کا انتقال ہو گیا۔ امام مسلم لکھتے ہیں کہ اس کے جانشین کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط لکھا مگر اس کا انجام معلوم نہیں۔

یہ خط بیہقی (۱) نے ابن اسحاق کی کتاب سے نقل کر کے محفوظ کیا ہے اور وہ یہ ہے:

هذا كتاب من محمد النبی الی النجاشی الاصحم
عظیم الحبشه ۔ سلام علیٰ من اتبع الهدیٰ و اٰمن
باللّٰه و رسوله و اشهد ان لّا اله الااللّٰه وحدهٗ
لاشریك لم یتخذ صاحبة ولا ولداوان محمد اعبد
ورسوله۔ وادعوك بدعایة الاسلام، فانی انارسوله۔
وأدعوك بدعایة الاسلام، فانی انارسوله فأسلم
تسلم۔ یا اهل الکتاب تعالو الیٰ كلمة سواء بیننا
وبینكم الانعبد الااللّٰه ولانشرك به شیئا ولایتخذ

(۱) طبری صفحہ ۱۵۱۹ تا ۱۵۷۰ عن ابن اسحاق صبح الاعشیٰ جلد ۶ صفحہ ۳۶۶ تا ۶۷ عن ابن اسحاق تاریخ ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۸۴ زاد المعاد لابن القیم ج ۳ صفحہ ۶۰ تا ۶۱ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون خط نمبر ۳ زیلعی تخریج احادیث الہدایہ کا ضمیمہ۔ مکتوب نمبر ۱۰/۳۔ سواطع الانوار د تاریخ حبشہ بر موقع

(۲) میں نے ہدایہ ابن کثیر میں یہ حوالہ پایا ہے۔

Marfat.com

بعضنا بعضاً اربا بامن دون اللّٰہ۔ فان تولو افقولوا
اشهد وا انامسلمون۔ فان ابیت فعلیك اثم۔
النصارٰی من قومك۔ (مُہر)(رسول اللّٰہ)

یہ خط پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حبشیوں کے سردار نجاشی اصحم کے نام ہے۔ سلامتی اس شخص کے لیے ہے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ اور یہ بھی کہ محمد اسی خدا کا بندہ اور رسول ہے۔ میں تجھے اسلام کے بلاوے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اسی کا رسول ہوں۔ اسلام لا تو سلامت رہے گا۔ اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات پر آ جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے۔ یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شرک کریں اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ آپس میں اپنوں ہی کو رب بنائیں۔ اگر وہ پلٹ جائیں تو کہہ دو کہ ہم تو (خدا کے) فرمانبردار ہیں اگر تو انکار کرے تو تیری قوم کے نصرانیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

حبشی اطالوی جنگ کی ابتداء میں اخباروں نے (ہمدم نے مصر کے اخبار البلاغ سے اور اس نے ادیس ابابا کے اخبار برہان اسلام سے نقل کر کے) یہ خبر شائع کی تھی کہ نجاشی نے اپنے خزانے سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط جواب تک محفوظ ہے۔ نکال کر مسلمانوں کے ایک وفد کو دکھایا۔ اس خط کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، وہ وہی ہے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ اس سے پہلے حبشہ کے اس اثری خزانے کی خبر کبھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ موجودہ خبر کے بموجب حبشی اس سے اکثر مشکل اوقات میں کام لیتے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اور اصلی خطوط گزشتہ صدی عیسوی کے ربع سوم میں دستیاب ہوئے ہیں اور ان کے فوٹو بھی مشرق اور مغرب کے علمی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے متن بھی بالکل وہی ہیں

Marfat.com

جو کہ قدیم عربی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔اگر نجاشی کے اس مزعومہ خط کا بھی فوٹو حاصل ہو سکے تو ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے۔اگر نجاشی ہایلا سلاسی نے اپنی جلاوطنی کے زمانے میں مجبوراً فلسطین میں ان یادگاروں کو فروخت کر دیا تھا جیسا کہ اوپر مسٹر ڈنلاپ کے خط سے اس خط کی اصل کو پانے کے واقعے سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے تو پھر شہادت زیادہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔

حبش کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ تعلقات:

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے تعلقات حبشہ کے ساتھ بے حد دوستانہ رہے۔ اور ایسی متعدد حدیثیں ملتی ہیں جن میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشیوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کی ہے۔ ابتدائی دورِ اسلام میں بعض فرزندانِ حبش نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس جوش وصداقت کے ساتھ ساتھ دیا اسے مسلمان اب بھی ادب کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اور پہلے موذن حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام میں وہ کشش ہے کہ جاوی زبان میں بلال کے معنے خود موذن کے ہیں۔اور لندن کی مسجد میں (جو محلہ پٹنی میں ہے) سب سے پہلے انگریز موذن کا نام بھی بلال رکھا گیا تھا۔ اور اب بہت کم لوگ جانتے یا جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان مسٹر بلال کا اصلی نام کیا تھا۔ اور یہ گورے بلال خود بھی کالے بلال کے ہم نام ہونے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ ابرہہ کے حملے کے سلسلے میں بہت سے حبشی بیمار ہو کر مکے ہی میں رہ گئے۔ کچھ عرصہ ہوا مشہور شرقیاتی پادری لامنس نے ۱۹۱۶ء کے ژورنال آزیاتیک (پاریس) میں ایک عجیب اور قابلِ غور مضمون لکھا ہے۔

Les Ahabis Et l o organisation Militaire. De la Mecgue Au fiecle De l Hi gire.

"یعنی حبشی اور قرن ہجرت کا فوجی نظام مکے میں"

اس میں وہ متعدد عربی حوالوں کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قریش نے ایک مستقل فوج قائمہ (Standing Army) تیار کی تھی جن میں ان کے حبشی غلام اور بہت سے

تنخواہ یاب حبشی سپاہی کام کرتے تھے۔ اور قریش ان کو نہ صرف اپنے تجارتی کاروانوں کے سفر کے وقت بطور محافظ دستہ ساتھ لے جایا کرتے تھے، بلکہ اپنی جنگوں میں بھی ان سے کام لیتے تھے۔ مسلمانوں سے جنگوں کے سلسلے میں اکثر ''قریش و احابیشہا'' کا ذکر تاریخوں میں آیا ہے۔

مصر کے جنوبی علاقے میں اسلام کی اشاعت:

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان جب تیزی سے چاروں طرف پھیلنے لگے تو مصر کا جنوبی علاقہ بھی نور اسلام سے منور ہونے لگا۔ معلوم نہیں وہاں اسلام کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ چونکہ مصر سے اس علاقے کے تجارتی تعلقات قدیم اور کثیر تھے اس لیے مصر کی فتح کے بعد ہی عرب مسلم تاجروں نے اسلام یہاں پہنچا دیا ہوگا۔ بہرحال حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے میں نوبیہ کے علاقے میں مسجدوں کا پتا چلتا ہے۔ مقریزی نے خطط مصر (باب ''البقط'') میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن العاص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں فاتحانہ آئے تو انہوں نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں بیس ہزار فوج دے کر مصر کے جنوب میں نوبیہ روانہ کیا۔ اور جب بہت دن ہو گئے تو عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو واپسی کا حکم دیا۔

نوبیہ پر مسلمانوں کی چڑھائی اور معاہدہ:

جب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو نوبیوں نے اس صلح کو توڑ دیا جو ان میں اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح میں ہوئی تھی اور وہ جنوبی مصر میں بکثرت لوٹ مار کرنے لگے۔ اس پر عبداللہ بن سعد نے مکرر نوبیہ پر چڑھائی کی۔ اب یہ خود مصر کے گورنر ہو گئے تھے اور یہ ۳۱ھ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہے۔ چنانچہ نوبیہ کے پائے تخت دنقلہ (دنگولہ) کا محاصرہ کر کے منجنیق سے پتھر برسائے جس سے ان کا گرجا منہدم ہوگیا۔ اس پر ان کا بادشاہ قلید روث گھبرا گیا اور بڑی عاجزی سے صلح کی درخواست کی اور معذرت کی کہ کھانے پینے کی تنگی سے لوٹ مار ہوتی ہے۔ چنانچہ مکرر (صلح) ہوئی

Marfat.com

جس سے نوبیوں نے سالانہ تین سو ساٹھ غلام کی پیش کش کرنے کا اقرار کیا اور مسلمانوں نے ان کو غلہ ہدیہ کرنا منظور کیا۔ اور ایک معاہدہ لکھا گیا جو بقط (Pact) کہلاتا ہے۔ اس کی نقل جس میں دنقلہ کی جامع مسجد کا بھی ذکر ہے یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) عہد من الا میر عبداللّٰہ بن سعد بن ابی سرح العظیم التوبہ ولجمیع اھل مملکۃ (۲)عہد عقدہ علی الکبیر والصغیر من التوبہ من حدارض اسوان الیٰ حدارض علوۃ (۳)ان عبداللّٰہ بن سعد جعل لھم امانا وھدنۃ جاریہ بینھم وبین المسلمین ممن جاورھم من اھل صعید مصر و غیر ھم من المسلمین واھلِ الذمۃ۔ (۴)انکم معاشر النوبۃ، اٰمنون بامان اللّٰہ وامان رسول محمد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِن لا نحار بکم ولا نغزو کم ما اقمتم علی الشرائط التی بیننا و بینکم (۵)علیٰ ان تدخلوا بلدنا مجتازین غیر مقیمین فیہ ونہ خل بلدکم مجتازین غیر مقیمین (۶)وعلیکم حفظ من نزل بلدکم اویطرقہ من مسلم اومعاھد حتیٰ یخرج عنکم۔ (۷)وان علیکم رد کل آبق خرج الیکم من عبید المسلمین حتی تردوہ الیٰ ارض الاسلام ولا تستولو اعلیہ ولا تمنعوامنہ ولاتتعرضوالمسلم قصدہ وحاورہ الیٰ ان ینصرف (۸)وعلیکم حفظ المسجد الذی ابتناہ المسلمون

Marfat.com

بفناء مدينتكم ولا تمنعوامنه مصليا وعليكم كنسه وسرجه (٩)وعليكم فی كل سنة ثلاث مايه وستون رأساتدفعونها الىٰ امام المسلمين من اوسط رقيق بلادكم غير المعيب يكون فيها ذكر ان واناء ليس فيها شيخ هرم ولا عجوز ولا طفل لم يبلغ الحلم، تدفعون ذالك إلى والىٰ اسوان (١٠)وليس على المسلمين دفع عدوعرض لكم ولامنعه منكم من مدارض علوة الى ارض اسوان (١١)فان اديتم عبدالمسلم اوقتلتم مسلما اومعا هدااوتعرضتم المسجد الذى ابتناه المسلمون بفناء مدينتكم يهدم اومنعتم شيئا من لثلاثمائه راس و ستين رأسافقد برئت منكم هذا الهديه والامآن وعدنا نحن و انتم على سواء حتىٰ يحكم اللّٰه بيننا وهو خير الحكمين (١٢)علينا بذالك عهد اللّٰه وميثاقه وذمته وذمة رسوله محمد صلى اللّٰه عليه وسلم ولنا عليكم بذلك اعظم ماتدينون به من ذمة المسيح و ذمة الحواريين وذمة من لقطمونه من اهل و بينكم وملتكم اللّٰه الشاهد بيننا وبلنا على ذالك (١٣)كتبه عمرو بن شرحبيل فی رمضان سنة احدى وثلاثين۔

(۱)امیر عبداللہ بن سعد کا معاہدہ نوبہ کے حکمران اور جملہ اہلِ ملک کے لیے (۲)جو نوبہ کے بڑے چھوٹے سبھوں کے لیے اسوان سے علوہ تک کے علاقے کے لیے کیا گیا۔ (۳)عبداللہ بن سعد نے ان سے مدامی امن وصلح منظور کی ہے جو ان کے اور جنوبی مصر

Marfat.com

وغیرہ کے مسلمانوں اور ذمیوں کے مابین ہوگی۔ (۴) اے نوبہ والو! تمہیں خدا اور رسول کا امان دیا جاتا ہے ہم تم سے نہ جنگ کریں گے نہ لڑائی جب تک تم ہماری باہمی شرطوں کو پوری کرو۔ (۵) یہ کہ تم ہمارے ملک میں آکر گزر سکو گے۔ بس نہ سکو گے اور ہم تمہارے ملک میں آکر گزر سکیں گے مقیم نہیں ہو جائیں گے۔ (۶) جو مسلمان یا ذمی تمہارے ملک میں آئے یا اس میں سے گزرے تو تمہارے علاقے سے واپسی تک اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ (۷) اور مسلمانوں کا کوئی بھگوڑا غلام تمہارے پاس آئے تو تم اسے اسلامی سرزمین میں واپس کرو گے اس پر قبضہ نہ کرلو گے اور نہ اس سے کوئی مسلمان ملنا اور بات کرنا چاہے تو تم ممانعت وتعرض کرو گے تا آنکہ وہ مسلمان واپس چلا جائے۔ (۸) تمہارے شہر میں مسلمانوں نے جو مسجد بنائی ہے اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ وہاں کسی نمازی کو جانے سے تم نہ روکو گے۔ وہاں جھاڑ وصفائی اور روشنی تمہارا فرض ہے۔ (۹) تم سالانہ تین سو ساٹھ غلام مسلمانوں کے حکمران کو خراج دو گے جو اوسط قسم کے تمہارے ملک کے ہوں، ان میں عیب نہ ہوں کچھ مرد اور کچھ عورتیں۔ مگر نہ بہت بوڑھے اور نہ بالغ یہ اسوان کے والی کے سپرد کیے جائیں گے۔ (۱۰) علوہ اور اسوان کے مابین تم پر کوئی حملہ آور ہو تو اس کو روکنا مسلمانوں کا فرض نہیں۔ (۱۱) اگر تم مسلمانوں کے کسی، بھگوڑے، غلام کو پناہ دو یا کسی مسلمان یا ذمی کو قتل کرو یا اس مسجد سے تعرض کرو جو مسلمانوں نے تمہارے شہر میں تعمیر کی ہے اور اس کو منہدم کر دیا تین سو ساٹھ غلاموں کے پیش کش میں کمی کرو تو یہ صلح وامان ختم ہو جائے گا اور ہم حالت برابری پر عود کر آئیں گے تا آنکہ خدا ہم میں فیصلہ نہ کرے۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (۱۲) ہم پر اس سلسلے میں خدا اور رسول کا ذمہ اور واسطہ ہے اور

Marifat.com

ہمارے لیے تم پر تمہارے دین کی سب سے بڑی اعتقاد کی چیز یعنی
حضرت مسیح اور حواریوں اور اپنے دین وملت کے دیگر بزرگ اشخاص
کی ذمہ داری ہے۔ اللہ ہم میں اور تم میں گواہ ہے۔(۱۳) اُسے
۳۱ھ میں رمضان میں عمرو بن شرحبیل نے تحریر کیا۔

مقریزی نے تفصیل کے ساتھ اس معاہدے کی تعمیل کی رسمیں بیان کی ہیں کہ ہر سال غلاموں کی حوالگی کے وقت کیا طریقہ انجام پاتا تھا اور کس طرح رواج نے گورنر مصر اور افسران متعلقہ کے لیے بھی کچھ حقوق مستقرہ پیدا کر دیے تھے اور کس طرح اور کس مقدار میں انہیں غلہ عطا کیا جاتا تھا، اور یہ کہ رواج نے کس طرح غلے کے علاوہ کپڑے وغیرہ کو بھی اس میں شامل کرا دیا تھا۔ چونکہ نوبی قوم عیسائی تھی۔ اس لیے سالانہ سفارت کے موقع پر ایک زمانے میں شراب کے پیپے بھی تحفہ دیے جانے لگے تھے اور علماء نے اس میں مداخلت کی تھی۔

حبش کے بعض ساحلی علاقے اور ان کا یکساں نظم:

حبشہ اور نوبیہ سے متصل بُجہ کا علاقہ ہے جو دریائے نیل اور بحر احمر کے مابین بندر عیذاب (حالیہ پورٹ سوڈان) سے جنوبی سکین تک پھیلا ہوا ہے۔ مقریزی (باب "ذکر البجہ") نے لکھا ہے کہ ان میں بھی جنوبی ہند کے بعض ساحلی علاقوں کی طرح مادرانہ معاشرہ رائج تھا۔ یعنی کسی کا وارث بیٹا نہیں بلکہ بھانجا اور نواسہ ہوتا تھا۔ اور یہ کہ ان میں کوئی سیاسی تنظیم اور کوئی مذہب نہ تھا۔ جب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے نوبہ پر حملہ کیا تھا تو اس علاقے پر بھی توجہ کی تھی لیکن جب یہاں کی حالت سے آگاہی ہوئی کہ کوئی حکومت ہی نہیں ہے جو مقابلہ کر سکے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا حتیٰ کہ کوئی معاہدہ تک نہیں طے ہوا۔ اور یہ کہ سب سے پہلی مرتبہ ان سے معاہدہ عبیداللہ بن الحجاب السلولی (زمانہ گورنری ۱۰۴ھ تا ۱۱۶ھ) نے کیا تھا جس میں مذکور تھا کہ "سالانہ ان لوگوں کو تین سو اونٹ دیئے جایا کریں گے۔ یہ تجارت کے لیے اسلامی سرزمین سے گزر سکیں گے لیکن وہاں بس جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ کہ ان کے علاقے میں مسلمان اور ذمی رعایا کو جان ومال کا امن حاصل رہے گا ورنہ ان سے معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ نیز یہ کہ مسلمانوں

Marfat.com

کے غلام بھاگ کران کے علاقے میں آئیں تو وہ واپس کردیے جائیں گے۔ معاہدے کی تعمیل کے لیے ان کا ایک وکیل بطور یرغمال مصر میں رہتا تھا۔ اور خلاف ورزی کی سزائیں مقرر تھیں چنانچہ ایک بکری کی لوٹ پر چار دینار اور ایک گائے کی لوٹ پر دس دینار جرمانہ ہوتا تھا اور بھگوڑے غلاموں کی عدم واپسی پر بھی ان سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے علاقے میں مسلمان جا کر بسنے، وہاں کے شاہی خاندان میں شادی بیاہ کرنے اور ان کی کانوں کو کھود کر استفادہ کرنے لگے جس کے باعث ان لوگوں کا وحشی پن بھی رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ لیکن خلیفہ مامون کے زمانے میں ان لوگوں نے لوٹ مار بہت شروع کی تو سپہ سالار عبداللہ بن جہم کو بھیجا گیا اور مختلف معرکہ آرائیوں کے بعد بجہ کے حاکم کنون بن عبدالعزیز نے صلح چاہی جس کا طویل متن مقریزی نے نقل کیا ہے جس کے اہم فقرات یہ ہیں:

''تو اور تیری رعایا سب خلیفہ مامون کے غلام سمجھے جائیں گے البتہ اپنے علاقے میں تو حسبِ حال بادشاہ رہے گا اور تو حسبِ سابق سو اونٹ یا تین سو دینار کا سالانہ خراج ادا کرے گا.......... اسلام، قرآن یا جناب رسالت کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو معاہدہ منسوخ سمجھا جائے گا.......... دشمنانِ اسلام کو تم لوگ نہ دو گے.......... کسی مسلمان یا ذمی آزاد کو قتل کیا تو دس خوں بہا اور غلام کو تو قیمت کا دس گنا، اور اسی طرح اسلامی رعایا کا مال لُٹے تو دس گنا جرمانہ وصول کیا جائے گا.......... اسلامی رعایا کو تیرے علاقے سے گزرنے میں کوئی ممانعت نہ ہو گی اور نہ رہزنی کی جائے گی .... مسلمانوں کی بنائی ہوئی مسجدوں کو نہ ڈھاؤ گے.......... کنون بن عبدالعزیز بطور یرغمال مصر میں مقیم رہے گا تاکہ معاہدے کی تعمیل کا اطمینان حاصل ہو.......... اسلامی افسر مسلمانان بجہ سے زکات وصول کرنے علاقے بجہ میں آسکیں گے.......... اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا گیا اور اس پر گواہیاں بھی ثبت کرائی گئیں۔''

معاہدہ کی تعمیل خلیفہ متوکل کے زمانے تک ہوتی رہی۔ پھر لوٹ مار بڑھ گئی تو ایک مہم بھیجی گئی جس نے فن حرب کی مہارت سے باوجود تعداد کی کمی کے، دشمن کو فاش شکست دی اور ان کے حکمران کو بغداد جا کر خلیفہ کے قدموں پر گرنے پر مجبور کیا۔ یہ ۲۴۱ھ کا واقعہ ہے اور بعض مزید حقوق مسلمانوں کے لیے حاصل کر کے مکرر صلح کی گئی۔

Marfat.com

حبشی علاقوں کے بہت سے حالات مقریزی نے ''الالمام'' نامی ایک مستقل کتاب میں بھی لکھے ہیں۔ لیکن ہمارا موضوع قبل اسلام اور ابتدائے اسلام کے تعلقات کا تذکرہ ہے اور بعد کے حالات محض تکملہ ہیں۔

(ثقافت-لاہور، مئی ۱۹۵۹ء)

Marfat.com

دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور
(عہد نبوی کی ایک اہم دستاویز)

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لیے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو ان کا پابند پاتا ہے۔ (۱) عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انہیں کتاب کا نام دیا گیا Bible Scripture کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ کنفوشس کی قانونی تالیف بھی ''کتاب'' کے نام سے موسوم ہے تو چنگیز خاں کے ''یاسہ'' (۲) کے معنی بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے، اور ''کتاب اللہ'' مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد و قوانینِ ملک کم و بیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا، مجھے اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے عہد نبوی سے پہلے نہیں مل سکی۔ بلاشبہ منوسمرتی (۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے۔ اور کوتلیا کی آرتھ شاستر (۳۰۰ ق م) اور اس کے ہم عصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان (۳) (۱۵۸) (۴) کے دستور بھی لکھے تھے، جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس سال قبل مصر میں بردی کاغذ (پاپیروس) پر محفوظ مل چکا ہے، اور ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے، اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب یا تو درسی اور مشورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا

Marfat.com

تاریخی تذکرہ ہیں۔ کسی مقتدر اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستور مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

۱ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق اور فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہ ابن اسحاق اور ابوعبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے، اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن (۵۳) جملے، یا قانونی الفاظ میں دفعات ہیں اور اس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں اس کی اہمیت اسلامی مؤرخوں سے کہیں زیادہ یورپی عیسائیوں نے محسوس کی۔ ولہاوزن، میولر، گریمے، اشپرنگر، ومینسنک، کائتانی، بول (۵) وغیرہ کے علاوہ ایک انگریز مؤرخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مؤلفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور اس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مؤلفوں کے بیانات کی تنقید کے لیے بڑا وقت چاہیے جو اس لکچر (۶) میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی پس منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہل ملک نے ابتداء حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالمگیر تھا اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بیزنطینہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرت اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیا داروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے۔ (۷) لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کے فرد کی حیثیت میں آپ کی سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری

Marfat.com

طائف (۸) اور مدینے (۹) کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے آپ طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے، مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ ودَو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرویدہ بنے، اور مدینے آنے پر آپ کو اور آپ کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسلمانان مکہ ہجرت کر کے مدینے جانے لگے۔ مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں، اس لیے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان (۱۰) کا محاصرہ اور شب خون کی تجویز پختہ کی گئی، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخیر وعافیت مکے سے نکل کر مدینے پہنچ گئے۔ جھنجلاہٹ میں مکے والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور دوسرے مہاجروں (۱۱) کی املاک وجائداد پر غاصبانہ تسلط جمالیا، مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگر چہ مدینے کی آبادی کا اندازہ اس وقت چار، پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب اس وقت یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا، وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقات خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس سرکاری عہدے تھے، جن کا تفصیلی ذکر میں نے حال میں ٹرونڈرم کے موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا ہے۔ (۱۲)

اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی، اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس اور خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے، تو یہودی بنو النضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں، اس میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آرہے تھے، اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہو کر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آچلے تھے۔ (۱۳) اور گو وہاں کے کچھ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی تلاش میں تھے۔ (۱۴) لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا۔ اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی

Marifat.com

تھی کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کو بادشاہ بنا دیں، حتیٰ کہ بخاری (۱۵) و ابن ہشام (۱۶) وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی۔

بے شبہہ آنحضرت نے بیعت عقبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کر کے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی، مگر اس سے قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا، اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا، کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا، تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتد بہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے، مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا۔ اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی، اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آتے ہیں، جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:

(۱) اپنے اور مسامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

انہیں اغراض کے مدنظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کر کے مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی (۱۷) ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفے کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاص متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانون ملک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا۔ اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی۔ اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا لکھا جانا معنے خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنے دستوار العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

Marfat.com

ہابس، روسو وغیرہ ''معاہدہ عمرانی'' کے نظریے کے تحت مملکت کا آغاز حاکم ومحکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتے ہیں۔ اس کی ایک بین اور واقعی مثال ہم کو بیعت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنے فرض اور حکم کے بھی ہیں۔

ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتاً

اِن کتٰب الابرار لفی علیین.

(۱۸) کتاب علیہم القتال وغیرہ میں لفظ ''کتاب'' اسی معنی میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ (Vorschrift) اور فرانسیسی و انگریزی لفظ (Prescription) (Prescrifena) ہسپانوی (Prescripcisn) (بمعنی فرض وحکم) کا مادہ بھی ''کتاب'' ہی کے معنے رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز کیا کہ ''ایک حکمران ایک قانون'' ابھی تک زکاۃ اور حج کے مرکز کش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبیلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا پھر بھی ایمان واعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے، ایک ہی نبی کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر ایک ہی سمت نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لیے انقلابی اصلاح ترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفریں کارنامہ اسی دستاویز میں ریکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین

اختیارات اپنے لیے محفوظ فرمائے مگر نہایت اہم اور قابل ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کیے، اصل سرچشمہ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی امت کے لیے لائے ہوئے احکام اپنے پر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیئے۔ اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور ٹارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر ہوئے (۱۹) ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے **King can do no wrong** (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی پر عدالتی دارو گیر سے محفوظ نہ رہ سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:

حصہ اوّل میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہاوزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یوروپی مولفوں نے ولہاوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبرات دیئے۔ البتہ ضمن الف وب کر کے دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دیئے تا کہ یورپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ فقرات پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۳) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے، ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ کی ذات ہو گی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اتنا بڑا اقتدار دے دینا غیر مسلم طبقات نے کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا

جا سکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے اپنے بزرگان خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی ان کے خُرد تر رشتہ دار انہیں کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پا سکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ عربی قبائل میں جو مشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون ہوں اور وہ قریش مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلفی کو توڑنے، تعلقات کو منقطع کرنے اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جانب دار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کیے گئے اور انہیں ان کو منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مولفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادرکشی اور باہمی لڑائیوں سے اُکتا گئے تھے اور تنگ آ کر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمران بنا کر آئندہ کی زندگی بسر کریں (۲۰)۔ یہ عربی غیر مسلموں کا ذکر تھا۔

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دستور کا حصہ دوم، یعنی یہودیوں کا دستور العمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلفی جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر لیے تھے۔ آنحضرت نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ، جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔

یہودیوں کے دو بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا مستقلاً الگ الگ رہ کر محفوظ رہنا ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے

ہوئے تھے۔ ان حالات نے انہیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہوسکتا ہے، اس سے پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت کے انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور سے یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دستاویز ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ۱ھ میں دستاویز کا حصہ اوّل مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کر کے حصہ اوّل کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب (۲۱) میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیئے گئے ہیں، ایک جملے میں اسے "فی کتابه للمهاجرین والانصار" کہہ کر اسے "دستور العمل مہاجرین وانصار" سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں "(ووقع فی کتاب رسول الله صلی الله علیه وسلم لیهود)" "دستور العمل یہودیان" کی اصطلاح برتی گئی ہے ایک اور زیادہ راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن (۲۲) میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے جیسا کہ عرض ہوا اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں، ایک اسلامی و عربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے، ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع ولاحق رہ کر ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت "محمد النبی رسول اللہ" کے احکام کی اطاعت کرے گی۔ ف ۱

اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذات خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمد کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں، جھگڑوں میں ان سے ہی رجوع ہوں گے اور ان کے فیصلے کو آخری مانیں گے۔ ف ۲۳

یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے امت واحدہ سمجھی جائے گی اور تمام دنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی۔ اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے۔ ف ۲۰

اور باوجود کمی تعداد و کمزوری وخطرات کے ان میں خودداری اور راہ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کیے گئے۔ ف ۲۰، ف ۱۳

جنگ وصلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہو سکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اس میں برابر کا حصہ لیں گے۔ عین حالت جنگ میں بھی نوبت نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے۔ ف ۱۷، ف ۱۸

جنگ وصلح تو مرکزی مسئلہ ہوں گے البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنی ترین شخص کے دیے ہوئے وعدہ پناہ کا بھی پوری امت احترام کرے گی۔ ف ۱۵

اور اس طرح اخوت ومساوات اور آزادی عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری وساری کر دی گئی۔ پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوق رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوق حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں۔

ف ۲۰ ب

اس دفعہ کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا امام بخاری (۲۳) نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگ بدر سے پہلے پیش آئے تھے ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بناء پر ان کی جائداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ بے شبہ اس دفعہ میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو کی گئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے اسی بناء پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی بعد میں جنگ بدر

Marfat.com

کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے یا کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی۔ جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دُکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا۔ ف ۱۹

عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالت مرافعہ جہاں ذات رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا وہیں ہرجے اور خون بہا (ضمان ودیت) کی ادائی کے لیے قدیم نظام بیمہ کی توثیق وتشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اس کے اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے۔ ف ۴

اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف، اور سقیفہ کہتے تھے۔ کوئی محلہ دار فنڈ یا خزانے کا پتہ تو نہیں چلتا، (۲۴) غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا۔ یہ محلہ دار مجلسیں بڑی حد تک خودمختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی وسماجی اغراض کے لیے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا۔ ف ۳

اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلہ دار مجلس اپنے کسی اہل محلہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی۔ ف ۱۲

اور یہ بھی صراحت سے بتا دیا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہوں یعنی کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا۔ ف ۱۲ اب

اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنا لے، (ایضا بروایت ابن حنبل) انصاف رسانی کا اختیار افراد سے لے کر جماعت یعنی مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی پچ کرنے

Marfat.com

بلکہ خود حقیقی بیٹے تک کو بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں۔ف ۱۳

قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لے کر قصاص سے درگزر کرے۔ اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ف ۲۱

اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں۔ف ۱۴

اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے، اگر وہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو ان کے والدین منت مان کر یہودی بنا دیتے تھے۔ ان کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ اتحاد عمل پر آمادہ ہوں تو انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق رعیت حاصل ہوں گے۔ ان کی حفاظت و مدد کی جائے گی اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ف ۱۶

یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اول میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔ حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد میں۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحاد عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم نہ صرف ف ۲۴ میں بیان ہوا ہے بلکہ ف ۳۷-ا اور ف ۳۸ میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً ف ۴۵ ب کی مبہم عبارت کا

Marfat.com

بھی یہی منشا ہے کہ (علی کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم) جس کو ابوعبید نے "حصتھم من النفقة" لکھا ہے اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں یہودی بہت بدنام تھے ان کی بدمعاملگی کو "لیس علینا فی الامین سبیل" اور "منھم من ان تامنه بدینار لایو دہ الیک" وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔ جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انہیں مال غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابوعبیدہ نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے۔(۲۵) یہودیوں نے بھی آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیسا کہ ف ۴۲ میں نہایت صراحت سے قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ف ۲۵ میں ''یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر'' کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود ف ۴۲ میں ابن اسحاق کی روایت میں ''محمد رسول اللہ'' اور ابوعبید کی روایت میں ''محمد النبی'' کے الفاظ برتے گئے ہیں اور ف ۴۷ میں ابن اسحاق کے ہاں ''محمد رسول اللہ'' کا کلمہ مکرر آیا ہے گو ابو عبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت کی رسالت یا نبوت مان لی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیونکہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نبی'' یا ''رسول اللہ'' کا لفظ آنحضرت نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جرأت نہ کی۔ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے استعمال کے متعلق سیرۃ ''ابن ہشام، ص ۹۹۲، سطر (۳) سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ اس ذیلی بحث سے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر کیا گیا۔ اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی۔ اس کا منشاء بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علاحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے

Marfat.com

جنگ کی یا انہیں رہنے کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انہوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا، منسوخ نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دستور میں خون بہا کی ادائی میں اہل قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دیے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنو النضیر سے اسی قرارداد مندرجہ ف ۲۵، ف ۳۱ کے تحت آنحضرت نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ (۲۶) یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی وتمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی ف ۲۵ اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنہیں موالی بطن اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے حقوق اور ذمہ داریوں میں عام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے۔ ف ۳۲، ف ۴۰، ف ۴۵، ف ۴۶ البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا ف ۴۱۔ یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ ف ۳۷، ف ۴۴ اور ف ۴۵ میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان، یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی ف ۴۵ نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں ان کی شرکت آنحضرت کی اجازت پر منحصر رکھی گئی ف ۳۶-الف، اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنی یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیئے گئے جیسا کہ ف ۴۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو

بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا (۲۷)۔ بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت کو حاصل ہو گئی جو آنحضرت کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا ف ۲۵ ف ۳۱ ف ۴۰۔ اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت ان کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں ف ۴۲۔ نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی ف ۳۶ ب میں صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک لخت روک دیا گیا۔ آنحضرت کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لیے بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا ف ۳۹۔ مکہ ایک حرم تھا۔ شہر طائف کی حرمت کو ۹ ھ کے معاہدہ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا دیکھیے کتاب الاموال لابی عبید، ص ۵۰۶) یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوالینا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح چھوٹی سی بستی کو جو بیس ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا، اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہیت، کا بلا کسی دقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یورپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی امیہ سے بہت پہلے حضرت عثمان کے زمانے میں ۲۷ ھ میں مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہو گئیں اور مزید

Marfat.com

کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور ملک کے ایک حصے پر قابض رہیں تاآں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہد عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری (۲۸) اور گبن (۲۹) نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہد عثمانی تک مدینہ ہی مرکز خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ ''دین'' بھی برتا گیا ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیش نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴

۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمہ فارسی، مخطوطہ پاریس) ورق ۱۰۱

۳۔ کتاب الاموال مولفہ ابو عبید قاسم بن سلام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷

۴۔ البدایہ والنہایہ مولفہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶

۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں۔

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱

۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ ج ا ص ۲۷۱۔ ج ۲ ص ۲۰۴ ج ۳ ص ۲۴۲

۳۔ تاریخ الطبری (طبع یورپ سلسلہ اول) ص ۱۲۶۱، ۱۳۵۹

۴۔ لغت لسان العرب مولفہ ابن منظور تحت مادہ ہائے ''بدر، وسع، عقب، عقل، فرح، وتغ''۔

۵۔ طبقات ابن سعد ج اقسم دوم ص ۱۷۲

اس موضوع پر یورپی زبانوں کے مضامین:

1. **Wellhausen Gemeideordnung von medina, (in Skizzen**

Marfat.com

und Vora rbeiten, vol.4. Nr,2.)
2. Caetani, Annali dell 'Islam, annol, 43.
3. Wensinck, mohammed on de Joden te Medina. pp 78 et Saq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210.212.
5. Sprenger, Das Leben und die Lehre des Mohammed vol. 3, pp.15-18.
6. Grimme, Mohammed pp. 75. 75.S1.
7. Mueller, Der Islam in Morgon - und Abendland, vol.1. pp.15-18.
8. Hamidullah, "Administrationof Justice in Early Islam", Islamic Culture, quartly, Hyderabad. vol 00. 163. 72.
10. La Diplomatie musulmane in loco.

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بہ عہد نبوی

(کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھنے کے لیے کسی حاشیے کی ضرورت نہ رہے۔ اور فقرات پر نمبر بھی لگا دیے گئے ہیں تاکہ حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہو چکے ہیں اور جرمنی، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اس لیے جہاں مجھے اختلاف کرنا پڑا وہاں الف، ب کر کے ذیلی تقسیم کی گئی ہے اور بین الاقوامی نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے)۔

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے

ف ۱ یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

ف ۲ تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (اُمت) ہوگی۔

Marfat.com

ف۳ قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۴ اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۵ اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۶ اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۷ اور بنی جُشَم اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۸ اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۹ اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف۱۰ اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۱ اور بنی الاوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے اور حسب سابق اپنے خون بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۲-الف اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دیں گے تا کہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۲-ب اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدہ برادری نہیں پیدا کرے گا۔

ف ۱۳ اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف ۱۴ اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ کسی فرد کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کرے گا۔

ف ۱۵ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنی ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

ف ۱۶ اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

ف ۱۷ اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

ف ۱۸ اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائے گی۔

Marfat.com

ف۱۹ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لیں گے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

ف۲۰-الف اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

ف۲۰-ب اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

ف۲۱ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام ایمان والے اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اور اس کے سوائے انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

ف۲۲ اور کسی ایسے ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا۔

ف۲۳ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمد سے رجوع کیا جائے گا۔

ف۲۴ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف۲۵ اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ، ایک سیاسی وحدت (یا اُمت) تسلیم کیے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین۔ موالی ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

ف۲۶ اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے

Marfat.com

یہودیوں کو۔

ف۲۷ اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۸ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۲۹ اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۰ اور بنی الاوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

ف۳۱ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

ف۳۲ اور جفنہ جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۳ اور بنی الشطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

ف۳۴ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۵ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

ف۳۶-الف اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

ف۳۶-ب اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی اور جو خونریزی کرے تو اس کی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ

Marfat.com

تعمیل کرے۔

ف ۳۷-الف اور یہودیوں پران کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پران کے خرچے کا۔

ف ۳۷-ب اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئے گی۔ اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

ف ۳۸ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

ف ۳۹ اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کے لیے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

ف ۴۰ پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ۔ نہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور نہ خود وہ عہد شکنی کرے گا۔

ف ۴۱ اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزیں کو نہیں)۔

ف ۴۲ اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمدؐ سے (جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو) رجوع کیا جائے گا۔ اور خدا اس شخص کے ساتھ ہے جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف ۴۳ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

ف ۴۴ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

ف ۴۵ الف اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کے لیے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

ف ۴۵ ب ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی (مدافعت) آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

Marfat.com

ف۴۶ اور (قبیلہ) الاوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں کہ اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے۔ اور وفا شعاری ہو گی نہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا خود ہی بھرے گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ مدافعت اور زیادہ سے زیادہ وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف۴۷ اور یہ کہ حکم نامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئے گا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفا شعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمد بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

حواشی

(۱) Grammar of politics. by H.J. Laski میں بھی یہی نتیجہ استقراء نکلا ہے۔

(۲) مسالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطہ پارلیس۔

(۳) Aristotle on the othenion constitution by kenyonp XV

(۴) Encyclopaedia of social sciences Vol-1 p.27 نیز P-X III

(۵) حوالے مضمون کے آخر میں دیے گئے ہیں۔

(۶) موتمر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد

(۷) ابن ہشام ص ۲۷۸، نیز طبقات ابن سعد، احوال قبل الہجرۃ

(۸) معارف ابن قتیبہ، ص ۴۳، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون

(۹) ابن ہشام ص ۱۰۷، ۳۳۶، ۳۴۶، طبقات ابن سعد ج ۱/ ۱ص ۳۴، ۴۵، ۴۶، معارف ابن

Marfat.com

تتمیہ "احوال عمومۃ" تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷۷ تا ۱۷۹ وغیرہ

(۱۰) بخاری کتاب ۶۴ باب ۸۴ حدیث ۳، یہ مکان بی بی خدیجہؓ سے آنحضرت کو وراثت میں ملا تھا (مبسوط سرخسی ۱۰/۵۳)

(۱۱) ابن ہشام ص ۳۳۹ ص ۳۲۱ تا ۲۲ نیز بنی جحش کی جائداد پر ابوسفیان کے قبضے اور فروخت کے لیے محمد بن حبیب کی المنمق (مخطوطہ) ص ۱۸۵

(۱۲) مطبوعہ رسالہ اسلامک کلچر، جولائی ۱۹۳۸ نیز باب گزشتہ "شہری مملکت مکہ"

(۱۳) ابن ہشام ص ۲۸۷، طبقات ابن سعد ۱/ اص ۱۴۷، مسند احمد ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷، بخاری کتاب ۶۳ باب ۱۷۱، ۴۶

(۱۴) ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰

(۱۵) بخاری کتاب ۷۹ باب ۲۰

(۱۶) سیرت ابن ہشام ص ۲۷۷، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ و مابعد، نیز قرآن مجید سورہ ۶۳ آیت ۸ کی تفسیر

(۱۷) ابن سعد ج ۲/ اص ۱۹۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۸

(۱۸) ابرار کے نامہ اعمال کا جنت میں بھجانا بے معنے بات ہوگی۔ میں اس کے معنے یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں رہیں گے۔

(۱۹) ابن ہشام ص ۴۴۴، نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و سیرۃ شامی بر موقع۔ جہاں چھ آٹھ مقدموں کا ذکر ہے۔

(۲۰) ملاحظہ ہو اوپر ص ۸۱

(۲۱) تحت کلمہ "ربع"

(۲۲) سنن ابی داؤد کتاب ۱۰ باب ۲۱

(۲۳) بخاری کتاب ۴۰ باب ۲ نیز کتاب ۶۴ باب ۲

(۲۴) لیکن بنو النضیر کے یہودیوں میں قبیلہ داری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم و کان سید بنی النضیر فی زمانه ذلک و صاحب کنزهم .... یعنی بالکنزهنا المال الذی کانوا یجمعونه لنو ایبهم وما لبصرض لهم" (یعنی سلام بن مشکم اس زمانے میں بنو النضیر کا سردار اور ان کا افسر خزانہ تھا، خزانے سے مراد یہاں وہ مال ہے جو وہ اتفاقی حوادث اور ضروریات

Marfat.com

کے لیے جمع کیا کرتے تھے۔

(۲۵) روض الانف للسھیلی ج ۲ ص ۱۷۔ کتاب الاموال لابی عبید ۵۱۷

(۲۶) ابن ہشام ص ۶۵۲۔ ابن سعد ج ا ص ۴۰ تا ۴۱۔ تاریخ طبری طبع یورپ ص ۴۴۹ تا ۵۰۔

(۲۷) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۶۔ ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز پروفیسر ٹارے کی ''جوئش فاونڈیشن آف اسلام''

(۲۸) تاریخ طبری ص ۲۸۱۷

(۲۹) Decline and fall of the Roman Empire v.p 555

(مجلہ طیلسانیین حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۳۹ء)

Marfat.com

اوّلین مساجد

اللہ نے ہمیں دعا سکھائی ہے: ''رَبِّ زِدْنی عِلْماً '' (اے میرے رب، مجھے علم میں بڑھا) علم میں زیادتی اس وقت ہوسکتی ہے جب پرانی چیزوں پر اکتفا کرنے کی جگہ، اس میں اضافے ہوتے رہیں۔ بعض پرانی باتوں سے مجھے الجھن ہے۔ وہ اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تا کہ ان کے ردِ عمل سے استفادہ کرسکوں۔

سب سے پہلی مسجد:

خدا کی عبادت سے مختص مقام کو بیت (یا بیت اللہ) کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے، مسجد کا بھی، جامع کا بھی۔ قرآن مجید کے مطابق فرشتے حضرت آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کی مخلوق ہیں اور فرشتے بھی مسلم (خدا کے مطیع) ہیں، اس لیے ان کی بھی کوئی مسجد کوئی مقام عبادت ہوتو وہی اولین مسجد ہوسکتی ہے۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں (سورۃ طور میں) لکھا ہے کہ ساتویں آسمان پر، عرش بریں کے نیچے البیت المعمور پایا جاتا ہے، جو فرشتوں کی مسجد ہے ایک حدیث میں ذکر ملتا ہے کہ آفرینش سے لے کر اب تک اس مسجد میں ہر روز ستر ہزار فرشتے آتے رہتے ہیں جو پھر کبھی دوبارہ نہیں آتے (فرشتوں کی تعداد کے اندازے کے لیے) ایک حدیث میں یہ بھی صراحت ہے کہ کعبہ (بیت اللہ)، اس البیت المعمور کے عین نیچے ہے۔ ایک اور روایت میں ہے (ٹھیک اتنا نیچے کہ اگر اوپر سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ کعبے کی چھت پر گرے!) دوسرے الفاظ میں کعبۂ معظمہ ایک کھڑکی ہے، جو براہ راست عرش پر کھلتی ہے (اور ہماری دعائیں خدا تک براہِ راست پہنچتی ہیں)۔

بعض اور پرانی مسجدیں:

ابن کثیر نے اپنی تاریخ (البدایہ والنہایہ) میں لکھا ہے کہ بعض بیانات کے مطابق ساتوں آسمانوں میں سے ہر آسمان پر ایک مستقل اور الگ کعبہ ہے جو متعلقہ آسمان کے رہنے والوں کی عبادت گاہ ہے۔(اگر ایسا ہے تو خیال گزرتا ہے کہ اگر کبھی مسلمان بھی چاند اور دیگر ستاروں پر چڑھیں تو روزانہ پنجوقتہ نمازوں کے لیے اس روایت سے استفادہ کر سکتے ہیں اور چاند وغیرہ پر بھی ایک کعبہ یا ایک بیت اللہ تعمیر کر سکتے ہیں جو زمین کے کعبے کی طرف نماز میں رُخ کرنے کے عدم امکان کا حل ہو سکے گا۔

کرۂ زمین کی پہلی مسجد:

قرآن مجید میں صراحت ہے کہ سب سے پہلے (خدا کی عبادت کا) گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہ ہے جو مکّہ میں (جو شہر مکہ کا ایک حصہ ہے) ہے بابرکت بھی اور لوگوں کے لیے باعث ہدایت بھی۔

روایت ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام خلافتِ الٰہی کا جائزہ لینے کے لیے زمین پر آئے تو دعا کی: ''اے اللہ میں آسمان پر جنت میں تھا تو وہاں فرشتوں کی مسجد تھی، یہاں زمین پر کچھ بھی نہیں کیا کروں''؟اس پر اللہ نے فرشتوں کو بھیجا جنہوں نے بیت المعمور کے سمتِ قدم پر کعبہ تعمیر کیا۔طوفان نوح کے بعد اس کے آثار باقی نہ رہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے کعبے کا مقام تلاش کیا اور وہاں پرانے پائے پر مکرر بیت اللہ کی تعمیر کی اور حج کا ادارہ قائم کیا۔اور یہ اب تک چلا آرہا ہے۔بائبل کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام جہاں بھی جاتے ،ایک بیت اوّل (یعنی بیت اللہ) تعمیر فرماتے۔ان کی بنائی ہوئی دوسری عبادت گاہوں کا تو اب نام ونشان نہ رہا،صرف مکہ معظمہ کے میدانِ بکہ کا کعبہ بفضلہٖ برقرار ہے۔

عبادت کے طریقے:

اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت غالباً وحی کی تعلیم کے ذریعے سے انسانوں میں دوطرح سے بہترین سمجھی جاتی ہے:ایک تو سربسجود ہو جانا (اور اسی لیے اس سے مختص مقام

کو مسجد کا نام دیا جاتا ہے) دوسرا طریقہ بیت اللہ کا طواف کرنا ہے۔ اس کے بہت عمیق رمزی معنے ہیں۔ اللہ تو ماورائے زمان و مکان ہے۔ اس کی کُرسی (یعنی موضع قدمَین، پاؤں رکھنے کا مقام) ہی آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسیع ہے۔ ایسا خدا کعبے کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں کیسے رہ سکتا ہے؟ اس گتھی کو قرآن اور حدیث نے خود ہی حل کر دیا ہے۔ اللہ بادشاہ (الملکِ القدوس) ہے۔ وہ عرش مجید (تخت) کا مالک ہے۔ اس بادشاہ کے پاس فوجیں اور خزانے اور ایک وسیع ملک ہے (لِلّٰه جنودِ السمٰوٰت والارض۔ لِلّٰه خزائن السمٰوٰت والارض ۔ لِلّٰه مُلکُ السمٰوٰت والارض)۔ ملک میں پایہ تخت ہونا چاہیے (اُم القرٰی، شہروں کی ماں، میٹروپولیٹن، شہر مکہ کے ناموں میں سے ایک ہے)۔ جب ملک میں بادشاہ ہو تو اس کو اطاعت کا اطمینان دلانے کے لیے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنی ہوتی ہے (کم سے کم پانچ صحابیوں کی روایت کردہ ایک متواتر حدیث ہے کہ الحجرالاسود یمین الله فی الارض، یعنی کعبے کا حجراسود زمین پر اللہ کا دایاں ہاتھ ہے اور حاجی جب اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے تو اسے استلام یا بیعت ہی کا نام دیا جاتا ہے)۔ جب بادشاہ کو کسی رعیت کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا اطمینان ہو جاتا ہے تو سب سے بڑا اعزاز جو اسے دیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس شخص کو اپنے محل کی حفاظت کا کام سپرد کرے۔ (کیونکہ بادشاہ کی گویا جان و مال اس سنتری، اس پہرہ دار پر منحصر ہو جاتی ہے اور پہرہ دار قصرِ شاہی کے اطراف مسلسل گھومتا رہتا ہے)۔

غرض سربسجود ہونا، یا طواف میں لگے رہنا، یہ ہیں عبادت کے دو بہترین طریقے اور کعبے کے سامنے ہم دونوں طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ سارے وفادار بہ یک وقت سنتری کا کام نہیں کرتے، بلکہ باری باری سے طواف ختم کر کے نماز، نماز ختم کر کے طواف میں لگتے ہیں تاکہ سب کو موقع ملے۔ شاید اسی لیے کعبے کا نام قرآن میں المسجد الحرام بھی ہے اور بیت بھی ہے۔

قبل اسلام کی چند اور مسجدیں:

قرآن مجید میں سورۃ کہف میں ذکر ہے کہ جب ان باایمان لوگوں کے مقام کا پتا

Marfat.com

چلا تو اس زمانے کے لوگوں نے وہاں ایک مسجد بنائی۔ اس کا زمانہ تو معلوم نہیں، بہ ظاہر یہودیوں سے بھی قبل کا ذکر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب یہودیوں کو بابل اور روما والوں نے ملک بدر کیا تو قرآن میں سورۃ اسراء میں پیشگوئی ہے کہ وہ مسجد میں دوبارہ داخل ہوں گے جیسا کہ پہلی دفعہ داخل ہوئے تھے۔''

سورۃ حج میں، صوامع وبیع وَصَلوَاتُ ومَساجدُ کا ذکر ہے کہ ان میں اللہ کا خوب نام لیا جاتا ہے۔

المسجد الاقصیٰ:

سورۃ اسراء میں معراج کا ذکر ہے:''سبحان الذی أسرٰی بعبده لَیلاً من المسجد الحرام اِلی المسجد الاقصا'' (یعنی پاکی ہے اس ذات تعالیٰ کے لیے جس نے اپنے بندے صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت المسجد الحرام سے المسجد الاقصیٰ کا سفر کرایا) المسجد الاقصیٰ کے لفظی معنے ہیں بہت دور کی مسجد۔ جس شخص صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتوں آسمانوں سے بھی پرے، سدرۃ منتہیٰ سے بھی ماوراء، مقام قابَ قوسَین تک پہنچایا گیا ہو تو اسے جزیرہ نمائے عرب کے ہمسایہ اور قریب ترین ملک یعنی بیت المقدس کی (جسے قرآن ہی نے سورۂ روم میں اَدنی الارض قریب ترین سرزمین کا نام دیا ہے) عبادت گاہ تک لیجانے کا ذکر کرنا معقول نہیں معلوم ہوتا ہے ان علماء کا خیال ہی درست معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ المسجد الاقصیٰ سے مراد قرآن مجید میں البیت المعمور یعنی فرشتوں کی مسجد ہے جو عرش بریں کے عین نیچے پائی جاتی ہے۔

اس پر بعض لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ صحیح بخاری وصحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے کہ''سواریوں کو (سفر کے لیے) کسا نہ جائے بجز مسجد حرام (مکہ)، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ) اور مسجد الاقصیٰ (بیت المقدس) کے'' حدیث صحیح ہے لیکن اس سے ثابت کچھ بھی نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو اس حدیث میں مسجد الاقصیٰ کا ذکر (بخاری میں) ہے اور قرآن میں المسجد الاقصیٰ ہے۔ دونوں ایک نہیں۔ مسجد الاقصیٰ

Marfat.com

مضاف، مضاف الیہ ہیں اور المسجد الاقصیٰ صفت، موصوف۔ دوسرے بخاری کے ہاں مسجد الاقصیٰ کا لفظ ہے لیکن بخاری کے استاد ابوالیمان کی کتاب میں، نیز صحیح مسلم میں اس کی جگہ مسجد ایلیاً کا ذکر ہے۔ بیت المقدس کو اسلام سے پہلے ایلیا کہتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں ہرقل سے سفیر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات بھی ایلیا میں بیان ہوئی ہے۔ جب عبدالملک بن مروان نے خلافت بنی اُمیہ میں وہاں قبۃ الصخرہ کی عمارت تعمیر کی تو اس نے اسے مسجد الاقصیٰ کا نام دیا۔ قصہ تکلیف دہ ہے یعنی جب یزید کی وفات ہوئی تو عبداللہ بن زبیر نے مکہ معظمہ میں اپنی خلافت کا دعویٰ کیا۔ پھر جب عبدالملک کی فوجیں ان سے لڑنے کے لیے مکہ آئیں تو ایک سال ایسا ہی گزرا کہ اُموی فوج حج کے لیے منا اور عرفات پر فارغ ہونے پر مجبور ہوئی (طواف اور سعی کے لیے مکہ نہ جا سکی) اور زبیری لوگ یعنی ساکنین مکہ حج پر صرف طواف اور سعی کر سکے، منا اور عرفات نہ جا سکے۔ اس وقت شامیوں کی تسلی اور دلدہی کے لیے عبدالملک نے مسجد الاقصیٰ تعمیر کرائی اور اس کا حج شروع کرایا (جیسا کہ ابن کثیر نے تفصیل سے بیان کیا ہے) ان حالات میں سورۃ اِسراء میں بیت المقدس کی مسجد کا ذکر ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ معراج کے اختتام پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر واپس آئے تو سارے پرانے انبیاء کی روحوں نے حضور کا بیت المقدس میں استقبال کیا اور مبارکباد دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

عہد اسلام کی ابتدائی مسجدیں:

کعبے کو چھوڑ کر ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الارقم میں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ مگر یہ سکونتی مکان تھا، مسجد نہیں۔ اولین مسجد مکے میں حضرت عمار بن یاسر نے تعمیر کی جیسا کہ ابن ہشام، ابن کثیر، بلاذری وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ یمنی تھے۔ کفار قریش نے ان کو کعبہ کے سامنے نماز سے روک دیا تو انہوں نے اپنے گھر میں ایک مسجد بنائی۔

دوسری مسجد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ جب یہ حبشہ کو ہجرت کے

لیے روانہ ہوئے اور راستے سے اپنے سسرال والوں کے کہنے پر مکہ واپس آئے تو قریش کی اذیت کے باعث انہوں نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں ایک مسجد بنائی اور وہ وہاں تجوید سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ اس کو سننے کے لیے اور تو اور ابوجہل بھی رات کو چھپ کر آیا کرتا تھا۔

ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں بھی کئی مسجدیں بن گئیں ۔ وجہ ظاہر ہے۔ بیعت ہائے عقبہ میں جب انصار نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے فوراً نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اس کے لیے مدینے میں مسجدوں کی ضرورت تھی۔ اتنی ہی مسجدیں ہوں گی جتنے قبیلے تھے (ممکن ہے بارہ مسجدیں ہوں کیونکہ بارہ نقیب نامزد ہوئے تھے) مگر صراحت دو کی ملتی ہے:

جب بیعت عقبہ میں رافع بن مالک الزرقی (انصاری) مسلمان ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا ایک کامل نسخہ تحفہ دیا۔ مدینہ لا کر وہ اس کی مسجد بنی زریق میں بہ آواز بلند تلاوت کیا کرتے تھے۔ دنیا میں تلاوت کا آغاز انہیں سے ہوا جیسا کہ سمہودی نے ذکر کیا ہے۔

مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی نئی مسجد نہ تھی بلکہ بنی النجار کے حضرت اسعد بن زُرارہ کی مسجد تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا چھوڑ کر مدینہ آئے تو اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ یہ کافی نہ ہونے لگی تو اسی کی توسیع کی گئی۔ یہی بعد میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہلانے لگی۔ (ایضاً سمہودی)

ہجرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے قبا پہنچے اور وہاں فوراً ایک مسجد تعمیر فرمائی۔ اس کا تعریفی ذکر قرآن میں سورۃ توبہ میں لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ علی التقویٰ کہہ کر آیا ہے ۔ وہیں بدمعاش منافقوں کی بنائی اور تیار کی ہوئی مسجد ضرار کا بھی ذکر ہے جو سازش گاہ تھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جلوا دیا۔

بہ ظاہر ۱ھ کا واقعہ ہے جو ابن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ مدینے میں قبیلہ جہینہ کے مہاجرین کے محلے میں پہلی مسجد بنائی گئی۔ جمعہ کی نماز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے پہلے جُواثا میں پڑھی گئی۔ یہ مشرقی عرب میں ریاض اور ظہران کے مابین

شہر ہفوف میں ہے اور حالیہ کھدائیوں میں پرانی مسجد برآمد ہوگئی ہے۔ اس بابرکت مقام کی زیارت کا اس گناہگار کو بھی موقع ملا ہے۔

(سیارہ ڈائجسٹ - لاہور - چودہ صدیاں نمبر)

۱۹۸۱ء

فروری - مارچ

Marfat.com

الاخبار الطّوال
از
دینوری

دینوری کی الاخبار الطوال پہلی بار ۱۸۸۸ء میں لایدن (ھالینڈ) سے شائع ہوئی تھی۔ ایڈٹ کنندہ روسی مستشرق ڈبلیو۔ گسر گاس نے اثنائے طباعت میں ۲۶ فروری ۱۸۸۷ء کو وفات پائی۔ اس لیے کتاب کا ابجدی اشاریہ اور ناشر کا مقدمہ ایک دوسرے روسی مستشرق اِغناطیوس کراچ کوفسکی نے ۱۹۱۲ء میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں لایدن ہی میں چھپوایا۔ یہ مقدمہ فرانسیسی میں ہے اور صفحہ ۷ تا ۵۶ پر مشتمل ہے۔

گسر گاس کا اڈیشن دو مخطوطوں پر مبنی تھا۔ ایک سینٹ پیٹرز برگ (حال: لینن گراڈ، روس) میں ہے، اور دوسرا جو مدینۂ منورہ کے کسی محمد امین نے فروخت کیا۔ لایدن یونیورسٹی میں (لانڈ برگ نمبر ۲۳۰ پر) ہے۔ مگر کتاب چھپ جانے کے بعد لایدن یونیورسٹی میں ایک تیسرا نسخہ (نمبر ۲۴۳۶/۴۹۹۳) دستیاب ہوا جو ہندوستان (؟) سے آیا تھا۔ اسی لیے کراچ کوفسکی نے مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کر کے اختلافات روایت کی ایک جدول بھی شائع کی ہے جو صفحہ ۵۷ سے ۹۴ تک کی گئی ہے اور ستارے کی علامت لگا کر ان اختلافات کو نمایاں کیا ہے جو اس کی رائے میں اہم ہیں اور حسبہ مطبوعہ نسخے کی اصلاح کی جانی چاہیے۔ اہم غلطیوں کا یہ انتخاب یہاں شامل کیا جاتا ہے تاکہ اگر کبھی کسی کو ولایتی اڈیشن دیکھنے کا موقع ملے تو اس جدول سے استفادہ کر سکے۔

ابھی حال میں ایک چوتھا مخطوطہ دستیاب ہوا ہے۔ چنانچہ مجلۃ معھد المخطوطات العربیہ، قاھرہ، جلد اول حصہ دوم ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) صفحہ ۱۹۱ کتاب نمبر ۸ پر لکھا ہے کہ

Marfat.com

سوھاج (جنوبی مصر) کے کتب خانہ بلدیہ میں الاخبار الطوال کا ایک مخطوطہ ہے جو ۵۷۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ خدا کرے اردو مترجم نے اس سے استفادہ کیا ہو کہ یہ قدیم ترین نسخہ ہے اور مصر سے فوٹو حاصل کرنا سفارتی ذرائع سے اب بہت آسان ہے۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ کوئی پندرہ سال قبل ایک ضرورت سے میں نے اس فرانسیسی مقدمے کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کی قسمت جاگی تو اب اس کی طباعت کا غیب سے سامان ہوا ہے۔ مگر اس فرانسیسی مقدمے کے ابتدائی تیرہ مطبوعہ صفحوں کا ترجمہ کرنے کی جگہ یہاں صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے کیونکہ پہلے تین صفحوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن کن لوگوں نے اس کو شائع کرنے کی کوشش کی، اور کیوں اس میں تعویق پر تعویق ہوتی گئی۔ اس کے بعد کے دس صفحوں میں مخطوطۂ مدینہ اور مخطوطۂ ہندوستان کی صورتِ حال تفصیل سے بتائی گئی ہے پھر اس کے بعد دینوری کے حالات اور اس کی مختلف تالیفوں پر تبصرہ ہے۔ اس حصے کا کامل ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

آخر میں ایک ضمیمے میں کراچکوفسکی کے معلومات کی تکمیل، اور بعض بیانات کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ماحضر و ماتیسّر ہے "وفوق کل ذی علمٍ علیم"۔

Marfat.com

جدول اختلافات

(لایدن کے ہندوستان والے مخطوطے کے مندرجہ ذیل اختلافات مطبوعہ نسخے کی عبارت پر قابل ترجیح ہیں۔)

صفحہ	سطر	بہتر عبارت
۶	۷	ونشرہ بمنشار
۱۹	c/۶	والبحران
۳۰	۱۷	"النجدۃ" کو "تبع الا قران" کے بعد لکھا جائے
۴۰	۷	یومئذ
۶۵	۱۱	بجیش
۷۰	۱۲	اوغل
۷۴	۱۸	بوتر بھما
۸۰	۱۲	الحروث
۸۱	۱۵	اوغل
۸۴	۷	بینھما
۸۸	d/۱۶	واتخذ
۸۹	۱۲	علیہ
۹۲	c/۵	صیتہ
۹۹	۱۳	لجمع
۱۰۰	۱۷	الذی کان مجلس فیہ
۱۰۱	۷	واقف
۱۰۲	b/۱۶	عظم

Marfat.com

صفحہ	سطر	بہتر عبارت
۱۰۴	a/۳	لتقتله
۱۰۴	۱۱	ودخل أصحاب بهرام عليه
۱۲۵	۱۱	أحدثوا
۱۲۶	b/۱۶	وأراد
۱۲۷	۱۲	ضنكته
۱۳۰	۲	وأوقفوهم
۱۳۹	۶	موسى وأصحابه
۱۴۰	۶	نفسه فيهم
۱۴۱	۱	اوغل
۱۴۹	۲	اوغل
۱۵۵	e/۱۱	للطبی ء
۱۶۱	۱۷	لا اعفيك منه
۱۶۹	۲	وكتبا
۱۷۰	a/۲۱	سی
۱۷۶	۱۴	وكان اول
۱۷۸	۵	يختلجان
۱۸۵	۱۳	للهبيرة
۱۹۹	۱۳	لو
۲۰۷	b/۶	تكتب
۲۲۵	۱۸	منكم رجالا صالحين
۲۲۶	d/۱۰	"و" حذف کیا جائے
۲۳۹	۲۱	ليس له في نفسه

Marfat.com

صفحہ	سطر	بہتر عبارت
۲۵۵	۱۸/c	فأدركب
۲۵۹	۱۵	فليقُم
۲۶۰	۲۰	ونستقبل القوم
۲۶۳	۳	اذا
۲۶۴	۱۷	فأمر
۲۷۹	۶/a	بيساسک
۲۸۱	۲۲	من رأى
۲۸۶	۲	عن مكانه
۳۱۰	۱۸	ارتكبتم
۳۳۲	۲	شرطته
۳۴۵	۲۱	ومالهشام
۳۴۷	۵	شرطته
۳۵۳	۶/a	رکب
۳۵۴	۱۷	يوم
۳۵۹	۱۹	يا محمد
۳۶۰	۱۱/c	غيبُ
۳۷۰	۲	مستهنيم
۳۸۲	۱۲	دبويع له
۳۸۷	۵	ادغل
۴۰۱	۹-۱۰	وحسبک أنت ايضا يا أبا عبدالله

پیش لفظ

(از اغناطیوس کراچ کوفسکی)

تمہید:

"کتابوں کی بھی اپنی اپنی قسمتیں ہوتی ہیں" (Habent sua fata libelli) لاطینی شاعر کا یہ مقولہ ہماری کتاب پر بھی صادق آتا ہے۔ ۱۸۷۷ء تک اس کا نام پڑھنے میں آتا تھا۔ سال مذکور میں بیرن (نواب) روزن (Rosen) نے لینن گراڈ کے مخطوطات کی فہرست شائع کی تو اس کے صفحہ ۱۴ تا ۱۷ پر اس کی تفصیل تھی۔ اس سے کئی علماء نے طباعت سے قبل بھی استفادہ کیا، خاص کر نویلڈیکے Noeldeke نے اپنی جرمن تالیف "ساسانی دور کے ایرانیوں اور عربوں کی تاریخ" میں روزن اسے خود ایڈٹ کرنا چاہتا تھا۔ پھر مصروفیتوں کے باعث اپنے رفیق پروفیسر گسر گاس سے یہ خواہش کی۔ اس اثنا میں لایدن میں محمد امین کا مخطوطۂ مدینہ پہنچ گیا جو قدیم تر اور بہتر تھا۔ اس کے باعث ایڈٹ کرنے کا کام آسان تر ہو گیا۔ مگر کتاب ابھی مطبع میں تھی کہ گسر گاس کا انتقال ہو گیا اور کتاب بغیر مقدمے اور بغیر اشاریے کے شائع کر دی گئی۔ اب سال ہا سال کے بعد لایدن کے ناشر نے مجھ سے خواہش کی ہے تو میں خوشی سے اس کی تکمیل کر رہا ہوں۔

مخطوطے:

مخطوطۂ پیٹرس بورگ (۱۰ تا ۱۹) کی (جو پہلے اطالنسکی (Italinsky) کے ذخیرے میں تھا) نواب روزن نے اچھی عالمانہ وصف نگاری کر دی ہے (دیکھیے فہرست مخطوطات لینن گراڈ، صفحہ ۱۴ تا ۱۷) اب اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

Marfat.com

لایدن کا مخطوطۂ مدینہ قدیم تر ہے۔ ۲۵۰ ورق، ۱۶×۵ . ۲۳ سم، ۱۴ سطریں، نسخہ ناقص تھا، بعد میں کسی نے اس کی تکمیل کی ہے اور آغاز، اختتام اور اوراق ۲، ۱۰، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰ جدید الخط ہیں۔ تکمیل کنندہ نے اپنا نام السید عبداللہ احمد بن عز الدین الناشری بتایا اور تاریخ کتابت بدھ کی رات ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۳۹ھ لکھی ہے لیکن اصل مخطوطہ یقیناً قدیم تر ہے اور اتفاق سے ورق ۴۷/ الف کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

فرغ من نسخه في خمسة عشر يوما آخرها يوم الأحد مستهل صفر سنة ٦٥٥۔

اس سے پندرہ دن میں فراغت ہوئی یعنی اتوار یکم صفر ۶۵۵ھ کو تصحیح یہ مخطوطے کے کاتب ہی کے قلم سے معلوم ہوتا ہے۔ حاشیے پر جا بجا تصحیحیں بھی ہیں اور طویل نوٹ بھی جو محمد بن جعفر بن محمد بن عبداللہ بن بدر نے لکھے ہیں جو غالی شیعی معلوم ہوتا ہے۔

(یہاں تین صفحوں میں یہ عربی عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں) مخطوطے کے آغاز میں یاقوت اور ذہبی نے دینوری کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان کا خلاصہ بھی درج ہے۔

لایدن کا مخطوطہ ہندستان: ۲۱۹ ورق، ۲۱×۱۵ سم، ۲۱ سطریں شروع میں، ۱۹ آخر میں۔ بابوں کے عنوان حاشیے پر ہیں۔ حضر موت والے کاتب نے نقل میں سہل انگاری کی ہے۔ تاریخ کتابت آخر میں یوں ہے:

تم الكتاب والحمد لله رب العالمين وصلى الله علىٰ سيدنا محمد و على آله الطاهرين وسلم تسليما وفرغ من تعليقه كاتبه أفقر عباد الله عالي لطفه وعطفه محمد بن عبدالرحيم الجابرى عفاالله عنه بالبلد لحانوس المحروس بالله تعالىٰ الشحر من أرض الأحقاف يوم الخميس في عشر من شهر الله الاصم الاصب رجب من سنة الالف احسن الله تقضيها من الهجرة النبوية على صاحبها

Marfat.com

أفضل الصلاة والسلام حامد الله تعالیٰ علی نعمه
ومصليا على نبيه محمد وعلى آله و مسلما کتاب
تمام ہوگئی، خدا کا شکر اور رسول اللہ پر درود وسلام اسے محمد بن
عبدالرحیم الجابری نے علاقۂ احقاف کے شہر شحر میں جمعرات، ۱۰
رجب ۱۰۰۰ھ کو خدا یہ سال خیر وخوبی سے پورا کرے۔ لکھا،
تعریف اللہ کے لیے اور درود وسلام اس کے نبی پر۔

پروفیسر دخویے De Goejeny نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو نواب روزن کو ایک خط جرمن میں لکھا ہے: ''......میں نے یہ نسخہ ہندستان میں خرید کیا......'' مخطوطے پر مختلف مالکوں کے نام ہیں۔ ایک یوں ہے:

احمد بن جعفر افندی الرومی الحنفی الواعظ المدرس بالمسجد الحرام و
بالحرم الشریف المکی عام ۱۰۲۱ ایک اور یوں ہے:

ثم فی ملك عبدالله امير المومنين اسماعيل بن
امير المؤمنين رضوان الله عليه [1]

اس نسخے کے آخر کی عبارت اور لینن گراڈ کا اختتام یہاں متوازی پیش کیے جاتے ہیں:

مخطوطہ لینن گراڈ	مخطوطہ ہندستان
نقلت هذه النسخة من نسخة	ونقلت هذه النسخة من نسخة
نقلت من نسخة قديمة الخط	جيسدة قديمة الخط
– هو بهو –	وقد كتب كاتبه فى آخر ها بخطه
	وهو من الائة المعتبرين

---

[1] یہ غالباً یمن کے زیدی حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ انسائکلو پیڈیا آف اسلام ''زیدیہ'' میں اس کے بیٹے کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں حکمران تھا۔

Marfat.com

مخطوطہ ہندستان	مخطوطہ لینن گراڈ
ومن ترجم [۱] له جمع، من	بلغ من تعليقه
المؤرخين مالفظه: فرغ من تعليقه	
بالجانب الغربي من بغداد الفقيرالى	
رحمة الله تعالىٰ عمر بن أحمد بن	الفقيرالى الله تعالىٰ
هبة الله بن محمد بن أبي جرادة في	- (ہوبہو) -
خمسة عشريوما آخرها يوم الأحد	- (ہوبہو) -
مستهل صفر من سنة خمس و	- (ہوبہو) -
خمسين وستمائة حامد الله تعالىٰ	سيدنا و على آله وصحبه
على نعمه ومصليا على نبيه محمد و	وسلم [پھر یہ ہے کہ وہ ۱۰۶۱ھ میں نقل ہوا]
على آله و مسلما۔ انتهى۔	

مخطوطہ ہندستان کی پہلی ہی سطر میں اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ اس پرانے نسخے کی نقل ہے جو کیم صفر ۶۵۵ھ کو ختم ہوا تھا۔ یاد ہوگا کہ مخطوطہ مدینہ پر یہی تاریخ درج ہے۔ مخطوطہ مدینہ کا آخری حصہ ضائع ہو جانے سے کاتب کا نام وہاں غیر موجود تھا اور یہاں وہ نام بھی معلوم ہو جاتا ہے اور نسخہ لینن گراڈ یہ کہتا ہے کہ وہ ۶۵۵ کے نسخے سے نقل شدہ نسخے کی نقل ہے۔

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ مخطوطۂ مدینہ سے مخطوطۂ ہندستان نقل ہوا۔ پھر نسخۂ ہندستان سے مخطوطۂ لینن گراڈ نقل ہوا اور بڑی عجیب بات ہے کہ منقول اور منقول عنہ یہ تینوں نسخے ہمارے سامنے ہیں۔ [۲]

لایدن کا مخطوطۂ مدینہ عمر بن احمد کا نقل کردہ ہے۔ یہ شخص کمال الدین ابن العدیم

---

۱ دیکھو مخطوطے کا ورق ۲۱۸/ب، نیز الاخبار الطوال کا ولایتی اڈیشن، صفحہ ۲، نوٹ ۵ (مترجم)

۲ یاد رہے کہ سوہاج (مصر) کا جدید دستیاب شدہ نسخہ ان سب سے قدیم اور ۵۷۹ھ کا لکھا ہوا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ (مترجم)

Marfat.com

کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ الکتبی کی فوات الوفیات (طبع مصر ۱۲۸۳، ج ۲ ص ۱۲۶ و مابعد) کے مطابق وہ مشہور خطاط بھی تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی اور کتاب کہیں موجود ہو۔ اگر وہ مل جائے تو اس نسخے کے خط سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ لینن گراڈ میں مرقعات میں کمال الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو وصلی ہے، وہ ابن العدیم کی نہیں کسی اور کمال الدین کی ہرات میں لکھی ہوئی ہے۔ (دیکھو ڈورن (Dorn) کی روسی فہرست مخطوطات و منقوشات چوبی نمبر ۱۴۷ مطبوعہ لینن گراڈ ۱۸۵۴ء)۔

ابوحنیفہ اور اس کا علمی کارنامہ

عربی ماخذوں میں ابوحنیفہ دینوری (۲۰) کے سوانح حیات بہت ہی کم مایہ ہیں۔ ۱ے اور یہی رائے یوروپی متلاشیوں کے ان بیانات پر بھی صادق آتی ہے جو ان (عربی) ماخذوں پر مبنی ہیں ۲ے۔ اس کا نام ابو حنیفہ احمد بن داود بن ونند

۱ے اہم معلومات فہرست ابن الندیم معجم الادبا یاقوت اور کشف الظنون حاجی خلیفہ کے ہاں ہیں۔ اوروں کی اہمیت کم ہے۔ (دیکھو ہمارا ضمیمہ (مترجم))

۲ے وہ یہ ہیں:

1. Silvestre de Sacy, Relation de 1, Egypte, P. 47, 64, 78.

سلویستر دساسی کی فرانسیسی "تاریخ مصر"

2. F. Wuestenfeld, Geschichte der arabischen Aerzte, Goettingen, 1840, P. 38, N 92.

وستن فلڈ کی جرمن "تاریخ اطبا عرب"

3. F. Wuestenfeld, Die Geschichtschreiber der Araber und iher Werke, Goettingen, 1882. P 27, N 79.

وستنفلڈ کی جرمن "عرب مورخین اور ان کی تالیفیں"

4. Ernst H.F. Meyer, Geschichte der Botaik, III, 163 - 167, Koenigsberg, 1856

مایر کی جرمن "تاریخ نباتیات"

5. G.Fluegel Die grammatischen Schulen der Araber, Leipzig 1862, P. 190ff.

فیلوگل کی جرمن "عربوں کے مکتب ہائے نحو"

6. J. Von Hamme, Lateraturgeshichte der Araber IV, 144.

فون حامر کی جرمن "تاریخ ادبیات عربی" (☆)

Marfat.com

الدینوری ۱؎ تھا۔ اس نسبت کے صحیح تلفظ کے بارے میں اب تک اختلاف پایا

7. L. Leclerc, Histoire de la medecine arabe, Paris 1876, I, 298. (☆)

لیکرکی فرانسیسی ''تاریخ طب عربی''

8. H. Derenbourg, in : Revue Critique, 1888, XXVI, 61 - 64.

ڈیرن بورگ کا مقالہ فرانسیسی رسالہ ''مجلہ تنقید'' میں

9. T - n (=A. Mueller) in : Leterarisches Centralblatt, 1889, P. 613 - 614.

میولر کا مضمون جرمن رسالہ ''ادبی مرکزی صحیفہ'' میں

10. Haeser, Geschichte der Medizin I, 558, Jena 1875.

هیزر کی جرمن ''تاریخ طب''

11. N. Miednikoff, Palestina (in Russian), 11, 91, St Petersburg 1897.

میدنیکوف کی روسی کتاب ''فلسطین''

12. H. Suter, Die Mathematiker und Astronomen Der Araber und ihre Werke, Leipzig 1900, P. 31, N. 60.

سوتر کی جرمن ''عرب ریاضیات وهیئت داں اور ان کی تالیفیں''

13. C. Brockelmann, Geschichte der arabischen Literatur, I, 123 Weimar 1898.

بروکلمان کی جرمن تاریخ ادبیات عربی'' اس کا ضمیمہ اور نیا اڈیشن بعد میں نکلے (مترجم)

14. Cl. Huart, Litterature arabe, Paris 1902, P. 154.

هیوار کی فرانسیسی کتاب ''عربی ادبیات''

15. B. Silberberg, Das Pflanzenbuch des Abu Hanifa Ahmad ibn Daud ad Dinawari in: Zeitschrift fuer Assyriologie, 1910, XXIV, 225, 265; 1911, XXV, 39 - 88.

ز۔لبر برگ کا جرمن مقالہ ''ابوحنیفہ احمد بن داود الدینوری کی کتاب النبات'' جو اشترا سبورگ کے جرمن رسالے ''مجلہ اشوریات'' ج ۲۴ تا ۲۵ میں دو قسطوں میں چھپا ہے اور بہت اہم چیز ہے۔

ہم ان کا اور بعض دیگر مولفین کا جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا۔ آئندہ کئی بار ذکر کریں گے۔

۱؎ ابن الأنباری کی ''نزھۃ الالباء، طبع قاھرہ ۱۲۹۴، ص ۳۰۵ میں اس کا نام ابوحنیفہ احمد بن السکیت چھپا ہے۔ یہ یا تو کاتب کی یا مطبع کی غلطی ہے۔ یاقوت کی معجم الادباء، شائع کردہ مارگولیوث، ج ۱، ص ۱۲۳ کو دیکھیے تو نزھۃ الألباء کی عبارت میں ایک سطر چھوٹی ہوئی ☆

Marfat.com

جاتا ہے۔ عام طور پر اسے دینوری پڑھتے ہیں۔ لیکن اکثر دَینوری بھی ۱؎ بلکہ دینوری (۲۱) یا دینوری بھی ۲؎ اول الذکر صحیح ترین ہے جس کی تائید ابن خلکان سے ہوتی ہے۔۳؎ سے ہوتی ہے۔ ثانی الذکر کی بھی کچھ نہ کچھ اساس ہے کیونکہ اس کی تائید سمعانی ۴؎ سے ہوتی ہے۔ ثالث الذکر کو ترک کر دینا چاہیے گویا وہ محض بے اصل ہے۔ مولف کے دادا کا نام ونسند ۵؎ تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تیسری پشت (یعنی دادا) تک اس کا خاندان خالص ایرانی تھا ۶؎ جیسا کہ اس دور میں عربی ادب میں امتیاز

☆ معلوم ہوتی ہے۔ یاقوت کے ہاں عبارت یوں ہے: أحمد بن داود الدینوری، أخذ عن البصریین والکوفیین وأکثر أخذه عن ابن السکیت۔

۱؎ مثلاً فان فلوٹن کی ولندیزی کتاب in Chorasan Van Vloten De opkomst der Abbasiden خراساں میں عباسیوں کا بول بالا، لایدن ۱۸۹۰ء میں کئی بار، یا برلن کے عربی مخطوطات کی فہرست، ج ۶، ص ۲۲۷، نمبر ۶۱۹۵۰، فہرست نگار کا نام ہے السورٹ (W. Ahlwardt)۔

۲؎ مثلاً دساسی کی کتاب مذکور، ص ۶۴، ۸۷، نمبر ۲۶، لیکر کی کتاب مذکور، ج ۱، ص ۹۸. لانڈ برگ کی فہرست مخطوطات لایدن، ص ۴۷، نمبر ۲۳۰ (سہو قلم سے حیرز کی کتاب بالا، ج ۱، ص ۵۵۸ میں ابو الدینودوری ہے۔ اسی طرح مایر کی کتاب مذکور میں بارہا Abu Hanifadt ہے (مایر نے دال کے زبر سے دینوری لکھا ہے (مترجم)

۳؎ وفیات الاعیان شائع کردہ وستنفلد، نمبر ۲۹۵، ص ۱۱۸، اور نمبر ۳۲۷، ص ۱۶، نیز دیکھو حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، شائع کردہ فلوگل، ج ۷، ص ۶۳۲ (= ج ۱، ص ۵۰۱، س ۷)، نیز ج ۵، ص ۶۵۲ (= ج ۲، ص ۱۰۵، س ۱۵)

۴؎ جیسا کہ ابن خلکان نے حوالہ بالا میں ذکر کیا ہے (سمعانی کی کتاب الانساب بعد میں چھپ گئی ہے (مترجم) اس کے معنی شاید یہ ہیں کہ یہاں فارسی یائے مجہول تھا (= دےنسوری) جو عربی میں غائب ہو گیا۔

۵؎ غالباً اسے یوں Wanand ہی پڑھنا چاہیے۔ یاقوت کی معجم الادباء (ج ۱ ص ۱۲۳، ۱۲۴) میں جسے مارگولیوث نے ایڈٹ کیا، وتسند چھپا ہے۔ اگرچہ دوبار یوں ہی چھپا ہے مگر اسے مطبع کی غلطی سمجھنی چاہیے (مارگولیوث کی غلطی بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟ کتاب کے طبع ثانی میں بھی وتند ہی ہے (مترجم))

۶؎ ونسند یا تو ایک ستارے کا نام ہے یا اس ستارے کے دیوتا کا پارسیوں کی مذہبی کتابوں میں ☆

Marfat.com

حاصل کرنے والے مولفوں کی اکثریت کا حال ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دینوری کی نسبت ابو حنیفہ ہی نہیں بلکہ اس کے آباواجداد کی طرف بھی کی جاتی ہو۔ بظاہر وہ دینور میں پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شہر میں گزرا۔ اور اس کی ملاقات اپنے ہم عصر مشہور لغوی المبرد سے وہیں ہوئی تھی۔ [1] وہاں سالہا سال تک وہ رصد و نجوم میں مشغول رہا۔ ۳۳۵ھ (۹۴۶ء) میں منجم عبدالرحمٰن الصوفی نے وہاں وہ مکان دیکھا تھا جو دینوری کے لیے رصدگاہ کا کام دیتا تھا۔ [2] فطرۃً اس کا علمی کام اس کے مسقط الراس ہی تک (۲۲) محدود نہ رہا۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان اہلِ علم کی طرح اس نے بھی اپنی جوانی سفروں میں گزاری۔ وہ عرب تمدن کے عراقی مرکز کو گیا تھا۔ یہاں اس نے بصرہ اور کوفہ ہر دو مکتبوں کے نمائندوں سے یکساں ذوق و شوق سے علم حاصل کیا اور خاص طور پر لغوی السکیت اور اس کے ممتاز بیٹے ابن السکیت [3] سے۔ کہتے ہیں کہ اس کے اساتذہ بھی وہی تھے جو اس کے ہمعصر ابو علی حسن الاصفہانی کے تھے۔ [4] اس کے ساتھ

☆ یہ نام خاصی کثرت سے آتا ہے (دیکھو مثلاً بسنشد ھیش کا انگریزی ترجمہ از ویسٹ (E.West) آکسفرڈ ۱۸۸۰ء باب دوم آیت ۷، باب ہفتم آیت ۱ وغیرہ یہ آدمیوں کا بھی نام ہے اور ہندی سیتھی (Indo-Scythian) بادشاہوں کے سکوں پر وہ یونانی میں Daninda کی شکل میں ملتا ہے (دیکھو جرمن کتاب ایرانی لسانیات کا خلاصہ Grundriss der iranischen Philologie طبع اشترا سبورک ج ۲، ص ۷۵)

[1] ابن فورجہ (صحیح: فرجہ مترجم) شارح المتنبی کا بیان جو یاقوت کی کتاب بالا میں ص ۱۲۶ پر نقل ہوا ہے؟ نیز دیکھو (عبدالقادر البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۱۱ و مابعد۔

[2] عبدالرحمٰن الصوفی کی کتاب صورالکواکب، شائع کردہ Caussin در رسالہ "NOtices et Extraits" ج ۱۲، ص ۲۶۲، اسی کتاب کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شیئل روپ نے بھی شائع کیا (دیکھو Schjellrup., Description des etoiles fixes St-Petersburg 1874, P. 33) (اس کتاب کو اب حیدر آباد میں دائرۃ المعارف نے بہت عمدہ طور پر چھاپ دیا ہے۔ دیکھو، ص ۷ تا ۸ (مترجم) نیز لکیر کی مذکورہ تاریخ طب، ج ۱، ص ۳۰۰، ۳۱۹۔

[3] الفہرست نشرہ فلوگل، ص ۷۸، س ۱۰ تا ۱۱، یاقوت نشرۃ مارگولیوث، ج ۱، ص ۱۲۳، سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، طبع مصر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۳۲ (البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۵۔

[4] الفہرست، ص ۸۱، س ۶، اور خاص کر یاقوت کی معجم الادباء ج ۳، ص ۸۲، س ۱ تا ۲۔

Marfat.com

آئندہ ابوحنیفہ نے علمی مناظرے شروع کیے جن کے اثار ابوحنیفہ کی ایک کتاب میں باقی ہیں ۱؎ مذکورہ اساتذہ کے علاوہ بظاہر اس کے اور بھی استاد تھے۔ کہتے ہیں کہ الفراء کی روایت اس تک ابوعبداللہ الطوال کے واسطے سے پہنچی ۲؎، مگر جس نے خود کوئی کتاب نہیں چھوڑی ہے۔ ۳؎ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ روایت زبانی ہوئی تھی۔ اس کا سفر عراق سے باہر تک بھی ہونے کا پتا چلتا ہے کہ کتاب النبات میں وہ مدینے کے مضافات کا بطور خاص ذکر کرتا ہے۔ نیز حرمین کا علی العموم۔ ۴؎ ان علاقوں میں اس کا طویل قیام محض حج کے اغراض کے لیے نہیں ہوا ہوگا۔ ۵؎ عُمان اور خلیج فارس کے ساحل کے حوالے ۶؎ اس کا ایک مزید ثبوت ہیں۔ اگرچہ اکثر یوروپی مولف ۷؎ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۲۳۵ھ، (۸۵۰ء) کے لگ بھگ وہ اصفہان میں تھا اور رصد و نجوم میں مشغول تھا۔ لیکن اس روایت کے قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا واحد ماخذ حاجی خلیفہ کا بیان ہے جو دینوری کی طرف منسوب (۲۳) ایک کتاب کے سلسلے میں ہے مگر جو یقیناً اس کی تالیف نہیں ہے۔ جب ہم اس کی نجومیاتی تالیفوں کا ذکر کریں گے تو اس سے بھی بحث کریں گے۔

۱؎ یاقوت، ج ۳، ص ۸۳، س ۶ تا ۷ نیز آگے ابوحنیفہ کی تالیفوں کی فہرست میں نمبر (۹)

۲؎ الفہرست، ص ۶۶، آخری سطر

۳؎ ایضاً، ص ۶۸، سطر ۱ تا ۲

۴؎ کتاب النبات الدینوری کی مطبوعہ جلد نیز ان اجزاء میں جو میں نے دیکھے ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ خُمر یعنی المی کے ذکر میں وہ صرف ایک بار کہتا ہے کہ میں نے اس کا درخت "فیما بین المسجدین" دیکھا ہے اور اس سے مکہ و مدینہ مراد لیا جاسکتا ہے۔ اس کے سوا اپنے مشاھدات حرمین کا شاید ہی کہیں ذکر ہو (مترجم)

۵؎ ماری کی کتاب بالا، ص ۱۶۳ (ظاہر ہے کہ اس حوالے میں سوائے قیاس آرائی کے اور کیا مل سکتا ہے (مترجم)

۶؎ لکیر، تالیف بالا، ص ۲۹۹، (اس موضوع پر دیکھو ہمارا ضمیمہ (مترجم))

۷؎ وستنفلد کی جرمن "عرب مورخین" ص ۲۷ نمبر ۴، فلوگل کی جرمن "کتب ھائے نحو" ص ۱۹۲، ڈیرن بورگ کا مقالۂ مذکور، ص ۶۲، زلبر برگ کا مقالۂ مذکور، قسط اول، ص ۲۲۹۔

Marfat.com

ابو حنیفہ کے متعلق جس واحد تاریخ کا ہمیں پتا چلتا ہے وہ اس کی تاریخ وفات ہے مگر اس میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی ۲۸۱ھ کہتا ہے تو کوئی ۲۸۲ھ اور کوئی ۲۹۰ھ۔ یاقوت [۱] نے یہ تینوں تاریخیں بیان کی ہیں اور ہر ایک کا حوالہ بھی۔ یہی حال سیوطی [۲] اور حاجی خلیفہ [۳] کا ہے۔ اکثر مورخ ۲۸۲ھ کی طرف مائل ہیں۔ [۴] مجبوراً اسی کو زیادہ قرینِ صواب سمجھنا پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے حوالے زیادہ یقینی ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ

---

۱ معجم الادباء ج ۱، ص ۱۲۴ [یاقوت نے ایک روایت ۲۸۰ھ کی بھی دی ہے اور ۲۹۰ھ نہیں بلکہ "۲۹۰ھ سے قبل" لکھا ہے۔ ۲۸۲ کی روایت یاقوت نے کتاب النبات کے اس نسخے کی پشت پر لکھی دیکھی جو ابن المسیح کے ہاتھ سے نقل ہوا تھا۔ القفطی کی انباء الرواۃ ج ۱، ص ۴۲ کے مطابق مسیح بن حسین دینوری کا بھانجا ہے۔ (مترجم)

۲ بغیۃ الوعاۃ، ص ۱۳۲

۳ کشف الظنون، نشرہ فلوگل، ج ۳، ص ۶۳، ج ۵، ص ۶۷ نیز ۱۳۰ (۲۸۱)، ج ۲، ص ۱۰۵ نیز ۶۴۴ (۲۸۲) ج ۱، ص ۳۲۹، ج ۲، ص ۳۶۱، ج ۵، ص ۵۴ نیز ۳۰۸ (۲۹۰) زلبر برگ (مقالۂ مذکور ص ۲۳۰) نے غلط لکھا ہے۔ ۲۸۱ھ کا ذکر دو جگہ ہے۔

۴ عبدالقادر بن ابی الوفاء القرشی کی الجواہر المعیئۃ کا اقتباس جو فلوگل نے ابن قطلو بغا کی تاج التراجم کے حاشیے میں ص ۹۵ نمبر ۱۱۹ میں نقل کیا ہے۔ (یہ کتاب اب دائرۃ المعارف نے حیدر آباد میں چھاپ دی ہے، دیکھو جلد اول ص ۶۷ (مترجم)) نیز دیکھو تاریخ ابن الأثیر، نشرہ ثورن برگ (Torn berg) ج ۷، ص ۳۲۹، ذھبی کی تاریخ الاسلام کا اقتباس الاخبار الطوال کے مخطوطہ مدینہ میں ورق ۱/ب پر، العینی کی کتاب (؟)، مخطوطہ لینن گراڈ، مختصر تفصیلی فہرست روزق (Rosen) ج ۲، ص ۴۰۷ ب میں، تاریخ ابو الفداء نشرہ رائسکے (Reiske)، ج ۲، ص ۲۷۶، (عبدالقادر البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶ (بظاہر کراچکوفسکی کو خزانۃ الادب کے مولف کا نام معلوم نہیں، وہ مولف خزانہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے۔ (مترجم)

رائے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ [1] چند مستثنیات [2] کو چھوڑ دیں تو یوروپی مولف اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ [3]

اتنے ہی پر وہ سب معلومات ختم ہو گئے جو عربی مآخذوں میں ابو حنیفہ دینوری پر ملتے ہیں۔ حیرت اس بنا پر بڑھ جاتی ہے کہ خاصے ابتدائی زمانے ہی سے اس نے بطور عالم کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ اس سے بہتر سلوک ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم خود اس کا اندازہ آئندہ اس کی تالیفوں کی فہرست سے لگا لیں گے۔ اس کی تالیفوں کی تعداد ہی نہیں بلکہ موضوعوں کی جدت بھی ہمیں اس بارے میں اچھا اندازہ کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی بیس ایک کتابوں میں سے صرف ایک [4] الاخبار الطوال ہم تک پہنچی ہے۔ ابو میان توحیدی ایک ممتاز اور صاحب جدت لغوی

---

[1] زلبر برگ نے (ص ۲۳۱ پر) لکھا ہے کہ خزانۃ الادب کا بیان اچھی تاریخوں کی صحت کے باعث سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ مگر اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ خزانۃ الادب میں باب ابو حنیفہ کلیتہً یاقوت پر مبنی ہے۔ خزانۃ الادب میں یاقوت کے اقتباسات بعض وقت بلا حوالہ بھی ہیں، اگرچہ اس نے اپنے ماخذوں کی عام فہرست میں یاقوت کا ضرور ذکر کیا ہے (دیکھو خزانہ الادب، ج ۱ ص ۱۱، س ۱۵) یہ قابل ذکر ہے کہ یاقوت نے تین تاریخیں دی ہیں جیسا کہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے (یہ کچھ ٹھیک نہیں دیکھو ضمیمہ (مترجم)) مہینے کا ذکر البتہ سیوطی (بغیۃ الوعاۃ) کے ہاں بھی ملتا ہے (دیکھو اس کا مخطوطہ لینن گراڈ کے متحف آسیائی نمبر ۲۱۵ میں ورق ۱۰۴/ب پر جہاں لکھا ہے: اس کی وفات جمادی الاول ۲۸۱ھ یا ۲۸۲ھ میں اور ایک روایت میں ۲۹۰ھ میں ہوئی۔)

[2] فلوگل (جرمن کتاب کتب ھائے نحو، ص ۱۹۱) تاریخ نہیں دی ہے۔ آلورٹ نے عربی مخطوطات برلن کی فہرست ج ۶، ص ۲۳۷، نمبر ۶۹۵۰ میں ۲۸۱ھ کو قبول کیا ہے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے۔

[3] پرانے مولفوں میں دساسی (کتاب مذکور ص ۶۴، ۷۸) نئے مولفوں میں بروکلمان (تاریخ ادبیات ج ۱، ص ۱۲۳) اور زلبر برگ (مقالۂ مذکور قسط اول، ص ۲۳۱)

[4] اب کتاب النبات کی بھی دو جلدیں دستیاب ہو گئی ہیں۔ دیکھو ضمیمہ (مترجم)

تھا ۱ اس نے جاحظ سے متعلقہ اپنی تالیف (''تقریظ الجاحظ'') میں یقیناً یہ بے وجہ نہیں بیان کیا ہے کہ دینوری، جاحظ اور ابوزید بلخی ہم رتبہ لوگ تھے اور وہ کہتا ہے کہ اس مثلث علمی کا ہر ایک زاویہ لاجواب اور بے عدیل تھا۔ ۲ لیکن یہ کس حد تک صحیح ہے اس کا ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ آخر الذکر مولف یعنی بلخی کی تالیفیں ہم تک بہت کم پہنچی ہیں۔ گذشتہ سال (۱۹۱۰ء) تک تو اس کی جغرافیہ ''صور الاقالیم'' تک کا ایک سے

---

۱ التباس نہ ہو کہ ایک اور ہمنام مولف اندلس میں بھی گزرا ہے دیکھو پونس بویگیس کی ہسپانوی کتاب ''سپین کے عرب مورخین اور جغرافیہ نگاروں کے حالات اور تالیفات کے ذکر کی ایک سعی''۔

(F. Pone Boigues, Ensaye bio bibliegraphico sobre los historiadoresy geografos arabigoespanoles, Madrid, 1898.

ص ۳۲۳ و مابعد۔ ہمارے ابوحیان کی وفات تقریباً ۳۸۰ھ میں ہوئی۔ اس کا نام علی بن محمد تھا (دیکھو سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹) بروکلمان (ج ۱، ص ۲۴۴، نمبر ۲) کے ہاں تاریخ کم صحیح ہے۔ نیز کم وبیش پورے حالات ہی۔ (برکلمان نے ابتداء ۴۰۰ھ کو تاریخ وفات بیان کیا تھا اور کوئی حالات دیے ہی نہ تھے۔ پھر ضمیمہ اول نیز جلد اول کے نئے اڈیشن میں اس کی تلافی کر دی ہے اور ۳۸۰ھ سے واقفیت ظاہر کرتے ہوئے بھی ترجیح اس کو دی ہے کہ وفات ۴۰۰ھ کے بھی بعد کسی تاریخ کو ہوئی اور مدینۃ العلوم کا حوالہ دیا ہے (مترجم) سیوطی کا ماخذ یاقوت کے معجم الادباء کا وہ حصہ ہوگا جو ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ بہرحال یاقوت نے جاحظ کے متعلق ابوحیان کی دلچسپ تالیف کا بارہا حوالہ دیا ہے مثلاً معجم الادباء، ج ۳، ص ۸۶، حالات سیرافی، ج ۱، ص ۴۱، حالات ابوزید۔

۲ یاقوت معجم الادباء ج ۱، ص ۱۲۴ تا ۱۲۵۔ (خزانۃ الادب میں لفظ بہ لفظ اس کی نقل ہے) ابوحنیفہ کو اس دور کے صفِ اول کے نمائندوں میں جگہ دینے کا رجحان کوئی انوکھی چیز نہیں۔ اشٹاین شنائڈر (Steinschneider) نے (جرمن رسالہ ZDMG ج ۲۴، ص ۳۷۳ میں) ایک شہادت پیش کی ہے کہ مشہور منجم الغزاری بانی علم عروض الخلیل مشہور ابن المقفع اور ابوحنیفہ دینوری کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے فن میں اپنی ذہنی پیداوار کے لاثانی آثار چھوڑے ہیں۔

Marfat.com

زیادہ مخطوطہ معلوم نہ ہوا تھا۔ [1] اب جبکہ احمد زکی بک [2] (باشا مرحوم) نے اس کا ایک اور [3] نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے تو (۲۵) توقع کرنی چاہیے کہ یہ نیز اس کے شاگردوں میں سے ایک کی ایک تالیف [4] بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اس جدت پسند شخصیت پر کچھ روشنی ڈالیں گی۔ ویسے بلخی اتنا مقبول عام تھا کہ دوسروں کی تالیفیں بھی لوگ اس کی طرف منسوب کر دیتے تھے تاکہ ان کو مقبولیت حاصل ہو سکے [5] جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے اس کی تالیفوں کی حالیہ سالوں میں اشاعت کے باعث، اس کے ادبی خدوخال پوری طرح معلوم ہو چکے ہیں۔ ابو حیان نے اس کی جو پر جوش توصیف کی ہے۔ اس کی ان تالیفوں سے پوری تائید ہوتی ہے اور ساتھ ہی ان سے بے شک وشبہہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جاحظ اور ابو حنیفہ دینوری میں علمی نوعیت کا کیا فرق تھا۔ یہ فرق ابو حنیفہ اور اس کے محترم استادوں (ابن السکیت اور اس کے باپ میں بھی کچھ کم نہیں پایا جاتا۔ اگر یہ دونوں مولف (السکیت اور ابن السکیت) سوائے لغت کے کسی چیز سے اشتغال نہیں رکھتے تھے تو اس کے برخلاف دینوری کا دائرہ عمل بہت زیادہ وسیع، اور اُس زمانے کے علوم کی ساری ہی شاخوں کو گھیرے ہوئے تھا۔ خیالات کی

---

[1] آلورٹ کی فہرست مخطوطات برلن، ج ۵، ص ۳۶۲، نمبر ۶۰۳۲۔

[2] دیکھو ان کی فرانسیسی یادداشت ''مصر میں عربی علوم کی نشاۃ، جدیدہ کے وسائل'' قاہرہ ۱۹۱۰ء ص ۱۹، نمبر ۱۰۔

[3] احمد زکی پاشا نے استانبول میں اس کتاب کے دو نسخے معلوم کیے تھے جیسا کہ ۱۹۳۲ء (۱۳۵۰ھ) میں انہوں نے مجھ سے بالمشافہ فرمایا تھا۔ ان کے فوٹو بھی دارالکتب المصریہ میں آ چکے تھے۔ اس کا ایک اچھا نسخہ اس ملاقات سے چند ہفتے قبل میں نے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بک، مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔ جس میں ملکوں کے نقشے بھی تھے۔ افسوس کہ سفر سوم ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) وہ وہاں سے لاپتہ ہو چکا تھا۔ (مترجم)

[4] مذکورہ یادداشت احمد زکی بک، ص ۱۲ تا ۱۳، یعنی جوامع العلوم لفریعین تلمیذ أبی زید البلخی۔

[5] جیسا کہ مطہر بن طاہر المقدسی کی کتاب البدء والتاریخ کو بھی البلخی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ دیکھو البدء والتاریخ نشرہ کلیمان هیوار (Cl. Huart) خاص کر ج ۲-۳ کا دیباچہ مطبوعہ پیرس ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۳۔

Marfat.com

وسعت اور علم کے تنوع میں وہ جاحظ سے مماثل تھا۔ تو تنظیم پسندی میں وہ جاحظ سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ جاحظ صرف قبولیت عامہ کا متلاشی تھا اور اس کی خاطر وہ ہر چیز کو قربان کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کی قیمتی معلومات کی ایک معتد بہ مقدار ہمارے لیے عملا اس طرح ضائع ہوگئی ہے کہ اس کی کتاب کے عنوانوں سے اس کا ذرا بھی پتا نہیں چلتا کہ اس میں کس چیز کا ذکر ہے۔ کیونکہ ہر ایک تالیف اپنی جگہ ایک جیتی جاگتی اور نہایت دلچسپ دائرۃ المعارف ہے جس میں ہر قسم کے معلومات کا انبار تو ہے مگر جن کو چن کر الگ کرنے کے لیے یوروپی اہل علم کو اکثر محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جاحظ کی تالیفوں کا وہی حال ہے جو ان مماثل (فرنگی) تالیفوں کا جن میں ''لکھے جانے کے قابل ہر چیز نیز کچھ اور بھی چیزوں'' (de omni re scribili et quibusdam aliis) سے بحث ہوتی ہے۔ ابو حنیفہ دینوری کا ذہن نظام پسند تھا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اسے ریاضیات سے رغبت تھی۔ افسوس کہ اس کی تالیفوں کے ہمیں صرف عنوانوں پر قناعت کرنی پڑتی ہے (اصل تو تاتاریوں اور فرنگیوں کے حملوں کی وجہ سے ناپید ہیں) بہر حال ان عنوانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری ہی تالیفیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے فن وار الگ کر لیا جا سکتا ہے اور اس کا پتا چلتا ہے کہ وہ خود اس کی امکانی کوشش کرتا تھا کہ مختلف موضوعوں کو (۲۶) ایک ہی تالیف میں ٹھونس نہ دے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ علوم وفنون کے اس تنوع سے دلچسپی رکھنے کے باوجود، وہ ہر ایک میں یکساں مہارت تامہ رکھتا تھا اور ہر ایک میں وہ جدتیں دکھانے کے قابل تھا۔ یہ بات بعد کے علماء میں نظر نہیں آتی بلکہ خود اس کے ہمعصروں میں بھی کمیاب ہے۔ اس کا فیصلہ ہم اس کی اسی یگانہ تالیف سے بھی کر سکتے ہیں جو ہم تک پہنچی ہے (یعنی الاخبار الطوال) نیز ان نادر وقلیل اقتباسات سے جو اس کی دوسری تالیفوں کے متعلق محفوظ رہ سکے ہیں۔ دینوری کا مقصد بھی، اپنے اساتذہ اور ہمعصروں کی طرح، لسانیاتی ہی تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی ''کتاب النبات'' کو اس درجہ بلند پایہ کر دیا کہ یونان کی نباتیات بھی بہت پیچھے رہ گئی [1] اور جس کے باعث اسے عظیم شہرت حاصل ہوگئی حتیٰ کہ اس

[1] جیسا کہ زلبر برگ نے (حوالہ مذکورہ میں) نہایت دلچسپ ملاحظات پیش کیے ہیں۔

Marfat.com

بہتر عبارت	سطر	صفحہ
فأدرکب	c/۱۸	۲۵۵
فلتقُم	۱۵	۲۵۹
ونستقبل القوم	۲۰	۲۶۰
اذا	۳	۲۶۳
فأمر	۱۷	۲۶۴
بيساسك	a/۶	۲۷۹
من رأى	۲۲	۲۸۱
عن مكانه	۲	۲۸۶
اركبتم	۱۸	۳۱۰
شرطته	۲	۳۳۲
ومالهشام	۲۱	۳۴۵
شرطته	۵	۳۴۷
ركب	a/۶	۳۵۳
يوم	۱۷	۳۵۴
يامحمد	۱۹	۳۵۹
غيبٌ	c/۱۱	۳۶۰
مُستبشم	۲	۳۷۰
وبويع له	۱۲	۳۸۲
اوغل	۵	۳۸۷
وحسبك أنت ايضا يا أبا عبدالله	۹-۱۰	۴۰۱

پیش لفظ

(از اغناطیوس کراچ کوفسکی)

تمہید:

"کتابوں کی بھی اپنی اپنی قسمتیں ہوتی ہیں" (Habent sua fata libelli) لاطینی شاعر کا یہ مقولہ ہماری کتاب پر بھی صادق آتا ہے۔ ۱۸۷۷ء تک اس کا نام پڑھنے میں آتا تھا۔ سال مذکور میں بیرن (نواب) روزن (Rosen) نے لینن گراڈ کے مخطوطات کی فہرست شائع کی تو اس کے صفحہ ۱۴ تا ۱۷ پر اس کی تفصیل تھی۔ اس سے کئی علماء نے طباعت سے قبل بھی استفادہ کیا، خاص کر نولڈیکے Noeldeke نے اپنی جرمن تالیف "ساسانی دور کے ایرانیوں اور عربوں کی تاریخ" میں روزن اسے خود ایڈٹ کرنا چاہتا تھا۔ پھر مصروفیتوں کے باعث اپنے رفیق پروفیسر گسر گاس سے یہ خواہش کی۔ اس اثنا میں لایدن میں محمد امین کا مخطوطہ مدینہ پہنچ گیا جو قدیم تر اور بہتر تھا۔ اس کے باعث ایڈٹ کرنے کا کام آسان تر ہو گیا۔ مگر کتاب ابھی مطبع میں تھی کہ گسر گاس کا انتقال ہو گیا اور کتاب بغیر مقدمے اور بغیر اشاریے کے شائع کر دی گئی۔ اب سال ہا سال کے بعد لایدن کے ناشر نے مجھ سے خواہش کی ہے تو میں خوشی سے اس کی تکمیل کر رہا ہوں۔

مخطوطے:

مخطوطۂ پیٹرس بورگ (۱۰ تا ۱۹) کی (جو پہلے اطالنسکی (Italinsky) کے ذخیرے میں تھا) نواب روزن نے اچھی عالمانہ وصف نگاری کر دی ہے (دیکھیے فہرست مخطوطات لینن گراڈ، صفحہ ۱۴ تا ۱۷) اب اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

Marfat.com

لایدن کا مخطوطہ مدینہ قدیم تر ہے۔ ۲۵۰ ورق، ۱۶×۵. ۲۳ سم، ۱۴ سطریں، نسخہ ناقص تھا، بعد میں کسی نے اس کی تکمیل کی ہے اور آغاز، اختتام اور اوراق ۲، ۱۰، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰ جدید الخط ہیں۔ تکمیل کنندہ نے اپنا نام السید عبداللہ احمد بن عز الدین الناشری بتایا اور تاریخ کتابت بدھ کی رات ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۳۹ھ لکھی ہے لیکن اصل مخطوطہ یقیناً قدیم تر ہے اور اتفاق سے ورق ۴۷/ الف کے حاشیے پر یہ عبارت ملتی ہے۔

فرغ من نسخه فی خمسة عشر یوما آخرها یوم الأحد مستهل صفر سنة ٦٥٥ـ

اس سے پندرہ دن میں فراغت ہوئی یعنی اتوار یکم صفر ۶۵۵ھ کو تصحیح یہ مخطوطے کے کاتب ہی کے قلم سے معلوم ہوتا ہے۔ حاشیے پر جا بجا تصحیحیں بھی ہیں اور طویل نوٹ بھی جو محمد بن جعفر بن محمد بن عبداللہ بن بدر نے لکھے ہیں جو غالی شیعی معلوم ہوتا ہے۔

(یہاں تین صفحوں میں یہ عربی عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں) مخطوطے کے آغاز میں یاقوت اور ذھبی نے دینوری کے جو حالات لکھے ہیں۔ ان کا خلاصہ بھی درج ہے۔

لایدن کا مخطوطہ ہندستان: ۲۱۹ ورق، ۲۱×۱۵ سم، ۲۱ سطریں شروع میں، ۱۹ آخر میں۔ بابوں کے عنوان حاشیے پر ہیں۔ حضر موت والے کاتب نے نقل میں سہل انگاری کی ہے۔ تاریخ کتابت آخر میں یوں ہے:

تم الکتاب والحمد لله رب العالمین وصلی الله علیٰ سیدنا محمد و علی آله الطاهرین وسلم تسلیما وفرغ من تعلیقه کاتبه أفقر عباد الله عالي لطفه وعطفه محمد بن عبدالرحیم الجابری عفاالله عنه بالبلد لحانوس المحروس بالله تعالیٰ الشحر من أرض الأحقاف یوم الخمیس فی عشر من شهر الله الاصم الاصب رجب من سنة الالف احسن الله تقضیها من الهجرة النبویة علی صاحبها

أفضل الصلاة والسلام حامد الله تعالىٰ علی نعمه
ومصليا علی نبيه محمد وعلى آله و مسلما کتاب
تمام ہو گئی، خدا کا شکر اور رسول اللہ پر درود وسلام اسے محمد بن
عبدالرحیم الجابری نے علاقۂ احقاف کے شہر شحر میں جمعرات، ۱۰
رجب ۱۰۰۰ھ کو خدا یہ سال خیر و خوبی سے پورا کرے۔ لکھا،
تعریف اللہ کے لیے اور درود وسلام اس کے نبی پر۔

پروفیسر دخویے De Goejeny نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو نواب روزن کو ایک خط جرمن میں لکھا ہے: ''......میں نے یہ نسخہ ہندستان میں خرید کیا......'' مخطوطے پر مختلف مالکوں کے نام ہیں۔ ایک یوں ہے:

احمد بن جعفر افندی الرومی الحنفی الواعظ المدرس بالمسجد الحرام و
بالحرم الشریف المکی عام ۱۰۲۱ ایک اور یوں ہے:

ثم في ملك عبدالله امير المومنين اسماعيل بن
امير المؤمنين رضوان الله عليه [1]

اس نسخے کے آخر کی عبارت اور لینن گراڈ کا اختتام یہاں متوازی پیش کیے جاتے ہیں:

مخطوطہ ہندستان	مخطوطہ لینن گراڈ
ونقلت هذه النسخة من نسخة جيسدة قديمة الخط	نقلت هذه النسخة من نسخة نقلت من نسخة قديمة الخط
وقد كتب كاتبه في آخر ها بخطه وهو من الائة المعتبرين	- هو بهو -

[1] یہ غالباً یمن کے زیدی حکمرانوں میں سے ایک ہے۔ انسائکلو پیڈیا آف اسلام ''زیدیہ'' میں اس کے بیٹے کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں حکمران تھا۔

مخطوطہ ہندستان	مخطوطہ لینن گراڈ
ومن ترجم ا ـ له جمع، من	بلغ من تعليقه
المؤرخين مالفظه: فرغ من تعليقه	
بالجانب الغربي من بغداد الفقيرالى	
رحمة الله تعالىٰ عمر بن أحمد بن	الفقيرالى الله تعالىٰ
هبة الله بن محمد بن أبي جرادة في	– (ہوبہو) –
خمسة عشريوما آخرها يوم الأحد	– (ہوبہو) –
مستهل صفر من سنة خمس و	– (ہوبہو) –
خمسين وستمائة حامد الله تعالىٰ	سيدنا و على آله وصحبه
على نعمه ومصليا على نبيه محمد و	وسلم [پھر یہ ہے کہ وہ ۱۰۶۱ھ میں
على آله و مسلما۔ انتهى۔	نقل ہوا]

مخطوطہ ہندستان کی پہلی ہی سطر میں اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ اس پرانے نسخے کی نقل ہے جو یکم صفر ۶۵۵ھ کو ختم ہوا تھا۔ یاد ہوگا کہ مخطوطہ مدینہ پر یہی تاریخ درج ہے۔ مخطوطہ مدینہ کا آخری حصہ ضائع ہو جانے سے کاتب کا نام وہاں غیر موجود تھا اور یہاں وہ نام بھی معلوم ہو جاتا ہے اور نسخہ لینن گراڈ یہ کہتا ہے کہ وہ ۶۵۵ کے نسخے سے نقل شدہ نسخے کی نقل ہے۔

اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ مخطوطۂ مدینہ سے مخطوطۂ ہندستان نقل ہوا۔ پھر نسخۂ ہندستان سے مخطوطۂ لینن گراڈ نقل ہوا اور بڑی عجیب بات ہے کہ منقول اور منقول عنہ یہ تینوں نسخے ہمارے سامنے ہیں۔ [۲]

لایدن کا مخطوطۂ مدینہ عمر بن احمد کا نقل کردہ ہے۔ یہ شخص کمال الدین ابن العدیم

---

[۱] دیکھو مخطوطے کا ورق ۲۱۸/ب، نیز الاخبار الطوال کا ولایتی اڈیشن، صفحہ ۲، نوٹ ۱۔ (مترجم)

[۲] یاد رہے کہ سوھاج (مصر) کا جدید دستیاب شدہ نسخہ ان سب سے قدیم اور ۵۷۹ھ کا لکھا ہوا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ (مترجم)

Marfat.com

کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ الکتبی کی فوات الوفیات (طبع مصر ۱۲۸۳، ج ۲ ص ۱۲۶ و مابعد) کے مطابق وہ مشہور خطاط بھی تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی اور کتاب کہیں موجود ہو۔ اگر وہ مل جائے تو اس نسخے کے خط سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ لینن گراڈ میں مرقعات میں کمال الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جو وصلی ہے، وہ ابن العدیم کی نہیں کسی اور کمال الدین کی ھرات میں لکھی ہوئی ہے۔ (دیکھو ڈورن (Dorn) کی روسی فہرست مخطوطات ومنقوشات چوبی نمبر ۱۴۷ مطبوعۂ لینن گراڈ ۱۸۵۴ء)۔

Marfat.com

ابو حنیفہ اور اس کا علمی کارنامہ

عربی ماخذوں میں ابو حنیفہ دینوری (۲۰) کے سوانح حیات بہت ہی کم مایہ ہیں۔ [۱] اور یہی رائے یوروپی متلاشیوں کے ان بیانات پر بھی صادق آتی ہے جو ان (عربی) ماخذوں پر مبنی ہیں [۲]۔ اس کا نام ابو حنیفہ احمد بن داود بن ونند

---

[۱] اہم معلومات فہرست ابن الندیم معجم الادبا یاقوت اور کشف الظنون حاجی خلیفہ کے ہاں ہیں۔ اوروں کی اہمیت کم ہے۔ (دیکھو ہمارا ضمیمہ (مترجم))

[۲] وہ یہ ہیں:

1. Silvestre de Sacy, Relation de 1. Egypte, P. 47, 64, 78.

سلویستر دساسی کی فرانسیسی "تاریخ مصر"

2. F. Wuestenfeld, Geschichte der arabischen Aerzte, Goettingen, 1840, P. 38, N 92.

وستن فلڈ کی جرمن "تاریخ اطبا عرب"

3. F. Wuestenfeld, Die Geschichtschreiber der Araber und iher Werke, Goettingen, 1882. P 27, N 79.

وستنفلڈ کی جرمن "عرب مورخین اور ان کی تالیفیں"

4. Ernst H.F. Meyer, Geschichte der Botaik, III, 163 - 167, Koenigsberg, 1856

مایر کی جرمن "تاریخ نباتیات"

5. G.Fluegel Die grammatischen Schulen der Araber, Leipzig 1862, P. 190ff.

فیلوگل کی جرمن "عربوں کے کتب ہائے نحو"

6. J. Von Hamme, Leteraturgeshichte der Araber IV, 144.

فون ہامر کی جرمن "تاریخ ادبیات عربی" (☆)

Marfat.com

7. L. Leclerc, Histoire de la medecine arabe, Paris 1876, I, 298. (☆)

لکیر کی فرانسیسی ''تاریخ طب عربی''

8. H. Derenbourg, in : Revue Critique, 1888, XXVI, 61 - 64.

ڈیرن بورگ کا مقالہ فرانسیسی رسالہ ''مجلہ تنقید'' میں

9. T - n (=A. Mueller) in : Leterarisches Centralblatt, 1889, P. 613 - 614.

میولر کا مضمون جرمن رسالہ ''ادبی مرکزی صحیفہ'' میں

10. Haeser, Geschichte der Medizin I, 558, Jena 1875.

هیزر کی جرمن ''تاریخ طب''

11. N. Miednikoff, Palestina (in Russian), 11, 91, St Petersburg 1897.

میدنیکوف کی روسی کتاب ''فلسطین''

12. H. Suter, Die Mathematiker und Astronomen Der Araber und ihre Werke, Leipzig 1900, P. 31, N. 68.

سوتر کی جرمن ''عرب ریاضیات وھیئت داں اوران کی تالیفیں''

13. C. Brockelmann, Geschichte der arabischen Literatur, I, 123 Weimar 1898.

بروکلمان کی جرمن تاریخ ادبیات عربی'' اس کا ضمیمہ اور نیا اڈیشن بعد میں نکلے (مترجم)

14. Cl. Huart, Litterature arabe, Paris 1902, P. 154.

هیوار کی فرانسیسی کتاب ''عربی ادبیات''

15. B. Silberberg, Das Pflanzenbuch des Abu Hanifa Ahmad ibn Daud ad Dinawari in: Zeitschrift fuer Assyriologie, 1910, XXIV, 225, 265; 1911, XXV, 39 - 88.

ز۔ لبر برگ کا جرمن مقالہ ''ابوحنیفہ احمد بن داود الدینوری کی کتاب النبات'' جو اشترا سبورگ کے جرمن رسالے ''مجلہ اشوریات'' ج ۲۴ تا ۲۵ میں دو قسطوں میں چھپا ہے اور بہت اہم چیز ہے۔

ہم ان کا اور بعض دیگر مولفین کا جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا۔ آئندہ کئی بار ذکر کریں گے۔

۱ ابن الأنباری کی ''نزھۃ الالباء، طبع قاہرہ ۱۲۹۴، ص ۳۰۵ میں اس کا نام ابوحنیفہ احمد بن السکیت چھپا ہے۔ یہ یا تو کاتب کی یا مطبع کی غلطی ہے۔ یاقوت کی معجم الادباء، شائع کردہ مارگولیوث، ج ۱، ص ۱۲۳ کو دیکھیے تو نزھۃ الألباء کی عبارت میں ایک سطر چھوٹی ہوئی ☆

Marfat.com

جاتا ہے۔ عام طور پر اسے دینوری پڑھتے ہیں۔ لیکن اکثر دِینوری بھی [1] بلکہ دینوری (۲۱) یا دینوری بھی [2] اول الذکر صحیح ترین ہے جس کی تائید ابن خلکان سے ہوتی ہے۔[3] سے ہوتی ہے۔ ثانی الذکر کی بھی کچھ نہ کچھ اساس ہے کیونکہ اس کی تائید سمعانی [4] سے ہوتی ہے۔ ثالث الذکر کو ترک کر دینا چاہیے گویا وہ محض بے اصل ہے۔ مولف کے دادا کا نام ونند [5] تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تیسری پشت (یعنی دادا) تک اس کا خاندان خالص ایرانی تھا [6] جیسا کہ اس دور میں عربی ادب میں امتیاز

☆ معلوم ہوتی ہے۔ یاقوت کے ہاں عبارت یوں ہے: أحمد بن داود الدینوری، أخذ عن البصریین والکوفیین وأکثر أخذہ عن ابن السکیت۔

[1] مثلاً فان فلوٹن کی ولندیزی کتاب in Chorasan Van Vloten De opkomst der Abbasiden خراساں میں عباسیوں کا بول بالا، لایدن ۱۸۹۰ء میں کئی بار، یا برلن کے عربی مخطوطات کی فہرست، ج ۶، ص ۲۳۷، نمبر ۶۹۵۰، فہرست نگار کا نام ہے السورٹ (W. Ahlwardt)۔

[2] مثلاً دساسی کی کتاب مذکور، ص ۶۴، ۸۷، نمبر ۲۶، لیکر کی کتاب مذکور، ج ۱، ص ۹۸. لانڈ برگ کی فہرست مخطوطات لایدن، ص ۴۷، نمبر ۲۳۰ (سہو قلم سے حیز کی کتاب بالا، ج ۱، ص ۵۵۸ میں ابو الدینوددری ہے۔ اسی طرح مایر کی کتاب مذکور میں بارہا Abu Hanifadt ہے (مایر نے دال کے زبر سے دینوری لکھا ہے (مترجم)

[3] وفیات الاعیان شائع کردہ وستنفلد، نمبر ۲۹۵، ص ۱۱۸، اور نمبر ۳۲۷، ص ۱۶، نیز دیکھو حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، شائع کردہ فلوگل، ج ۷، ص ۶۳۲ (= ج ۱، ص ۵۰۱، س ۷)، نیز ج د، ص ۶۵۲ (= ج ۲، ص ۱۰۵، س ۱۵)

[4] جیسا کہ ابن خلکان نے حوالہ بالا میں ذکر کیا ہے (سمعانی کی کتاب الانساب بعد میں چھپ گئی ہے (مترجم) اس کے معنی شاید یہ ہیں کہ یہاں فارسی یائے مجہول تھا (= دے نسوری) جو عربی میں غائب ہو گیا۔

[5] غالباً اسے یوں Wanand ہی پڑھنا چاہیے۔ یاقوت کی معجم الادباء (ج ۱ ص ۱۲۳، ۱۲۴) میں جسے مارگولیوث نے ایڈٹ کیا، وتسند چھپا ہے۔ اگرچہ دو بار یوں ہی چھپا ہے مگر اسے مطبع کی غلطی سمجھنی چاہیے (مارگولیوث کی غلطی بھلا کیسے ہو سکتی ہے؟ کتاب کے طبع ثانی میں بھی وتند ہی ہے (مترجم))

[6] ونند یا تو ایک ستارے کا نام ہے یا اس ستارے کے دیوتا کا پارسیوں کی مذہبی کتابوں میں ☆

Marfat.com

حاصل کرنے والے مولفوں کی اکثریت کا حال ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دینوری کی نسبت ابو حنیفہ ہی نہیں بلکہ اس کے آبا و اجداد کی طرف بھی کی جاتی ہو۔ بظاہر وہ دینور میں پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شہر میں گزرا۔ اور اس کی ملاقات اپنے ہم عصر مشہور لغوی المبرد سے وہیں ہوئی تھی۔ ۱ وہاں سالہا سال تک وہ رصد و نجوم میں مشغول رہا۔ ۳۳۵ھ (۹۴۶ء) میں منجم عبدالرحمٰن الصوفی نے وہاں وہ مکان دیکھا تھا جو دینوری کے لیے رصدگاہ کا کام دیتا تھا۔ ۲ فطرۃً اس کا علمی کام اس کے مسقط الراس ہی تک (۲۲) محدود نہ رہا۔ اس زمانے کے اکثر نوجوان اہلِ علم کی طرح اس نے بھی اپنی جوانی سفروں میں گزاری۔ وہ عرب تمدن کے عراقی مرکز کو گیا تھا۔ یہاں اس نے بصرہ اور کوفہ ہر دو مکتبوں کے نمائندوں سے یکساں ذوق و شوق سے علم حاصل کیا اور خاص طور پر لغوی السکیت اور اس کے ممتاز بیٹے ابن السکیت ۳ سے۔ کہتے ہیں کہ اس کے اساتذہ بھی وہی تھے جو اس کے ہمعصر ابو علی حسن الاصفہانی کے تھے۔ ۴ اس کے ساتھ

☆ یہ نام خاصی کثرت سے آتا ہے (دیکھو مثلاً بسنشد ھیش کا انگریزی ترجمہ از ویسٹ (E.West) آکسفرڈ ۱۸۸۰ء باب دوم آیت ۷، باب ھفتم آیت ۱ وغیرہ یہ آدمیوں کا بھی نام ہے اور ہندی سیتھی (Indo-Scythian) بادشاہوں کے سکوں پر وہ یونانی میں Daninda کی شکل میں ملتا ہے (دیکھو جرمن کتاب ایرانی لسانیات کا خلاصہ Grundriss der iranischen Philologie طبع اشتراسبورک ج ۲، ص ۷۵)

۱ ابن فورجہ (صحیح: فرجہ مترجم) شارح المتنبی کا بیان جو یاقوت کی کتاب بالا میں ص ۱۲۶ پر نقل ہوا ہے؟ نیز دیکھو (عبدالقادر البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۱۱ و مابعد۔

۲ عبدالرحمٰن الصوفی کی کتاب صور الکواکب، شائع کردہ Caussin در رسالہ "NOtices et Extraits" ج ۱۲، ص ۲۶۲، اسی کتاب کو فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شیئل روپ نے بھی شائع کیا (دیکھو Schjellrup,. Description des etoiles fixes St-Petersburg 1874, P. 33) (اس کتاب کو اب حیدر آباد میں دائرۃ المعارف نے بہت عمدہ طور پر چھاپ دیا ہے۔ دیکھو، ص ۷ تا ۸ (مترجم) نیز لیکیر کی مذکورہ تاریخ طب، ج ۱، ص ۳۰۰، ۳۱۹۔

۳ الفہرست نشرہ فلوگل، ص ۷۸، س ۱۰ تا ۱۱، یاقوت نشرۂ مارگولیوث، ج ۱، ص ۱۲۳، سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، طبع مصر ۱۳۲۶ھ، ص ۱۳۲ (البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۵۔

۴ الفہرست، ص ۸۱، س ۶، اور خاص کر یاقوت کی معجم الادباء ج ۳، ص ۸۲، س ۱ تا ۲۔

آیندہ ابوحنیفہ نے علمی مناظرے شروع کیے جن کے اثار ابوحنیفہ کی ایک کتاب میں باقی ہیں [1]۔ مذکورہ اساتذہ کے علاوہ بظاہر اس کے اور بھی استاد تھے۔ کہتے ہیں کہ الفراء کی روایت اس تک ابوعبداللہ الطوال کے واسطے سے پہنچی [2]، مگر جس نے خود کوئی کتاب نہیں چھوڑی ہے۔[3] اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ روایت زبانی ہوئی تھی۔ اس کا سفر عراق سے باہر تک بھی ہونے کا پتا چلتا ہے کہ کتاب النبات میں وہ مدینے کے مضافات کا بطور خاص ذکر کرتا ہے۔ نیز حرمین کا علی العموم۔ [4] ان علاقوں میں اس کا طویل قیام محض حج کے اغراض کے لیے نہیں ہوا ہوگا۔ [5] عُمان اور خلیج فارس کے ساحل کے حوالے [6] اس کا ایک مزید ثبوت ہیں۔ اگرچہ اکثر یوروپی مولف [7] یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۲۳۵ھ، (۸۵۰ء) کے لگ بھگ وہ اصفہان میں تھا اور رصد و نجوم میں مشغول تھا۔ لیکن اس روایت کے قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا واحد ماخذ حاجی خلیفہ کا بیان ہے جو دینوری کی طرف منسوب (۲۳) ایک کتاب کے سلسلے میں ہے مگر جو یقیناً اس کی تالیف نہیں ہے۔ جب ہم اس کی نجومیاتی تالیفوں کا ذکر کریں گے تو اس سے بھی بحث کریں گے۔

---

[1] یاقوت، ج ۳، ص ۸۳، س ٦ تا ۷ نیز آگے ابوحنیفہ کی تالیفوں کی فہرست میں نمبر (۹)

[2] الفہرست، ص ٦٦، آخری سطر

[3] ایضاً، ص ٦٨، سطر ۱ تا ۲

[4] کتاب النبات الدینوری کی مطبوعہ جلد نیز ان اجزاء میں جو میں نے دیکھے ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ ضُرّ یعنی الی کے ذکر میں وہ صرف ایک بار کہتا ہے کہ میں نے اس کا درخت "فیما بین المسجدین" دیکھا ہے اور اس سے مکہ و مدینہ مراد لیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اپنے مشاھدات حرمین کا شاید ہی کہیں ذکر ہو (مترجم)

[5] مایر کی کتاب بالا، ص ۱٦۳ (ظاہر ہے کہ اس حوالے میں سوائے قیاس آرائی کے اور کیا مل سکتا ہے (مترجم)

[6] لکیر، تالیف بالا، ص ۲۹۹، (اس موضوع پر دیکھو ہمارا ضمیمہ (مترجم))

[7] وستفلد کی جرمن "عرب مورخین" ص ۷ ۲ نمبر ۴، فلوگل کی جرمن "کتب ھائے نحو" ص ۱۹۲، ڈیرن بورگ کا مقالۂ مذکور، ص ٦۲، زلبربرگ کا مقالۂ مذکور، قسط اول، ص ۲۲۹۔

Marfat.com

ابو حنیفہ کے متعلق جس واحد تاریخ کا ہمیں پتا چلتا ہے وہ اس کی تاریخ وفات ہے مگر اس میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی ۲۸۱ھ کہتا ہے تو کوئی ۲۸۲ھ اور کوئی ۲۹۰ھ۔ یاقوت [۱] نے یہ تینوں تاریخیں بیان کی ہیں اور ہر ایک کا حوالہ بھی۔ یہی حال سیوطی [۲] اور حاجی خلیفہ [۳] کا ہے۔ اکثر مورخ ۲۸۲ھ کی طرف مائل ہیں [۴] مجبوراً اسی کو زیادہ قرینِ صواب سمجھنا پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے حوالے زیادہ یقینی ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ

---

۱ معجم الادباء ج ۱، ص ۱۲۴ [یاقوت نے ایک روایت ۲۸۰ھ کی بھی دی ہے اور ۲۹۰ھ نہیں بلکہ "۲۹۰ھ سے قبل" لکھا ہے۔ ۲۸۲ کی روایت یاقوت نے کتاب النبات کے اس نسخے کی پشت پر لکھی دیکھی جو ابن المسبح کے ہاتھ سے نقل ہوا تھا۔ القفطی کی انباء الرواۃ ج ۱، ص ۴۲ کے مطابق مسبح بن حسین دینوری کا بھانجا ہے۔ (مترجم)

۲ بغیۃ الوعاۃ، ص ۱۳۲

۳ کشف الظنون، نشرہ فلوگل، ج ۳، ص ۶۳، ج ۵، ص ۶۷ نیز ۱۳۰ (۲۸۱)، ج ۲، ص ۱۰۵ نیز ۶۴۴ (۲۸۲) ج ۱، ص ۳۲۹، ج ۲، ص ۳۶۱، ج ۵، ص ۵۴ نیز ۳۰۸ (۲۹۰) زلبر برگ (مقالۂ مذکور ص ۲۳۰) نے غلط لکھا ہے۔ ۲۸۱ھ کا ذکر دو جگہ ہے۔

۴ عبدالقادر بن ابی الوفاء القرشی کی الجواہر المضیئۃ کا اقتباس جو فلوگل نے ابن قطلوبغا کی تاج التراجم کے حاشیے میں ص ۹۵ نمبر ۱۱۹ میں نقل کیا ہے۔ (یہ کتاب اب دائرۃ المعارف نے حیدرآباد میں چھاپ دی ہے، دیکھو جلد اول ص ۶۷ (مترجم)) نیز دیکھو تاریخ ابن الاثیر، نشرہ تورن برگ (Tornberg) ج ۷، ص ۳۲۹، ذھبی کی تاریخ الاسلام کا اقتباس الاخبار الطوال کے مخطوطہ مدینہ میں ورق ۱/ب پر، العینی کی کتاب (؟)، مخطوطہ لینن گراڈ، مختصر تفصیلی فہرست روزن (Rosen) ج ۲، ص ۴۰۷ ب میں، تاریخ ابو الفداء، نشرہ رائسکے (Reiske)، ج ۲، ص ۲۷۶، (عبدالقادر البغدادی کی) خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶ (بظاہر کراچکوفسکی کو خزانۃ الادب کے مولف کا نام معلوم نہیں، وہ مولف خزانہ کہہ کر ختم کر دیتا ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

رائے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ ۱؎ چند مستثنیات ۲؎ کو چھوڑ دیں تو یوروپی مولف اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ ۳؎

اتنے ہی پر وہ سب معلومات ختم ہو گئے جو عربی ماخذوں میں ابوحنیفہ دینوری پر ملتے ہیں۔ حیرت اس بنا پر بڑھ جاتی ہے کہ خاصے ابتدائی زمانے ہی سے اس نے بطور عالم کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ اس سے بہتر سلوک ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم خود اس کا اندازہ آیندہ اس کی تالیفوں کی فہرست سے لگا لیں گے۔ اس کی تالیفوں کی تعداد ہی نہیں بلکہ موضوعوں کی جدت بھی ہمیں اس بارے میں اچھا اندازہ کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اگرچہ اس کی بیس ایک کتابوں میں سے صرف ایک ۴؎ الاخبار الطوال ہم تک پہنچی ہے۔ ابو میان توحیدی ایک ممتاز اور صاحب جدت لغوی

۱؎ زلبر برگ نے (ص ۲۳۱ پر) لکھا ہے کہ خزانۃ الادب کا بیان اچھی تاریخوں کی صحت کے باعث سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ مگر اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ خزانۃ الادب میں باب ابوحنیفہ کلیۃً یاقوت پر مبنی ہے۔ خزانۃ الادب میں یاقوت کے اقتباسات بعض وقت بلا حوالہ بھی ہیں، اگرچہ اس نے اپنے ماخذوں کی عام فہرست میں یاقوت کا ضرور ذکر کیا ہے (دیکھو خزانہ الادب، ج ۱ ص ۱۱، س ۱۵) یہ قابل ذکر ہے کہ یاقوت نے تین تاریخیں دی ہیں جیسا کہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے (یہ کچھ ٹھیک نہیں دیکھو ضمیمہ (مترجم)) مہینے کا ذکر البتہ سیوطی (بغیۃ الوعاۃ) کے ہاں بھی ملتا ہے (دیکھو اس کا مخطوطہ لینن گراڈ کے متحف آسیائی نمبر ۲۱۵ میں ورق ۱۰۴/ب پر جہاں لکھا ہے: اس کی وفات جمادی الاول ۲۸۱ھ یا ۲۸۲ھ میں اور ایک روایت میں ۲۹۰ھ میں ہوئی۔)

۲؎ فلوگل (جرمن کتاب کتب ھائے نحو، ص ۱۹۱) تاریخ نہیں دی ہے۔ آلورٹ نے عربی مخطوطات برلن کی فہرست ج ۶، ص ۲۳۷، نمبر ۶۹۵۰ میں ۲۸۱ھ کو قبول کیا ہے اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے۔

۳؎ پرانے مولفوں میں دساسی (کتاب مذکور ص ۶۴، ۷۸) نئے مولفوں میں بروکلمان (تاریخ ادبیات ج ۱، ص ۱۲۳) اور زلبر برگ (مقالۂ مذکور قسط اول، ص ۲۳۱)

۴؎ اب کتاب النبات کی بھی دو جلدیں دستیاب ہو گئی ہیں۔ دیکھو ضمیمہ (مترجم)

Marfat.com

تھا۔[1] اس نے جاحظ سے متعلقہ اپنی تالیف (''تقریظ الجاحظ'') میں یقیناً یہ بے وجہ نہیں بیان کیا ہے کہ دینوری، جاحظ اور ابوزید بلخی ہم رتبہ لوگ تھے اور وہ کہتا ہے کہ اس مثلث علمی کا ہر ایک زاویہ لاجواب اور بے عدیل تھا۔[2] لیکن یہ کس حد تک صحیح ہے اس کا ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ آخر الذکر مولف یعنی بلخی کی تالیفیں ہم تک بہت کم پہنچی ہیں۔ گذشتہ سال (۱۹۱۰ء) تک تو اس کی جغرافیہ ''صور الاقالیم'' تک کا ایک سے

---

[1] التباس نہ ہو کہ ایک اور ہمنام مولف اندلس میں بھی گزرا ہے دیکھو پونس بوئیکیس کی ہسپانوی کتاب'' سپین کے عرب مورخین اور جغرافیہ نگاروں کے حالات اور تالیفات کے ذکر کی ایک سعی''۔

(F. Pone Boigues, Ensayo bio bibliographico sobre los historiadoresy geografos arabigoespanoles, Madrid, 1898.

ص ۳۲۳ وما بعد۔ ہمارے ابوحیان کی وفات تقریباً ۳۸۰ھ میں ہوئی۔ اس کا نام علی بن محمد تھا (دیکھو سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، ص ۳۴۸ تا ۳۴۹) بروکلمان (ج ۱، ص ۲۴۴، نمبر ۲) کے ہاں تاریخ کم صحیح ہے۔ نیز کم وبیش پورے حالات ہی۔ (بروکلمان نے ابتداء ۴۰۰ھ کو تاریخ وفات بیان کیا تھا اور کوئی حالات دیے ہی نہ تھے۔ پھر ضمیمہ اول نیز جلد اول کے نئے اڈیشن میں اس کی تلافی کر دی ہے اور ۳۸۰ھ سے واقفیت ظاہر کرتے ہوئے بھی ترجیح اس کو دی ہے کہ وفات ۴۰۰ھ کے بھی بعد کسی تاریخ کو ہوئی اور مدینۃ العلوم کا حوالہ دیا ہے (مترجم) سیوطی کا ماخذ یاقوت کے معجم الادباء کا وہ حصہ ہوگا جو ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ بہرحال یاقوت نے جاحظ کے متعلق ابوحیان کی دلچسپ تالیف کا بارہا حوالہ دیا ہے مثلاً معجم الادباء، ج ۳، ص ۸۶، حالات سیرافی، ج ۱، ص ۱۴۱، حالات ابوزید۔

[2] یاقوت معجم الادباء ج ۱، ص ۱۲۴ تا ۱۲۵۔ (خزانۃ الادب میں لفظ بہ لفظ اس کی نقل ہے) ابوحنیفہ کو اس دور کے صفِ اول کے نمائندوں میں جگہ دینے کا رجحان کوئی انوکھی چیز نہیں۔ اشٹاین شنائڈر (Steinschneider) نے (جرمن رسالہ ZDMG ج ۲۴، ص ۳۷۳ میں) ایک شہادت پیش کی ہے کہ مشہور منجم الغزاری بانی علم عروض الخلیل مشہور ابن المقفع اور ابوحنیفہ دینوری کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے فن میں اپنی ذھنی پیداوار کے لاثانی آثار چھوڑے ہیں۔

Marfat.com

زیادہ مخطوطہ معلوم نہ ہوا تھا۔ ۱ اب جبکہ احمد زکی بک ۲ (باشامرحوم) نے اس کا ایک اور ۳ نسخہ ڈھونڈ نکالا ہے تو (۲۵) توقع کرنی چاہیے کہ یہ نیز اس کے شاگردوں میں سے ایک کی ایک تالیف ۴ بھی زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اس جدت پسند شخصیت پر کچھ روشنی ڈالیں گی۔ ویسے بلخی اتنا مقبول عام تھا کہ دوسروں کی تالیفیں بھی لوگ اس کی طرف منسوب کر دیتے تھے تا کہ ان کو مقبولیت حاصل ہو سکے ۵ جہاں تک جاحظ کا تعلق ہے اس کی تالیفوں کی حالیہ سالوں میں اشاعت کے باعث، اس کے ادبی خدوخال پوری طرح معلوم ہو چکے ہیں۔ ابو حیان نے اس کی جو پرجوش توصیف کی ہے۔ اس کی ان تالیفوں سے پوری تائید ہوتی ہے اور ساتھ ہی ان سے بے شک وشبہہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جاحظ اور ابو حنیفہ دینوری میں علمی نوعیت کا کیا فرق تھا۔ یہ فرق ابو حنیفہ اور اس کے محترم استادوں (ابن السکیت اور اس کے باپ میں بھی کچھ کم نہیں پایا جاتا۔ اگر یہ دونوں مولف (السکیت اور ابن السکیت) سوائے لغت کے کسی چیز سے اشتغال نہیں رکھتے تھے تو اس کے برخلاف دینوری کا دائرہ عمل بہت زیادہ وسیع، اور اُس زمانے کے علوم کی ساری ہی شاخوں کو گھیرے ہوئے تھا۔ خیالات کی

---

۱ آلورٹ کی فہرست مخطوطات برلن، ج ۵، ص ۳۶۲، نمبر ۶۰۳۲۔

۲ دیکھو ان کی فرانسیسی یادداشت ''مصر میں عربی علوم کی نشاۃ، جدیدہ کے وسائل'' قاہرہ ۱۹۱۰ء، ص ۱۹، نمبر ۱۰۔

۳ احمد زکی پاشا نے استانبول میں اس کتاب کے دو نسخے معلوم کیے تھے جیسا کہ ۱۹۳۲ء (۱۳۵۰ھ) میں انہوں نے مجھ سے بالمشافہ فرمایا تھا۔ ان کے فوٹو بھی دارالکتب المصریہ میں آ چکے تھے۔ اس کا ایک اچھا نسخہ اس ملاقات سے چند ہفتے قبل میں نے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بک، مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔ جس میں ملکوں کے نقشے بھی تھے۔ افسوس کہ سفر سوم ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) وہ وہاں سے لاپتہ ہو چکا تھا۔ (مترجم)

۴ مذکورہ یادداشت احمد زکی بک، ص ۱۲ تا ۱۳، یعنی جوامع العلوم لفریعین تلمیذ ابی زید البلخی۔

۵ جیسا کہ مطہر بن طاہر المقدسی کی کتاب البدء والتاریخ کو بھی البلخی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ دیکھو البلدء والتاریخ نشرہ کلیمان حیوار (Cl.Huart) خاص کر ج ۲-۳ کا دیباچہ مطبوعہ پیرس ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۳۔

Marfat.com

وسعت اور علم کے تنوع میں وہ جاحظ سے مماثل تھا۔ تو تنظیم پسندی میں وہ جاحظ سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ جاحظ صرف قبولیت عامہ کا متلاشی تھا اور اس کی خاطر وہ ہر چیز کو قربان کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کی قیمتی معلومات کی ایک معتد بہ مقدار ہمارے لیے عملاً اس طرح ضائع ہوگئی ہے کہ اس کی کتاب کے عنوانوں سے اس کا ذرا بھی پتا نہیں چلتا کہ اس میں کس چیز کا ذکر ہے۔ کیونکہ ہر ایک تالیف اپنی جگہ ایک جیتی جاگتی اور نہایت دلچسپ دائرۃ المعارف ہے جس میں ہر قسم کے معلومات کا انبار تو ہے مگر جن کو چن کر الگ کرنے کے لیے یوروپی اہل علم کو اکثر محنت شاقہ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جاحظ کی تالیفوں کا وہی حال ہے جو ان مماثل (فرنگی) تالیفوں کا جن میں "لکھے جانے کے قابل ہر چیز نیز کچھ اور بھی چیزوں (de omni re scribili et quibusdam aliis) سے بحث ہوتی ہے۔ ابو حنیفہ دینوری کا ذھن نظام پسند تھا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اسے ریاضیات سے رغبت تھی۔ افسوس کہ اس کی تالیفوں کے ہمیں صرف عنوانوں پر قناعت کرنی پڑتی ہے (اصل تو تاتاریوں اور فرنگیوں کے حملوں کی وجہ سے ناپید ہیں) بہر حال ان عنوانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری ہی تالیفیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے فن وار الگ کر لیا جا سکتا ہے اور اس کا پتا چلتا ہے کہ وہ خود اس کی امکانی کوشش کرتا تھا کہ مختلف موضوعوں کو (۲۶) ایک ہی تالیف میں ٹھونس نہ دے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ علوم وفنون کے اس تنوع سے دلچسپی رکھنے کے باوجود، وہ ہر ایک میں یکساں مہارت تامہ رکھتا تھا اور ہر ایک میں وہ جدتیں دکھانے کے قابل تھا۔ یہ بات بعد کے علماء میں نظر نہیں آتی بلکہ خود اس کے ہمعصروں میں بھی کمیاب ہے۔ اس کا فیصلہ ہم اس کی اسی یگانہ تالیف سے بھی کر سکتے ہیں جو ہم تک پہنچی ہے (یعنی الاخبار الطوال) نیز ان نادر وقلیل اقتباسات سے جو اس کی دوسری تالیفوں کے متعلق محفوظ رہ سکے ہیں۔ دینوری کا مقصد بھی، اپنے اساتذہ اور ہمعصروں کی طرح، لسانیاتی ہی تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی "کتاب النبات" کو اس درجہ بلند پایہ کر دیا کہ یونان کی نباتیات بھی بہت پیچھے رہ گئی [1] اور جس کے باعث اسے عظیم شہرت حاصل ہوگئی حتیٰ کہ اس

[1] جیسا کہ زلبر برگ نے (حوالہ مذکورہ میں) نہایت دلچسپ ملاحظات پیش کیے ہیں۔

Marfat.com

''شرح کبیر'' مولفہ ابوعبداللہ محمد بن سلیمان المالقی جس کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی۔ یہ تیس جلدوں میں ہے اور ابوحنیفہ دینوری کی کتاب البیان کی شرح پر مشتمل ہے جیسا کہ ذھبی نے اپنی ''تاریخ الاسلام'' میں ذکر کیا ہے۔

مورخ الذھبی کے حوالے پر اعتماد کرتے ہوئے، فلوگل [۱] یہ یقین کرتا ہے کہ کتاب البیان کا کوئی وجود ہے، اور گمان کرتا ہے کہ وہ تاریخ کی کوئی بڑی کتاب ہے جس کا حاجی خلیفہ نے ایک دوسری جگہ ذکر کیا ہے اور ابن قتیبہ پر چوری کا الزام لگایا ہے۔ [۲] ہم اس مسئلہ پر آئندہ بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف یہ بیان کرنے پر اکتفا کریں گے کہ فلوگل کا گمان کسی سنجیدہ اساس پر مبنی نہیں، اور یہ کہ ابوحنیفہ نے ''کتاب البیان'' نام کی کوئی کتاب کبھی نہ لکھی۔ اصل میں یہاں صرف کتابت کی ایک غلطی سے سابقہ ہے، اور ''النبات'' کے عوض ''البیان'' لکھ دیا گیا ہے۔ اس شارح (المالقی) کی سوانح عمری دیتے ہوئے المقری [۳] نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے اگرچہ وہ شرح کے ساٹھ جلدوں میں ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ البتہ وہ اصل کتاب کا نام صحیح دیتا ہے۔ الذھبی کے نام سے زیادہ فائدہ نہ اٹھانا چاہیے (جن کی ''تاریخ الاسلام'' اس وقت تک شائع نہیں ہوئی تھی) کیونکہ اس میں دینوری کی صرف تاریخی کتابوں کا ذکر نہیں ہے۔ مزید برآں ذھبی کا اقتباس خود الاخبار الطوال کے مخطوطہ مدینہ پر موجود ہے اور وہاں صاف ''کتاب النبات'' لکھا ہے۔ (دیکھو ورق ۱/ب)

ایک دوسری غلطی کا آغاز یوروپ میں ہوا اور اس کی ابتداء (لبنانی پادری)

---

۱ دیکھو اس کی جرمن کتاب ''مکتب ہائے نحو'' ص ۱۹۰ و ۱۹۱

۲ کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۵، نمبر (۲۱۱۷) (فلوگل نے کشف الظنون، ج ۵، ص ۱۰۵، نمبر ۱۰۲۱۸، عربی جی باشی نے لکھا ہے۔ (مترجم)

۳ نفح الطیب (طبع لایدن ۱۸۵۸، ج ۲، ص ۲۷۰، س ۱۰) ''ولہ توالیف، منھا شرح کتاب النبات الدینوری فی ستین مجلدا، وغیر ذلک'' (یعنی اس کی کئی تالیفیں ہیں مثلاً ابوحنیفہ کی کتاب النبات کی شرح ساٹھ جلدوں میں، وغیرہ) نیز دیکھو ڈیرن بورگ کا مقالہ بالا، ص ۶۳، حاشیہ (۱)

Marfat.com

الغزیری(Casiri) سے ہوئی۔ ایسکوریال (سپین) کے عربی مخطوطات کی (لاطینی میں) مفصل فہرست مرتب کرتے ہوئے اس نے ان مولفوں کی فہرست دی ہے جن کا حوالہ ابن (۳۸) العوام نے (کتاب الفلاحۃ میں) دیا ہے۔ چنانچہ الغزیری [1] نے اور سب مولفوں سے پہلے یہ لکھا:

> ابوحنیفہ دینوری شامی (جس نے دو کتابیں لکھیں ایک جنگلی چیزوں (نباتات؟) پر اور ایک بیطاری (علاج حیوانات) پر اس کی وفات ۲۹۰ھ میں بیان کی جاتی ہے۔
>
> Abu Hanipha Aldainuraeus Assyrius (quivolumina do de re rustica ac veterinaria conscripsit annoque Aegirea 290 traditur)

جس قطعیت اور اذعان کے ساتھ وہ دو تالیفوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس سے گمان ہوگا کہ اس کے پاس قابل اعتماد حوالے موجود تھے۔ علم کی جو مسلسل ترقی ہو رہی ہے اس سے خیال کرنا پڑتا ہے کہ الغزیری سے ایک غلطی ہوئی ہے اور اب سے ڈیڑھ (بلکہ دو) سو برس پہلے اس کا ارتکاب ہوا ہو تو حیرت کی بات نہیں۔ ان دو تالیفوں کا کہیں بھی پتا نہیں چلتا۔ اس لیے اس کا موقع ملتا ہے کہ ان کے وجود پر شبہہ کریں۔ مزید برآں ابن العوام کی کتاب پر بعد میں جو تحقیقات عمل میں لائی گئیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ابوحنیفہ کا جب کبھی ذکر کرتا ہے تو اس کی کسی تالیف کا نام لیے بغیر، اور اس نے جتنے اقتباسات دیے ہیں وہ پودوں کی تشریح کے متعلق ہیں۔ [2] اس طرح یہ قطعی اور یقینی ہے کہ ابن العوام نے کتاب النبات کے سوا دینوری کی کسی اور تالیف سے استفادہ نہیں کیا۔ ابن العوام نے فلاحت الارض (کاشتکاری) اور بیطاری پر ایک کتاب تالیف کی۔ اس سے اس بات کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے کہ کیوں الغزیری نے ابن العوام کے ماخذ (دینوری)

---

[1] اس کی فہرست مخطوطات Bibliotheca Arabica,Hispana Escurialensis طبع مجریط (میڈریڈ) ۱۷۶۰ء، جلد اول، ص ۲۲۳۔

[2] کلیمان مولے نے اس کا فرانسیسی ترجمہ کیا۔ دیکھو

Clement Mullet, Le livre d agriculture d Ibn an-Awwam, Paris1864,p.76-77

Marfat.com

کے متعلق بھی یہ فرض کر لیا کہ اس نے بھی انہیں دو موضوعوں پر کتابیں تالیف کی ہوں۔ اس غلطی پر سلویستر دساسی کو بھی تنبہ ہو گیا تھا، اور اس نے الغزیری کی بیان کردہ تالیفوں کی صحت پر شبہہ ظاہر کیا ہے [1] مایر نے بھی (سلویستر دساسی کی) اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ [2] اگرچہ وستنفلد [3] اور لکلیر [4] نے الغزیری کی تائید کی ہے۔ اوپر جو بحث کی گئی اس کے بعد ان لوگوں کے بیانات کے متعلق یہ گمان کرنا مشکل ہے کہ وہ مستحکم ثبوتوں پر مبنی ہوں۔

۱۲۔ کتاب الباہ:

Liber Coitus [5] (یعنی جماع پر کتاب)۔ اس کتاب کا بہت کم ذکر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ حاجی خلیفہ [6] کے بیان کے مطابق وہ ایک طبی رسالہ تھا، نہ کہ رنڈی بازی کی تفصیل جیسا کہ بعد کے زمانے میں اس نام کی اکثر کتابوں کا حال ہے۔ [7]

---

[1] اس کی تالیف مذکور، ص ۷۸

[2] اس کی تالیف مذکور، ص ۱۶۴ و ۱۶۵ (مگر مایر کی اس کتاب میں ہمیں ایسی کوئی رائے نہیں ملی (مترجم)

[3] اس کی جرمن تالیف "تاریخ اطبائے عرب"، ص ۳۸، نمبر (۹۲/۱)

[4] اس کی تالیف مذکور، ج ۱، ص ۴۰۹

[5] اس کتاب کا نام "الباہ" یاقوت کی معجم الادباء (ج ۱، ص ۱۲۷، س ۱) اور ابن الانباری (ص ۳۰۵) میں ہے۔ الاخبار الطوال کے مخطوطہ مدینہ میں (ورق ۱/ب) "کتاب السیاہ" ہے۔ سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ کے مطبوعہ نسخے میں "کتاب والباہ" (کذا) ہے اور اس کے مخطوطے میں جو لینن گراڈ کے متحف آسیائی میں ہے "کتاب السیاہ" ہے۔ خزانۃ الادب (ج ۱، ص ۲۶، س ۶) میں "کتاب والباءۃ" بیان ہوا ہے۔ (باہ اور باءۃ عربی میں مترادف ہیں (مترجم)۔ نیز دیکھو فلوگل (ابن قطلوبغا کی تاج التراجم، ص ۱۹۲، نمبر ۸) جس نے اس نام کا جرمن ترجمہ صرف "مقویات" Ueber die Stimulantia کیا ہے۔

[6] کشف الظنون، ج ۲، ص ۷ نمبر ۱۶۱۵، اور خاص کر ۸، ۴۰ و مابعد

[7] اس ادعا کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ (مترجم)

Marfat.com

عرب مولفوں نے جو حالات دیے ہیں، ان کی روشنی میں ابو حنیفہ کی ریاضیاتی تالیفیں بھی اتنی ہی کثیر ہیں جتنی اس کی لسانیاتی تالیفیں۔ اس میں ایک طرف حساب اور جبر و مقابلہ شامل ہیں تو دوسری طرف علم ھیئت۔

۱۳۔ کتاب البحث فی حساب الھند:

ھندی حساب کی تحقیق [۱] اس طرح کے نام کی دیگر تمام تالیفوں کی طرح غالباً یہ بھی حساب (آرتماطیقا) پر ہوگی۔ سوتر [۲] نے اپنے پیش کیے ہوئے نظریے کو مسلسل باقاعدگی سے نباہتے ہوئے، چاہا ہے کہ اسے (البحث کی جگہ) ''التخت'' پڑھے۔ اس کی جو وجہ وہ بیان کرتا ہے وہ ایک طرح اس کے پیشرو وُ یکے (Woepke) کی توجیہ کے مماثل ہے۔ [۳] اس میں کافی وزن ہوگا لیکن راقم الحروف اس فن کا متخصص نہ ہونے کے باعث اس بارے میں جھگڑ نہیں سکتا کہ وہ صحیح اساس پر مبنی ہے یا نہیں۔ لیکن سوتر کی توضیحوں کو ایک طرف رکھ دیں تو، اس کی مہارت فنی کا پورا احترام کرتے ہوئے بھی، میرے خیال میں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابو حنیفہ کی اس تالیف کے متعلق ہمارا دیا ہوا نام صحیح تر ہے۔ تمام ہی ماخذوں میں یہ نام اسی طرح دیا گیا ہے اور نحوی لحاظ سے اس نام میں سادگی ہے۔ یہ دونوں باتیں ہم کو لفظ ''بحث'' کو قبول کرنے پر مائل کرتی ہیں۔ یہی نہیں مزید برآں ''الفہرست'' میں ایک مقام پر، جس کا حوالہ سوتر [۴] نے دیا ہے، ناقابل فہم ''التخت'' کا لفظ برتا گیا ہے اور جسے سوتر ''التخت'' پڑھنا لازمی

---

[۱] الفہرست ص ۷۸، س ۱۴، یاقوت، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۳، الاخبار الطوال کا مخطوطہ مدینہ، ورق ۱/ب، ابن الانباری، ص ۳۰۶، خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۸، تاج التراجم (شائع کردہ فلوگل)، ص ۱۹۲ نمبر (۱۶)

[۲] اس کی جرمن کتاب عرب ریاضیات وھیئت داں''، ص ۳۱، نمبر ۶۰۔

[۳] اس نظریے کی تشریح اس نے اپنی ایک دوسری جرمن تالیف میں کی ہے یعنی ''الفہرست میں ریاضیات دانوں کی فہرست'' جو بطور مقالہ رسالہ Zeitschrift fuer Mathematic und Physik ۱۸۹۲ء، ج ۳۷ ضمیمہ، ص ۷۰ میں شائع ہوا۔ دیکھو نمبر ۲۳۹ کے تحت۔

[۴] دیکھو مقالہ مذکور ''الفہرست میں ریاضیات دانوں کی فہرست''، ۳۷، ۴۰، ۴۱۔

سمجھتا ہے۔ مگر عجیب سی بات ہے کہ الفہرست کا مولف ہماری زیر بحث (دینوری کی) کتاب کے متعلق بھی وہی (نا قابل فہم) لفظ استعمال نہیں کرتا بلکہ بہت صاف ''البحث'' [1] لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نام میں (۴۰) اور اسی موضوع سے متعلق نظر آنے والی دو اور تالیفوں کے ناموں میں ایک نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ البتہ آخرالذکر دو تالیفوں میں وہ نا قابل فہم اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے جو سوتر نے تجویز کی ہے۔ پہلی تالیف مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی ہے، اور اس کا نام ''کتاب حساب العدد الھندی'' [2] دیا گیا ہے۔ دوسری ''کتاب الحساب الھندی'' سند بن علی کی طرف منسوب ہے۔ [3] اس مواد کی روشنی میں اس کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا کہ ابو حنیفہ کی تالیفوں کے متعلق اس نظریے کو قبول کریں جو سوتر نے تجویز کیا ہے۔ اس کے نظریے دیگر مواقع پر بابنیاد ہو سکتے ہیں۔

ابو حنیفہ کی جو تالیفیں جبر و مقابلہ پر ہیں۔ ان کے متعلق محض نام کے سوا ہمیں اور کچھ معلوم نہیں:

۱۴۔ **کتاب الجبر و القابلہ:**

جبر و القابلہ پر کتاب [4] اور

---

[1] الفہرست شائع کردہ فلوگل میں ''البحث'' ہے نہ کہ ''البخت'' جیسا کہ سوتر نے غلطی سے پڑھ لیا ہے (دیکھو اس کی جرمن کتاب ''عرب ریاضیات وھیئت داں''، ص ۳۱، حاشیہ (د)۔ یہ قابل ذکر ہے کہ وہ اپنی پہلی کتاب کے آخر میں ''تصحیحات'' کے سلسلے میں (دیکھو ص ۷۸، حاشیہ (ذ) وہ اپنے نظریے کی صحت پر کچھ تردد اور شبہات ظاہر کرتا ہے، مگر کتاب ثانی میں وہ (ص ۶۴، حاشیہ ب) مکرر پہلا نظریہ ہی پیش کرتا ہے۔ اگر اس لفظ کو وہ صحیح پڑھتا تو وہ اس قطعیت کے ساتھ اپنا خیال ظاہر نہ کرتا۔

[2] نالینو کی اطالوی تالیف ''الخوارزمی اور اس کی تصحیح جغرافیہ بطلیموس''

C.A. Nallino, Al Huwarizmi e il suo rifacimento della geographia di Tolomeo, Roma 1895, p. 10, 02

نیز دیکھو سوتر کی مذکورہ جرمن تالیف ''ریاضیات وھیئت داں''، ص ۱۱

[3] الفہرست، ص ۲۷۵، سوتر کا مذکورہ جرمن مقالہ ''ریاضیات دانوں کی فہرست''، ص ۲۹

[4] الفہرست، ص ۷۸، س ۱۵، یاقوت کی معجم الادباء، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۳، الاخبار الطوال کا مخطوطہ ☆

Marfat.com

۱۵۔ کتاب نوادر الجبر:

جبر و مقابلہ کے نادر مسئلے ۱؎

ابو حنیفہ دینوری کو اس کی علم ہیئت کے تالیفوں کے باعث بھی، کتب نباتیات کی طرح، کچھ کم مقبولیت نہیں حاصل ہوئی:

۱۶۔ کتاب الأنواء:

نوء یعنی بارش کی کارتیوں ۲؎ پر تالیف ۳؎۔ اس کے (۴۱) اقتباسات سے

☆ مدینہ، ورق ۱/ب، خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۸، کشف الظنون، ج ۵، ص ۶۷، نمبر (۱۰۰۰۱۲)، سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، ص ۱۳۲، عبدالقادر القرشی کی الجواہر المضیۃ، بحوالہ تاج التراجم شائع کردہ فلوگل، ص ۹۵، نمبر ۱۱۹، ابن الانباری ص ۳۰۶، مزید برآں دیکھو رائسکے کی مذکورہ تاریخ ابو الفداء، ج ۲، ص ۲۶۷، فلوگل کی جرمن تالیف "مکتب ہائے نحو"، ص ۱۹۲، نمبر (۱۸)، سوتر کی مذکورہ تالیف، ص ۳۱، نمبر (۶۰)

۱؎ الفہرست، ص ۷۸، س ۱۶، یاقوت، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۶، الاخبار الطوال کا مخطوطہ مدینہ، ورق ۱/ب، خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۱۰، نیز دیکھو فلوگل کی جرمن تالیف "مکتب ہائے نحو" ص ۱۹۲، نمبر (۱۸)، سوتر کی مذکورہ تالیف، ص ۳۱، نمبر (۶۰)۔

۲؎ عربی لفظ "نوء" جس کی جمع "انواء" (اور جسے خاص کر جنوبی ہند کی اردو میں کارتی کہتے ہیں)، اس کے معنی، ہیں منازل قمر کے مواقع (Occasus cosmicus stationis Lunaris) تفصیلوں کے لیے دیکھو لفظ "نوء" کے تحت نالینو کی کتاب

C.A. Nallino, Al-Battani Opus astronomicum, II, Milano 1907, p.354-355

۳؎ الفہرست، ص ۷۸، س ۱۳ نیز ص ۸۸، س ۱۷ تا ۱۸، یاقوت، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۲، کشف الظنون، ج ۵، ص ۵۴، سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ، ص ۱۳۲، ابن سیدہ کی کتاب المخصص، ج ۱، ص ۱۱، س ۱۲، الجواہر المضیۃ، بحوالہ تاج التراجم، ص ۹۵، نمبر ۱۱۹، ذھبی کی تاریخ الاسلام کا اقتباس الاخبار الطوال کے مخطوطہ مدینہ میں ورق ۱/ب، خزانۃ الادب ج ۱، ص ۲۶، س ۷، البیرونی کی الآثار الباقیۃ، ص ۳۳۶، س ۱۰ نیز ص ۳۴۷، ابن الانباری، ص ۳۰۶، محمد الاشبیلی (الغزیری کی فہرست مخطوطات اسکوریال، ج ۹، ص ۳۷۶ میں) عبدالرحمن الصوفی کی صور الکواکب کا اقتباس فرانسیسی رسالہ Notices et Extraits کی ج ۱۲، ص ۱۶۲ پر، (یہ کتاب اب دائرۃ المعارف نے حیدرآباد دکن میں چھاپ دی ہے۔ وہاں دیکھو ص ۷ و ۸)، نیز فلوگل کی جرمن "مکتب ہائے نحو"، ☆

اندازہ لگایا جائے تو یہ تالیف، ''کتاب النبات'' کے بعد، سب سے زیادہ مقبول ہے۔ ابو حیسان نے اس کے متعلق جو بیان دیا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے، اور یاقوت [1] نے اسے نقل کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس تالیف سے پتا چلتا ہے کہ دینوری کو علم ھیئت (نجوم) اور ''آسمان کے رازوں'' کے متعلق وسیع معلومات حاصل تھیں۔ حاجی خلیفہ کی ثنا خوانی تو اور بھی زیادہ پرجوش ہے۔ وہ کہتا ہے [2] کہ دینوری نے اس تالیف میں عربوں کا پورا علم بھر دیا ہے۔ منجم عبدالرحمٰن الصوفی اپنی رائے میں زیادہ محتاط ہے۔ وہ بے پس و پیش اس تالیف کو اپنی نوعیت کی بہترین تو قرار دیتا ہے اور یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دینوری کو اس موضوع کے سابقہ ادبیات پر عبور حاصل تھا، لیکن پھر بھی وہ دینوری کے مشاهدات رصدی کے متعلق کسی قدر بے اعتمادی ظاہر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ مشاهدات تعداد میں قلیل اور بنیاد میں کم مستحکم ہیں۔ [3] بعض وقت تو وہ اپنی تنقید میں قطعی فیصلے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے [4] لیکن عبدالرحمٰن صوفی کی اس رائے کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ دینوری کے کام کی تائید میں البیرونی کی ناقابل تزلزل سند

☆ ص ۱۹۱، نمبر ۷، رینو کی کتاب ''ابوالفداء''، ص ۷ ۱۸ (Reinaud, Aboulfeda, CLXXXVII) ، مایر کی مذکورہ کتاب، ص ۱۶۴، نمبر ۵، سوتر کی مذکورہ کتاب، ص ۳۱، نمبر ۶۰

[1] معجم الادباء، ج ۱، ص ۱۲۵، س ۵: '' وھذا کلامہ فی الانواء یدل ''علی حظ'' وافر من علم النجوم و اسرار الفلک'' (یعنی کارتیوں کے متعلق اس کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے علم نجوم اور اسرار فلک سے بہرہ وافر ملا تھا)۔ یہی الفاظ ہو بہو خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶ میں بھی دہرا دیے گئے ہیں۔ (ناظرین کو غلط فہمی نہ ہو۔ دینوری نے ستاروں کی مدد سے غیب کی باتیں اور آدمی کی آئندہ قسمت بتانے کی بالکل کوشش نہیں کی ہے بلکہ یہ بتایا ہے کہ بدویوں کے تجارب میں کس ستارے کے کس منزل قمر میں ہونے کے وقت بارش کی توقع کی جاتی ہے اور کب نہیں۔ (مترجم)

[2] کشف الظنون، ج ۵، ص ۵۴، خاص کر سطر ۷ و مابعد، فلوگل کی کتاب بالا، ص ۱۹۱

[3] صور الکواکب کا حوالہ بالا (مطبوعہ حیدر آباد، ص ۷ و ۸)

[4] صدر الکواکب کا اقتباس بالا، ص ۲۶۲، ۲۶۵ (متن، یا ص ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۸ ترجمہ)

Marfat.com

پائی جاتی ہے، کیونکہ نہ صرف اس نے اس کا ذکر کیا ہے [1] بلکہ اپنے جداول میں سے ایک میں اس نے ابو حنیفہ کا ایک پورے کا پورا اقتباس بھی نقل کر دیا ہے [2] غیر متخصصین کی تالیفوں میں تو دینوری کو بہت بڑی وقعت حاصل ہے۔ چنانچہ مشہور لغت نویس ابن سیدہ [3] نے اصطلاح ''نوء'' (کارتی) کی تاریخ اسی سے اخذ کی ہے۔

(۴۲) علم ھیئت کے متعلق اس کی دو اور تالیفوں پر ہمیں نام کے سوا اور کچھ معلوم نہیں:

۱۷۔ کتاب القبلۃ والزوال:

قبلہ نماز اور (ظہر کی نماز کے لیے) سورج کے ڈھلنے کے متعلق [4] جن حوالوں سے اس تالیف کا پتا چلا ہے۔ ان میں سے بعض میں اس کتاب کا مخفف صرف ''کتاب القبلۃ'' نام دیا گیا ہے۔[5]

۱۸۔ کتاب الکسوف:

سورج گرھن کے متعلق [6]۔ اس کا ذکر صرف خزانۃ الادب میں ہے۔ فلوگل نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی بنا پر زلبر برگ کا خیال ہے کہ یہ ان کتابوں میں سے ایک ہے جن کا حاجی خلیفہ نے ذکر کیا ہے اور جن پر ہم ابھی بحث کریں گے۔ میں نہیں

---

[1] الآثار الباقیۃ، ص ۳۳۶، س ۱۰

[2] ایضاً، ص ۳۴۶: ''جداول احوال المنازل: انواؤھا علی ماذکرھا ابو حنیفۃ الدینوری''

[3] کتاب المخصص، ج ۹، ص ۱۳

[4] الفہرست، ص ۷۸، س ۱۳، یاقوت کی معجم الادباء، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۶ و ۷، الاخبار الطوال کا مخطوطۂ مدینہ ورق ۱/ب، خزانۃ الادب، ج، ص ۲۶، س ۱۰، فلوگل کی مذکورہ کتب ہائے نحو، ص ۱۹۲، نمبر (۱۳)

[5] عبدالقادر کی الجواہر المضیئۃ، بحوالہ تاج التراجم، ص ۹۵، نمبر ۱۱۹، الاشبیلی کی تالیف مذکور، فہرست ایسکوریال ج ۹، ص ۲۷۶، نیز سوتر کی تالیف مذکور، ص ۳۱، نمبر ۶۰۔

[6] یاقوت کی معجم الادباء، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۷، الاخبار الطوال کا مخطوطۂ مدینہ ورق ۱/ب، خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۱۰، نیز زلبر برگ کی تالیف مذکور ص ۲۳۱ (قفطی نے اپنی انباہ الرواۃ، ج ۱، ص ۲، میں لکھا ہے کہ اس کے پاس اس کا نسخہ بخطِ مولف ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

خیال کرتا کہ یہ رائے بابنیاد ہے۔ جیسا کہ ہم کئی بار دیکھ چکے ہیں۔ خزانۃ الادب کا مولف یاقوت کا خوشہ چین ہے، یاقوت کی یہ سند اتنی کافی اہم ہے کہ اس کی موجودگی میں اس پر شبہہ کرنے کی وجہ نہیں کہ ابوحنیفہ دینوری ہی اس کتاب کا مولف ہو۔ یاقوت اس کا ذکر کرتا ہے اور یاقوت نے اس کی جن دیگر تالیفوں کا ذکر کیا ہے ان کا ثبوت دیگر قابلِ اعتماد ماخذوں سے حاصل ہو چکا ہے۔

جہاں تک ان ہیئتی تالیفوں کا تعلق ہے جن کا ذکر صرف حاجی خلیفہ کے ہاں ہے، ان کے متعلق ہمیں گہرا یقین ہو چکا ہے کہ ہمارے مولف کی طرف ان کی نسبت محض ایک افسوسناک سہو ہے۔ اس نظریے کو پیش کرتے ہوئے ہم نہ صرف اس پر مجبور ہیں کہ وستنفلد [1] یا فلوگل [2] جیسے مورخین ادبیات سے اختلاف کریں بلکہ سوتر [3] اور زلبربرگ [4] جیسے متخصصین علوم طبیعیہ سے بھی۔ ان سب کا ماخذ حاجی خلیفہ کے دو اقتباس ہیں، اور مزید وضاحت کے لیے ہم ان کو لفظ بہ لفظ نقل کیے دیتے ہیں:

(۱) کشف الظنون شائع کردہ فلوگل ج ۳، ص ۴۷ نمبر ۶۲۶۳

رصد ابی خلیفة أحمد بن داود الدینوری باصبهان سنة ۲۳۵
ابوحنیفہ کے مشاہدات فلکی اصفہان میں ۲۳۵ھ میں

(۲) ایضاً ج ۳، ص ۵۵۸، نمبر ۶۹۳۶

زیج أبی حنیفه الدینوری صاحب الرصد باصبهان فی سنة ۳۳۵ خمس و ثلاثین و ثلاث مائة لرکن الدولة حسن بن بویه الدیلمی ذکره صاحب الگزیده قلت: وقد أرخ أصحاب التواریخ وفاة أبی حنیفه الدینوری المهندس المنجم سنة ۲۸۱، وقیل سنة ۲۹۰ فاذاً لا یصح قول صاحب الگزیده فتامل۔

---

[1] وستنفلد کی جرمن تالیف "مورخین عرب"، ص ۲۷، نمبر ۷۹، ص ۴-۵
[2] فلوگل کی مذکورہ "کتب ہائے نحو"، ص ۱۹۲، نمبر ۱۹، ۱۰
[3] سوتر کی تالیف مذکور، ص ۳۲، نمبر ۶۰
[4] زلبربرگ کی تالیف مذکور، ص ۲۲۹

Marfat.com

مشاہدات فلکی کرنے والے ابو حنیفہ دینوری کی زیج جو اصفہان میں ۲۳۵ میں بو یہی رکن الدولہ کے لیے تیار کی گئی۔ تاریخ گزیدہ کے مولف نے اس کا ذکر کیا ہے۔ (حاجی خلیفہ) کہتا ہوں کہ مورخین نے دینوری کی وفات ۲۸۱ یا ۲۹۰ میں بیان کی ہے اس لیے تاریخ گزیدہ کے مولف کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا۔ توجہ فرمالیں۔

ان اقتباسات کی تنقیح کرنے سے پہلے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس کا ذکر حاجی خلیفہ کے سوا کہیں اور نہ ہونا خاصا حیرتناک ہے۔ دینوری کی تالیفوں کے سلسلے میں ہم ایک سے زائد بار رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ حاجی خلیفہ کے بیان پر بہت زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔ دینوری کی تاریخی تالیفوں کے سلسلے میں ہم اسے مزید دیکھیں گے۔ اس کے ماسوا یہ بھی عجیب ہے کہ اس کا ذکر نہ تو دینوری کی تالیفوں کی فہرستوں میں ہے اور نہ علوم نجوم کے نمایندوں سے کسی کے ہاں۔ البیرونی، البسانی اور عبدالرحمٰن صوفی جیسے منجم ابو حنیفہ کی نجومیات سے متعلق تالیفوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی تالیفوں میں اگرچہ اکثر اقتباسات مثلاً دینوری کی کتاب الانواء کے آتے ہیں، مگر ان کے ہاں حاجی خلیفہ کی بیان کردہ ان دو تالیفوں کا قطعاً کوئی نام ونشان نہیں۔ اس طرح یہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ حاجی خلیفہ کی باتوں کو بہت زیادہ احتیاط سے قبول کرنے کی ضرورت ہے۔

اوپر کے دیے ہوئے اقتباسوں کے سلسلے میں ہمیں یہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہاں دو تالیفوں کا ذکر ہو۔ اور ہمیں زلبر برگ کے خلاف احتجاع کرنا پڑتا ہے جس نے (حوالہ بالا پر) لکھا ہے کہ: ''کتاب الرصد میں اس نے ۲۳۵ھ ہی میں اپنے مشاہدات اصفہان میں منضبط کر لیے تھے۔'' کشف الظنون میں لفظ ''کتاب'' نہیں ہے بلکہ صرف ''الرصد'' اور کتاب ہو بھی نہیں سکتی۔ رصد کے معنی کبھی ''مشاهدات فلکی کی کتاب'' کے نہیں ہوتے، بلکہ اس کے معنی خود مشاہدات کے ہوتے ہیں۔ ۱؎ چنانچہ اس اصطلاح کا مفہوم خود حاجی خلیفہ وضاحت کے ساتھ ماموئی جداول ۲؎ کے سلسلے میں معین کرتا ہے:

۱؎ رصد (جس کی جمع ہے اَرصاد = فلکی مشاہدہ) اور رصد (= فلکی تخمین)۔ ان اصطلاحوں کے متعلق دیکھو نالینو کی مذکورہ تالیف ''البتانی'' ۱۹۰۷ء، ج ۲، ص ۳۳۴۔

۲؎ اسے فلوگل نے شائع کیا۔ دیکھو تفصیلیں ج ۳، ص ۴۶۶، ''علم الرصد'' کے تحت۔

Marfat.com

فقیدوا مانتهوا أليه وسموه الرصد الأمونی ......
وألف كل منهم فی ذلك زيجا منسوبا أليه وكان
أرصاد هؤلاء أول أرصاد كان فی مملكة الاسلام۔

انہوں نے اپنے حاصل کردہ نتائج کولکھا اور اسے رصد مامونی سے موسوم کیا...... ان میں سے ایک نے ایک زیج تالیف کی جو اس کی طرف منسوب ہے اور ان کی رصدیں ہی عہد اسلامی کی اولین رصدیں ہیں۔

خود اسی عبارت سے بہت اچھی طرح وہ فرق واضح ہو جاتا ہے جو زیر بحث دونوں اصطلاحوں میں پایا جاتا ہے: یعنی ''رصد'' (=مشاہدات فلکی) اور ''زیج'' (وہ جدولیں جو ان مشاہدات کی بنا پر مرتب ہوں) [1] چنانچہ ایک مشاہدہ فلکی (رصد) کی اساس پر متعدد مولف اس قابل ہوتے ہیں کہ متعدد جدولیں تیار کریں، جس طرح خود ایک تنہا مولف اس قابل ہوتا ہے کہ کسی اور کے مشاہدات کی اساس پر مختلف جدولیں تیار کر ڈالے۔ اس آخر الذکر امکان کا ذکر حاجی خلیفہ [2] نے کیا ہے:

زيج ابن حماد الاندلسی بن علی، علی أرصاد
ابراهيم بن يحي النقاش، فعمل عليهما ثلاثه أزياج
...... الخ

ابن حماد کی زیج جس نے ابراہیم بن یحییٰ النقاش کے فلکی

---

[1] ''زیج'' کا ترجمہ عام طور پر ''جداول نجوم'' کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ بلکہ زیج میں کروی نجومیات کا وہ پورا نظام داخل ہے جو جدولوں کے ذریعے سے وضع کیا جاتا ہے، جیسا کہ نالینو نے (البتانی، ج۱، ص XXXI فقرہ ۴ میں) ثابت کیا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۵ء تک خود نالینو بھی یہی ترجمہ کرتا رہا اور کتاب الزیج کو (اطالوی میں) Tavola astronomicha کہتا رہا۔ دیکھو اس کی کتاب ''الخوارزمی''، ص۱۰، نمبر۴

[2] کشف الظنون، ج۳، ص۵۵۶، نمبر۶۹۳۲

Marfat.com

مشاہدات کی اساس پر تین زیجیں تیار کیں...... وغیرہ [1]

غرض اسی طرح یہ یقینی ہے کہ لفظ ''رصد'' کسی کتاب کا نام نہیں ہوتا۔ اس کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ تمام اہل علم جو ''رصد'' (یعنی مشاہدات فلکی) کرتے رہے، ان کے متعلق متعلقہ باب میں لکھا جاتا ہے کہ وہ ''صاحب الزیج'' تھے۔ [2] مزید برآں ان کی (۴۵) تالیفوں کی فہرست میں کبھی یہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ ''رصد'' نام کی ان کی کوئی تالیف ہو [3]۔ اس طرح رصد ابی حنیفہ کے لفظ سے یہ سمجھنا کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ کوئی خاص تالیف ہو، جیسا کہ مذکورہ یوروپی اہل علم نے فرض کر لیا ہے [4] حاجی خلیفہ کے مطابق ابو حنیفہ نے فلکی مشاہدات اصفہان میں ۲۳۵ھ میں کیے۔ اس سے زیادہ اس نے اور کچھ نہیں بیان کیا ہے۔ بد قسمتی سے یہ بیان اس قابل نہیں کہ ہم اس پر اعتماد کر سکیں، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے۔

(دینوری کے) ان فلکی مشاہدات کے نتائج بھی دیگر مولفین کی طرح جداول (زیج) ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک بیان میں جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے ایسی ایک زیج کے وجود کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ایسی بدوقتی

---

[1] یہ بیان ایک نمونہ بن سکتا ہے، اور اس کا کافی یقین دلا سکتا ہے کہ ہیئتی تالیفوں کے متعلق حاجی خلیفہ کے دیے ہوئے معلومات کے سلسلے میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ (نیز دیکھو سوتر کی تالیف بالا ''ریاضیات وھیت دان'' ص ۱۳۶، نمبر ۲۸۷)۔

[2] اس کے ثبوت کے لیے ان منجمین کے حالات کو جو حاجی خلیفہ نے ''باب علم الرصد'' میں دیے ہیں، دیکھنا اور ان کا سوتر کی کتاب کے متعلقہ مقامات سے مقابلہ کرنا کافی ہوگا۔

[3] ایضاً

[4] سوتر جیسا متخصص تاریخ ھیت اس کتاب کو das Buch der astronomischen Beobachtungen (فلکی مشاہدات کی کتاب) سے تعبیر کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ قابل احترام صاحب علم اصل ماخذوں تک نہیں گیا بلکہ اس نے صرف وستنفلد کی (جو لاطینی نام observationes astronomicae دیتا ہے) اور فلوگل کی (جو اس کو زیج سے الگ ایک کتاب سمجھنے پر اصرار کرتا ہے) سند پر تکیہ کر لیا ہے۔ اگر سوتر نے جانا ہوتا کہ اصل ماخذ میں لفظ ''رصد'' ہے تو یقیناً وہ اسے کوئی مستقل تالیف نہیں قرار دیتا۔

Marfat.com

(Anachronism) کے ساتھ کہ یوروپی اہلِ علم ہی نہیں یہ مشرقی مولف [1] (حاجی خلیفہ) بھی کھٹکے بغیر نہ رہ سکا [2] جیسا کہ معلوم ہے رکن الدولہ بویہی نے ۳۲۱ھ سے ۳۶۶ھ تک حکمرانی کی۔ ابو حنیفہ دینوری اپنی کتاب اس کے نام معنون نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ۲۸۲ھ کے لگ بھگ ہی فوت ہو چکا تھا۔ حاجی خلیفہ کے ہاں دی ہوئی تاریخ کو ایک سہو قرار دے سکتے ہیں، مگر اس کے بعد رکن الدولہ سے متعلقہ پورا جملہ حذف کر دینا پڑے گا۔ اس غلطی کے علاوہ جو حاجی خلیفہ کی شہادت پر شبہہ پیدا کرتی ہے، بعض اور شبہے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ''صاحب الرصد باصبھان'' کا جملہ اپنی ساخت کے لحاظ سے ایک اور ثبوت مہیا کرتا ہے کہ اس کا اطلاق کسی کتاب بلکہ خود فلکی مشاہدات پر بھی نہیں کیا جا سکتا بہ ظاہر اسے (۴۶) ''صاحب الرصد'' پڑھنا چاہیے نہ کہ ''صاحب الرصد'' اور معنی یہ ہوں گے کہ وہ رصد گاہ کا مہتمم تھا۔ ابن رستہ نے [3] اس کا صراحت سے ذکر کیا ہے کہ اصفہان میں ایک رصد گاہ پائی جاتی تھی۔ اگر حاجی خلیفہ کے بیان پر واقعی اعتماد کیا جائے تو یہ باور کرنے کی طرف میلان ہو کہ ابو حنیفہ اس رصد گاہ کا کچھ عرصے تک مہتمم رہا۔ یوروپی اھل علم نے کم و بیش ایسا ہی خیال کیا ہے اور (تاریخ گزیدہ کے) بیان کردہ سنہ میں سے سو سال حذف کر کے انہوں نے بیان کے جزء دوم (یعنی رکن الدولہ سے معنون کیے جانے) کو رد کر دیا۔ اور یہ باور کرنے لگے کہ ابو حنیفہ ۲۳۵ھ

---

[1] مغرب کی فوقیت اور مشرق کی فطری فروتری کے مغرورانہ ادعا کا خدا نے مزا چکھایا۔ مشرقی مولف ہی نے اس تضاد بیانی کو محسوس کیا اور مغرب میں کراچکوفسکی کے سارے ہی پیشرو بھٹکتے رہے جیسا کہ کراچکوفسکی خود بیان کرتا ہے لیکن اسے اپنی تضاد بیانی پر تنبہ نہیں ہوتا۔ غلطی سے مبرا صرف خدا کی ذات ہے۔ (مترجم)

[2] ان بیانات نے نہ صرف فلوگل اور وستفلد کو غلطی میں مبتلا کیا، بلکہ اس سے رائسکے (Reiske) کو تاریخ ابی الفداء کے لاطینی ترجمے (ج ۲، ص ۲۶۷ تا ۲۷۷) حاشیہ ۲۷۷ میں شدید مشکلیں پیش آئیں۔ رائسکے کو کشف الظنون سے آگاہی نہ تھی اور جب اس نے دیربلو D' Herbelot کے ہاں (ص ۹۳۴، تحت کلمہ زیج) ۶۳۵ء کی غلط تاریخ دیکھی تو سخت الجھن میں پڑ گیا۔

[3] شائع شدہ بہ سلسلہ جغرافیہ ہائے عرب، نمبر ۷، ص ۱۶۲

Marfat.com

میں اصفہان میں تھا۔ براون(Browne) کی مہربانی سے اب حاجی خلیفہ کا ماخذ یعنی تاریخ گزیدہ ہماری دسترس میں ہے، اور جس عبارت پر اس نے تکیہ کیا تھا وہ فی الحقیقت اس میں ''حصہ علماء'' میں موجود ہے [1] اس میں دینوری کے متعلق حسب ذیل بیان ہے [2] ''منجم ابوحنیفہ دینوری، جو رکن الدولہ حسن بویہ دیلمی کا ہمعصر تھا، اس نے (رکن الدولہ) کے لیے ۳۳۵ھ میں اصفہان میں فلکی مشاہدے کیے اور ایک زیج مرتب کی۔ یہ شہادت اس اذعان کے ساتھ دی گئی ہے کہ اس میں کسی سہو کا امکان نہیں، اور ہمیں دو میں سے ایک بات قبول کرنی پڑتی ہے، یا تو یہ تسلیم کریں کہ تاریخ گزیدہ ایک ناقابل یقین طور شدید التباس میں مبتلا ہے (مگر یہ تسلیم کرنا دشوار ہے کیونکہ (رکن الدولہ اور ۳۳۵ھ کی) تاریخ بالکل ٹھیک بیٹھتی ہے اور اس طرح کوئی اندرونی تضاد بیانی نہیں پائی جاتی) یا یہ تسلیم کریں کہ ابوحنیفہ دینوری نام کا کوئی اور منجم بھی گزرا ہو (اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے) [3] اس دوسری متبادل صورت کو قبول کریں تو حاجی خلیفہ کو جو سہو ہوا ہے اس کی وجہ سمجھ میں آ جاتی ہے چنانچہ اس نے اپنے مذکورہ بالا اقتباس دوم میں (۴۷) لفظ زیج کے تحت تاریخ گزیدہ کا بیان ٹھیک نقل کیا ہے۔ کشف الظنون نے باب ''علم الرصد'' میں ابوحنیفہ کی طرف ایک کتاب منسوب کر دی ہے اور اس کا نام تک بیان کر دیا ہے مگر حمداللہ مستوفی قزوینی اس حد تک نہیں گیا تھا۔ البتہ (حاجی خلیفہ کے لیے) یہ ناگزیر تھا سو سال تاریخ میں سے کم کرے۔ ۳۳۵ھ کا ذکر کرنے سے ایک توارد کا مشاہدہ نہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ توارد شاید اتفاقی ہی ہے۔ لیکن ہے بہر حال عجیب۔ یاد رہے کہ عبدالرحمٰن صوفی کا بیان ہے کہ وہ ۳۳۵ھ ہی میں دینور گیا تھا جہاں لوگوں نے اسے وہ مکان بتایا

---

[1] تاریخ گزیدہ، مولفہ حمداللہ مستوفی قزوینی، طبع لایڈن ۱۹۱۰، ج ۱، ص ۸۰۲، س ۸ تا ۱۰، اس کے علاوہ اس تاریخ میں دینوری کا کہیں اور ذکر نہیں، حتیٰ کہ رکن الدولہ کے حالات (ص ۴۱۷ و مابعد) میں بھی کہیں اس کا نام نہیں۔

[2] اصل فارسی عبارت یہ ہے ''ابوحنیفہ دینوری، منجم معاصر رکن الدولہ حسن بویہ دیلمی بود۔ درسنہ خمس وثلاثین وثلثمایہ در اصفہان جہت او رصد بست و زیج ساخت''

[3] لیکن بدقسمتی سے سوتر کی تالیفوں میں اس کے مماثل کوئی اور نام نہیں ملتا۔

جس کی چھت پر سے ابو حنیفہ دینوری سالہا سال تک ستاروں کے مشاہدوں میں مشغول رہا۔ اس عجیب و غریب توارد سے گمان ہوتا ہے کہ شاید عبدالرحمٰن صوفی کی شہادت نے حمداللہ مستوفی اور حاجی خلیفہ کے بیانات کے تیار کرنے میں اس سے زیادہ حصہ لیا ہو جتنا بادی النظر میں خیال ہوسکتا ہے [1]

بہر حال، جو کچھ ذکر ہوا اس سے یہ ظاہر ہے کہ ابو حنیفہ دینوری کی اس کی دیگر بیان کردہ ہیئتی تالیفوں کے علاوہ ان دو میں سے پہلی کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ لفظ ''رصد'' سے کبھی کوئی کتاب مراد نہیں ہوتی اور جہاں تک دوسری کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حاجی خلیفہ کے ذہن میں وہاں ہمارا مولف نہیں بلکہ کوئی اور مولف ہے۔ ان بیانات ہی کی بنا پر یوروپی اھل علم نے یہ خیال کیا تھا کہ ابو حنیفہ اصفہان گیا تھا۔ اب اس نظریے کو ترک کر دینے کی ضرورت ہے کیونکہ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے اور نہ وہ کسی مستحکم اساس پر قائم ہے۔

اب ہم دینوری کی تاریخی تالیفوں پر پہنچتے ہیں۔ ان کی تعداد دو ہے۔

۱۹۔ کتاب البلدان:

ملکوں کے متعلق [2] اور

۲۰۔ کتاب الاخبار الطوال:

طویل خبروں کی کتاب [3]

---

[1] غالبًا کہنا یہ مقصود ہے کہ غائب دماغی اور سہو قلم سے حمداللہ مستوفی نے بجائے عبدالرحمٰن صوفی کے دینوری کا نام یہاں لکھ دیا ہے۔ (مترجم)

[2] الفہرست، ص ۷۸، س ۱۴ (جہاں لکھا ہے: ''کتاب البلدان کتاب کبیر'' یعنی کتاب البلدان ایک بڑی کتاب ہے)، یاقوت کی معجم الادباء، ج ۱، ص ۱۲۷، س ۳ (: ''کتاب البلدان، کبیر'' یعنی: کتاب البلدان جو بڑی ہے)، الاخبار الطوال کا مخطوطہ مدینہ ورق ۱/ب، ابن الانباری ص ۳۰۶، سیوطی، ص ۱۳۲، خزانۃ الادب، ج ۱، ص ۲۶، س ۸، نیز وستفلد کی جرمن کتاب ''عرب مورخین''، ص ۲۷، نمبر ۷۹ (۱)

[3] الفہرست، ص ۷۸، س ۱۵، یاقوت ج ۱، ص ۱۲۷، س ۵، الاخبار الطوال کا مخطوطہ مدینہ ورق ۱/ب۔ ☆

Marfat.com

(۴۸) ان میں سے آخر الذکر ہی وہ کتاب ہے جو تماماً ہم تک پہنچی ہو اور جس کو ہم اچھی طرح جانتے ہوں۔ اس دوسری کے برخلاف اول الذکر (کتاب البلدان) خاصی بڑی کتاب رہی ہوگی کیونکہ ہر (سوانح نگار) باقاعدہ طور پر اس کتاب کے لقب و صفت کے طور پر لفظ ''کبیر'' کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ صفت شاید اس لیے ہے کہ اس کتاب کو اسی موضوع کی ایک چھوٹی کتاب سے ممتاز کیا جائے [۱]۔ اس کتاب کے بارے میں بھی کچھ شبہے پائے جاتے ہیں۔ دیگر ماخذوں میں ''کتاب البلدان'' کا ذکر ہے تو حاجی خلیفہ [۲] اس کی جگہ صرف ''تاریخ ابی حنیفہ'' کا ذکر کرتا ہے۔ انہیں وجوہ سے، یہ خیال کرنا کہ اس سے دو الگ الگ تالیفیں (کتاب البلدان اور تاریخ ابی حنیفہ) مراد ہیں، کچھ ضروری نہیں، اور صفت ''کبیر'' سے ان کے ایک ہی ہونے کا تعین ہو جاتا ہے۔ مزید برآں کسی ماخذ میں بھی بہ یک وقت ان دونوں تالیفوں کا ذکر نہیں: کسی میں ایک کا تو کسی میں دوسری کا۔

☆ دمیری کی حیاۃ الحیوان ج ۱، ص ۸۱، س ۲۸ نیز ص ۹۸، س ۹، خزانۃ الادب ج ۱، ص ۲۶، س ۹، نیز وستفلد کی جرمن ''عرب مورخین'' ص ۲۷، نمبر ۷۹ (۲)، فلوگل کی مذکورہ جرمن ''کتب ہائے نحو'' ص ۱۹۲، نمبر ۱۷، بروکلمان کی جرمن تاریخ ادبیات عربی، ج ۱، ص ۱۲۳، ہیوار (Huart) کی فرانسیسی تاریخ ادبیات عربی، ص ۱۵۴، ڈیرن بورگ کا مقالہ مذکور، ص ۶۳ تا ۶۴، میولر کا مضمون در جرمن رسالہ (Moeller, Lit. Centralblatt) ۱۸۸۹ء ص ۶۱۳ و ۶۱۴، زلبر برگ کا مقالہ مذکور، ص ۲۳۱۔

[۱] یہاں کراچکوفسکی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر کتاب البلدان الکبیر'' نام ہوتا تو ایک ''کتاب البلدان الصغیر'' کا امکان پیدا ہو سکتا۔ یہاں صفت موصوف نہیں، مبتدا خبر کی صورت ہے۔ غالباً اس سے کوئی جغرافیہ کی کتاب مراد ہے۔ (مترجم)

[۲] کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۰۵، نمبر ۲۱۱۷: '' تاریخ ابی حنیفہ أحمد بن داود الدینوری المتوفی سنہ ۲۸۲، قال المسعودی: ھو کبیر الخ'' (یعنی دینوری کی تاریخ، مسعودی نے کہا ہے کہ یہ بڑی ہے الخ'')

[۳] الأخبار الطوال کا شائع کردہ گرگاس، ص ۴۳، س ۱۶ و ۱۷: ''فکان من قصۃ ماھو مشھور قد کتبناہ فی غیر ھذا الموضع '' (یعنی اس کا قصہ مشہور ہے اور ہم نے اسے ایک اور مقام پر لکھا ہے)

Marfat.com

''کتاب البلدان'' کی اشاعت کم ہوئی تھی۔ اس کے اقتباسات ہمیں کہیں نہیں ملتے۔ شاید وہ کتاب ''الاخبار الطوال'' سے قبل تالیف ہوئی تھی، کیونکہ اس آخرالذکر کتاب میں دینوری جہاں یمن کے بادشاہ اسعد کا ذکر کرتا ہے تو جس کتاب کا حوالہ دیتا ہے وہ غالباً یہی کتاب البلدان ہے۔

ا۔ الاخبار الطوال کا شائع کردہ گرگاس، ص ۴۳، س ۱۶ و ۱۷: "فکان من قصة ماھو مشھود قد کتبناہ فی غیر ھذا الموضع" یعنی اس کا قصہ مشہور ہے اور ہم نے اسے ایک اور مقام پر لکھا ہے)۔

Marfat.com

ابن قتیبہ کا دینوری کی کتابوں کو چوری سے اپنی طرف منسوب کر لینا

ابو حنیفہ دینوری کا تاریخی تالیفوں کے ذکر میں اس مسئلے سے چپ نہیں رہا جا سکتا کہ ابن قتیبہ نے دینوری کی کتابیں چوری سے اپنی طرف منسوب کر لی ہوں، جیسا کہ تمام ہی اہلِ علم[1] اس کی ایک تالیف کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ اس مسئلے سے کوئی حیرت نہ ہو گی جب ہم اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ ادبیات کی مملکت کے متعلق عربی ادبیات کا نقطۂ نظر کتنا وسیع تھا [2]۔ مسئلہ زیر بحث میں حالات بہت زیادہ مدد و معاون تھے، کیونکہ ابن قتیبہ جو ابو حنیفہ دینوری کا ہم عصر تھا، طویل عرصے تک دینور میں، جہاں ہمارا مولف بھی اس زمانے میں سکونت پذیر تھا، قاضی تھا۔ [۴۹] مگر یہ امر ذرا مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں اہلِ علم میں تاریخی تالیفوں کی حد تک علمی سارق و مسروق منہ کا رشتہ تھا۔ وستنفلد[3] کا گمان رہا ہے کہ یہ شاید [ابن قتیبہ کی] ''عیون الاخبار'' سے متعلق ہے۔ لیکن اب ''الاخبار الطوال'' اور ''عیون الاخبار'' دونوں کے چھپ [کر ہمارے سامنے آ] جانے کے باعث یہ خیال ترک کر دینا پڑا[4]۔ بے شبہ

---

1. دیکھو مثلاً ڈیرن بورگ کا مقالۂ مذکور، ص: ۶۳
2. اس کا شکریہ۔ لیکن ہمارے مشرقی ناظرین کی خدمت میں عرض ہے کہ علمی چوری مغرب میں بھی کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی رہی ہے۔ (مترجم)
3. وستنفلد کی جرمن ''عرب مورخین''، ص: ۲۷، نمبر ۷۹ (۲)
4. بروکلمان کی جرمن ادبیات عربی، ج ۱، ص ۱۲۳، حاشیہ (۱)۔ بروکلمان نے بے بنیاد طور پر فرض کر لیا ہے کہ حاجی خلیفہ نے کتاب الاخبار الطوال کے متعلق یہ ذکر کیا ہے، وہ تو تاریخ ابی حنیفہ کا ذکر کر رہا ہے۔ [کراچکوفسکی کا یہ اعتراض ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں۔ بروکلمان کے الفاظ ہیں: ''مسعودی کے بیان کو حاجی خلیفہ ج ۲، ص ۱۰۵، نمبر ۲۱۱۷، دہراتے ہوئے ابن قتیبہ پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے اسے نقل کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا تھا۔ یہ الزام مشکل سے درست ہے۔ ابن قتیبہ کی کونسی کتاب مراد ہے؟ اس کی عیون الاخبار تو یقیناً نہیں ہو سکتی''۔ [مترجم]

دینوری کی تاریخی کتابوں میں سے جو ہم تک نہیں پہنچی ہیں، مثلاً کتاب البلدان، ان کے متعلق علمی سرقے کا احتمال رہتا ہے۔ اگرچہ ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ تاریخی کتابوں کی حد تک اس خیال کو ترک کر دینا ہی بہتر ہوگا کیونکہ وہ حاجی خلیفہ کے ایک سہو پر مبنی ہے، اور یوروپی اہلِ علم اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتے رہے ہیں۔ جس فقرے [1] سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی وہ یہ ہے:

تاریخ ابی حنیفة الخ قال المسعودی ہو کبیر آخذ ابن قتیبة ما ذکرہ وجعله عن نفسه۔

تاریخ ابی حنیفہ ..... مسعودی نے کہا ہے کہ وہ بڑی ہے اور اس میں ذکر شدہ باتوں کو لے کر ابنِ قتیبہ نے اپنی طرف منسوب کرلیا ہے۔

مسعودی کا یہ بیان، جس پر حاجی خلیفہ تکیہ کرتا ہے، معلوم ہے۔ وہ "مروج الذہب" [2] میں موجود ہے، لیکن ایک خاص فرق کے ساتھ۔ وہ کسی معین کتاب کے متعلق اس کا ذکر

---

[1] کشف الظنون ج ۲، ص ۱۰۵، نمبر ۲۱۱۷

[2] فرانسیسی ترجمے کے ساتھ شائع کردہ باربیے دیمنار (Barbier de Meynard)، ج ۳، ص ۴۴۲ میں عبارت یوں ہے:

"..... ذکرنا جمله من ذلك فی کتابنا فی أخبار الزمان وقد جسرد ذلك فی کتابه أبو حنیفة الدینوری۔ وقد سلب ذلك ابن قتیبة فنقله الی کتبه نقلا و جعله عن نفسه۔ وقد فعل ذلك فی کثیر من کتب أبی حنیفة الدینوری هذا۔ وکان أبو حنیفة ذامحل من العلم کبیر"

ہم نے ان مسائل کا مجمل ذکر اپنی کتاب "فی الاخبار الزمان" میں کیا ہے۔ ان مسائل کو ابو حنیفہ دینوری نے بطور ایک تجرید کے اپنی کتاب میں بیان کیا تھا مگر ابن قتیبہ نے اسے سلب کرلیا اور اپنی کتابوں میں نقل کر کے اپنی طرف منسوب کرلیا۔ ابن قتیبہ نے اس ابو حنیفہ دینوری کی بہت سی کتابوں کے متعلق ایسا ہی کیا ہے حالانکہ ابو حنیفہ بڑا علمی پایہ رکھتا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

نہیں کرتا، اور مزید برآں وہ کتاب کا نام نہیں لیتا۔ یہ سب کشف الظنون کے مولف کی اپنی ایجاد ہے۔ بہرصورت یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسعودی کے ذہن میں ان دونوں مولفوں کی تاریخی کتابیں نہ تھیں۔ مسعودی کا یہ بیان اس موقع پر ہے جہاں اس نے مختلف مظاہر فلکی کا ذکر کیا ہے، مثلاً ستاروں کا اثر [۵۰] دنیا اور آدمیوں کی طبیعت پر، وغیرہ[ا]
ہم جانتے ہیں کہ عرب انواء (کارتیوں) کو ایک خاص اہمیت دیتے تھے، اور اس بارے میں ابو حنیفہ کی تالیف کو تو ادبیات عالیہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ گمان کرنا مشکل نہیں کہ اس طرح کی ہی کوئی کتاب ہوگی جو ابن قتیبہ کی طرف منسوب ہوگئی ہو۔

[مسعودی کی عبارت کا آخری حصہ بھی توجہ طلب ہے کہ ''دینوری کی بہت سی کتابوں کے متعلق'' ابن قتیبہ نے ایسا کیا ہے۔ کراچکوفسکی نے اس پر مطلق توجہ نہیں دی ہے۔ ہمارا خیال ضمیمے میں درج کیا جائے گا (مترجم)]

ا مروج الذهب کے جس باب میں یہ ذکر ہے، اس کا عنوان ہے:

الباب الحادی والستون ذکر القول فی تأثیر النيرين فی هذا العالم و جمل مماقيل فی ذلك ممالحق بهذا الباب۔

اکسٹھواں باب اس بات کے ذکر میں کہ چاند اور سورج کا اس عالم پر کیا اثر پڑتا ہے؟ اور اس باب سے ملحق چیزوں کے متعلق کہے ہوئے امور کا اجمالی بیان۔

[کراچکوفسکی کے اس بیان سے غلط فہمی پیدا ہوگی کہ دینوری یا ابن قتیبہ کے ہاں ستاروں کی تاثیر سے بحث ہوئی ہے۔ اس سے اوپر کے حاشیے کی عبارت کو کراچکوفسکی نے نامکمل نقل کیا ہے۔ اصل عبارت مسعودی کے ہاں یوں ہے:

فأما قبلة أهل المشرق المغرب والتيمن والجدی فقد ذکرنا جملا من ذلك فی کتابنا فی أخبار الزمان......

جہاں تک مشرق و مغرب اور شمال و جنوب والوں کے قبلے کا تعلق ہے، ہم نے اس کا مجمل ذکر اپنی کتاب فی اخبار الزمان میں کیا ہے......

اس کو ''تاثیر النیرین'' کے خرافات سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً اس سے دینوری کی ''کتاب القبلۃ والزوال'' مراد ہے'' (مترجم)]

مورخ کی حیثیت سے ابو حنیفہ دینوری کو کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی کیونکہ اسے جو جو القاب دیے جاتے ہیں ان میں مورخ کا لفظ نہیں پایا جاتا۔ اسے زیادہ تر نباتاتی یا لغوی کہا جاتا ہے، نادر صورت میں منجم بھی، لیکن مورخ کبھی نہیں۔ اس کے باوجود ابن قتیبہ کی نجومیاتی تالیفوں کے نام معلوم ہیں، اور ان کے گمنام رہ جانے کی وجہ شاید وہی ہے جو مسعودی نے بیان کی ہے اور جو جلدی ہی یعنی دونوں مولفوں [دینوری اور ابن قتیبہ) کی وفات کے بعد، بمشکل پچاس سال ا کے اندر دریافت ہوگئی۔ ابن قتیبہ کی نجومیاتی تالیفوں میں سے ایک کا نام ''کتاب الانواء'' ۲ ہی ہے، اور دوسری کا ''کتاب فی علم الفلک'' ۳۔ ظاہر ہے کہ یہ اذعان کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسعودی کے ذہن میں یہی دونوں تالیفیں رہی ہوں۔ لیکن مسعودی کے بیان کا اطلاق تو تاریخی تالیفوں کے متعلق اس سے بھی کم یقین کے ساتھ ہو سکتا ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ کی بنا پر سارے یوروپی اہلِ علم یقین کر بیٹھے تھے'' ۴۔

کتاب الاخبار الطوال

اب ہمیں صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ کچھ الفاظ اس کتاب کے بارے میں بھی کہیں جس کے باعث ہی یہ ساری بحث چھڑی اور یہ یادداشت مرتب ہوئی، یعنی

ا ابن قتیبہ کی وفات اور مروج الذهب کی تالیف کے مابین کی مدت مراد ہے۔ (مترجم)

۲ بروکلمان کی جرمن تاریخ ادبیات عربی، ج ۱، ص ۱۲۲ نمبر ۸، سوتر کی مذکورہ ''ریاضیات وھیئت داں''، ص ۳۱ نمبر ۵۷۔ [یہ کتاب اب حیدرآباد میں دائرۃ المعارف نے چھاپ دی ہے۔ (مترجم)

۳ سوتر کتاب بالا، حوالۂ بالا۔ [یہ کوئی الگ کتاب نہیں۔ کتاب فی الانواء ہی کو کتاب علم الفلک۔ یا زیادہ صحیح لفظوں میں کتاب علم الفلک۔ کہا جاتا رہا ہے، جیسا کہ کتاب الانواء کے مقدمے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (مترجم)

۴ مسعودی کا یہ چاہنا کہ اس باب میں علوم طبیعیہ سے بحث کرے، ان ناموں سے ثابت ہوتا ہے جو وہ ابو حنیفہ کے بعد سائنسی علوم کے متعلق بطور سند ذکر کرتا ہے (دیکھو صفحہ ۴۴۳)۔ چنانچہ یہاں وہ نام ملتے ہیں جو عربی نجومیات میں مشہور ومعروف ہیں (یعنی بطلیموس، الکندی، ماشاءاللہ [نومسلم یہودی]، ابومعشر، محمد بن کثیر، الفرغانی، البتانی وغیرہ)۔

Marfat.com

"کتاب الاخبار الطوال"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مشرق میں کبھی زیادہ مقبول نہ رہی، اگرچہ [ابو حنیفہ دینوری کی] تالیفوں کی فہرست میں [۵۱] حاجی خلیفہ کو چھوڑ کر باقی سارے ہی سوانح نگار اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ حاجی خلیفہ بھی دینوری کی "تاریخ" کے لفظ سے اسی کتاب کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال اس کتاب کے مخطوطوں کی قلیل تعداد [۱] سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ وہ زیادہ پھیلی نہیں، اور مورخ ابن العدیم نہ ہوتا، اور اس تاریخی کتاب کی قدردانی نہ کرتا تو اس کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہتا۔ ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ اس کے حوالے یا اقتباس دیگر کتابوں میں نہیں ملتے، سرگرم تلاش پر شاید ایسی کچھ مثالیں ملیں گی لیکن اب تک تو ہمیں صرف دو اقتباس ملے ہیں جو الدمیری کی کتاب کے تاریخی حصے میں ہیں[۲]۔ یہ مولف علوم طبیعی کا ماہر تھا،

---

[۱] اس دلیل سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ تین چار نسخے تو اچھی خاصی تعداد ہیں۔ کتنی ہی مشہور اور مقبول کتابیں ہیں کہ ان کا اب دنیا میں وجود نہیں۔ کتنوں ہی کو محض واحد نسخے کی بنا پر چھاپا گیا۔ ہر قوم کی زندگی میں بیرونی حملوں کی صورت میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ علم ضائع ہو جائے۔ یہودیوں میں توریت سے زیادہ مقبول و محترم کتاب کونسی ہوگی؟ بابل کے بخت نصر اور روما کے ٹیٹس نے ان پر حملہ کیا تو چن چن کر توریت کے مخطوطے جلا دیے اور اس طرح اصل توریت دنیا سے ناپید ہوگئی۔ مسلمانوں میں چھاپے کے رواج سے پہلے اولاً حروب صلیبیہ میں فرنگی قتل و غارت سے سابقہ رہا۔ پھر تاتاری سیلاب میں سقوطِ بغداد ہوا۔ اُدھر اندلس و صقلیہ میں بھی فرنگیوں کو عربی کتابوں سے خاص کر بغض رہا۔ معتبر لوگوں کی چشم دید بات سنی گئی کہ ۱۸۵۸ء جیسے روشن زمانے میں لال قلعے پر قبضے کے بعد انگریز کمانڈر نے مغلیہ شاہی کتاب خانے کی ساری کتابیں نکلوا کر ہولی جلائی۔ صرف چند طبی کتابیں حکیم اجمل خان مرحوم کے والد یا دادا کو اٹھا لیجانے کی اجازت دی۔ ابھی ۱۹۶۴ء میں پاریس کے اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ روسیوں نے وسط ایشیا میں بدھ مت کی ایک خانقاہ کے کتب خانے کو خاکستر کر دیا جہاں ایسی کتابیں بھی تھیں جن کا دنیا میں اب کوئی اور نسخہ باقی نہیں۔ قسمت کے ان حوادث کو کتاب کی مقبولیت سے کوئی تعلق نہیں۔ الف لیلہ سے زیادہ مقبول عوام کتاب کونسی ہوگی؟ اس کا بھی کوئی کامل نسخہ اب تک نہیں ملا۔ یا صلحنامۂ ورسای کے اصل دستخط شدہ نسخوں میں سے اب دنیا میں کوئی باقی نہیں حالانکہ یہ ۱۹۱۹ء کی چیز ہے۔ (مترجم)

[۲] حیاۃ الحیوان ج ۱، ص ۸۱، س ۲۶ تا ۳۱، نیز ص ۹۸، س ۹-۱۳، پہلے اقتباس میں خلیفہ

اسی لیے [۵۲] ابوحنیفہ دینوری کی دیگر تالیفوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور غالبًا! اس کی کتاب النبات سے استفادہ بھی کر چکا تھا۔ اشاعت سے قبل ''الاخبار الطوال'' یوروپی ادبیات میں بہت کم معروف تھی اور خود ۱۸۶۲ء میں فلوگل گمان کرتا رہا کہ اس کتاب سے مراد ''لمبی خبریں (حضرت محمدؐ کے ملفوضات)'' [۱] ہونگے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب کے چھپنے کے بعد بھی اس کی طرف توجہ زیادہ منعطف نہ ہوئی [۲]۔ لیکن جب

بقیہ حاشیہ:

عبدالملک کی وصیت کا، اور دوسرے میں خلیفہ مامون کے اوصاف کا ذکر ہے۔ ہم انہیں یہاں کاملاً نقل کرتے ہیں اور مربع قوسین میں ان الفاظ کو نمایاں کرتے ہیں جو الاخبار الطوال میں نہیں ہیں یا اختلاف کے ساتھ ہیں:

پہلا اقتباس، دمیری ۱/۸۱، س ۲۶ تا ۳۱ = الاخبار الطوال ص ۳۲۸، س ۱۱-۱۳ [ذکر ابو حنیفة فی الاخبار الطوال أن عبدالملک بن مروان أوصی ابنه الولید لماثقل فی مرضه فقال] یا ولید لا ألفینك اذا وضعتنی فی حفرتی 'دینوری + أن) تعصر عینیك کلأمة الولهاء [دینوری : الورهاء] بل اتزر و شمر والبس جلد النمر وادع الناس الی البیعة فمن قال برأسه کذا [أی لا] فقل بالسیف کذا [أی اضرب عنقه انتهی]۔

دوسرا اقتباس، دمیری ۱/۹۸ س ۹-۱۳ = الاخبار الطوال ص ۳۹۶، س ۳ تا ۸ : [قال فی الاخبار الطوال] کان [المأمون] شهما بعید الهمه، أبی النفس وکان نجم بنی [دینوری : ولد] العباس فی العلم والحکمة وکان قد [دینوری : وقد کان] أخذ من دینوری + جمیع] العلوم بقسط و ضرب فیها بسهم۔ وهو الذی استخرج کتاب اقلیدس [دینوری + من الروم] وأمر بترجمة و تفصیله وعقد المجالس فی خلافه للمناظرة فی الادیان والمقالات۔ وکان استفاذه فیها أبا الهذیل محمد بن الهذیل العبدی المعتزلی الذی یقال له] العلاف۔

[۱] فلوگل کی مذکورہ جرمن ''کتب ہائے نحو''، ص ۱۹۲، نمبر (۱۷)

[۲] ہمیں صرف دو تنقیدوں کا پتا چل سکا ہے، ایک انگ ڈرین بورگ کی جس سے ہم نے استفادہ کیا ہے، اور دوسری اے ہولر کی۔

چند تاریخی کتابوں کی تالیف میں اس سے استفادہ عمل میں آیا تو پھر اس کے مندرجات کی قدر و قیمت کو پوری طرح تسلیم کیا گیا۔ [لینن گراڈ کے] مخطوطات کی تفصیلی فہرست مرتب کرتے وقت ہی وکٹور روزن نے اس کی ساری اہمیت جانچ لی تھی ۱۔ پھر مذکورہ تاریخی تالیفوں میں ان سارے مباحث کی تحلیل کی گئی جن کا دینوری نے ذکر کیا ہے چنانچہ سکندر اعظم کا افسانہ ۲، ساسانی ۳ دور حکومت، [مسلمانوں کی] ابتدائی فتوحات ۴ بنی امیہ کی عام تاریخ ۵، اور اس خانوادے کے ابتدائی خلفاء ۶، اس عہد کی مذہبی

---

۱ اس کی فہرست مخطوطات لینن گراڈ، ص ۱۶

۲ نویلڈ یکے کی جرمن کتاب ''افسانہ سکندر کی تاریخ پر تازہ مواد''، ویانا ۱۸۹۰ء، ص ۳۵ و مابعد

Th. Neoldeke, Beitraege zur Geschiachte des Alexanderromans

۳ نویلڈ یکے کی جرمن ''ساسانی دور کے ایرانیوں اور عربوں کی تاریخ''، لایدن ۱۸۷۹ء

Th. Neoldeke, Geschichte der Perser und Araber zur Zeit der Sasaniden

اس کے علاوہ روٹ شٹائن کی جرمن ''حیرہ کا لخمی خانوادہ''، برلین ۱۸۹۹ء

Rothstein, Die dynastie der Lahmiden

اور کرسٹنسن کی فرانسیسی ''ساسانیوں کی شہنشاہی کوپنہاگن ۱۹۰۷ء

A. Christensen, L'Empire der Sassanides

۴ ولہاوزن کی جرمن ''اسلام کی قدیم تاریخ کا مقدمہ''، جو اس کی تالیف ''خاکے اور پیش عملیاں'' کی جلد ششم میں ہے، طبع برلین ۱۸۹۹ء

J. Wellhausen, Prolegomena zur aeltesten Geschichte des Islams (in: Skizzen und Vorarbeiten)

اور کائتانی کی اطالوی ''تاریخ اسلام'' تین جلدیں، میلان ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۱ء [اس کی بعد میں مزید جلدیں چھپیں (مترجم)

L. Caetani, Annali dell'Islam

۵ ولہاوزن کی جرمن ''عربی سلطنت اور اس کا زوال''، برلین ۱۹۰۲ء

J. Wellhausen, Das arabische Reich und seine Sturz

۶ لامنس کے مقالے بیروت کے فرانسیسی رسالے ''کلیۂ شرقیات کا مجموعہ'' جلد دوم تا پنجم، بیروت ۱۹۰۶ تا ۱۹۱۱ء میں۔

H. Lammens in: Melanges de la Faculte Orientale

Marfat.com

تحریکیں[1]، بنی عباس کے لیے دعایہ[2]، وغیرہ۔ ان مولفوں کے طفیل اب اس کی ضرورت نہ رہی کہ الاخبار الطوال کے ہر باب کی تفصیل سے تحلیل کی جائے اور یہ امر مشتبہ ہی ہے کہ اب بھی ایسا کوئی شخص پایا جاتا ہو جو [۵۳] ہولر کی طرح یاس انگیز ہو۔ مولف مذکور[3] نے ۱۸۸۹ء میں لکھا تھا کہ تاریخ ابو حنیفہ دینوری کی اہمیت اس وقت تک کے لیے تھی جب تک کہ طبری کی تاریخ شائع نہ ہوگئی، اور یہ کہ یہ اہمیت اس بات کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے کہ [الاخبار الطوال سے] تاریخ ابن الاثیر کے متن کی تصحیح میں مدد ملتی ہے۔

الاخبار الطوال کے مندرجات سے اب سب واقف ہو چکے ہیں[4] دیگر عرب

---

۱ فان خلدر کی ولندیزی کتاب ''مختار جھوٹا نبی'' لایدن ۱۸۶۸ء

Van Gelder Mohtar de valsche profeet

اور ولہاوزن کی جرمن ''قدیم اسلام میں مذہبی اور سیاسی مخالفت کی پارٹیاں''، برلین ۱۹۰۱ء

J. Wellhausen, Die religioes-politischen Oppositionsparteien im alten Islam

۲ فان فلوٹن کی ولندیزی ''خراسان میں عباسیوں کا بول بالا''، لایدن ۱۸۹۰ء

G. van Vloten, De opokomst der Abbasiden in Chorasan

اور اسی مولف کی فرانسیسی ''عربی غلبہ، شیعیت اور اموی دور خلافت میں مسیح موعود کے متعلق اعتقادات''، امسٹرڈام ۱۸۹۴ء

Recherches sur la domination arabe, le Chiisme et les croyances messianiques sous le khalifate des Omsyades

۳ اس کا مقالہ جرمن رسالہ Literaraishes Centralblatt ۱۸۸۹ء، ص ۶۱۴ میں۔ مگر یہ رائے خود اس مقالے کے آخری ریمارک سے کچھ زیادہ ہم آہنگی نہیں رکھتی کہ: ''ایسے پرانے مولف کی کتاب کی بہر حال لسانیاتی اور تاریخی تلاش و تحقیق کے سلسلے میں قدر و قیمت ہوتی ہے''۔ رہا ہولر، اس کی ناموافق رائے خاص کر فان خلدر کے مذکورہ ولندیزی رسالے پر مبنی ہے جو اسی سال شائع ہوا تھا، لیکن اب اس کے جواب میں ولھاوزن کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے اپنی جرمن ''عربی سلطنت اور اس کا زوال'' میں اس بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اور جو دینوری کے بیانات کو زیر بحث (اموی) دور کے متعلق زیادہ موافقانہ طور پر جانچتا ہے۔

۴ مثلاً روزن کی فہرست مخطوطات، ص ۱۵، ڈیرن بورگ کا مقالہ مذکور، ص ۳۰۔ بروکلمان کی تاریخ ادبیات عربی، ج ۱، ص ۱۲۳ [اس میں مینڈنیکوف کی روسی کتاب ''فلسطین'' کا بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ اس میں دینوری کے بہتر مختصر حالات دے کر الاخبار الطوال کی تحلیل کر دی گئی ہے۔ (مترجم)]۔

مولفوں کی طرح، دینوری کے ہاں بھی تاریخ حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبروں کے قصوں اور ایران ویمن کی خرافات بھری تاریخ کو اس کتاب میں کوئی اساسی اہمیت نہیں دی گئی ہے اگرچہ جگہ جگہ اس میں بھی بعض اہم واقعات مل جاتے ہیں۔ مثلاً وہ قصہ جو یقیناً فرضی ہے [1]، اور جس میں حضرت عبداللہ بن الصامت نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں ان کو قیصر روم کے ہاں بطور سفیر بھیجا گیا (مطبوعہ عربی متن، ص ۲۱)۔ سکندر اعظم کے عہد کے حالات بہت بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں اور مولف نے اس افسانے کو تفصیل سے بیان کیا ہے (ص ۳۱ - ۴۱)۔ اس نے اہم اہم واقعات کو لے کر ساسانی دور کے بڑے خدو خال بیان کیے ہیں تا آنکہ ساسانی حدود پر عربی حملے شروع ہوں۔ اس لمحے سے دینوری کی تاریخ درجۂ اول کی اہمیت اختیار کر لیتی ہے (ص ۱۱۶)۔ یہ قابل ذکر ہے کہ دینوری حضرت محمدؐ کے حالات بیان نہیں کرتا اور صرف چند سطروں پر اکتفا کرتا ہے [2]۔ تاریخ خلفاء سے اسے دلچسپی صرف اس حد تک ہے کہ ایران کس طرح فتح ہوا۔ چنانچہ وہ حضرت خالد بن الولید کی مہم کو زیادہ تفصیل سے بیان کرتا ہے (ص ۱۱۷ الخ)۔ اسی طرح حضرت ابو [۵۴] عبیدہ کی مہم کو (ص ۱۱۹ الخ) قادسیہ اور نہاوند کے معرکے (ص ۱۲۷ تا ۱۳۳ اور ص ۱۴۱ تا ۱۴۵)۔ ایرانی شہنشاہی کے زوال کے ذکر کے بعد وہ مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو حضرت عثمان کی وفات کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ پھر جنگِ صفین کے حالات (ص ۱۶۴ و مابعد) سے اس تاریخ کا اہم ترین حصہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی باہمی

---

[1] اس قصے کا اساسی مسئلہ کہ پیشینگوئیوں کو تصویروں کی البم کی صورت میں تیار کیا گیا ہو، اب خود بیزنطینی تاریخوں میں بھی مل گیا ہے۔ اسلامی حالات بھی حدیث کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان پر میں نے فرانسیسی میں ایک تفصیلی مضمون لکھ کر کراکو (پولینڈ) کے رسالۂ مستشرقین میں شائع کیا ہے: ''حضرت ابوبکر کی سفارت ہرقل کے ہاں اور بیزنطینی کتاب پیشینگوئی ہا'':

Une ambassade du calife Abu Bakr aupres de l'empereur Heraclius et le livre byzantin de la prediction des destinees, in: Polia Orientalia, II, 29-42, 1961.

[2] روزن نے اپنی فہرست (ص ۱۵) جس میں عبارت کا اس سلسلے میں ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ عہدِ نبوی کے کچھ تاریخی حالات ص ۷۵، س ۱۷ تا ص ۷۶، سطر ۶ تک میں بھی ہیں۔

Marfat.com

حریفی اور حضرت علیؓ کی خوارج سے جنگ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں خلیفوں کی وفات تک اس تفصیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے (ص ۲۳۷ اور ص ۲۴۰)۔ پھر اموی تاریخ سے اس کو دلچسپی صرف اس سلسلے میں ہے کہ اس عہد کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کو نمایاں کرے۔ پھر وہ زیادہ تفصیل سے امام حسینؓ کے حالات (ص ۲۵۷ ومابعد) اور ان کی شہادت کو (ص ۲۷۰ ومابعد) بیان کرتا ہے۔ پھر آزارقہ (خوارج) کی بغاوت (ص ۲۷۸) اور خاص کر مدعی نبوت مختار کے (ص ۲۹۶ تا ۳۱۴) حالات ہیں۔ عبدالملک (ص ۳۲۸) اور ولید (ص ۳۳۱) کے حالات میں گویا صرف ان کی موت پر اکتفا ہے۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ذکر ہے (ص ۳۳۳)۔ پھر شیعی بغاوت کے آغاز کا ذکر (۳۳۴ ومابعد)، خاص کر اس کے قائد اعظم ابو مسلم خراسانی کے حالات (ص ۳۳۸ ومابعد)۔ تاریخی نقطہ نظر سے اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ ابو حنیفہ دینوری کی کتاب کا یہ حصہ یعنی ساسانیوں کی تاریخ اور دور اموی کے وسط کی بغاوتیں ہی وہ حصہ ہیں جو سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے [1]۔ مروان کی وفات (ص ۳۶۵) اور ابو العباس السفاح کے انتخاب (ص ۳۶۸) سے عباسی خانوادے کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس سلسلے میں بھی دینوری مسلسل حالات کی جگہ صرف خاص خاص واقعات پر اکتفا کرتا ہے۔ چنانچہ شہر بغداد کی تعمیر (ص ۳۷۹)، ابو مسلم خراسانی کی موت (ص ۳۷۸)، نفس زکیہ کی بغاوت (ص ۳۸۱)، امین اور مامون کے حالات (ص ۳۸۳ تا ۳۹۵)، بابک خرمی کی بغاوت (ص ۳۹۷) دیگر حالات کی طرف محض اشارہ ہوتا ہے۔ اور جتنا جتنا وہ اپنے ہمعصر زمانے سے قریب آتا جاتا ہے، حالات اتنے ہی مختصر ہوتے چلے جاتے ہیں اور معتصم کی وفات پر جو ۲۱۸ میں ہوئی، اور جو ابو حنیفہ کی ولادت سے کچھ بہت پہلے کا واقعہ نہیں، یہ قصہ یکایک ختم ہو جاتا ہے۔

عرب اہل علم کے لیے تاریخ ایک من بھاتا موضوع ہے۔ مذکورہ بالا خلاصے سے معلوم ہوگا کہ اس علم میں بھی ابو حنیفہ دینوری نے اپنی جدت پوری طرح برقرار رکھی

---

[1] فان فلوٹن کی مذکورہ ولندیزی "خراسان میں عباسیوں کا بول بالا" ص ۹۸، ۱۰۱ مع نوٹ ۱، ص ۱۳۸ مع نوٹ ۴ وغیرہ۔

Marfat.com

ہے۔ اس کی تاریخ بے شبہہ ''طویل خبروں'' پر مشتمل ہے۔ وہ حالات کبھی سنہ وار نہیں بیان کرتا۔ کسی واقعے میں یہ بھی کبھی نہیں بتاتا کہ اس میں کوئی اختلاف روایت ہو۔ وہ ہمیشہ حالات کو ایک مسلسل قصے کے طور پر بیان کرتا چلا جاتا ہے، لیکن صرف ان امور کے متعلق جن سے اسے دلچسپی تھی۔ اس طرح اس کتاب کو ایک واقعی ادبی قدر و قیمت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے وہ شروع سے آخر تک ایسی ہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ، اگرچہ دینوری کو زیادہ تر سائنس (ریاضی، نباتیات وغیرہ) سے دلچسپی تھی، اسے بڑا ادبی ملکہ بھی حاصل تھا۔ ثبوت کے طور پر مختار کے حالات، یا خراسان میں امویوں کا زوال، اور نصر بن سیار کی جنگ قابل ذکر ہیں۔ اس آخر الذکر میں خود ہم جدید مغربیوں کو اعلیٰ ترین ڈرامائی منظر نگاری نظر آتی ہے۔ بعض وقت قصے کی پُر جوش کیفیت سے خود بھی متاثر ہو کر وہ اپنی رائے بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے [1]۔ ادبی مہارت کے باوجود وہ بعض وقت کوئی واقعہ ''ثم کان'' [2] (پھر یوں ہوا کہ) سے شروع کرنے میں تامل نہیں کرتا، خواہ یہ نیا واقعہ اس کے عین پہلے سے واقعے سے قطعاً بے تعلق ہی کیوں نہ ہو۔

مزید براں، ابو حنیفہ کا اسلوب یورپی اہل علم کے لیے زیادہ سہولت بخش نہیں۔ وہ کبھی کسی واقعے کی کامل سند نہیں بیان کرتا اور شاذ ہی اپنے ماخذوں کا ذکر کرتا ہے جیسا کہ اس اشاریے (انڈکس) کی ورق گردانی سے نظر آ جائے گا۔ ماخذوں میں زیادہ معروف مولف ہی ہیں [3]۔ لیکن جو اقتباسات وہ دیتا ہے ان سے یہ پتا چلانے کا قطعاً امکان نہیں ہوتا کہ کس نوبت تک کس اقتباس سے اس نے استفادہ کیا ہے۔ ایران کے حالات پر عربی ماخذوں کے علاوہ وہ ایرانی ماخذوں سے بھی استفادہ کرتا ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نویلڈیکے [4] کی تحقیقات سے ثابت ہو گیا

---

[1] مثلاً عربی متن کا صفحہ ۸۵، س ۴، ص ۱۰۳، س ۱۴

[2] مثلاً ص ۱۴۱، س ۷، ص ۱۴۸، س ۵، ص ۱۴۹، س ۹، ص ۱۶۴، س ۱۱۔

[3] مثلاً ھیثم بن عدی، الکلبی، الکیسائی، الشعبی، الاصمعی، عبید بن الشریہ وغیرہ۔

[4] نویلڈیکے کی، کورہ بزمن ''ساسانی دور کے ایرانیوں اور عربوں کے حالات''، صفحہ XXV و مابعد

ہے کہ دینوری نے افسانوی [۵۶] کتابوں کو کم یا زیادہ تصحیح کر کے بطور ماخذ استعمال کیا ہے [1]۔ اس نے سند باد کے قصے کے پہلوی ایڈیشن کے بعض آثار بھی محفوظ کیے ہیں [2] اور اسے قصۂ کلیلہ ودمنہ سے بھی اچھی واقفیت ہے [3]۔ اس کے فارسی زبان سے واقف ہونے کا کافی ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں فارسی اقتباسات بہت کافی دیتا ہے [4]۔ اس کے فارسی الاصل ہونے کا اس سے مزید ثبوت مل جاتا ہے، ورنہ اس کے دادا کا نام ونسند ہونے کے باوجود بعض اہلِ علم نے اس پر شبہہ ظاہر کیا تھا [5]۔ یہ مسئلہ کہ اس نے اپنی کتاب کے دیگر حصوں کے متعلق معلومات کہاں سے حاصل کیے ہیں، اس کا پتا چلانا کافی مشکل ہے۔ اس کے لیے ہر ہر مسئلے کے متعلق مستقل تلاش کرنی پڑے گی۔ اوپر جن [فرنگی] تاریخی تالیفوں کا ذکر ہوا، ان میں ایک حد تک یہ کام انجام دیا جا چکا ہے [6] اور جن کو اس سے دلچسپی ہو وہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ا کیا اچھی دلیل کہ مجوسیوں کے افسانوں کا محرف تذکرہ مسلمانوں کے سنجیدہ اور حوالوں کے ساتھ بیان شدہ حالات سے بھی زیادہ اہم ہیں! (مترجم)

۲ صفحہ ۱۴۵، س ۱۳ ومابعد [بظاہر اس حوالے میں طباعتی غلطی ہے (مترجم)] اس بارے میں ہورو وٹس (J. Horowitz) نے جرمن رسالہ ZDMG ۱۹۱۱ ج ۶۵، ص ۲۸۷ تا ۲۸۸ میں جو ریمارک کیا ہے وہ متاخر چیز ہے۔ دینوری کی اساس پر یہ قصہ اس سے بھی پہلے نویلڈ کیے نے ZDMG ہی کی جلد ۳۳ ص ۵۱۳ ومابعد میں شائع کر دیا تھا۔ (دیکھو اولڈن بورگ S. Oldenburg کا بیان ZDMG ہی کی ج ۶۵، ص ۶۲۰ میں)

۳ عربی متن، ص ۸۰، س ۱۲

۴ ص ۳۲، ۵، ص ۶۰، س ۱، ص ۷۳، س ۱۰، ص ۱۰۵، س ۱۸، ص ۱۳۰، س ۳، ص ۱۳۳، س ۲۱، ص ۳۵۱، س ۲۱، ۲۲، ص ۳۶۰، س ۳ ایک مرتبہ تو اثنائے عبارت میں وہ فارسی لفظ ''باغ'' بھی استعمال کرتا ہے (ص ۱۱۴، س ۱۹) ایک اور مرتبہ اس میں ایک پہلوی اقتباس بھی آیا ہے (ص ۵۷ س ۱۵)

۵ اشترا سیورگ کا [مرحوم] جرمن رسالہ Zeitschr' fuer Assyriologie ۱۹۱۰، ج ۲۶، ص ۲۲۹۔

۶ مثلاً اب ہم جانتے ہیں کہ ۱۳ تا ۲۳ھ کے حالات پر ابوحنیفہ نے زیادہ تر کتب ہائے مدینہ کی روایتوں پر اعتماد کیا ہے۔ دیکھو کاکانی کی اطالوی تاریخ اسلام، ج ۳، ص ۷، ف ۵، (نیز س ۱۵۱، ف ۱۵۸)، وغیرہ۔

Marfat.com

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس سے بہ آسانی یہ نظر آ جاتا ہے کہ جس موضوع میں دینوری کو زیادہ شہرت نہ تھی، خود اس کے متعلق بھی اس کی واحد کتاب سے نہ صرف ہمیں بڑے قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوتے ہیں، بلکہ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ابو حنیفہ دینوری اپنی جدت برقرار رکھنے میں کس طرح کامیاب ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہمارا افسوس اور بڑھ جاتا ہے کہ ان موضوعوں پر جن میں وہ سند سمجھا جاتا تھا، اس کی کتابیں ہم تک نہیں پہنچ سکیں، خاص کر اس کی بے مثل ''کتاب النبات''[1]۔

سینٹ پیٹرسبورگ [حال: لینن گراڈ] دسمبر ۱۹۱۱

---

[1] اس کتاب کی دو جلدیں مل گئی ہیں اور تادمِ تحریر کچھ حصہ چھپ بھی گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھو آگے ہمارا ضمیمہ (مترجم)

Marfat.com

ضمیمہ

تمہید:

تالیف اور ترجمے میں فرق ہوتا ہے۔ مجھ سے کراچ کوفسکی کے ترجمے کی خواہش کی گئی اس لیے مختصر حاشیوں کو چھوڑ کر اسی کے خیالات کو اسی کی ترتیب کے ساتھ من و عن پیش کرنا پڑا۔ لیکن اردو بورڈ نے از راہ عنایت اس کی بھی اجازت دی ہے کہ ضروری باتوں کا اضافہ کروں اس لیے یہ ضمیمہ مربوط بیان کی جگہ مختلف مسائل کا مجموعہ ہوگا۔

الاخبار الطوال کی اہمیت اور خامی:

یہ ایک تاریخی کتاب ہے جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا مولف ایک مسلمان تھا۔ اس لیے اولاً یہ یاد دلانا شاید بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے علم تاریخ کی کیا خدمت کی، اور اس میں دینوری کا کیا حصہ ہے؟

جیسا کہ اشپرنگر نے اب سے صدی بھر پہلے اعتراف کیا تھا، حق و باطل میں امتیاز کے لیے قانونِ شہادت انسانی سماج میں بہت عرصے سے پایا تو جاتا ہے، لیکن سابق میں وہ صرف عدالتوں میں برتا جاتا تھا، مسلمان ہی وہ پہلی قوم ہیں جنہوں نے قانونِ شہادت کو تاریخ پر بھی منطبق کیا تاکہ ہر ہر تاریخی واقعے کے ایک، دو، تین جتنے چشم دید اور گوش شنید گواہ مل سکتے ہیں ان کے بیان کی اساس ہی پر اس واقعے کو نقل کیا جائے۔ اس طرح تاریخ، افسانوں کی جگہ، قابل اعتماد حقائق کا مجموعہ بن سکی، اور ہر ناظر کے لیے اس کا موقع رہا کہ بیان شدہ ماخذوں کو پرکھ کر خود مولف کے خلاف بھی رائے قائم کر سکے۔ مسلمانوں نے ہر ہر واقعے کی ''مکمل'' سند پیش کرنی ضروری قرار دی یعنی حادثے کو برموقع معلوم کرنے والے سے لے کر مولف کے زمانے تک کے سارے درمیانی وسائل، روایت اور واسطہ ہائے خبر رسانی صراحت سے بیان ہوں۔ تاریخ کا یہ

Marfat.com

بلند معیار حق یہ ہے کہ آج بیسویں صدی میں بھی کسی اور متمدن قوم میں نہ آ سکا۔ اس نقطۂ نظر سے الاخبار الطوال کی قیمت ابن اسحاق، طبری وغیرہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ تسلی کا واحد امر یہ ہے کہ دینوری کو ثقہ راوی تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے یہ چیزیں خود گھڑی نہ ہوں گی۔ دوسروں سے سنے ہوئے واقعات کو محمد حسین آزاد کی قصص ہند کی طرح اچھے ادیبانہ انداز میں، کسی قدر نمک مرچ کے ساتھ پیش کر دیا ہوگا۔

دوسری اہم خدمت مسلمانوں نے تاریخ کی یہ کی کہ اس کو مینڈک کے کوئیں اور گرگٹ کی باڑ کی جگہ ایک انسانیت کے شایانِ شان اور عالمگیر چیز بنایا۔ ان سے پہلے کی قوموں کو بھی تاریخ سے دلچسپی تھی لیکن تنگ نظری اتنی تھی کہ اپنے سوا گویا دنیا میں کسی اور قوم، کسی اور ملک کا وجود ہی نہیں۔ تاریخ کو ابتدائے آفرینش سے شروع کرنا، پھر اولین انسان حضرت آدم سے لے کر (اپنے اپنے وسائل اور امکانات کے مطابق) دنیا کی ساری قدیم اور ہمعصر قوموں کے حالات کو بیان کرنا، یہ مسلمانوں نے شروع کیا۔ یہ اس حقیقت کو یاد دلانا تھا کہ بنی آدم اعضائے یکدیگر اند۔ بین الاقوامی عمل و ردعمل سے تاریخی دھارا جس جس جگہ رخ بدلتا ہے، اس کو سمجھنے کا موقع ملنے لگتا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ اسلامی تعلیم کے باعث اس کے سوا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اسلام میں خدا ''ربِ بنی فلاں'' نہیں بلکہ ''رب العالمین'' کہلاتا ہے۔ پیغمبر ''فلاں گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں'' کے لیے نہیں ''کافۃ للناس'' اور ''رحمۃ للعالمین'' ہوتا ہے۔ عالمگیر تاریخوں میں رشید الدین بن فضل اللہ کو بڑی اہمیت رہے گی کہ اس نے خلفاء کے ساتھ پوپوں، سلاطین کے ساتھ پیغمبروں، مسلمانوں کے ساتھ رومی، بیزنطینی، ہندی، چینی، ایرانی، تورانی غرض دنیا کی ساری ہی متمدن قوموں کے باتصویر حالات، ان کے اپنے مولفوں کی لکھی ہوئی تاریخوں سے اقتباس کر کے بیان کیے ہیں۔ یہ ذرا بعد کی چیز ہے۔ اس سے قبل طبری (وفات ۳۱۰ھ) نے بھی اپنے محدود تر وسائل سے ایسی ہی کوشش کی تھی۔ لیکن دینوری (ف ۲۸۲ھ) کا زمانہ تو اس سے بھی پہلے کا ہے۔ اس طرح دینوری کو ان اولین مولفوں میں شمار کرنا پڑتا ہے جنھوں نے تاریخ میں عالمگیریت پیدا کی اور عالمگیریت والی قوم کے شایانِ شان بنایا۔

Marfat.com

الاخبار الطوال سے قطع نظر، دینوری کو ایک اور اہمیت حاصل ہے۔ اسلام سے قبل یونانیوں نے نباتیات کو کافی ترقی دی تھی۔ لیکن ان کی شہرۂ آفاق کتابوں کے عربی ترجمے سے بھی قبل دینوری نے چھ ضخیم جلدوں میں ایک نباتیاتی انسائکلو پیڈیا لکھا تھا اور زلبر برگ وغیرہ مغربی مولف بھی اب تسلیم کرتے ہیں کہ یونان کے ہزار سالہ علم کا نتیجہ، مسلمانوں کے دو سو سالہ علم کے مقابلے میں پھیکا پڑ گیا۔ لیکن نباتیات سے بحث کا محل دوسرا ہوگا۔ نکلیر نے تاریخِ طب عربی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یونانی تراجم کے شروع ہونے سے بھی پہلے مسلمانوں کے علم کی یہ ترقی غالباً جندیسابور کے ایرانی مدرسۂ طب کی رہینِ منت ہوگی۔ لیکن یہ مدرسہ دینوری کی ولادت سے دو ڈھائی سو سال پہلے بند ہو چکا تھا۔ اس لیے کسی بیرونی تاثیر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔

دینوری کے حالات:

اوپر کراچ کوفسکی کا مقدمہ پیش کر دیا گیا۔ یہ اب سے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ قبل، اس کی نوجوانی اور پروفیسر بننے سے بھی پہلے کی علمی کاوش ہے۔ اس کا تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس میں مذہبی تعصب اور اسلام دشمنی نہیں ہے، لیکن مشرق و مغرب کا تعصب بڑا شدید ہے جو اس کے علم و فضل پر ایک داغ بن گیا ہے۔ خیر اس کی یادداشت کی اشاعت کے بعد سے کچھ نئے ماخذ معلومات دستیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً القفطی کی "انباہ الرواۃ فی اخبار النحاۃ" چھپ گئی ہے [1]۔ التمیمی الغزی کی "الطبقات السنیۃ فی تراجم السادۃ الحنفیۃ" میں حنفی فقہاء کے حالات میں دینوری کا بھی تفصیلی ذکر ہے اور ابن شہبہ کی "طبقات اللغوین والنحاۃ" کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔ (اس کے مخطوطے استانبول وغیرہ میں ہیں)۔ کراچکوفسکی نے ایک کتاب کا سرسری ذکر کیا ہے۔ ابو القاسم علی بن حمزہ البصری نے "التنبیہات علیٰ اغلاط الرواۃ" لکھی۔ اس کا قدیم ترین نسخہ مصر میں ہے۔ اس کی نقلیں لندن، اشٹراسبورگ اور ییل Yale (امریکہ) میں ہیں۔

---

[1] اس کی ج ۱، ص ۳۱ تا ۳۳ پر دینوری کے حالات میں وہاں ایڈیٹر نے تلخیص ابن مکتوم، اور حاجی خلیفہ کی سلم الوصول میں بھی سوانح عمری کے ہونے کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

اس میں حسب ذیل باب ہیں:

۱۔ التنبیہ علیٰ مافی نوادر أبی زیاد الکلابی الأعرابی
۲۔ " نوادر أبی عمرو الشیبانی
۳۔ " کتاب النبات لأبی حنیفۃ الدینوری
۴۔ " کتاب الکامل للمبرد
۵۔ " کتاب الفصیح لأبی العباس ثعلب
۶۔ " کتاب غریب المصنف لأبی عبید القاسم بن سلام
۷۔ " کتاب اصلاح المنطق لابن السکیت
۸۔ " کتاب المقصور والممدود لابی العباس بن محمد بن ولاد

اس کا تیسرا باب کلیہ دینوری کی بعض صرفی نحوی غلطیوں کے متعلق ہے۔ مگر متعدد دیگر ابواب میں دوسروں کی غلطیاں دکھانے کے لیے دینوری سے استدلال بھی کیا گیا ہے۔ ابن سیدہ کی کتاب المخصص میں "قال المتعقب" کر کے اس کو کئی بار نقل بھی کیا گیا ہے۔ ایک اشتہار میں ذکر ہوا تھا کہ مولانا عبدالعزیز میمن اسے ایڈٹ فرما رہے تھے لیکن پتا نہیں ابھی چھپی یا نہیں۔ لگے ہاتھوں یہ اشارہ کرتا چلا جاؤں کہ تاج العروس میں لفظ "نضب" نضب کے تحت اور نبض کے ہم معنی ہونے کی ایک توجیہ دینوری کے حوالے سے کرتے ہوئے مولف نے کہا ہے کہ دینوری کو نباتیات کی بے شک مہارت تھی مگر صرف ونحو میں وہ کوئی سند نہیں، اس کا بیان اس سلسلے میں غلط اور بے بنیاد ہے۔

دینوری کے حالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے طبع اول اور طبع دوم میں بھی ہیں۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کے لیے بھی ترجمے کی جگہ اس پر ایک خصوصی مضمون لکھوایا گیا ہے۔ الاخبار الطوال سے متعلق تو نہیں لیکن دینوری کی کتاب النبات کے متعلق حالیہ سالوں میں اردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور ترکی میں بہ کثرت مقالے چھپے ہیں۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ان کی یہاں تفصیل دیتا۔ البتہ خود کتاب النبات کی دستیابی کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔

۱۹۴۶ء میں مجھے اس کا ایک ٹکڑا مدینۂ منورہ میں کتاب خانہ عارف حکمت میں

Marfat.com

ملا۔ دو سال بعد یورپ میں اس کی اشاعت کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کی جلد پنجم جامعۂ استانبول کے کتاب خانے میں ملی ہے اور ایڈٹ ہو رہی ہے۔ چند سال بعد جلد سوم کے بھی جامعۂ ییل Yale امریکہ میں ہونے کا پتا چلا۔ حلب کے ایک کتب خانے کی فہرست میں اس کے کامل نسخے کا ذکر ہے لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے وہ لاپتا ہے، معلوم نہیں کسی علمی چور کے ہاں ہے یا تلف ہوگئی۔ اس کی تحلیل ضروری ہے۔

جلد پنجم کے شروع میں چند ابواب ہیں مثلاً کمان بنانے میں کونسے پودے استعمال ہوتے ہیں، وغیرہ۔ تقریباً وسط میں حروف تہجی پر قاموس نباتات شروع ہوتی ہے۔ الف سے زے تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔ جلد ششم میں سین سے یے تک کے پودے ہونے چاہئیں، لیکن وہ جلد تا حال ملی نہیں ہے۔ اس طرح اب اس کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ دینوری کی کتاب کی ساڑھے چار جلدیں چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل تھیں، مثلاً پہاڑی پودے، میدانی پودے، رنگ کے پودے، مسواک کے پودے وغیرہ وغیرہ، اور ڈیڑھ جلد حروف تہجی پر سارے پودوں کو ایک قاموس کی شکل میں مرتب کرنے پر مشتمل تھی۔ اس میں ہر پودے کی شکل، مسکن، خاصیتیں وغیرہ بھی بیان ہوئی ہیں اور عربی ادبیات، نظم و نثر میں اس کا ذکر ہوا ہے تو اس کی بھی تفصیل ہے۔

ایک آخری قابلِ عرض چیز یہ ہے کہ عربی کی ساری لسانی، طبی اور نباتی لغتوں میں دینوری کے اقتباسات ہیں۔ مجھے اس سے دلچسپی ہوئی تو ایسے سارے اقتباس جمع کیے جو بحذفِ مکررات ڈیڑھ ہزار صفحوں میں آئے ہیں۔ چونکہ الف سے زے تک کی قاموس چھپ گئی ہے اس لیے اپنے مواد سے مقابلے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اقتباسات میں اصل کتاب کا پچاس فی صد مواد اور نباتاتی معلومات کا تقریباً سو فی صد حصہ موجود ہے۔ اب اگر س تا ی کا حصہ بھی جو میں نے مرتب کیا ہے چھپ جائے تو نباتات کی ایک مکمل اچھی عربی قاموس ہاتھ آجائے۔

اس ذرا بہ ظاہر غیر متعلق ذکر کا منشا یہ ہے کہ دینوری کے کچھ حالات اگر اس کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں تو کچھ اس کی تالیفوں کے اندر کی خود نوشتہ سوانح حیات اور اشارات سے بھی۔ اس لیے کوشش کرنی چاہیئے کہ کتاب النبات کی اندرونی شہادت سے

Marfat.com

اس کی سوانح عمری کی تکمیل کی جائے۔

پاکستان کی سیاحت؟

دینوری کی کئی بار صراحت سے "ہمارے ملک جبل میں" کا ذکر کرتا ہے۔ جبل، جسے عربی میں قوہستان یا قہستان (کوہستان کا معرب) بھی کہتے ہیں وہی ملک ہے جہاں دینوری بستا ہے۔ اس کی تعلیم بصرہ، کوفہ اور بغداد میں ہوئی۔ اس لیے دینور تا بغداد کا وہ سفر کے دوران میں مشاہدہ کر چکا تھا۔ کوفے کا پرانا حصہ حیرہ کہلاتا ہے۔ بظاہر وہ ادھر کی سیر کر چکا تھا کیونکہ وہ کہتا ہے "ذُرق کو حیرہ والے حندقوقا کہتے ہیں"۔

سچ پوچھو تو خالص علمی انداز سے دیکھنے پر سوائے عراق کے کسی اور ملک کی سیاحت کا صریح ذکر اس کے ہاں نہیں ہے۔ چنانچہ اسی "ذُرق" کے باب میں وہ کہتا ہے "قلدرأيته بالعاراق يبيعه الأنباط ويسمونه حندقوق" یعنی میں نے عراق میں دیکھا ہے کہ نبطی قوم والے [تاجر] اسے بیچتے اور اسے حندقوق کہتے ہیں)۔

اس کے علاوہ حمر (املی) کے باب میں بھی صراحت ہے "وقد رأيته، فيما بين المسجدين" (یعنی میں نے املی کا درخت دو مسجدوں کے مابین بھی دیکھا ہے)۔ اس کا امکان ہے کہ اس سے مراد مکہ اور مدینہ ہوں، کیونکہ یہ عرب کے ذکر میں ہے اور اس سے عین اوپر ہے "وہ سرات میں بہت ہے اور اسی طرح علاقہ عمان میں" اور بہ حیثیت مسلمان اس نے حج کرنے کی پوری کوشش کی ہوگی۔

اس کے علاوہ سارے حوالوں میں نرمی سے بلکہ خوش فہمی سے جانچو تو کہنا ممکن ہوگا کہ وہ فلاں فلاں علاقے کی سیاحت کر چکا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے ذکر کے سلسلے میں:

شام:

"مجھ سے ایک شام والے نے کہا کہ" (اثل) "مجھ سے ایک شام والے بدوی نے کہا کہ" (رند) "رجاص کو شام والے کمثریٰ کہتے ہیں" (اجاص) "شام والے خوق کو دراقن کہتے ہیں" (خوق، دراقن)۔

Marfat.com

سرات:

یعنی جنوبی فلسطین: ''مجھ سے سرات کے ایک بدوی نے کہا کہ'' (تین، حرمل، حلق، جنون، خزم، خطر، ذبنان، رقع)۔ ''اسے سرات والے مناور کہتے ہیں'' (ارز)۔ ''میں نے ایک سرات والے سے پوچھا'' (جوز)۔ ''مجھے ازدِسرات کے ایک بدوی نے بتایا کہ'' (رقوم) ''مجھے ازدِسرات کے ایک بدوی نے بتایا کہ'' (خروع)

دروب الروم:

یعنی بیزنطینی سرحد، اناطولیا ولبنان: کرم کا درخت سرحدی پہاڑوں میں اُگتا ہے'' (اثل) ''تنوب کے اُگنے کا مقام دروب الروم کے پہاڑ ہیں'' (تنوب)

یمن وحضرموت:

''جوز کا درخت یمن میں بہت ہے'' (جوز، اثل) ''تالب کے اُگنے کا مقام پہاڑ ہیں'' (تالب)۔ ''مجھے ایک یمنی بدوی نے بتایا کہ'' (خشیسرم) ''دارم کے اگنے کا مقام شحر کے قریب کا ریگستان ہے'' (دارم)۔

عمان:

(جنوب مشرقی عرب): ''پان کی کاشت عمان کے اطراف میں عرب میں ہوتی ہے'' تامول'' آم کا درخت عمان کے اطراف عرب میں بہت ہے'' (انج)۔ ''املی کا درخت عمان میں بھی بہت ہے'' (حمر)۔ ''مجھے عمان کے ایک بدوی نے بتایا کہ'' (حمر، حبن، خرزہ، دفلی)۔

ایران وخراسان:

''حمصیص کو جبل اور خراسان والے ترف کہتے ہیں'' (حمصیص)۔

افغانستان و پاکستان:

حلتیث اُس ریگستان میں ہوتی ہے جو بُست اور قیقان کے مابین ہے۔ وہاں

Marfat.com

والے اسے پکا کر کھاتے ہیں (حلتیث -) یہ سارا مواد کتاب النبات کی مطبوعہ جلد سے لیا گیا ہے۔ ذیل کا ذکر دینوری کی طرف منسوب ہے اور مختلف مصادر سے حاصل کیا گیا ہے:- ''ابو حنیفہ کا بیان ہے کہ کندلی کا درخت علاقۂ دیبل میں ہوتا ہے اور سمندر کے پانی کے اندر ہوتا ہے۔ وہاں اس سے موٹے دیبلی چمڑے کی دباغت کی جاتی ہے جس سے وہ سرخ ہو جاتا ہے''۔ [مفردات غافقی، لفظ کندلا، نیز مفردات ابن البیطار، لفظ کندلا] پروفیسر نبی بخش بلوچ نے اس کی تحقیق میں بڑی محنت اور رقم صرف کی اور اس کا پتا چلایا کہ یہ اب بھی موجود ہے۔ اور ان کا بیان ہے کہ یہ کنڑڑ کا درخت ہے۔ ''دینوری کا بیان ہے کہ کندلی عرب میں نہیں ہوتا.........قرم اور کندلا دونوں سمندر کے پانی میں اگتے ہیں۔ سمندر کا پانی نباتات کا دشمن اور ان کے لیے مہلک ہے، مگر یہ دونوں پودے اسی میں اگتے اور اسی سے غذا حاصل کرتے ہیں'' (عباب صاغانی، لفظ کدل، تاج العروس، لفظ کدل)۔ ''ابو حنیفہ نے بیان کیا ہے کہ کندلی ایک درخت ہے جس سے سندھ میں دباغت کی جاتی ہے۔ اس سے چمڑا سرخ ہو جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر ابو حنیفہ نے کہا کہ اسے کندلاء بھی کہتے ہیں اور یہ کہ سمندر کا پانی سارے درختوں کا دشمن ہے بجز کندلاً اور قرم کے'' (لسان العرب، لفظ کندل)۔ ''کندلی......ابو حنیفہ کا بیان ہے کہ یہ ایک ایسی نباتات ہے جو سمندر کے پانی میں اُگتی ہے۔ اسے شورہ کہتے ہیں۔ اس کی چھال کو ایدع کہتے ہیں جس سے دباغت کی جاتی ہے۔ اس کا گوند قوت باہ کے لیے مفید ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ سندھ میں دباغت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے چمڑہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ایک اور جگہ اسی نے کہا ہے کہ سمندر کا پانی سارے درختوں کا دشمن ہے بجز کندلی اور قرم کے'' (تاج العروس، لفظ کندل)۔ ''کندلی ایک درخت ہے جس سے دباغت کی جاتی ہے۔ اس سے دباغت سندھ میں ہوتی ہے اور اس سے چمڑا سرخ ہو جاتا ہے۔ یہ ابو حنیفہ کا بیان ہے۔ اسی نے ایک دوسری جگہ اسے کندلاً کہا ہے اور بتایا ہے کہ سمندر کا پانی ہر درخت کا دشمن ہے بجز کندلاً اور قرم کے'' (ابن سیدہ کی کتاب المحکم، لفظ کد، رباعی)۔ ''جو دباغت درخت قرظ سے نہ ہو، اس میں چمڑے کو سرخ کرنے کے لیے الگ رنگنا پڑتا ہے۔ بجز اس کے جس کی دباغت کندلاً سے ہو۔ یہ

Marfat.com

سندھ اور اس کے اطراف کے علاقے میں دباغت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے چمڑا سرخ ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس دیسی چمڑے کو تم دیکھتے ہو۔ کندلاً ان کے ہاں ایک درخت ہے" (کتاب النبات الدینوری، مخطوطہ جامعہ ییل، ورق ۸۸/الف، بمہربانی پروفیسر برنہارڈ لوین B. Lewin)۔

حجاز، نجد، قبیلۂ تمیم:

"تمر (کھجور) کو حجاز والے مونث بولتے ہیں..... تو نجد والے اور قبیلۂ تمیم کے لوگ مذکر بولتے ہیں" (تمر)

قبیلۂ کلب، قبیلۂ ربیعہ، قبیلۂ عنزہ:

"مجھے قبیلۂ کلب کے ایک بدوی نے بتایا کہ" (ذرق، حسار) "مجھے قبیلۂ ربیعہ کے ایک بدوی نے بتایا کہ" (اسحل، اَرطی، بسباس، تعضوض، ثرمد، جثجاث، حواء، حنبل، حنظل، دارم، ذفراء، رمرام) "مجھے قبیلہ عنزہ کے ایک بدوی نے بتایا کہ" (ذوَنون)

ان تمام صورتوں میں جس طرح اس کا امکان ہے کہ ابو حنیفہ ان کے علاقے میں گیا اور برسر موقع سنا ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ان علاقوں کے لوگ دینوری سے کہیں اور، مثلاً بغداد، بصرہ، یا کوفہ میں ملے ہوں۔ اور اس نے اتنی صحرانوردی کی تھی تو وہ ایک تنومند اور صحتمند شخص ہونا چاہیے۔

آم اور پان:

اوپر عمان کے حالات سے معلوم ہوا کہ آم اور پان سے نہ صرف عرب واقف تھے بلکہ عمان میں ان کی کاشت بھی ہوتی تھی اور عمان والے پان چبایا بھی کرتے تھے۔ لیکن اس سے دینوری کی سوانح عمری کو ذرا دور ہی سے تعلق ہے۔ یہ اردو دانوں کی دلچسپی کے لیے ہے۔

کیا دینوری ایک طبیب تھا؟

کراچ کوفسکی کو اس سے شدت سے انکار ہے۔ اور اس واقعے کے باوجود کہ

دینوری کی تالیفوں میں ایک خالص طبی کتاب بھی ہے، وہ اپنے انکار پر مصر ہے اور متعدد یوروپی موافقین کی رائے کو رد کرتا ہے۔ واحد ثبوت وہ یہ پیش کرتا ہے کہ ابن ابی سیبعہ نے ''طبقات الاطباء'' میں دینوری کی سوانح عمری شامل نہیں کی ہے۔

چند امور قابل ذکر ہیں: طب پر ایک مستقل رسالہ لکھنے کے علاوہ، اپنی ''کتاب النبات'' میں وہ بیسیوں پودوں کی توصیف میں ان کے طبی خواص کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جو شخص علم طب سے بے بہرہ ہو، اسے یہ دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ پیشہ ور طبیب نہ بھی ہوتو اس نے طب کی تعلیم پائی ہو گی۔

نباتیات کو طب سے بہت گہرا تعلق ہے۔ پرانے زمانے کی طب مفردات پر قائم تھی اور مفردات میں پودے ہی غالب تعداد میں استعمال ہوتے تھے جیسا کہ ابن سمجون، الغافقی، ابن البیطار اور ابن سینا کی ''کتاب المفردات'' نامی تالیفوں سے ہویدا ہوتا ہے۔

اسی طرح پرانے زمانے میں - بلکہ ہمارے بچپن تک - اسلامی مدرسوں میں کوئی تعلیم اس وقت تک مکمل نہ سمجھی جاتی تھی جب تک کہ دینیات اور فلسفے کے ساتھ طب کا درس بھی نہ لیں۔ ہمارے مفتیوں اور مرشدوں سے لوگ دکھ درد بیان کر کے طبی مشورے بھی مانگتے تھے۔ پارلیمنٹ کے ارکان سے زیادہ ان لوگوں کو عوام سے تماس رہتا تھا۔ طبی واقفیت تبلیغ میں بھی بڑی کارآمد ہوتی تھی۔

مفردات طب کے سارے مولف ابن سمجون، ابن البیطار، ابن سینا وغیرہ جب بھی دینوری کا بیان ملتا ہے، اسے سرفہرست جگہ دیتے ہیں۔ کیا طبیب کسی اناڑی کو یہ عزت دیں گے؟

دینوری کی تالیف جواہر العلم:

اس بارے میں کراچکوفسکی کو شبہہ صرف اس بنا پر ہے کہ اس کا ذکر ''کشف الظنون'' کے سوا کسی اور ماخذ میں نہیں۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ اس کا ایک مخطوطہ استانبول میں اور ایک اور اٹلی میں ہے۔ کئی سال قبل میں نے اس کی ورق گردانی کی تھی۔ سرورق

پر دینوری کا نام تو ہے لیکن پورا نام نہیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو اندر بعض ایسے مولفوں کے بھی اقتباس ہیں جو ابو حنیفہ کے بعد کے ہیں۔ بہر حال یہ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف، یا اس کے استاد ابن حبیب کی کتاب المحبر سے مشابہ چیز ہے۔ اس سے واضح ہو گا کہ ''کشف الظنون'' میں چاہے غلط فہمی ہو، غلط بیانی نہیں ہے۔ میں ان دنوں استانبول سے دور پیرس میں ہوں اس لیے زیادہ یقینی معلومات پیش نہ کر سکنے کی معافی چاہتا ہوں۔

کیا ابن قتیبہ نے دینوری سے اقتباسات کیے ہیں؟

یہ ناممکن نہیں ہے۔ ابن قتیبہ کی کتاب الأنواء چھپ گئی ہے۔ دینوری کی کتاب الأنواء کا بہت بڑا حصہ میں نے متاخر مولفوں کے ہاں کے اقتباسات کی مدد سے اعادہ کر لیا ہے۔ ان دونوں میں بڑی مشابہت ہے۔ لیکن محض مشابہت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دینوری نے ابن قتیبہ سے معلومات اخذ کیے ہوں۔ لیکن جیسا کہ ابن قتیبہ کی کتاب الأنواء کے مقدمے میں وضاحت کی گئی ہے، دینوری کے بیانات مفصل تر ہیں، ابن قتیبہ کے مختصر تر۔ مختصر کرنا آسان ہے، پھیلانے کے لیے مزید مواد کی ضرورت ہے جو گھڑا نہیں جا سکتا۔ کم سے کم دو صورتوں میں دینوری کی غلطیوں کو ابن قتیبہ نے محسوس کیے بغیر نقل کر لیا ہے۔

ابن قتیبہ قاضی تھا، ادیب تھا، مورخ تھا لیکن اس کا پتا نہیں چلتا کہ وہ دینوری کی طرح مشاہدات فلکی کرتا اور صحرا نوردی کر کے بدویوں کی زبانی قطرہ قطرہ کر کے معلومات جمع کرتا پھرتا رہا ہو۔

لیکن قصہ یہ ہے کہ اگر دینوری نے کتاب النبات چھ جلدوں میں لکھی، اور ابن قتیبہ نے اپنی ''ادب الکاتب'' میں تین چار صفحوں کا ایک باب نباتات پر دیا ہو تو ایک قابل غور امر یہ ہے کہ ابن قتیبہ کا استاد ابن حبیب بھی ایک کتاب النبات کا مولف ہے۔ اس لیے یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ ابن قتیبہ نے دینوری سے نہیں بلکہ ابن حبیب سے معلومات لیے؟ دینوری اور ابن قتیبہ ہمعصر ہیں۔ ابن قتیبہ کی وفات دینوری سے

Marfat.com

پانچ چھ سال پہلے ہوئی۔ گمان ہوتا ہے کہ ابن قتیبہ معمر تر تھا، اس طرح دینوری سے اقتباسات کا امکان کسی قدر گھٹ جاتا ہے۔

کتاب الشعر والشعراء دونوں نے لکھی ہے۔ ابن قتیبہ کی موجود ہے، دینوری کی تاحال دستیاب نہیں ہوئی۔

ہم اوپر کراچکوفسکی کے ترجمے میں ایک حاشیے میں بتا چکے ہیں کہ دینوری کی کتاب القبلہ سے بھی ابن قتیبہ کے اقتباسات کا امکان ہے۔ اس موضوع پر معلومات ایک ھیئت داں ہی بہتر جمع کرسکتا ہے، ابن قتیبہ ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔

دینوری کی قدردانی اندلس میں:

تاریخ اسلام کا یہ ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ بغداد سے بغاوت کر کے قرطبہ نے خودمختاری تو حاصل کرلی لیکن مشرق کے علم کو اندلس ہمیشہ ادب واحترام سے دیکھتا رہا۔ اس کے مخفی یا علانیہ کارندے ہمیشہ مشرق آتے اور کتابیں خرید کر یا نقل کر کے اندلس لیجاتے رہے۔

دینوری کی بھی اندلس میں غیرمعمولی قدروقیمت ہوئی۔ مقری کے مطابق ابن اُخت غانم نے کتاب النبات کی شرح ساٹھ جلدوں میں لکھی۔ دینوری کے حنفی المذہب ہونے کا ذکر بھی ''الجواہر المضیۂ'' (طبقات احناف) کے مولف کو ایک اندلسی ماخذ ابوالقاسم مسلمہ بن القاسم الاندلسی کی ''ذیل علی اَسماء المحدثین'' ہی سے معلوم ہوسکا۔

دینوری کا مذہب:

مجھے شخصی طور پر اس مسئلے سے دلچسپی نہیں۔ سنی ہو یا شیعہ یا خارجی، ہر شخص اپنے اپنے اعتقادات اور اعمال کا انفرادی طور پر خدا کے پاس جوابدہ ہے۔ لیکن کراچکوفسکی نے یہ بحث چھیڑی ہے تو کچھ توضیح نامناسب نہ ہوگی۔

ابھی ہم نے بیان کیا کہ ابوالقاسم اندلسی نے اسے حنفی قرار دیا ہے۔ لیکن مجھے پتا نہ چل سکا کہ ان کا زمانہ کب کا ہے؟ ان سے اور ان کی کتاب کے وجود سے بروکلمان ناواقف ہے۔

Marfat.com

ذہبی (ف ۷۴۸ھ) نے جو لکھا ہے اسے اوپر کراچکوفسکی نے نقل کیا: ''اور کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے حنفیوں میں سے تھا''۔

ابن ابی الوفاء (ف ۷۷۵ھ) نے اپنی ''الجواہر المضیۃ'' میں ابو القاسم اندلسی کے حوالے سے اسے ''فقیہ حنفی الفقہ'' بیان کرنے پر اکتفا کی ہے۔

التمیمی الغزی (ف ۱۰۱۰ھ) نے الطبقات السنیۃ فی تراجم السادۃ الحنفیہ نے ابو القاسم الاندلسی ہی کے بیان کو دہرایا ہے، معلوم نہیں براہ راست مطالعہ کر کے یا ''الجواہر المضیۃ'' میں دیکھ کر۔

''الاخبار الطوال'' کے مخطوطہ ہند کے سرورق پر کسی مالک نے کفعمی کا حوالہ دینوری کے شیعہ ہونے کے متعلق دیا ہے، جیسا کہ کراچکوفسکی نے نقل کیا۔ کفعمی نے اپنی کتاب ''الجنتہ الواقیہ والجنتہ الباقیہ'' ۸۹۵ھ کے لگ بھگ تالیف کی۔ اس کا حاشیہ انہیں کا ہے یا کسی اور کا معلوم نہیں۔ پھر یہ الفاظ: ''حلمی کے حوالے سے کفعمی نے جو بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دینوری امامی تھا''، بہ ظاہر استنباط پر مبنی ہیں۔ یعنی دینوری کی کتابوں میں خاص کر حضرت علی و حضرت معاویہ کی کشمکش کے متعلق دینوری کے رجحان سے یہ گمان کیا ہے کہ وہ شیعہ تھا۔ ایک مماثل چیز سے ہم توجیہ کریں گے۔

کون نہیں جانتا کہ زیدیہ فرقے کی کتابوں میں امام ابو حنیفہ کو بھی زیدیہ کہا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بنو امیہ کے روز افزوں ظلم وستم پر امام زین العابدین کے بیٹے زید نے بغاوت کی ٹھانی تو امام ابو حنیفہ نے ان کی مالی مدد کی اور فرمایا: ''اگر مجھے یقین ہوتا کہ تمہیں جو لوگ مدد کا وعدہ کر رہے ہیں وہ دم آخر دغا نہ دیں گے تو میں بھی تمہاری فوج میں بھرتی ہو کر ہتھیار چلاتا''۔ (واقعۃً تیس ہزار بیعتیوں میں سے جنگ کے وقت صرف تین سو آئے اور زید شہید ہو گئے)۔ اسی طرح امام شافعیؒ کو بھی شیعی کہا جاتا تھا۔ اس پر خود ان کا مقولہ ہے ''اگر رسولؐ اللہ کی آل سے محبت کا نام شیعیت ہے تو میں سب سے پہلا شیعی ہوں''۔

غرض ان معنوں میں سنی رہتے ہوئے بھی دینوری کا سیاسی حیثیت سے اہل بیت کی طرف میلان ہو سکتا ہے کہ کاش بدکار ظالم حکمرانوں کی جگہ متقی و پرہیزگار افراد

Marfat.com

اہل بیت حکومت کریں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ (سنا ہے کہ احمدی حضرات بھی حنفی فقہ پر عمل کرتے ہیں)۔

لیکن کچھ داخلی شہادت کا بھی جائزہ لیں۔ ''کتاب النبات'' میں شیعہ سنی جھگڑا کبھی نہیں ملتا۔ اب لے دے کر صرف ''الاخبار الطوال'' رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی اس تاریخ کو پڑھتا ہے تو اسے تاثیر یہی ہوتا ہے کہ اس کا مولف شیعی میلان رکھتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بُرا تو نہیں کہتا لیکن اموی دور میں وہ واقعات کے متعلق شیعہ نقطۂ نظر ہی پیش کرتا ہے۔ اس کی توجیہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک تاریخ سے زیادہ تر شیعی مولفوں نے دلچسپی لی تھی۔ ابو مخنف، کلبی وغیرہ اس بارے میں قابل ذکر ہیں۔ ابھی طبری وغیرہ پیدا نہ ہوئے تھے اور خود طبری کو بھی اس میں باک نہیں کہ ابو مخنف، کلبی اور دیگر شیعہ مورخوں کی روایتیں نقل کرے۔ دینوری نے کوفے میں، جو شیعیت کا مرکز ہے، تعلیم پائی تھی۔ ممکن ہے تاریخ کے درس اس نے کسی شیعہ استاد سے لیے ہوں، اور اس موضوع میں اختصاص نہ کرنے کے باعث مزید تحقیق و تلاش نہ کی ہو اور انہی پڑھی ہوئی باتوں کو حرفِ آخر سمجھ لیا ہو۔

غیر متعلق ہی سہی، ایک ذاتی تجربے پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ میرے کچھ مضمون ووکنگ کے اسلامک رویو میں چھپے، اور مندرجات نہیں رسالۂ مضمون کی بنا پر مجھے احمدی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے کراچی میں کسی نے نماز میں رکوع کے بعد ہاتھ اٹھاتے دیکھ لیا اس پر ایک اہلِ حدیث مدرسے سے خط پیرس آیا ہے کہ ''آپ ہمارے میں سے ہیں اس لیے ہمارے مدرسے کی مہتممی قبول فرمالیجیے''۔ پیرس کے ایک یہودی بلکہ صہیونی رسالے میں میرا ایک مضمون چھپا اس کی بنا کر پیرس میں شہرت ہوئی کہ میں نومسلم یا نیم مسلم یہودی ہوں۔ غالباً دینوری بھی ''مشعرِ مرا بمدرسہ کہ بُرد'' کہہ کر ''جوابِ جاہلان الخ'' پر عمل کرے گا۔

بعمل کوش، بعمل کوش، بعمل کوش فقط۔ محمد حمید اللہ

۲۹ ربیع الانور ۱۳۸۵ھ

پیرس

Marfat.com

حوالہ

(اخبار الطوال۔
ترجمہ از میرزا محمد منور ایم۔اے
مرکزی اُردو بورڈ لاہور (۱۹۶۶))

Marfat.com

تقویمِ ہجری

اور

عالمِ اسلام میں ایک دن عید منانے کا مسئلہ:

کچھ عرصہ سے یہ تجویز مختلف حلقوں کی طرف سے سننے میں آ رہی ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں عید اور رمضان ایک ہی دن منانا چاہیے، تا کہ اتحادِ کی شان پیدا ہو، بعض حضرات تو اس تجویز کی تائید میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ وہ اس مقصد کے لیے ہجری تقویم میں لوند کا مہینہ بڑھانے یا ۹ سے بدل کر شمسی تقویم اختیار کرنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتے، عالمِ اسلام کے معروف محقق اور اہلِ قلم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے زیر نظر مضمون میں اسی مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے یہ دراصل ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کے ایڈیٹر صاحب کے نام ایک خط ہے جو ایک مضمون کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا اور مسلم ورلڈ کے ۲۶ فروری ۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ترجمے کے لیے ہم جناب محمد حسن عسکری کے ممنون ہیں۔ امید ہے کہ یہ مضمون ان حضرات کے لیے بصیرت کا سبب ہوگا جو اسلامی اتحاد کی اصل روح کو فراموش کر کے اسے ان رسمی مظاہروں کا پابند سمجھتے ہیں۔

ایڈیٹر

Marfat.com

پیرس۔ ۱۷ شوال ۸۵ھ

بنام مدیر ''مسلم ورلڈ'' کراچی

برادرم، السلام علیکم۔ آپ نے ۶ شوال ۱۳۸۵ھ کے پرچے میں ایک مضمون ہجری تقویم کے موضوع پر شائع کیا ہے اور قارئین کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے میں اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کرتا ہوں:

نمبر۱ مضمون میں لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کوئی تقویم نہ تھی۔ یہ درست نہیں عرب میں تنوع تو ضرور تھا۔ ہر علاقہ اپنا الگ سنہ رکھتا تھا جس کا آغاز بھی وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ مگر سال کا حساب رکھنے کے طریقے موجود تھے اور سب محرم کے مہینے سے شروع ہوتے تھے۔ مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مکے والے اپنا حساب اصحابِ فیل کے واقعے یعنی حبش کے حملے سے شروع کرتے تھے۔

نمبر۲ مضمون میں لکھا ہے...... ''سال کا حساب کسی اہم واقعے سے لگایا جاتا تھا۔'' یہاں ایک تو تضاد بیانی ہے، پہلے کچھ اور کہا ہے۔ یہاں کچھ اور پھر اس جملے میں الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن سے مطلوبہ معنی برآمد نہیں ہوتے کسی اہم واقعے سے سال کا حساب نہیں بلکہ سنہ کا حساب شروع ہوتا تھا، جیسا کہ دنیا بھر میں ہوتا ہے عرب میں تو سال کا حساب ہمیشہ محرم سے شروع ہوتا تھا اور حج پر ختم ہوتا تھا۔

نمبر۳ مضمون میں لکھا ہے۔ ''قریش اس طاقت کا استعمال اپنی مرضی کے مطابق کرتے تھے (اور جب چاہتے تھے لوند کا مہینہ گھٹا بڑھا دیتے تھے)'' یہ بیان بھی صحیح نہیں۔ تقویم کا بندوبست قریش کے پاس نہیں تھا بلکہ قبیلہ تمیم کے سپرد تھا یہ شخص گویا تقویم کا مہتمم ہوتا تھا اور وہ شمال مشرقی عرب سے دور دراز کا سفر کرکے اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آیا کرتا تھا۔ قریش مکہ اس پر ذرا بھی اختیار نہ رکھتے تھے۔ یہ شخص مہینہ بڑھانے کا حکم ہمیشہ ایک ہی طریقے سے دیتا تھا، یعنی لوند کے سال میں کہ جب محرم ذی الحجہ کے فوراً بعد نہیں بلکہ مہینے بھر بعد آتا تھا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ کام۔ بے ضابطہ طور سے نہیں بلکہ مقررہ وقفوں کے مطابق ہوتا تھا۔

نمبر۴ مضمون میں کہا گیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج ۱۷

فروری کو ادا فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ربیع الاوّل ۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج اس سے تین مہینے پہلے ادا فرمایا تھا۔ وولزیلی ہیگ کے حساب کے مطابق ۱۱ھ ۲۹ مارچ ۶۳۲ء کو شروع ہوا ہے۔ اس لیے حج اس سے بیس دن پہلے شروع ہوا ہوگا، یعنی ۹ مارچ ۶۳۲ء کے قریب۔

نمبر۵ مضمون میں کہا گیا ہے کہ حجۃ الوداع سے دو سال پہلے مکہ فتح ہو چکا تھا مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوند کے مہینے کا طریقہ نہیں بدلا۔ یہ بیان غلط فہمی پیدا کرتا ہے یہ بات مسلمہ ہے کہ عرب میں لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بعد بڑھایا جاتا تھا یہ کام مکے میں ہوتا تھا اور حج کی خاطر ہجرت کے بعد مسلمانوں کو مکے میں آنے کی اجازت نہ رہی تھی اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں بھی لوند کے مہینے کی رعایت رکھی ہو اس کے برخلاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلی محرم کا بھی علم تھا اور لوند والے محرم کا بھی۔ جیسا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ سے صاف ظاہر ہے ۹ھ میں دونوں قسم کے محرم حج کے بعد ایک ساتھ آ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کا انتظار تھا کہ تقویم کی اصلاح سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ۹ھ میں یہ مقصد حاصل ہوگیا ۱۰ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس مکے تشریف لے گئے اور لوند کے مہینے کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم قرآن شریف کی ایک آیت (نویں سورت آیت ۳۷) کے بموجب دیا جس میں نسی (لوند کا مہینہ بڑھانے) کو مردود قرار دیا گیا ہے۔

نمبر۶ اس بیان میں ذرا کلی صداقت نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوند کا مہینہ بڑھایا گیا۔ قرآن شریف نے اس کی صاف الفاظ میں ممانعت کی ہے۔ چنانچہ کوئی مسلمان ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

نمبر۷ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا تھا کہ اسلامی تقویم کے نقطۂ آغاز کو اس طرح مقرر کر دیا کہ حساب کا ایک ہی طریقہ رائج ہو جائے۔ یہ تو میں نے کہیں بھی نہیں پڑھا کہ رومی یا ایرانی تقویم کو اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوئی ہو مجھے اس تجویز کا بھی علم

Marfat.com

نہیں کہ اسلامی تقویم کا آغاز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے کیا جائے۔ جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ آغاز قرآن شریف کے نزول سے کیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "اس وقت تو ہم میں سے بہت سے لوگ کافر تھے۔" جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقویم شروع کرنے کی تجویز سامنے آئی تو خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ دن تو ہمارے لیے غم کا ہے چنانچہ آخر ہجرت کے واقعے کو اختیار کرلیا گیا۔ اس سلسلے میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب دلائل النبوۃ میں ایک بہت اہم بات بتائی ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں مسلمانوں نے تقویم کے آغاز کے لیے ہجرت کے واقعے کو اختیار کر لیا تھا، مگر اختلاف اور تنوع اس بات میں تھا کہ کچھ لوگ تو اس سال کے محرم سے حساب شروع کرتے تھے کہ جس سال سے ذوالحجہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا۔ (یعنی ہجری سنہ سے ایک سال پہلے) کچھ لوگ اس محرم سے شروع کرتے تھے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لانے کے بعد آیا (یعنی ۲ھ سے) پھر کچھ لوگ اس سال کے محرم سے جس کے ربیع الاوّل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے روانہ ہوئے یہی وہ صورت ہے جسے خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ نے مشورے کے بعد سرکاری طور سے اختیار فرمایا۔

نمبر ۸ مضمون میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے دن زندہ نہیں رہے کہ لوند کا مہینہ ختم کرنے سے جو خراب نتائج برآمد ہوئے انہیں دیکھ سکیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار کو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں کہ لوند کے مہینے کو دوبارہ شروع کرنے یا اسلامی مقاصد کے لیے شمسی تقویم اختیار کرنے سے کیا خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بہرحال قمری حساب کے چند فائدے حسب ذیل ہیں۔

چاند کے حساب کے فوائد:

(۱) جہاں تک روزے کا سوال ہے، خالص قمری حساب بہت مفید ہے کیونکہ اس سے آدمی کو ہر موسم میں کھائے پیے بغیر رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ نہ تو یہ ہے کہ ہمیشہ سختی رہے اور نہ یہ کہ ہمیشہ آسانی رہے جنگ کے زمانے میں یا دکانداروں کی ہڑتال کے زمانے میں یا اور ایسے ہی حالات میں یہ روزے کی عادت بڑی افادیت رکھتی ہے۔

Marfat.com

(ب) اسلام ایک ایسا دین ہے جو ساری دنیا کے لیے آیا ہے۔ لہٰذا آب وہوا کے اختلافات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً: اگر روزوں کا زمانہ جنوری مقرر کر دیا جائے تو خطِ استوا کے اوپر کرۂ ارض کے شمالی نصف حصے میں سردی ہوگی اور خطِ استوا کے نیچے جنوبی حصے میں گرمی اس طرح سہولت کا منشا فوت ہو جائے گا۔ اگر روزے سردیوں ہی میں رکھ دیئے جائیں تو پھر بھی یکسانی حاصل نہیں ہو سکتی۔ شمالی حصے والے جنوری میں روزے رکھیں گے اور جنوبی حصے والے جولائی میں۔ اگر خط استوا کے نزدیک والے علاقوں میں سردیوں کا زمانہ خوشگوار ہوتا ہے تو قطبین کے علاقوں میں یہی زمانہ بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ اس طرح تو مختلف خطوں کے مسلمانوں میں امتیاز پیدا ہو جائے گا۔ اس خرابی کا سدِ باب قمری تقویم ہی سے ہوتا ہے کہ سارے مسلمان باری باری سے تمام موسموں میں روزے رکھیں گے۔

(ج) زراعتی پیداوار چھوڑ کر پس انداز کیے ہوئے مال یا تجارت وغیرہ پر زکوٰۃ اس طرح بڑھ جاتی ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ وہ یوں کہ ہر ۳۳ سال میں حکومت کو معاشرے کی بہبودی اور خصوصاً غریبوں کی مدد کے لیے امیروں سے زائد پیسہ ملتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر امریکہ اور روس کے وزرائے مالیات چھوٹے چھوٹے تعصبات سے اوپر اُٹھ سکیں تو وہ ٹیکس کا حساب لگانے کے لیے قمری تقویم فوراً اختیار کر لیں۔ اس کا ایک اور بھی عملی فائدہ ہے جس سے ہم ابھی بحث کریں گے۔

(د) آپ کہتے ہیں کہ حج کے لیے خوشگوار موسم زیادہ مناسب ہوگا، یعنی مکے کا جاڑا یا بہار۔ مگر مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں سرکاری ملازموں کو گرمیوں میں تنخواہ کے ساتھ ایک مہینے کی چھٹی ملتی ہے۔ مسلمان ملازمین اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ چھٹی کا زمانہ حج کے ساتھ آئے۔ آپ کا منصوبہ رائج ہو جائے تو ایسے لوگ اور کئی دوسری قسم کے لوگ بھی حج سے محروم ہو جائیں گے۔

نمبر ۹ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوند کے مہینے کی ممانعت فرمائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی احساس تھا کہ موسموں اور فصلوں کا تعلق شمسی تقویم سے ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کا بھی حل تجویز فرما دیا۔ اس زمانے کی

Marfat.com

دستاویزوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فصلوں کا محصول ادا کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص مہینہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ کاشتکاروں کو یہ آسانی دے دی کہ ہر فصل کے وقت جب پیداوار ایک خاص مقدار سے اوپر ہو تو وہ محصول ادا کریں۔ تجارت، پس انداز کیے ہوئے مال، مویشی، وغیرہ کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجری سال کے خاص مہینے مقرر فرمائے یہ دو قسم کے طریقے محکمہ مال کے لیے ایک اور طرح بھی بہت مفید ہیں۔ آج کل کے ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں شمسی سال کے مطابق حساب ہوتا ہے، سرکاری خزانہ مالی سال کے آخری ہفتوں میں خالی ہونے لگتا ہے اور حکومت کو کچھ عرصہ کے لیے بونڈ جاری کرنے پڑتے ہیں تاکہ نئے سال کی آمدنی ہونے تک کام چلایا جا سکے بونڈ چونکہ قرضے کی ایک شکل ہے اس لیے حکومت کو اس پر سود دینا پڑتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ روپیہ ہر موسم میں آتا رہتا ہے اور کمی کا خطرہ نہیں رہتا کیونکہ بعض محصول قمری مہینوں کے حساب سے آتے ہیں اور بعض شمسی مہینوں کے حساب سے۔

نمبر۱۰ اب ذرا عملی پہلو کا جائزہ لیجیے۔ مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ مکے میں جس دن چاند نظر آئے اسی کو ساری دنیائے اسلام کے لیے فیصلہ کن سمجھا جائے۔ عید الاضحیٰ کے معاملے میں تو خیر یہ بات ممکن بھی ہے کیونکہ یہ عید دسویں تاریخ کو ہوتی ہے لیکن رمضان اور شعبان کے چاند کے معاملے میں اتنی آسان نہیں قطب شمالی سے لے کر قطب جنوبی تک لاکھوں گاؤں اور قصبے ہیں جن میں سے بیشتر غیر مسلم حکومتوں کے ماتحت ہیں اور وہاں مسلمانوں کی بھی آبادی ہے۔ وہاں تار کون بھیجے گا؟ خود پاکستان میں بھی ایسے گاؤں کتنے ہیں جہاں ریڈیو موجود ہو؟ مکہ کا ریڈیو یہ اطلاع کتنی زبانوں میں نشر کرے گا؟ جس وقت مکے میں سورج غروب ہوگا اس وقت دنیا میں کتنی جگہیں ایسی ہیں جو مکہ کا ریڈیو سننے کے لیے تیار ہوں گی؟ کیونکہ مقامی وقت تو فاصلے کے ساتھ بدلتا چلا جاتا ہے۔ انتظامی پہلو سے قطع نظر، چاند سب جگہ ایک ہی وقت میں نظر نہیں آتا۔ فطرت نے بندوبست ہی ایسا کیا ہے کہ چاند زمین کے گرد "تیرتا" اور گھومتا رہتا ہے اور چاند کا نظر آنا اور چھپنا اس کے حساب سے ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً ڈھاکے میں ۲۹ شعبان کو

Marfat.com

چاند نظر نہیں آیا، مگر کراچی یا مکہ یا پیرس یا نیو یارک میں نظر آ گیا۔ یہ تو فضا کی حالت کا معاملہ نہیں بلکہ فلکیات کا مسئلہ ہے۔ اگر چاند صرف مکہ میں نظر آیا ہے تو کیا کراچی ڈھاکہ، جکارتا وغیرہ کے مسلمانوں کو فطرت کے قانون اور شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے خلاف عمل کرنا پڑے گا؟ آپ نے مضمون میں چند پاکستانی اصلاحات کا ذکر کیا ہے۔ پیرس کے اخباروں میں یہ خبر شائع نہیں ہوئی اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا کیا مطلب ہے۔ مگر مجھے ۱۹۵۰ء کے اس واقعے کا بخوبی علم ہے کہ نیا چاند دیکھنے کے لیے ہوائی جہاز اُڑا تھا۔ معاملہ کتنا پیچیدہ ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی دن کلفٹن چلے جایئے، مگر مطلع صاف ہونا چاہیے پھر سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھئے اگر اس وقت کوئی ہوائی جہاز چند ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہو تو اس سے دریافت کر کے دیکھئے ہوائی جہاز والا کہے گا کہ سورج ابھی تک چمک رہا ہے اس قسم کا واقعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پیش آیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک میدان میں تشریف رکھتے تھے، غروب آفتاب کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار فرمالیا۔ اتنے میں ایک آدمی نے پہاڑ کی چوٹی پر سے پکارا کہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص کے لیے دن ابھی ختم نہیں ہوا، مگر ہمارے لیے ختم ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ ہوائی جہاز چلانے والا تو روزہ نہیں کھولے گا مگر آپ کلفٹن کے ساحل پر ہیں تو آپ کو روزہ کھولنا پڑے گا۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ پیچیدہ انتظامات یا مشینوں کے پابند ہو کے رہ جائیں۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ دنیا کے سب سے کم ''تہذیب یافتہ'' حصوں میں بھی دینی ضروریات معمولی سے معمولی مسلمان کی بھی دسترس سے باہر نہ ہوں۔

میری ناچیز رائے میں تو یہ اصلی بات نہیں کہ لوگ عید ایک خاص دن منائیں بلکہ چیز یہ ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقعوں پر خلوص اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں اور اس کا شکر بجالائیں۔ اگر بعض مقامات پر یہ عبادت ایک دن ہوئی اور دوسرے مقامات پر دوسرے دن تو حرج ہی کیا ہے؟

مخلص

محمد حمید اللہ

Marfat.com

پیرس۔ ۲۱ شوال ۱۳۸۵ھ

جناب ایڈیٹر صاحب مسلم ورلڈ، السلام علیکم

آپ کے ۱۳ اشوال ۱۳۸۵ھ کے پرچے میں ایک بے نام نامہ نگار نے اسلامی تقویم کے بارے میں چند سوال پوچھے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سوالات کا جواب حسب ذیل ہے:

قانون ساز چاہے کوئی پارلیمنٹ ہو یا وحی، مگر اُصول یہ ہے کہ جب ایک ہی قانون ساز دو متناقض یا متضاد قانون نافذ کرے تو عملدرآمد آخری قانون پر ہوتا ہے اور پہلے والا قاعدہ منسوخ ہو جاتا ہے مثلاً یہ دلیل احمقانہ ہوگی کہ اسلام کے ابتدائی دور میں شراب پر پابندی نہیں تھی، لہٰذا پابندی لگ جانے کے بعد بھی شراب پینے کی اجازت ہونی چاہیے۔

قرآن شریف نے لوند کا مہینہ بڑھانے کو مردود قرار دیا ہے۔ جس چیز کو پہلے گوارا کرلیا گیا تھا اس حکم کے نزول کے بعد اب اس سے بچنا لازمی ہے۔

اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ۹ ہجری میں لوند کا مہینہ بڑھایا گیا تھا ایک سال بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوند کے مہینے کو ختم کر دیا۔ ۹ھ میں اس چیز کو کیوں گوارا کیا گیا اس کی وجہ حجۃ الوداع کے خطبے میں بیان ہوئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اصلی مہینوں اور لوند کے مہینوں کے ایک ساتھ آنے کا انتظار تھا جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو لوند کا مہینہ بھی ختم کر دیا گیا اور کسی کو دشواری بھی نہیں ہوئی۔

عرب میں محرم سال کا پہلا مہینہ ہمیشہ سے مانا گیا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں کوئی تبدیلی مناسب نہیں خیال فرمائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں جو آخری حکم صادر فرمایا تھا اسی کو برقرار رکھا۔

میں اپنے پچھلے خط میں تفصیلاً بیان کر چکا ہوں کہ میری ناچیز رائے میں عبادات یا مالیات کسی باب میں بھی مسلمانوں کو قمری تقویم میں تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔

مخلص

محمد حمید اللہ

(البلاغ۔ کراچی ذی قعدہ و ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ)

Marfat.com

Marfat.com

پچیس سال پہلے کی باتیں

ماھنامہ ''روح ترقی'' حیدرآباد دکن بابت رمضان وشوال ۱۳۶۸ھ میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب کا مضمون ''پچیس سال پہلے کی باتیں'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے استاد عبدالرحمٰن خان صاحب اور جامعہ عثمانیہ میں اپنے دور طالب علمی کے دلچسپ واقعات تحریر فرمائے تھے۔ یہ نادر مضمون یہاں پیش کیا جارہا ہے۔(مرتب)

۱۳۴۱ھ کا زمانہ ہے، ایک پندرہ سالہ اور جامعہ کے سب سے نوعمر طالب علم کی حیثیت سے میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں شریک ہوا تھا۔ ابھی پرنسپل عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ بن کر وہاں نہیں آئے تھے۔کوئی آٹھ سال بعد ایم اے اور ریسرچ کے کام کے بعد جب میں باہر روانہ ہوا تو اس اثناء میں مجھے ان سے بہت کم سابقہ رہا۔ تین سال بعد واپس ہوکر اساتذہ میں شمول کی عزت حاصل ہوئی تو وہ بدقسمتی سے جامعہ سے جا چکے تھے۔ان حالات میں چند سرسری تاثرات کے قلمبند کرنے کے سوا چارہ نہیں۔

شعبۂ سائنس کا طالب علم نہ رہنے کے باعث مجھے خان صاحب سے راست شاگردی کا تعلق نہ رہ سکا..........اور اپنی افتادطبع کے باعث ایم اے، ایل ایل بی میں آنے تک جہاں تک یاد ہے مجھے اپنے صدر کلیہ سے بات کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئی۔ سالانہ یوم کلیہ میں امتحان میں اول آنے والوں کو جو انعامات اس زمانہ میں ملتے تھے

Marfat.com

اس میں سال بسال دیکھنے کے باعث ممکن ہے صورت ان کے ذہن نشین ہوگئی ہو۔ ورنہ ان کو دور سے کبھی کبھی گزرتے دیکھنے کے سوا کوئی ضرورت ملاقات کی پیش ہی نہیں آئی۔

میں سال سوم میں تھا کہ خان صاحب جامعہ لندن کی صد سالہ سالگرہ میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں پروفیسر رحیم الدین صاحب کو بے قصور بعض حالات کے تحت خدمت سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ تعطیلاتِ گرما کا واقعہ ہے۔ کالج کھلنے پر اپنے ہر دلعزیز استاد کی واپسی کے لیے ہم طلبہ نے جدوجہد شروع کی اور غالباً جامعہ میں طلبہ کا اولین ''ہنگامہ'' تھا۔ تجویز ہوئی کہ ایک محضر امیر جامعہ کو دیا جائے۔ محضر کی منظوری کے لیے طلبہ کے جلسہ عام کی ضرورت تھی، خوف تھا کہ حدود جامعہ میں اس کی اجازت نہ ملے گی اس لیے ہم لوگوں نے چپکے سے جلسہ کی اطلاع نوٹس بورڈوں پر لگا دی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب (مدیر ''وقت'') اس زمانہ میں جونیئر انٹر میں تھے۔ نوٹس پڑھتے ہی نہ معلوم کیوں ارباب کلیہ کے پاس پہنچے اور رپٹ دے دی۔ فوراً سارے اطلاعات ضبط کر لیے گئے اور جلسہ کے لیے جو کمرہ تجویز ہوا تھا اس وقت پر مقفل کر کے پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر کئی سو طلبہ جمع ہو گئے اور آسمان کے زمردیں شامیانے میں ہمارا اجلاس ہوا اور محضر بھیجنا اور اس کی عبارت بہ اتفاق آرا منظور ہوئی اور حاضرین اور غیر حاضرین کے دستخط لے کر وفد مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کے پاس پہنچا، بڑی ہی جھنجھٹوں کے بعد باریابی ہوئی اور محضر دے کر ہم چلے آئے۔

کچھ دنوں بعد خاں صاحب ولایت سے واپس آئے اور غالباً ان پر جامعہ میں ضبط نہ رہنے کا الزام لگایا گیا تھا حالانکہ وہ واقعہ ان کی غیر موجودگی کا تھا اور یوں بھی وہ ہوتے بھی تو ہم اپنے استاد کی خاطر بہر حال وہی کرتے جو کیا اور آج بھی ہم اس پر شرمندہ نہیں ہیں۔ بہر حال ایک دن شام کو جب ہماری سال چہارم کی انگریزی جماعت برخاست ہوئی اور ہم جماعت سے گھر جانے کے لیے نکلنے لگے تو یکایک صدر صاحب کلیہ جماعت میں آگئے اور ہدایت کی کہ ہم ٹھہریں انہیں کچھ کہنا ہے۔ پھر انہوں نے انگریزی میں تقریر کی اور امیر جامعہ کے پاس جانے پر ہمیں ڈانٹا۔ وہ اوراق ان کے ہاتھ میں تھے جن میں محضر میں شریک طلبہ کے دستخط تھے۔ کوئی سزا وغیرہ تو نہ ملی لیکن اب خیال ہوتا ہے

Marfat.com

کہ ممدوح نے صرف حسب الحکم ہم کو ڈانٹا اور انگریزی میں تقریر اس لیے کی کہ چپراسی اور اہلکار وغیرہ کوئی اس کو نہ سمجھ سکیں۔

۱۹۴۵ء یا ۴۶ء کا زمانہ تھا کہ ہمارے خاندان کے مقبوضہ قدیم سامان کی مدد سے حیدر آباد کی اولین نمائش ثقافت اسلامیہ میرے والد کے گھر میں منعقد ہوئی۔ خان صاحب نے دعوت پر فرمایا تھا کہ مصروف ہوں موقع ملے تو آ جاؤں گا۔ شاید موٹر زنانہ استعمال میں تھا اس لیے تشریف بھی لائے تو بائیسکل پر۔ سامان کی تعریف فرمائی اور ہم نے جو اردو جھنڈی بولی (سمافور سگنلنگ) ایجاد کی تھی اس کے مظاہرے کے لیے ایک مختصر پیام کے ذریعے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ یہ میرا ان کا اولین تماس تھا۔

میں ایم اے میں تھا۔ بزم دینیات کا نائب صدر منتخب ہوا (اس زمانہ میں صدر شعبہ ہی صدر ہوتا تھا) تو اپنے لائحہ عمل میں شعبۂ دینیات کی ضرورتوں میں ارباب جامعہ کو متوجہ کر کے کوئی درجن بھر مطالبات کیے تھے۔ صدر شعبہ استاد محترم مولانا عبدالقدیر صدیقی صاحب نے وہ خطبہ ''لحاظ مناسب'' کے لیے صدر کلیہ کے پاس بھیج دیا۔ چند دن بعد میری طلبی ہوئی۔ یہ ''بدعت'' کہ طلبہ جامعہ کے ''سیاسی'' معاملات میں حصہ لیں موصوف کو شاید نئی نسل کی خطرناک ذہنیت کا پتہ دینے لگی تھی۔ نفس مطالبات کے حسن و قبح پر کوئی گفتگو ہوئی صرف اعتراض یہ تھا کہ طلبہ اس میں کیوں حصہ لیتے ہیں، وہ اساتذہ شعبہ کا کام ہے۔ بہر حال انہوں نے نرم تنبیہ کر کے رخصت کیا۔

اس کے قریبی زمانہ میں سر تیج بہادر سپرو حیدر آباد آئے تو طلبہ قانون کو مخاطب کرنا انہوں نے از راہ عنایت منظور کر لیا۔ مہمان وقت سے ذرا پہلے آ گئے تو ہم نے خان صاحب کو اطلاع کروائی۔ وہ لازماً بے چین ہو کر دفتر سے تیز تیز پیدل چلے آئے اور بے خیالی میں نظام العمل طلب کیے بغیر جلسہ شروع کر کے تعارفی تقریر شروع کر دی۔ اتفاق سے بزم قانون کا نائب صدر بھی میں ہی تھا، سوائے اس کے کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی کہ نظام العمل مقرر کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ تقریر کرتے کرتے خاں صاحب نے اس پر نظر ڈالی اور صورت حال سمجھ گئے اور پھر مجھے تعارف کے لیے طلب کیا۔ اس یادگار جلسے کے حالات اخباروں میں بھی آئے تھے۔ میں نے اپنی طالب علمانہ بدتمیزی

Marfat.com

سے جو تقریر کی تھی اس کا آغاز یوں ہوا تھا کہ اگرچہ بحیثیت نائب صدر بزم قانون آج کے جلسہ کی صدارت میرا حق ہے لیکن ایک ممتاز مہمان کی موجودگی میں شاید ہماری نوعمر جامعہ کے متعلق ذمہ دار بیانات و معلومات کی ضرورت ہوگی اس لیے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ صدر کلیہ ہی صدارت فرمائیں......'' پھر مہمان کا تعارف میں نے کرایا تھا۔

غرض اس طرح صدر کلیہ اور ایک نوجوان طالب علم میں وقت بوقت نوک جھونک ہی چلتی رہی۔ مجھے ان کے اخلاق اور طبیعت کے معلوم کرنے کا کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایم اے کامیاب ہونے کے بعد کسی ضرورت سے (جواب یاد نہیں) میں ان کے اجلاس پر گیا تو ان کے اخلاق پر سے پردہ اولین مرتبہ میرے لیے ہٹا۔ میں ابھی دروازے سے داخل ہی ہوا تھا، میز تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کسی معزز شخص کو جو اجلاس پر بیٹھا ہوا تھا مخاطب کر کے خاں صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا **He has got a first class** مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس وقت تک معلوم نہیں (اور شاید اب بھی نہیں معلوم ہو سکا) کہ امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہو جانا کیا خاص اہمیت کی بات ہے۔ مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ خاں صاحب میری صورت اور نام سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں بلکہ باوجود میری گستاخیوں کے دل میں کتنی محبت رکھتے ہیں۔ چند دن میں جلسہ تقسیم انعامات ہوا تو خاں صاحب نے بلاضرورت میرا تعارف صدر جلسہ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت سے کرایا کہ یہ طالب علم فرانسیسی اور ترکی بھی جانتے ہیں۔

میں نے ایم اے کے بعد جامعہ میں تحقیقاتی سند کی جماعت کھولنے کی درخواست کی۔ بہ امید منظوری خاں صاحب نے اس کا انتظام کر کے مجھے شریک کر لیا تھا۔ چند دن بعد میں ان کے اجلاس پر ایک درخواست ہاتھ میں لیے ہوئے گیا تو دروازے ہی میں مجھے یہ الفاظ سننے پڑے کہ ''میں نے آپ کے لیے وظیفے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا'' معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ایسی تحریک کر رہے تھے۔ بہر حال مجھ بے خبر کو یہ برا لگا۔ میں نے کہا ''میں اس کے لیے آیا بھی نہیں ہوں۔ میں ریسرچ کے لیے کتب خانہ جامعہ میں بعض سہولتیں چاہتا ہوں۔'' یکایک ان کا رویہ بدل گیا بیٹھنے کے لیے کرسی دی اور درخواست پڑھ کر فوراً منظوری دی اور ایک طالب علم کو کتب خانے کے مخزن میں جایا کرنے اور وہیں بیٹھ کر جو

Marfat.com

کتاب جب چاہے نکلوا لینے اور پڑھنے کی اجازت مل گئی۔

کچھ عرصہ کام کر کے میں نے درخواست کی کہ اپنے مصارف پر مشرق قریب جا کر وہاں کے قلمی کتب خانوں سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ حیدر آبادی مخطوطات سے فارغ ہو چکا ہوں، خاں صاحب نے فوری منظوری دی اور میری درخواست کے بغیر اس اثناء میں میرے لیے پچھتر روپے ماہوار کا جو وظیفہ منظور ہوا تھا اسے خالی کی جگہ کلدار کروایا۔ پھر میں نے حجاز، لبنان، شام، فلسطین، مصر اور ترکی کے کتب خانوں میں ایک سال گزارنے کے بعد درخواست کی کہ مجھے جرمنی جانے اور اپنا جامعہ عثمانیہ کے لیے شروع کیا ہوا مقالہ وہیں پیش کرنے کی اجازت دی جائے تو خاں صاحب نے اس کی بھی خوشی سے منظوری دی اور معلوم ہوا کہ انہوں نے میرے لیے خود تین سو پونڈ کی یکمشت امداد کی بھی تحریک کی۔ بعد میں وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ ''میں نے عترت حسین اور تمہارے لیے تحریک کی۔ ان کی تو منظور ہوگئی۔ فضل محمد خان صاحب ناظم تعلیمات نے تمہارے لیے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ آکر نوکری مانگے گا۔ مجھے عمر بھر رنج رہے گا کہ میں تمہاری کچھ مدد نہ کر سکا۔'' میں نے کہا: ''خان صاحب الحمد للہ میں اس سرکاری خیرات کے بغیر بھی اپنا کام کر چکا اور شاید اوروں سے بہتر ہی رہا۔ جرمنی اور فرانس دونوں جگہ سے ڈاکٹری کی سند لی اور عزت سے کامیاب ہوتا رہا۔ آپ رنج نہ فرمائیں۔''

مختصر یہ کہ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب بظاہر بڑی آن بان کے اور خشک سے افسر رہے لیکن دل میں طلبہ کی گستاخیوں کو سہتے اور ان کی ہر وقت ہر طرح مدد کرنے کے لیے تن من دھن سے کوشاں رہتے تھے۔ اب سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ کثر اللہ فینا امثالہٗ۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ- راشد شیخ
المیزان پبلشرز، فیصل آباد)

2003ء

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

جناب مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک نے کئی برس قبل مشاہیر علماء و محققین کی خدمت میں ایک سوالنامہ روانہ فرمایا تھا جس میں ان حضرات کی علمی اور مطالعاتی زندگی سے متعلق سوالات درج تھے ۔ بعد میں ان تمام جوابات کو کتابی شکل میں "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے عنوان سے مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے مرتب فرمایا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا جواب گو مختصر تھا لیکن اس میں غور وفکر کے کئی پہلو موجود ہیں ۔ یہاں ہم مولانا سمیع الحق صاحب کا سوالنامہ اور ڈاکٹر صاحب کا جواب پیش کرر ہے ہیں۔ (مرتب)

سوالنامہ از مولانا سمیع الحق:

ا) آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے؟

ب) ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیت۔

ج) کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا، موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟

د) آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لیے؟ ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلبہ کی تعمیر وتربیت میں مدد

Marfat.com

ملی؟

ہ) اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث ونوازل کا سامنا ہے اس کے لیے قدیم یا معاصر اہل علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں؟

و) علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تحریفی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کون سی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی راہنمائی کرسکتی ہیں؟

ز) موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کون سی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں؟

ح) مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظام میں وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو اسے موثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں؟ امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

جواب از ڈاکٹر محمد حمید اللہ:

آپ نے کچھ سوال فرمائے ہیں، مجھے اس قسم کے سوالوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

یا

وللناس فیما یعشقون مذاهب

کتابوں کے سلسلے میں میرا اصول "خذ ما صفا دع ما کدر" کا ہے۔ قرآن وحدیث کے باہر کوئی کتاب سو فیصد صحیح ہو نہیں سکتی۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں دونوں کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

میں اردو میں معارف اعظم گڑھ کو پسند کرتا ہوں، اوروں میں کم ہی کوئی کام کی چیز ملتی ہے۔

حیدرآباد، جرمنی اور فرانس کی درسگاہوں میں اساتذہ سے تو کم، اپنی ذاتی تلاش

Marfat.com

اور مطالعے سے ہی وہ سیکھا جواب جانتا ہوں (اور جو بہت ہی حقیر علم ہے)۔ تاثر یہی ہے کہ آدمی اپنی ذاتی محنت اور کاوش سے کچھ سیکھتا ہے اور بس! ایک ہی استاد کے ایک ہی لیکچر سے دو طلبہ دو سو مختلف سبق سیکھتے ہیں۔

مجھے عصرِ حاضر کے مسائل سے دلچسپی نہیں، میرا موضوع اس سے مختلف ہے اس سے آپ کے سوال ز، ح، پر اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ہوں۔

چونکہ "مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب" سے میں واقف نہیں ہوں اس لیے کسی رائے زنی کا امکان بھی نہیں...... آدمی قرآن وحدیث جیسی بنیادی چیزوں کے پڑھنے بلکہ سمجھنے سے بھی آدمی نہیں بنتا بلکہ ان پر عمل کرنے سے ہے۔ بقول سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے "بداخلاق آدمیوں سے آدمی خوش اخلاق بنتا ہے اگر ان کو نمونہ بنائے کہ خود ویسا نہ کرے۔"

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ-محمد راشد شیخ
المیزان پبلشرز-فیصل آباد)
۲۰۰۳ء

Marfat.com

مکاتیب

Marfat.com

مخدوم و محترم

سلام مسنون نیاز مندانہ ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ ایک اور مضمون ملفوف ہے، مناسب ہو تو شائع فرما دیا جائے، گذشتہ مضمون سنا کہ شائع ہوا اگرچہ تا حال پڑھنے یا دیکھنے میں نہیں آیا، خیر اسے کوئی اہمیت نہیں غرض تو اشاعت و اطلاع تھی۔

گذشتہ دو سال سے معارف دیکھنے کو ترستا تھا ابھی حال میں ایک دوست کے یہاں ان شماروں کا بڑا حصہ دیکھنے میں آیا، اور دل بھر آیا، مسرت نہ صرف اس عزیز دور افتادہ دوست سے مکرر ملنے پر ہوئی، بلکہ اس پر بھی کہ معیار اگر بلند تر نہیں ہوا تو ماشاء اللہ پرانا معیار برقرار ضرور ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب کا دلچسپ مضمون طب پر دیکھ کر مستفید ہوا۔ انہوں نے ابن سمحون کا خاص ذکر کیا ہے، لیکن اس کی کتاب بہ ظاہر اُن کی دانست میں مفقود ہے، الحمدللہ اب اس کے بڑے حصے کا پتا بھی چل گیا ہے، اس کی تالیف الجامع لاقوال الحکماء ...... فی الادویۃ المفردہ کی دو جلدیں میں نے آکسفورڈ کے کتب خانہ باڈلیان میں دیکھیں اور معلوم ہوا تھا کہ کچھ اور جلدیں بھی حال میں برٹش میوزیم میں آئی ہیں، تادم تحریر آخر الذکر کے مطالعہ کا موقع نہ ملا، آکسفورڈ کا مخطوطہ نہایت قدیم، نہایت خوشخط اور خط کوفی (مراکشی، مغربی) میں ہے، اس کا نہج وہی ہے جو بعد میں ابن البیطار کے ہاں ملتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ مختلف بوٹیوں کو حروف تہجی پر مرتب کر کے ان کے متعلق مختلف قدیم و ہمعصر مؤلفوں کے بیانات یکجا جمع کر دیے ہیں۔ اس میں بھی دینوری پر سب سے زیادہ اعتماد کیا گیا ہے، یہ کتاب بھی اس قابل ہے کہ اسے شائع کیا جائے، ہماری علمی میراث میں اسے اہم درجہ حاصل ہے۔

ایک اور بھی وجہ مسرت ہے:

مجھے یاد نہیں کبھی اس سے پہلے مولانا ابوالجلال ندوی کی میں نے کوئی چیز پڑھی ہو،

Marfat.com

گذشتہ دو سال میں اُن کے جو مضمون چھپے ہیں: اُن سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمانِ علم پر ایک نیا کوکب دُری ایک درخشاں تارہ نمودار ہو گیا ہے، خدا اسے بہت دن تابان رکھے، ان کی تحقیقات قابلِ رشک ہیں، اگر وہ کبھی کبھی فرانسیسی جرمن میں نہ سہی انگریزی ہی میں ان کے ترجمے یا خلاصے شائع کرائیں تو انہیں ہم فن زیادہ تعداد میں مل جائیں، انہوں نے ایک جرمن کتاب مولفہ ڈوزی (Dieisraeliten zu mekka) کا ذکر کیا ہے، اس کا صحیح تلفظ ''دِی اسرائےلیتن تسومکہ'' ہے، مولانا کی اعلام القرآن کا انتظار رہے گا، خدا کرے جلد تکمیل کو پہنچے اور یہ خدمت قرآن، صاحب قرآن جل شانہٗ کے ہاں مقبول ہو۔

ابو محفوظ الکریم صاحب تفسیر طبری کے سلسلے میں مفید کام کر رہے ہیں، ایک چیز ذہن میں آتی ہے، ان کے غور کے لیے عرض ہے، تفسیر طبری اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے، اس سے سات تو کیا، ستر مستقل کتابیں اخذ اور الگ کی جاسکتی ہیں لیکن وہ اس طرح نئی کتابیں شائع کرنے کی کوشش کرنے کی جگہ محض اشاریے یا انڈکس شائع کر دیں تو کم خرچ اور زیادہ مفید ہو، تفسیر طبری اس وقت جن لوگوں کے پاس ہے اُن کے لیے سات اور کتابیں خریدنا ایک طرح سے تحصیل حاصل ہوگا، مولوی ابو محفوظ الکریم صاحب نے جو سات عنوان تجویز کیے ہیں، انہیں پر مجوزہ انڈکس مرتب کریں اور مثلاً معانی القرآن کے سلسلہ میں الفاظ کو حروف تہجی پر مرتب کر کے یہ بتاتے جائیں کہ وہ لفظ کس کس سورت اور کس آیت میں ہے، نیز طبری کی کس کس جلد اور کس صفحے میں کن سطروں میں ہے، یہی حال اعراب القرآن، بلاغات القرآن وغیرہ کا ہے جو انڈکس میں الگ الگ ابواب میں آ سکتے ہیں، طبری کی عبارتوں کو دہرانے کی ضرورت نہ ہوگی، یوں بھی طبری کا ایک ہی فقرہ ممکن ہے متعدد ابواب سے متعلق رہے اور اس طرح بار بار نقل دہرانے سے تیس جلد کی تفسیر طبری کا ''اقتباس'' شاید ساٹھ جلدوں میں ہو جائے موصوف کی فہرست میں کم از کم چار عنوانوں کا اضافہ مناسب ہوگا۔

(۱) آدمیوں کے نام (۲) مقاموں کے نام (۳) کتابوں کے نام (۴) اشعارِ شواہد کی یکجائی یا کم از کم صدر بیت مع قافیہ بتا کر تفصیل۔ اس طرح کے جامع اشاریے سے اہلِ علم کو بڑی سہولت ہوگی، اور وہ اس خدمت کو سر آنکھوں پر رکھیں گے، چند سال قبل

Marfat.com

سنا تھا کہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی اس طرح کا کام کر رہے یا کرنے والے تھے انہوں نے غالباً اس پر کوئی مضمون بھی لکھ کر اہلِ علم کی رائے طلب کی تھی، اگر یہ کام ایک اکیلے آدمی کے لیے بہت وقت لینے والا ہو تو کام کا خاکہ طے کر کے پانچ دس موزوں و مستعد افراد میں بانٹ دیا جا سکتا ہے، اور نتیجہ ہند ہی نہیں عربی فارسی ممالک میں بھی خوش آمدید ہوگا، طبری کے دل سے بھی دعا نکلے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمدُ للہ رَبّ العلمین

(معارف- اعظم گڑھ- مئی ۱۹۵۰ء)

Marfat.com

اسلامیات کی ایک انگریزی کتاب پرسوال و جواب

مسلم مستشرق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے فرانس میں ''انٹروڈکشن ٹو اسلام'' لکھی ہے جس کے متعلق ۳۱ رجولائی کے صدق میں ایک مراسلہ بھی ہے۔ یہ کتاب تو ''عجوبہ'' معلوم ہوتی ہے۔

پیراگراف نمبر ۱۸۴ میں یہ ہے۔ حج کے موقع پر بڑے پیانہ پر دنگل، مشاعرے اور مختلف تماشے ہوتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان مشاغل کو موقوف کیا!

نمبر ۵۸ میں فرماتے ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی تھی کہ اگر تلفظ میں زحمت ہو تو متن قرآنی کے الفاظ کے بجائے ان کے مترادفات استعمال کر لیے جائیں!

نمبر ۳۹۲ میں ''جلا بیبھن'' والی آیت کا ذکر ہی نہیں ہے لکھا ہے کہ عہد رسالت میں مومنات گانیوالیاں اور ہیئر ڈریسر کا پیشہ کرتی تھیں اور عہد فاروقی میں ایک مومنہ مارکٹنگ انسپکٹر تھیں!

نمبر ۵۴۸ میں صرف جمپر کو نیچا کرنے کی ہدایت ہے۔ ٹانگوں کو ڈھاکنے کا ذکر ندارد!

نمبر ۴۳۹ میں غیر مسلم اہل کتاب ''موحدہ'' سے شادی ہو سکتی ہے اور

Marfat.com

اسے مئے نوشی وغیرہ کی اجازت ہوگی!

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے

اقبال

ز اجتہادِ عالمان کم نظر
اقتدائے رفتگاں محفوظ تر

ایم اے (علیگ) از کراچی

مصنف کے قلم سے

کتاب ''انٹروڈکشن ٹو اسلام'' ایک روز افزوں شدید ضرورت اور تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مرتب کی گئی۔ وہ نقش اوّل ہے اور ضرورت ہی نہیں۔ تمنا ہے کہ اہل علم اس کی اصلاح وتصحیح کے لیے مشورے دے کر عنداللہ ماجور ہوں اور عندالمولف مشکور۔ اب تک راست ہو کہ بالواسطہ ایسی تنقیدوں کا فقدان رہا ہے۔ انگریزی کا تیسرا ایڈیشن اب مطبع جا رہا ہے۔ کاش یہ گمنام دوست ہی زیادہ غور سے کتاب کا مطالعہ کر کے کچھ تعمیری تنقید فرمائیں۔

موجودہ تنقید سے گمان ہوتا ہے کہ بیانات کا حوالہ نہ ہونا بعض ناظرین کے لیے کتاب کو ''عجوبہ'' (؟ اعجوبہ) بنا دیتا ہے کوشش کی جائے گی کہ آئندہ حوالے بڑھائے جائیں لیکن فی الحال یہ عرض ہے کہ سارے ہی بیانات قرآن مجید، حدیث شریف اور مستند کتب فقہ وتاریخ پر مبنی ہیں۔

اسلام نہ تو ترک دنیا کا نام ہے اور نہ ترک عقبیٰ کا بلکہ فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کا۔

۱۔ دنگل، تیراندازی، گھڑ دوڑ، وزنی پتھروں کا اٹھانا وغیرہ مختلف جسمانی صلاحیتوں کے مقابلے فوجی ضرورتوں سے جناب رسالت مآب کی مدینہ منورہ میں سرپرستی

Marfat.com

حاصل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ کتب حدیث میں صراحت ہے۔ مطعون ص۱۸۴ میں تو زمانۂ جاہلیت کا ذکر ہے۔ حجۃ الوداع رسول اکرم کی وفات سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ پھر حضرت ابوبکر کی دو سالہ خلافت فتنۂ ارتداد کے انسداد میں صرف ہوگئی۔

۲۔ شاعری کو اسلام نے ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ اس طری صلاحیت کو بہتر راستے پر لگایا۔ کتب صحاح میں ہے کہ رسول اکرم حضرت حسان بن ثابت کو منبر پر چڑھ کر اپنے اشعار سنانے کی ہدایت فرماتے تھے اور یہ کہ قبیلہ تمیم کا اسلام ایک ''مشاعرے'' میں مسلمان شاعر کے جیتنے کے باعث وقوع میں آیا۔

۳۔ ص ۵۸ کے سلسلے میں ایک مشہور واقعہ جو کتب حدیث میں مروی ہے یاد دلاؤں گا۔ ایک بدوی نے ''شجرۃ الزقوم طعام الاثیم'' کو ''طعام الیتیم'' تلفظ کیا اور بار بار مشق کرانے کے باوجود وہ اثیم کو یتیم ہی کہہ سکا۔ اسے اجازت دی گئی کہ ''طعام الفاجر'' پڑھا کرتے ''طعام الیتیم'' نہیں۔

۴۔ ص۳۹۲ ہی کو کوئی اور فقرہ، یہ کیا ضروری ہے کہ ساری متعلقہ قرآنی آیتیں اس تمہیدی اور ابتدائی کتاب میں درج کی جائیں۔ قابل اعتراض جب ہو کہ عدم ذکر سے کوئی غلط بیانی ہوتی ہو۔ لیکن محترم ناقد نے جس آیت کے عدم ذکر کا ذکر کیا ہے، وہ تو اس فقرے میں صراحت سے مذکور ہے۔ (دیکھو سطر ۸ تا ۱۰ فقرۂ زیر بحث)۔

۵۔ دلہنوں کو بنانے سنوارنے کی اسلام ممانعت نہیں کرتا۔ اور قطعاً نہیں کرتا۔ تو یہ کام کسی اسلامی ملک میں مسلمان عورتوں کے سوا کون کرسکتا ہے؟ اور اس کسب حلال سے کوئی ماہر فن عورت کچھ کماتی ہے تو اس میں کیا اعتراض ہے؟ کتب حدیث سے پتا چلتا ہے کہ عہد نبوی میں مدینۂ منورہ میں اس کا رواج رہا ہے (کتاب میں یہ کہیں ذکر نہیں ہے کہ ایسی عورتیں بے پردہ ہوتی تھیں) حضرت شفاء بنت عبداللہ کو حضرت عمر نے سوق مدینہ کے جس انتظامی کام پر مامور رکھا اس کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ جناب رسالت مآب کے عمل ہی کو برقرار رکھنے

پر مبنی تھا۔

۶۔ ص ۵۴۸ کا مطعون بیان ایک حدیث پر مبنی ہے۔ نصف پنڈلی تک لہنگا رکھنا ٹانگوں کو ڈھاپنے ہی کے لیے ہے۔ اگر ٹکوے تک یا کسی اور حد تک ڈھانکنے کا لزوم ہے تو محترم ناقد صاحب براہ کرم حوالے کا ذکر فرمائیں۔ آئندہ مطعون بیان کی تصحیح کر دی جائے گی۔

۷۔ ص ۴۳۹ کا بیان بھی کتب حدیث وفقہ پر مبنی ہے۔ غیر مسلم بیوی کو سارے اسلامی ممنوعات سے روکنے کا لزوم اگر محترم ناقد صاحب کسی آیت، حدیث یا فقہاء کے بیانات میں موجود پاتے ہوں تو براہ کرم حوالے دے کر ممنون فرمائیں۔

مکرر یقین دلاتا ہوں کہ زیر بحث کتاب حرف آخر نہیں نقش اوّل ہے۔ تعمیری تنقید ہم خرما و ہم ثواب کا باعث ہوگی۔ کم از کم کوئی بہتر کتاب ہمارے گم نام فاضل خود مرتب فرمائیں کہ اس کی شدید ضرورت ہے اور ہم اسی کو استعمال کریں گے، زیر تنقید کتاب کو نہیں۔

محمد حمید اللہ

(ہفت روزہ ''صدق جدید'' لکھنؤ تمبر ۱۹۶۴ء)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے دو خط

C/O Schmoelz
8959 - Weissesf
West Germany

۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ دوشنبہ

مکرمی دام لطفکم

سلام مسنون۔ خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ ایک زحمت دہی کی جرأت کرتا ہوں، بشرطیکہ فرصت ہو۔ یہ سن کر آپ کو مسرت ہوگی کہ "بال جبریل" کا فرانسیسی میں (اور پہلی بار ایک فرنگی زبان میں) ترجمہ ہوا ہے اور معلوم ہوا کہ یونیسکو نے اسے چھاپنا منظور کر لیا ہے۔

فرانسیسی مترجمہ نے بعض مشکلات میں مجھ سے رجوع کیا ہے۔ اگر آپ میری دستگیری فرمائیں تو میں بھی ممنون ہوں گا کہ یہ میرا موضوع نہیں ہے، اور وہ بھی ممنون ہوگی۔

۱۔ص ۲۱۰: میری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی۔ کئی لوگوں نے دِیر پیوندی پڑھ کر دیر یا مشکل سے مانوس ہونا گمان کیا ہے۔ میں دیر یعنی خانقاہ پڑھتا ہوں کہ خدا صوفیوں کی خلوتوں میں ملتا ہے، سرِ راہ نہیں۔

۲۔ص ۷۹: تو آپ ہے اپنی روشنائی؟۔ میں اس سے روشنی نہیں، بلکہ سیاہی، جس سے لکھنا، یعنی تقدیر مراد لیتا ہوں۔

۳۔ص ۱۷۱: اتر کر جہانِ مکافات میں؟۔ مکافات تو آخرت میں ملے گی۔ کیا مراد یہ ہے کہ وہ جہاں جس کے اعمال کی ایک دن مکافات ہوگی؟

۴۔ص ۱۴: جہانِ مرغ و ماہی۔ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ ہوا کے پرند، سمندر کی مچھلیاں یعنی وہ دنیا جو تحت الثریٰ سے ثریا (آکاش سے پاتال) تک ہے؟ پھر محاورۃً

Marfat.com

''ماہی مراتب'' کی کیا توجیہ ہوگی؟

۵۔ص۶۴: عیارِ گرمیٔ صحبت ہے حرفِ معذوری۔ معذرت کس کی طرف سے؟ ساقی یا رند؟

۶۔ص۱۵: حق راسجودے، صنماں رابطوافے۔ کیا ریاکارانہ عبادت مراد ہے؟

۷۔ص۱۵۳: آئینہ کائنات کا معنی دیریاب تو۔ کون خدا، یا عشق؟

اقبال کی عربی سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت بھی ہے افسوس بھی باللسان۔ (ص۵۴)۔ اَرَنی (ص۹۱) للّٰہ ۔ (ص۱۶۱) اور سب سے بڑھ کر لزومات۔ (ص۲۰۹) جو نہ صرف متن میں ہے کہ وزنِ شعر کا بہانہ کریں، بلکہ حاشیے میں بھی۔ کتاب کا صحیح نام لزومیات ہے۔

یہی حال جرمن دانی کا ہے: نیٹشا (ص۸۲)

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ اوپر دیے ہوئے پتے پر (جو ماہ اگست ۱۹۷۰ء کے لیے ہے) جواب مرحمت ہو تو مجھے جلد مل جائے گا۔ دلی شکریہ۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

جواب:

جنابِ مکرم!

السلام علیکم

کرم نامہ ملا یاد فرمائی کا شکریہ، جواب میں تاخیر ہوئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، بہت مصروف تھا۔ آج اگست کی ۲۴ تاریخ ہے ستمبر کے ''فاران'' کی کاپیاں ابھی تک پریس نہیں جاسکیں!

آپ کے استفسارات کے جواب میں عرض ہے۔

(۱) پورا شعر یوں ہے:

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

''بالِ جبریل'' میں ''میری'' کتابت کیا گیا ہے اور آپ نے بھی ''میری'' لکھا ہے، یہ کاتب کی غلطی ہے! ''مری'' ہونا چاہیے۔ ورنہ ''میری'' سے تو شعر وزن سے ساقط ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا ایک مصرعہ ہے:

عشق بمیر دز وصل

''وصل کے بعد عشق ختم ہو جاتا ہے، عاشق کا سارا لطف فراق اور دوری میں ہے،

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

جس شعر کے بارے میں آپ نے استفسار فرمایا ہے، اس میں بھی اقبال کا یہی خیال، فکر اور جذبہ ملتا ہے۔ یہ کہ حقیقی مطلوب و محبوب (اللہ تعالیٰ) کا حجاب ہی آوارہ کوئے محبت کے لیے ''اکسیر'' یعنی باعثِ اضطراب وشوق اور وجہِ زندگی ہے!

مصرعہ اولیٰ میں ''دیر'' سے آتش پرستوں کا معبد، خانقاہ یا بقول آپ کے صوفیوں کی ''خلوت'' مراد نہیں ہے! شاعر اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے یہ عرض کر رہا ہے کہ باری تعالیٰ تیری ''دیر پیوندی'' یعنی تیری رضا کا جلد حاصل نہ ہونا بلکہ دیر میں حاصل ہونا ہی میری آتش شوق کو بھڑکاتا ہے! میں نے ''دیر پیوندی'' کے معنی اللہ تعالیٰ کے دیر سے ملنے یا دیر یا مشکل سے مانوس ہونے کی بجائے ''اللہ کی رضا کا دیر سے حاصل ہونا'' لیے ہیں! اس میں جو ادب واحتیاط کا پہلو ہے اس کو پڑھ کر ان شاء اللہ آپ لطف لیں گے

(۲) تیری قندیل ہے ترا دل — تو آپ ہے اپنی روشنائی

اس شعر میں اقبال نے تدبیر و تقدیر کا فلسفہ بیان نہیں کیا ''روشنائی'' سے لکھنے کی سیاہی نہیں بلکہ روشنی اور تجلی مراد ہے! میں نے اپنے بچپن میں ایک نعتیہ شعر سنا تھا:

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گر مصطفائی نہ ہوتی — تو عالم میں یہ روشنائی نہ ہوتی

اس میں ''روشنی'' کو روشنائی کہا گیا ہے۔

اقبال کے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے انسان خود تیرا دل ہی قندیل ہے اور تو

Marfat.com

اپنی ذات سے خود روشنی اور تجلی واقع ہوا ہے:

(۳) اُتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں

اقبال کا ایک اور شعر ہے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

زندگی موت سے اس طرح بدلہ لیتی ہے کہ ایک ناپید ہوتا ہے تو کئی پیدا ہو جاتے ہیں! اسی اعتبار سے علامہ نے اس دنیائے آب وگل دارِ عمل اور عالم کون وفساد کو ''جہانِ مکافات'' کہا ہے! عام اور مشہور اصطلاح میں جہاں مکافات عالم آخرت ہی کو کہتے ہیں یہ شاعر کا تصرف (Poetic License) ہے!

(۴) تری دنیا جہان مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبحگاہی

اقبال اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کر رہا ہے کہ تو خشکی وتری کا خالق ہے اور پاتال سے آکاش تک تیری خدائی ہے..... میں کیا ہوں، بس یہی کہ فغانِ صبحگاہی کا مجھے اختیار دیا گیا ہے، یہی آہ وفغاں اور ذکر وتسبیح میری دنیا ہے!

''ماہی مراتب'' تو شاہی اعزاز کا نام ہے جس کا اس شعر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) سنے نہ ساقیٔ مہوش تو اور بھی اچھا — عیار گرمیٔ صحبت ہے حرفِ معذوری

''حرفِ معذوری'' رندوں کی طرف سے! یعنی رندوں کی معذرت، فریاد، طلب جام وشراب کی درخواست کو اگر ساقی نہیں سنتا تو یہ اور بھی اچھا ہے کہ اس سے گرمیٔ صحبت باقی رہتی ہے ورنہ ساقی اگر جام عنایت کر دیتا تو میخوار پی پلا کر میکدے سے چلا جاتا اور ساقی کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا لطف جاتا رہتا!

(۶) حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم ودیر بجھا دو

آپ کا خیال درست ہے، اس سے ریاکارانہ عبادت ہی مراد ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو ریا آمیز سجدوں سے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں اور بتوں کو طواف سے، مرزا غالب کا شعر ہے:

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند — حق را بسجودے ونبی ﷺ را بہ درودے

اقبال نے ''نبی را بہ درودے'' کے بجائے ''صنماں را بطوافے'' کر دیا، اس میں

Marfat.com

فریہ مقدر و محذوف ہے!

(۷) آیہ کائنات کا معنی دیریاب تو نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

معنی دیریاب سے نہ خدا مراد ہے اور نہ عشق "تو" کہہ کر اقبال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا ہے، اس کے بعد کا (چوتھا) جو بند ہے وہ نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

علامہ اقبال عربی جانتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف "عبقات" پڑھ چکا ہوں یا پڑھنا چاہتا ہوں، یہ کتاب (عبقات) عربی میں ہے اور تصوف و کلام کے نازک وادق مسائل اس میں بیان کیے گئے ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اس کا اُردو ترجمہ کیا ہے[1]۔ بال جبریل میں "باللسان" کے بجائے "بااللسان" اور "اِرنی" کی جگہ "اَرنی" کا املا یہ کتابت کی غلطی ہے۔ بال جبریل میں الارض اللہ درج ہے آپ نے اپنے مکتوب میں ایک شوشہ اور بڑھا دیا اور یوں ......للّٰہ لکھا یہ بھی کاتب کا تصرف ہے، خود میرے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ "اصرار" کو کاتب نے "اسرار" لکھا اور کاپی پڑھتے ہوئے میری نگاہ سے چوک ہوگئی، کتابت کی یہ غلطی درست ہونے سے رہ گئی۔

ابوالعلامعری کے قصائد کے مجموعہ "لزومیات" کو لزومات لکھنا یہ علامہ اقبال کا تسامح ہے۔ جس کی کوئی توجیہ اور تاویل نہیں کی جاسکتی! بھول چوک سے کون انسان بچا ہوا ہے۔

علامہ اقبال نے نیٹشے کو ایک جگہ "نطشہ المانوی" لکھا ہے، شاعر کے اصل نام نیٹشے سے وہ ناواقف نہیں تھے جس مقام کی آپ نے نشاندہی کی ہے، وہاں کاتب سے یا ممکن ہے خود اقبال سے سہوِ قلم (Pen Slip) ہوگیا ہو۔

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اقبال کے جن شعروں کے بارے میں آپ

---

[1] علامہ اقبال کی وفات کے بعد یہ کتاب اللجنۃ العلمیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔ (م ع م ح)

نے استفسار فرمایا ہے ان میں سے کئی شعر خاصے اُلجھے ہوئے ہیں اور ان میں وہ شکوہ ورعنائی بھی نہیں ہے جو کلامِ اقبال کا خاصہ ہے...... مگر یہ بات آپ اس فرانسیسی خاتون سے جو بال جبریل کا ترجمہ کر رہی ہے، ہرگز نہ کہیے۔

میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بعافیت ہوں، احباب میں آپ کا تذکرہ رہتا ہے، سب لوگ آپ کی سیرت و کردار علم و فضل کے مدآح و معترف ہیں!

آپ کا مکتوب اپنے جواب کے ساتھ اکتوبر کے ''فاران'' میں شائع کر رہا ہوں!

والسلام

مخلص۔ ماہر القادری۔ ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء

دوسرا خط:

والیسنز ے

۲۴ جمادی الآخرہ ۱۳۹۰ھ

مکرمی دام لطفکم!

سلام مسنون و رحمت اللہ و برکاتہ۔ عنایت نامہ ملا مسرور کیا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ شرمندہ ہوں کہ زحمت کا باعث بنا۔

(۱) دیر پیوندی کے معنی آپ نے رضائے الٰہی کا دیر سے حاصل ہونا لیے ہیں اس حسن ادب کی بے ساختہ داد تو دیتا ہوں لیکن اس مفہوم کے قبول کرنے میں ایک حدیث قدسی کے باعث اب بھی تامل ہے یعنی ''اگر بندہ میری طرف ایک قدم آتا ہے تو میں اس کی طرف دو قدم جاتا ہوں، وہ میری طرف چلتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتا ہوں۔ رضائے الٰہی کا حصول آسان ہے ہمارے نفس امارہ کی رضا ہی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

(۵) رندوں کی معذرت، فریاد جام طلب: معذرت کو فریاد سے کیا ربط ہے؟ رند کی فریاد پر ساقی کی معذرت تو البتہ سمجھ میں آتی ہے۔ معاف فرمایئے میں ادب کا ذوق نہیں رکھتا، روکھا پھیکا قانونی اسلوب بیان جانتا ہوں۔ اسی طرح ساقی مہوش کی نظارہ بازی کا جسے شوق ہو تو وہ ''پی پلا کر چلے جاتے'' پر عمل نہ کرے بلکہ پیالے کو لبریز ہی رہنے

Marfat.com

دے، یا پیالہ پی کر ھل من مزید کی فریاد کرے۔

(۷) کیا نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو کا سرورِ کائنات پر اطلاق درست ہوسکتا ہے؟ میرے ناقص علم میں تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک رہنما ہے، مطلوب صرف ذات الٰہی ہوسکتی ہے۔

میں نے للہ نہیں لکھا ہے، بلکہ لِلّٰہ، خالص عربی خط میں گول ہ سے۔ املا کی غلطیاں کاتب سے منسوب کرنا آسان ہے لیکن اقبال مرحوم کا طظنہ اتنا رہا ہے کہ بے چارہ کاتب کسی تبدیلی کی جرأت کم ہی کرسکتا ہے میں نہیں چاہتا کہ اقبال مرحوم کے متعلق ''پیراں نمی پرند مریداں می پرانند'' کیا جائے۔ غالباً ان کے اصل مسودے محفوظ ہوں گے کاش کوئی اللہ کا بندہ لاہور میں جاوید اقبال صاحب سے ملے۔ احقاقِ حق میں ان کو تامل نہ ہونا چاہیے۔ غلطی میری نکلے تو ازیں چہ بہتر۔

عربی پڑھ کر مطلب سمجھ لینا بہت سے لوگ کر لیتے ہیں عربی میں لکھنا زیادہ عبور چاہتا ہے۔

فرنگیوں کو اقبال سے اگر دلچسپی ہے تو وہ میری دانست (بدگمانی) میں اس بنا پر ہے کہ ملا اور زاہد ریاکار کے پردے میں ان کو مسلمانوں کے فقہاء اور صوفیہ کا مضحکہ کرنے کا ایسا موقع ملتا ہے کہ کسی مسلمان کو گرفت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیا اقبال مرحوم نماز روزے کی پابندی اور منہیات سے اجتناب میں ملاؤں اور زاہدوں کے مقابل بہتر نمونہ پیش کرتے رہے ہیں؟ اچھا ہوتا اگر وہ صرف مادیت اور مغربیت پر طنز پر اکتفا کرتے میرے مشاہدے میں تو سارے اقبال پرست، عام طور پر دیندار لوگوں کا مضحکہ کرتے رہتے ہیں۔ خیر، اپنی اپنی رائے ہے، مجھ سیاہ دل کو کیا حق ہے کہ دوسروں کو سبق دوں۔

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔

میں اب ان شاء اللہ دو تین دن میں وطن مالوف کو واپس ہو جاؤں گا۔ اطلاعاً عرض ہے۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

Marfat.com

جواب:

جناب مکرم!

السلام علیکم

میں بڑا فکر مند تھا کہ میرا نیاز نامہ آپ کو جرمنی میں وقت پر ملتا بھی ہے یا نہیں! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ کے مکتوب نے اس فکر کو دور کر دیا۔

(۱) دیر پیوندی کے عام طور پر یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے دیر میں مانوس ہوتا ہے۔ مگر یہ عنوان کس قدر وحشت ناک ہے! اس نامناسب صورت حال سے بچنے کے لیے میں نے ''دیر پیوندی'' کی شرح ''رضائے الٰہی کا دیر سے حاصل ہونا کی'' یہ مضمون اس حدیث قدسی سے متصادم نہیں ہے۔ جس کو آپ نے اپنے مکتوب میں درج کیا ہے۔ حدیث قدسی کا مفہوم یہ ہے کہ جو بندے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہ قدر جدوجہد ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ پذیرائی کی جاتی ہے یعنی کسی کی کوشش رائگاں نہیں جاتی مگر رضائے الٰہی اور ثواب و پذیرائی بالکل ایک چیز نہیں ہیں! مرد مومن کا اصل مقصود اجر و ثواب سے زیادہ رضائے الٰہی کا حصول ہے!

(۵) اصل شعر میں جو الجھاؤ ہے، اس کو دور کرنے کے لیے میں نے حرف معذوری کی نسبت رندوں کی طرف کی ہے!

(۷) شوق و محبت کی زبان میں:

نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

سے مراد نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو تو دینی اعتبار سے یہ قابلِ گرفت بات نہیں ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رہنما بھی ہیں اور مطلوب و مقصود بھی ہیں اور یہ طلب و جستجو بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے!

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

آپ نے اپنے پچھلے خط میں ''للہ'' لکھا ہے اصل مکتوب میرے پاس موجود ہے اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ خود آپ نے ایک شوشہ کا اضافہ فرما دیا!

Marfat.com

یہ کام بڑا دشوار ہے کہ علامہ کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال سے رابطہ قائم کیا جائے اور وہ بال جبریل کے اس مسودے کی تلاش کریں جو خود علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

علامہ اقبال انسان تھے فرشتہ نہ تھے، بہتر یہ ہے کہ ان کی زندگی کو زیر بحث نہ لایا جائے، ایک صاحب نے فاران میں اشاعت کے لیے ایک مقالہ بھیجا تھا جس میں اقبال کی زندگی کا مولانا روم علیہ الرحمۃ کی سیرت سے جوڑ ملایا تھا میں نے وہ مضمون واپس کر دیا اور ان کو لکھا کہ اس قسم کی مبالغہ آرائی سے خود اقبال کی شخصیت کو نقصان پہنچے گا۔

اقبال کی زندگی کا آخری دور توبہ وندامت اور خیر پسندی کا دور تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر ان کی پلکیں بے اختیار بھیگ جاتیں، اسلام اور ملت کی خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے ان کی شاعری نے دینی محاذ کو بڑی تقویت پہنچائی انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مولویوں اور مولاناؤں کی باتوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں مگر علامہ اقبال کی شاعری کے آگے دم بخود ہو جاتے ہیں، اقبال کی شاعری نے اس دورِ انکار و بے یقینی میں دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے وہ اسلامی شعر و ادب کے نقیب اور امیرِ کارواں ہیں۔ (نور اللہ مرقدہ و برد اللہ مضجعہ)

راقم الحروف نے یومِ اقبال پر ایک جلسہ میں عرض کیا تھا کہ علامہ اقبال نے سب سے زیادہ طنز مغربی تہذیب اور مغرب زدہ مسلمانوں پر کی ہے۔ مگر یہ گروہ یہ سمجھتا ہے اس طنز کا مصداق ہم نہیں، کوئی اور ہے! ہم مسلمانوں کی بے علمی اقبال کی تعلیمات ہی تک محدود نہیں ہے، قرآن پڑھتے ہیں اور عمل نہیں کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے عشق کے مدعی مگر زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی قدم قدم پر خلاف ورزی! اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے پیرس پہنچ گئے ہوں گے! پارسال پیرس میں آپ کی معیت میں چند دن اچھے گزرے! میرے مزاج میں جو ایک قسم کی وحشت اور لااُبالی پن ہے، اس کو آپ نے گوارا کیا، اور میں کم بخت معذرت تک نہ کر سکا۔

والسلام　　　　طالب دعا - ماہر القادری

(ماہنامہ فاران کراچی - اکتوبر ۱۹۷۰ء)

Marfat.com

ڈوب مرے فرعون کا نام

فاضل و نامور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا استنبول سے بھیجا ہوا یہ خط اتنی قیمتی معلومات پر مشتمل ہے کہ ناظرین فاران کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا اس لیے یہ خط بعینہ شائع کیا جا رہا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جن مقاصد کے ماتحت بار بار دہرایا گیا ہے ان کے لیے اگرچہ اس تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ ڈوبنے والے فرعون کا نام کیا تھا یا جس جگہ یہ صورت پیش آئی تھی وہ کون سی جگہ تھی لیکن تفصیلی معلومات کے لیے اس قسم کی تفصیلات کا ذکر قدیم زمانہ سے تفسیروں میں ہو رہا ہے اور مفسرین نے تورات کے ہر ہر لفظ کو محرف و مبدل کبھی نہیں کہا ہے۔ جہاں کہیں تورات کا بیان قرآن مجید کے موافق ملا ہے بلکہ جہاں قرآن مجید کے بیان پر قرین قیاس اضافہ نظر آیا ہے اسے بے تکلف تفسیروں میں درج کر دیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید میں ڈوبنے کا ذکر کرتے ہوئے نیل یا بحر احمر کا نام نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زمانۂ شیر خوارگی میں تابوت میں رکھ کر سپرد دریا کیا گیا ہو وہ دریائے نیل ہو اور جہاں وہ بنی اسرائیل کو لے کر معجزانہ طور پر پانی

Marfat.com

سے عبور کر کے دوسری طرف آ گئے ہوں وہ بحر احمر ہو۔ اس خیال کو اس سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے عبور دریا کا ذکر قرآن مجید میں بحر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ زمانہ نزول قرآن مجید میں اگرچہ لفظ بحر آبی حصہ کے لیے مستعمل مل جاتا ہے مگر دریائے نیل کے لیے عموماً لفظ نھر النیل مستعمل نظر آتا ہے، بحر النیل نظر نہیں آتا۔ دریائے نیل کے مشرق میں جزیرہ نمائے سینائی نہیں بلکہ مصر ہی کا ایک حصہ ہے اور بنی اسرائیل عبور بحر کے بعد جزیرہ نمائے سینائی میں پہنچ جاتے ہیں اور فرعون کی حکمرانی سے باہر ہو جاتے ہیں اگر وہ نہر نیل کو عبور کرتے تو فرعون کے حدود سلطنت سے باہر کہاں ہوتے۔ رہا یہ سوال کہ وہ بحر القصب یعنی لمبی گھاسوں والا دریا تھا اس کی تصریح تو کہیں موجود نہیں۔ بحر قلزم (بحر احمر) کے کھاری پانی کے کنارے پر گھاس نہیں ہو سکتی یہ قیاس بھی صحیح نہیں ہے ایک قسم کی لمبی گھاس کھاری پانی کے کنارے پر ہوتی ہے اور آج بھی متعدد مقامات پر موجود ہے۔

شاید ہی ان باتوں پر غور کرنے کے بعد مفسرین نے فرعون کے ڈوبنے کی جگہ بحر کی مغربی شاخ کو قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (عبدالقدوس ہاشمی)

میں آپ کو استنبول سے مخاطب کر رہا ہوں۔ آپ کے پابند وقت رسالہ فاران کا آخری شمارہ کوئی ہفتہ بھر ہوا پاریس میں پایا اور پڑھا تھا اس میں آپ کے نئے سفر فرنگ کے سلسلے میں مصر سے گزرنے کا ذکر ہے۔ عجائب خانے کی سیر کی تفصیل میں مرحوم و مغفور عبدالماجد دریابادی کے حوالے سے یہ بیان ہوا ہے کہ فرعون رعمسیس ثانی کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس کے بیٹے اور جانشین فرعون منفتاح کے زمانے میں مصر سے خروج فرمایا اور آخر الذکر فرعون ہی ڈوب مرا۔ یہاں اسی سے بحث مطلوب ہے۔

Marfat.com

یاد میں یاد، یہ ذکر کرتا چلوں کہ دو ایک سال کا عرصہ ہوا مولانا دریابادی مرحوم نے مجھے ایک خط لکھ کر سرفرازی فرمائی تھی اور چاہا تھا کہ میں ان کی تفسیر کا فرانسیسی ترجمہ شائع کروں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس میں عذر نہیں لیکن اصل کی تکمیل سے قبل ترجمے کا آغاز مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اس کے تعارف اور اس کے بلند پایہ محتویات سے اہلِ علم کو آگاہ کرنے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اہم و جدید تحقیقات والے اجزاء کی نشاندہی فرمائیں یا چھوٹے چھوٹے مضمون بھیجے جائیں جن کو فرانس کے علمی اور خاص کر اسلامی رسالوں میں شائع کیا جائے اور قرآن مجید کی بعض گتھیوں کی طرف خود توجہ بھی دلائی مثلاً شائع شدہ اجزاء تفسیر ماجدی میں فعلیھن نصف ماعلیٰ المحصناتِ من العذاب (زنا کا لونڈی کو آزاد عورت کی سزا کا نصف دیا جائے) اور فوراً سورۃ نور کی آیت (الزانية والزاني فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة (زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو سو درے لگاؤ) سے استدلال کر کے لونڈی کو پچاس درے کا حکم دیا ہے میں نے عرض کیا کہ سارے مفسر متفق ہیں کہ سورۃ نور کا نزول متاخر ہے، اس لیے ایک نامعلوم اور غیر نازل شدہ حکم سے استدلال غور طلب ہے۔ اسی طرح والّتی تخافون نشوزھن (جن بیویوں کے نشوز یعنی نافرمانی کا تمہیں خوف ہو تو ان کو اولاً نصیحت، پھر بستر سے جدائی اور آخر میں مار کی سزا دو) کے بعد وان امرأة خافت من بعلھا نشوزا (جس عورت کو اپنے شوہر کے نشوز یعنی نافرمانی کا حزن نہیں خوف ہو تو ......) ایک ہی سورت میں ایک ہی لفظ نشوز کے کہیں کچھ اور کہیں کچھ معنی لینے کے لیے کوئی مجبور کن وجہ ہونی چاہیے۔ نشوز کے لغت میں ایک معنی نافرمانی کے ضرور ہیں لیکن ایک تو خطبۂ حجۃ الوداع میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے لفظ نشوز کے معنی فحش اور بدکاری کے بتائے ہیں اور دوسرے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں بھی نافرمانی کو رد کر دیا گیا ہے۔

جواب آیا لیکن بات ختم کرنے کے لیے اور لہجے میں کچھ ملال بھی تھا۔ اس کا مجھے صدمہ ہے۔ اگرچہ میں نے مکرر بہ ادب یہ عرض کیا کہ مقصد گستاخی یا اعتراض نہیں، علمی تحقیق اور طالب علمانہ سوال تھا۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ قرآن مجید کے

Marfat.com

ترجمے اور تفسیر کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے سلسلے میں بائبل سے دوچار ہونا ناگزیر ہے۔ خود قرآن کا حکم ہے۔ فاتوابالتوراۃ فاتلوھاان کنتم صادقین (تو پھر توراہ لے آؤ اور پھر اس کو پڑھ کر بتاؤ اگر تم سچے ہو) تورات کو خود یہود و نصاریٰ بھی سوفی صد صحیح نہیں بتاتے ہیں۔ اسی طرح سو فیصد غلط بھی نہیں کہ خود قرآن نے بارہا اس کے موجودہ مندرجات سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً کتبنا علیھم فیھا أن النفس بالنفس (ہم خدا نے ان یہودیوں پر اس تورات میں لکھا ہے کہ جان کا بدلہ جان ......اس لیے قصہ موسیٰ علیہ السلام و فرعون کا تورات و قرآن کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ تورات کا یہ حصہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر جزاً صحیح ہے تو کون سا حصہ صحیح ہے تورات اور قرآن دونوں کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وقت پیدا ہوئے جب مصر میں یہودیوں کی نوزائیدہ اولاد نرینہ کو قتل کرنے کی فرعونیت زیر عمل تھی، ماں کو کچھ اور نہ سوجھا تو بچے کو ایک تابوت (صندوق برابر کشتی) میں لٹا کر دریائے نیل میں بہادیا خدا نے اسے فرعون کے محل کے قریب پہنچادیا۔ وہاں قرآن کے مطالب فرعون کی بیوی (امر تورات کے مطابق فرعون کی بیٹی) نے اسے نکالا اور بچے پر رحم کھا کر اس کے لیے ایک آیا مقرر کی اور قصر شاہی میں پرورش کی گئی تورات کے شارح لکھتے ہیں کہ اس پروردے کے ساتھ فرعون کا سلوک اتنا اچھا تھا کہ بعد میں جب حبش پر چڑھائی کرنی منظور ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ تورات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک حبشن سے نکاح بھی کیا (قرآن ان دونوں تفصیلوں سے ساکت ہے)۔

تورات اور قرآن دونوں کا بیان ہے کہ ایک مصری نے بے وجہ ایک یہودی کو ستایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ظالم کو غصے سے ایک گھونسہ مارا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ شاہی مجلس شوریٰ میں قصاص کی تجویز ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تن تنہا مصر سے روانہ ہوئے اور مدین میں جا پناہ گزین ہوئے (مدین سعودی عربستان کے شمال مغربی حصے میں خلیج عقبہ کے تقریباً وسط میں ساحل کے قریب ہے گویا سارے جزیرہ نمائے سینا کو عبور کر کے وہاں آئے) اس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر تیس پچیس سال سے زیادہ نہ ہونی چاہیے!

Marfat.com

قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ یا دس سال رہے پھر اہل وعیال کے ساتھ صحرائے سینا میں جبلِ طور کے قریب پہنچے تو انہیں نبوت ملی اور مصر جا کر تبلیغ دین کا حکم ملا۔ تورات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں بہت طویل عرصہ مقیم رہے اس اثنا میں ایک فرعون مر گیا پھر آپ مصر آئے اور فرعون سے ملاقات کی تو اس وقت آپ کی عمر شریف اسی (۸۰) سال کی تھی۔ قرآن وتورات دونوں کے مطابق اسکے بعد جلدی ہی مصری حکومت سے مایوس اور بیزار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سارے یہودیوں کے ساتھ ترک وطن کی تجویز کی تورات کے مطابق اس زمانے میں یہودی شمالی مصر میں دریائے نیل کے ڈیلٹا میں رعمسیس نامی علاقے میں رہتے تھے جیسے ہی موقع ملا وہاں سے مشرق یعنی جزیرہ نمائے سینا کی طرف روانہ ہوئے۔ بادشاہ کو اطلاع ملی تو فوج لے کر تعاقب میں روانہ ہوا اور اس وقت جا لیا جب مفرورین بحرِ قلزم کو عبور کر رہے تھے۔ یہودی تو معجزانہ سلامت رہ گئے اور فرعون اور اس کے ساتھی ڈوب کر مر گئے، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں میں ہے۔ یہ تفصیل بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن میں غرقابی کے مقام کے لیے یم یعنی پانی کا ذکر ہے۔ بحرِ احمر یا نیل کا نام نہیں۔ تورات میں ایک طرف بحرِ احمر کا ذکر ہے اور دوسری طرف بحر القصب (یعنی گنے جیسی بلند گھاس والے دریا) کا ذکر ہے اس گھاس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت بھی آتا ہے کہ وہیں فرعون کی بیٹی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کشتی میں بہتے پایا تھا۔ ان حالات میں اس کا امکان ہے کہ فرعون دریائے نیل کی کسی شاخ میں، ڈیلٹا میں ڈوب مرا ہو، بحر قلزم (بحر احمر) میں نہیں۔

قرآن نے بیان کیا ہے کہ فرعون کی لاش بچالی گئی۔ تورات اس سے ساکت ہے گزشتہ صدی عیسوی کے اواخر میں پرانی مومیائی ہوئی بہت سی لاشیں مصر میں برآمد ہوئیں جس میں رعمسیس، منفتاح وغیرہ بادشاہوں کی بھی ہیں۔ فرنگی ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیق ہے کہ لاشوں میں سے کوئی بھی گلی سڑی نہیں ہے۔ یعنی بادشاہ کے ڈوبتے ہی ہمراہیوں نے کوشش کر کے غوطہ خوروں کی مدد سے لاش کو فوراً برآمد کر لیا پھر حسب عادت مومیا کر اسے اعزاز واحترام سے شاہی قبرستان میں دفن کر دیا وہیں کھدائیوں میں وہ ملا تو قاہرہ لایا

Marfat.com

گیا اور اب ۱۹۷۷ء میں لاش کو علاج کے لیے فرانس لایا گیا ہے..... مومیا نے میں بھیجا اور آنتیں وغیرہ نکال لی جاتی ہیں اور بیرونی جسم کو ایک قسم کے نمک سے طلا کیا جاتا ہے اس سے ڈوب مرنے کا استدلال ان لوگوں نے کیا ہے جو طبیب نہ تھے اور مومیا نے کے طریقوں سے ناواقف تھے۔

تورات کا بیان کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں پچاس ساٹھ سال پناہ گزیں رہے، غیر قرین قیاس ہے۔ قرآنی بیان آٹھ یا دس سال ہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ مشہور ماہر تورات پادری (ریورنڈ فادر Deyaux) کے مطابق بھی تورات کا یہ حصہ مشتبہ ہے۔

کہتے ہیں کہ مصر میں کچھ پُرانے وثائق بردی کاغذ پر ملے جن میں سے ایک ویانا (آسٹریا) میں ہے اور اس پر لکھا ہے رعمسیس دوم نے تریسٹھ سال حکومت کی جس کے بعد اس کا بیٹا منفتاح بادشاہ ہوا۔ تورات کے بیان کو صحیح ماننے والے فرنگی ماہر اسی سے استدلال کرتے ہیں کہ رعمسیس کے آغاز حکومت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور وہ مدین میں تھے جب رعمسیس نے وفات پائی پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر آئے اور منفتاح کو اسلام لانے اور ظلم سے باز رہنے اور یہودیوں کو مصر سے باہر جانے کی اجازت دینے کی خواہش کی۔ اس نے نہ مانا اور جو فرعون ڈوب مرا وہ منفتاح ہی ہوسکتا ہے۔

لیکن مصری آثار قدیمہ اور پُرانے کتبے اس کی تردید کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ ایک پتھر پر دو کتبے کندہ ملے ہیں جو ہیروغلیفی خط میں ہیں ایک بہت پُرانا ہے جس پر اَمونفس بادشاہ اپنے معبود کے چڑھاووں کا ذکر کرتا ہے۔ دوسرے رخ منفتاح کا ذکر ہے کہ اس نے مغرب میں لیبیا والوں کو، مشرق میں حطیوں کو سخت شکست دی اور بنی اسرائیل نامی قوم کو تو اس طرح نابود کیا کہ ان کی نسل تک باقی نہیں رہی۔

بنی اسرائیل سے یہ جنگ کب ہوئی؟ اگر خروجِ موسیٰ علیہ السلام سے قبل ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ خروج کرنے کوئی یہودی باقی نہیں رہنا چاہیے، حالانکہ تورات کے مطابق کوئی پانچ لاکھ یہودی بچ نکلے تھے، اگر یہ جنگ خروج موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی تو بات تو ناممکن نہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ باپ کی موت کا انتقام لینے کے لیے منفتاح نے چڑھائی کی ہوگی اگر واقعۃً جنگ ہوئی ہوتی تو تورات اس سے ساکت نہ رہتی

Marfat.com

اور کہتی کہ بنی اسرائیل کی بے شمار بپتاؤں میں ایک مزید، خروج کے بعد منفتاح کے ہاتھوں ہوئی۔

ان حالات میں قرین قیاس ان مورخوں کا بیان ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں مصر کے بادشاہ کے ڈوب مرنے کے باعث جو قومی توہین ہوئی اس بدنامی کو دور کرنے کے لیے کتبے میں یہ غلط بیانی کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بچ نہیں نکلے بلکہ ہم مصریوں ہی نے ان کو اس طرح نیست ونابود کیا کہ ان کی نسل ہی کا استیصال ہوگیا ہے اور اب مصر میں ایک یہودی بھی باقی نہیں ہے۔

ایسی مغرورانہ غلط بیانیاں اس زمانے کے متعلق کتبوں میں اور بھی ملی ہیں ۔ مثلاً ایک کتبے میں رعمسیس دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے مشرقی لوگوں یعنی حطی قوم کو نہایت سخت شکست دی۔ حالانکہ واقعہ صرف یہ ہوا تھا کہ حطیوں اور مصریوں میں اس شرط پر صلح ہوئی کہ حطی سارے مقبوضہ مصری علاقے پر قابض رہیں گے (خاص کر شہر قادلش جو جزیرہ نمائے سینا میں ہے) باپ کے بعد بیٹے نے بھی اسی قسم کی مغرورانہ غلط بیانی کی ہے یعنی اگرچہ رعمیس ڈوب مرا اور یہودی فرار ہو کر بچ نکلے لیکن منفتاح اپنے اہلِ ملک کو باور کراتا ہے کہ یہودیوں کو ہم نے ہی پیس ڈالا اور اب وہ مصر میں باقی نہیں ہیں۔

اس تاویل کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ لیبیا والوں اور حطیوں وغیرہ پر شاندار فتوح حاصل کرنے کے باوجود یہ بادشاہ اتنا مفلس تھا کہ ان کارناموں کو کندہ کرنے کے لیے وہ ایک نیا مستقل پتھر بھی خرید نہ سکا۔ ایک پُرانے بادشاہ کے کتبے کے دوسرے رُخ اپنی لن ترانیاں کندہ کراتا ہے (اس کے افلاس کی ایک وجہ یہ بھی ہوگی کہ بیگار اور غلام کی طرح مفت کام کرنے والے بنی اسرائیل ملک سے چلے گئے تھے، بلکہ تورات کے مطابق جاتے وقت مصریوں سے بے شمار زیور بھی مستعار لے کر فرار ہوئے تھے)۔

رعمسیس کی لاش صحیح سالم ملی ہے۔ سر پر بال ہیں منہ میں تقریباً سارے ہی دانت موجود ہیں چہرے سے ۶۲ سالہ حکومت اور تقریباً سو سالہ عمر کا پتا نہیں چلتا۔ اسے پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر مجھ جیسا اناڑی اور غیر طبیب بھی نہیں دے سکتا۔ منفتاح کی لاش بھی سالم ہے البتہ کھوپڑی میں ایک بڑا سوراخ ہے (جو مرنے کے بعد قبر میں بھی پیش

Marfat.com

آسکتا ہے)۔جس سے بہر حال یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ڈوب مرا ہو۔آج کل فرانس میں موميوں سے اختصاص رکھنے والے جوڈاکٹر ہیں انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر کوئی شخص اب سے تین ہزار سال پہلے ڈوب مرا ہو، لاش کوفوراً برآمد کرلیا گیا ہواوراس پر خرچیلا عمل مومیائی بھی کیا گیا ہوتو اب اس کی غرقابی یا غیر غرقابی کا پتانہیں چلایا جاسکتا۔(علم نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے)۔

یہ مومیاں بھی اب بیمار ہوتی جارہی ہیں۔رعمسیس کی موی کو پاریس لایا گیا ہے اورذراتی (اٹامک) شعاعوں سے اس کی لاش کا علاج کیا جارہا ہے۔بہ ظاہر تو کوشش یہ ہورہی ہے کہ یہ موی فرانس ہی میں رکھ لی جائے اور قاہرہ واپس نہ کی جائے جیسا کہ پاریس کے روزنامہ لموندLemonde کی ایک خبر سے مترشح ہے۔اللہ باقی ، باقی سب فانی۔یہ چند معلومات اہلِ علم کی خدمت میں پیش ہیں ،نتیجہ وہی نکالیں گے۔ان کے خیالات اگر چھپیں تو ممکن ہے کہ اس ناچیز کو بھی استفادے کا موقع ملے۔

(فاران-کراچی،مئی ۱۹۷۷ء)

Marfat.com

پیرس سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مکتوب

محترمی!

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ مئی کا فاران ملا، جزاکم اللہ احسن الجزاء ڈوب مرے فرعون کا تتمہ وتصحیح بھی فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

1. حُبُّكَ الشئ يُعمِي ويُصِمّ کے تحت آپ نے شائع شدہ خط کی تمہید کے آغاز میں بعض باتیں لکھ دی ہیں۔ خدارا اس پر بھی غور فرمائیں کہ کیا اس طرح آپ غیر معصوم اور ناچیز مولفوں کو رفتہ رفتہ مغرور نہ بنادیں گے؟

2. صفحہ (۲۳) سطر (۱۵ تا ۱۶) میں کسی فاضل مصحح یا پروف خوان نے تحریف کر دی ہے اس دوسری آیت نشوز میں جس عورت کو اپنے شوہر کے نشوز یعنی نافرمانی کا تمہیں خوف ہو تو صحیح نہیں۔ اسے جس عورت کو اپنے شوہر کے نشوز یعنی سختی کا خوف ہو تو...... پڑھیں تاکہ بعد کا جملہ بامعنی بن سکے یعنی ایک ہی صورت میں ایک ہی لفظ نشوز کے کہیں کچھ اور کہیں کچھ اور معنی لینے کے لیے کوئی مجبور کن وجہ ہونی چاہیے۔

3. صفحہ (۲۴) سطر (۳) ''قرآن کے مطالب'' کی جگہ ''قرآن کے مطابق'' پڑھنا چاہیے۔

4. صفحہ (۲۶) سطر (۱۱) کے بعد یہ جدید اضافہ مفید ہوگا۔

مصر کے محکمہ آثار قدیمہ کے ایک فاضل کا یہ خیال وقیاس بھی معقول معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

کہ "مِنفتاح کا یہ کتبہ مِنفتاح کی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے (کچھ/بہت؟) بعد لکھا گیا اور اسے ایک پُرانے کتبے کی پشت پر کندہ کرا دیا گیا۔ کندہ کرانے والے بادشاہ یا پُجاریوں کو قومی خودداری کی لاج رکھنے کے لیے یہ جھوٹ بولنا مناسب معلوم ہوا" پرانے کتبے کی پشت پر لکھنا اخلاص سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک فرانسیسی ماہر مصریات نے حال میں لکھا ہے اور اس طفلانہ منطق کی بنا پر بھی کہ لوگ اسے بھی پرانا سمجھیں (جو قبل از وقت ہو جائے گا) یا پرانے کتبے کا وقار اس جھوٹ کے جھوٹے پن پر پردہ ڈال دے۔

کاش آپ کے اسلامی پرچے پر اسلامی مہینے کا بھی نام ہوا کرے۔ مسلمان بھی اسے استعمال نہ کریں تو کون استعمال کرے گا؟

زحمت دہی پر معذرت خواہ

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(فاران-کراچی، ستمبر ۱۹۷۷ء)

Marfat.com

استدراک

اکتوبر کے شمارہ میں ''اسلامی مملکت کا دستوری تصور اور اسلامی دستور'' کے عنوان سے شہرہ آفاق اسلامی سکالر و محقق علامہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرانس کا مقالہ شائع کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ آپ نے اسلام آباد کی نفاذ شریعت کانفرنس میں پڑھا تھا۔ مسودہ ٹائپسٹوں نے غلط سلط ٹائپ کیا تھا۔ ہماری کوشش کے باوجود حسب ذیل اغلاط رہ گئیں۔ ہم جناب فاضل مقالہ نگار کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اغلاط نامہ ارسال فرمایا۔ (ادارہ)

مخدوم محترم!

سلام مسنون ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ آپ اپنے مؤقر رسالہ سے مجھے نوازتے ہیں۔ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ کا شمارہ ابھی ابھی پہنچا ممنون ہوا۔ اس میں میرا ایک مقالہ بھی شامل کر کے میری عزت افزائی فرمائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں دو امور پر ادب سے توجہ دلاؤں گا۔

۱۔ مدیر کے نوٹ میں شروع میں لکھا گیا ہے کہ اس مضمون کے بعض مقامات پر اظہار خیال کی گنجائش ہے۔ اگر اس کی تفصیل فرمائی جاتی یا فرمائی جا سکے تو میرے لیے استفادے کا باعث ہو۔

۲۔ طباعت کی غلطیاں بہ کثرت رہ گئی ہیں۔ اہم مقامات کی نشاندہی کرتا ہوں۔ مناسب ہو تو آئندہ کسی نمبر میں چھاپ دیجیے کہ علم کی خدمت ہوگی۔

صفحہ	سطر	مطبوع	صحیح
۸	۱۳	بھیج دیا اس پر	بھیج دیا پھر تو یہ قبول ہوئی اس پر

Marfat.com

۹	۸	ہبوط کے معنے جاننے کے ہیں	ہبوط کے معنے جانے کے ہیں
۹	۲۰	بکار خود خود	بکار خود
۱۰	۱۴	معجزہ تھا اور ایک معجزہ تھا	معجزہ تھا
۱۱	۴	عدل فرماتے ہیں	عمل فرماتے ہیں
۱۱	۲۵	یہودیوں	یہودیوں سب نے
۱۲	۱	تمیں قبیلے	تین قبیلے
۱۲	۷	بین نامی مقام	ینبن نامی مقام
۱۲	۱۹	سن ہجری میں	۱ھ میں
۱۳	۵	عاقل	معاقل
۱۳	۲۰	تشریح	تشریع
۱۳	۲۴	قرینۃ	قریۃ
۱۴	۱۲	عین مدت	معین مدت
۱۶	۳	تحکم .... برائی	بم تحکم؟ بکتاب اللہ، فان لم تجد؟ فبسنۃ رسول اللہ، فان لم تجد؟ اجتھد برای ولا آلو
۱۷	۱۰	کنفیکٹ	کنفلکٹ
۱۸	۱۲	بندرگاہ تک جا پہنچ سکیں	بندرگاہ جار تک پہنچ سکیں
۱۸	۱۴	اسلامی کا	اسلامی معاونت کا
۱۹	۲	اگر یہ لوگ	اکثر یہ لوگ
۱۹	۱۳	استدلال بحث طلب ہو جاتی ہے	استدلال بحث طلب ہو جاتا ہے

نیاز مند - محمد حمید اللہ - ۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۰ھ

(الحق - اکوڑہ خٹک - دسمبر ۱۹۷۹ء)

Marfat.com

تقویم ماقبلِ ہجری

پاریس ۳رذی الحجہ ۱۴۰۰ھ

مخدوم ومحترم اڈیٹر صاحب
ماہنامہ ''قومی زبان''

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

جون کا شمارہ اب اکتوبر میں آیا ہے۔ حسبِ معمول شوق سے ورق گردانی کی اور مستفید ہوا۔ اس دفعہ کے ایک مضمون ''تقویم ماقبل ہجری'' کے سلسلے میں چند معروضے ہیں جو فاضل مولف کی خدمت میں غور کے لیے پیش ہیں، چاہیں تو چھاپ بھی دیں۔

(الف) کیا ساٹھ سال تک ہر سال محرم تیسا، صفر انتیسا الخ ہوا؟ پھر جب رمضان بھی ہمیشہ تیسا ہوتا ہے تو عید کے متعلق ہر سال ہنگامے کیوں ہوتے ہیں؟ یوں بھی علم ہیئت کہتا ہے کہ بعض مسلسل تین مہینے انتیسے ہو سکتے ہیں، مسلسل چار مہینے تیسے ہو سکتے ہیں۔ اپنا ماخذ نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کسی فرنگی جدول یا فرنگی جدول سے منقول مسلمان جدول کی نقل ہو اور قصور مولف کا نہ ہو۔

(ب) ہجرت کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۳ سال کی تھی۔ ساٹھ سال کی تقویم کا کیا مطلب ہے؟ رسول اللہ کی ولادت تو ۵۷۱ء، ۵۳ق۔ھ میں بتایا گیا ہے سب جانتے ہیں کہ قمری سال حجتہ الوداع میں وفات سے تین مہینے پہلے نافذ ہوا۔ اس سے قبل کی ساری حیات نبوی مکی تقویم میں گزری جس میں نسئی ہو کر شمسی سال ہو کر ہوتا تھا۔ وفات ۶۳۲ء میں ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی تو

Marfat.com

ولادت ۵۶۹ء میں ہونی لازم معلوم ہوتی ہے۔ عرب میں نسئی ہوتی تھی خالص قمری سال نہ ہوتا تھا۔

(ج) کیا یہ زیادہ موزوں نہ ہو کہ غففات کے معنے بھی بتا دیے جاتے تا کہ مجھ جیسا جاہل بھی استفادہ کر سکتا؟ مسطر اول میں (کذا) غالباً سنہ عیسوی ہے۔ سات شاید جولائی کے لیے ہے 'ذ' چتان ہے۔

(د) میں نے فرنگی جدولوں پر امریکا میں منعقد شدہ موتمر مستشرقین عالم میں ایک مقالہ پڑھا تھا کہ موجود الوقت ساری فرنگی جدولیں بلا استثناء لغو ہیں۔ اس اعتراض کو وہاں قبول کر کے بہ اتفاق آرا ایک قرارداد منظور ہوئی کہ میرے بیان کردہ اصول پر ایک نئی جدول تیار کرائی جائے۔ اس بارے میں میرے دو مضمون انگریزی میں "جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" میں جنوری اور اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اور ایک ووکنگ کے اسلامک ریویو فروری ۱۹۶۹ء میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

یہ سوال ہیں، اعتراض نہیں۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔

فقیر حقیر

محمد حمید اللہ

(ماہ نامہ قومی زبان، کراچی - دسمبر ۱۹۸۰ء)

فرانس سے ایک قابلِ قدر علمی مکتوب

مخدوم ومکرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ اپنے موقر رسالہ الحق کے ارسال سے اس ناچیز کو سرفراز فرماتے رہتے ہیں۔ آج رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کا شمارہ پہنچا۔ استفادہ کیا چند باتوں پر مودبانہ توجہ منعطف کراؤں گا۔

ص ۷ پر امام بخاری اور صحیح بخاری کے فاضلانہ مضمون میں مدون مقالہ نے حضرت ابو طالب کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ صحیح بخاری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحت ہے کہ ابو طالب کا مقام جہنم ہے اگرچہ خفیف ترین عذاب ہوگا۔ یعنی قدموں تلے آگ ہوگی۔ لیکن یہ اس بات کے لیے کافی ہوگی کہ سر کا بھیجا پگھل کر کھولتا رہے۔ ان حالات میں ''حضرت'' کا لفظ نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

رجم پر جو فاضلانہ مقالہ ہے اس میں ص ۲۶ تا ۲۷ پر اس سے بحث ہے کہ رجم کا ذکر کیوں قرآن مجید میں نہیں ہے۔ ایک پہلو یہ میرے ناچیز ذہن میں آتا ہے کہ ......**اولئک الذین هدی اللہ فبھد اھم اقتدہ** (سورۃ انعام ۶/۸۳-۹۰) ختم المرسلین کو حکم دیا گیا ہے انبیاء سلف کی سنت پر بدستور عمل پیرا رہیں۔ (بجز ان احکام کے جو قرآن نے منسوخ کیے ہوں) صحیح بخاری میں صراحت ہے کہ تورات میں زنا محصنہ کی سزا رجم ہے۔ رسول اکرم نے اس پر عمل بھی کرایا۔ تورات ہی میں زنا غیر محصنہ کی سزا رقمی جرمانہ ہے۔ اس کو سورۂ نور میں منسوخ کر کے سو کوڑوں کی جسمانی سزا مقرر کی گئی۔ لہٰذا زنا محصنہ کا مرسوئی وعیسوی قانون منسوخ نہ ہوا اور سورہ انعام میں صراحت ہوئی کہ

Marfat.com

اس پر بدستور عمل کیا جائے۔

اسی مضمون میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آیت رجم کے متعلق بیان بھی زیر بحث رہا ہے۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی کسی روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں فرمایا کہ الرجم فی القرآن بلکہ فی کتاب اللہ جس کا اطلاق تورات میں انجیل پر بھی اسی طرح ہو سکے گا جس طرح قرآن مجید پر اور واقعۂ رجم کا حکم موجودہ متداول تورات اور انجیل دونوں میں موجود ہے اور عہدِ نبوی کی تورات میں بھی ہونا صحیح بخاری و صحیح مسلم سے ثابت ہے۔

اگر علماء کرام ان حقیر سوالات پر روشنی ڈالیں تو طلبہ علم فائدہ اٹھائیں۔ الحق کے اسی شمارے میں ص ۵۴ پر فرعون کی لاش پر صدق جدید لکھنو کا ایک نوٹ نقل ہوا ہے (صدق جدید کی تاریخ درج نہیں) اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱۔ رسالہ فاران کراچی بابت مئی ۱۹۷۷ء میں اس موضوع پر "ڈوب مرے فرعون" کے نام کے عنوان سے بحث ہوئی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر مدریس بوکائی (آپ کے ہاں ہیوکلی چھپا ہے) کی کتاب میں فرعون کی لاش کا تو ذکر ہے لیکن ان کو اصرار ہے کہ حضرت موسیٰ مدین میں طویل عرصہ تقریباً پچاس سال مقیم رہے۔ قرآن میں آٹھ زیادہ سے زیادہ دس سال کا ذکر ہے) یہ کہ اس اثناء میں یہودی نوزائیدہ بچوں کو قتل کرنے والا فرعون مر گیا۔ اور اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ اس پر اسی سال کی عمر میں حضرت موسیٰ مصر واپس آئے اور نیا حکمران ڈوب مرا لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ اسی جدید حکمران منفتاح کا ایک کتبہ ملا ہے کہ میں نے بنی اسرائیل کو اس طرح نابود کیا ہے کہ اس نسل کا دنیا سے خاتمہ ہو گیا ہے۔" یہ واقعہ اگر خروج مصر سے قبل پیش آیا تو حضرت موسیٰ کے ہمراہ جو چھ لاکھ سے زائد یہودی نکلے وہ کہاں سے آئے۔ اگر خروج کے بعد حملہ ہوا سزا دہی کے لیے تو تورات اس سے کیوں ساکت ہے اور اپنی ان گنت بپتاؤں میں اس کا اضافہ کیوں نہیں کرتی، یوں بھی مدریس بوکائی حجیت حدیث سے انکار کرتے ہیں۔

ناچیز۔ محمد حمید اللہ

Marfat.com

الحق:

۱۔ ریاست وشرافت دنیوی کے اعتبار سے حضرت ابو طالب کا استعمال غیر مناسب اور قابلِ مواخذہ نہیں۔ معززینِ مکہ اور روسائے قوم میں ان کا شمار کسی سے مخفی نہیں۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قوی رشتہ اور بنو ہاشم و بنو کنانہ قریش جن کی شرف و بزرگی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے اس بناء پر حضرت ابو طالب کہنا کوئی جرم نہیں۔

۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وخدمت آٹھ سال سے لے کر ۱۰ نبوۃ تک یہ ایک مستقل منقبت ہے۔

۴۔ مشرکین مکہ اور روسائے قریش کی مسلسل تحریص وترغیب کے باوجود آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت سے دستبردار نہیں ہوئے۔

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں قصائد مدحیہ مثلاً

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ ثمال الیتامیٰ عصمۃٌ لِلارامل

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں یہاں تک فرمانا کہ

واللّٰہ لن یصلوا الیک بجمعھم حتیٰ اوسدّ فی التراب دفینا

۷۔ جب قوم نے ان کا بائیکاٹ کیا اور شعب ابی طالب میں ان کی ناکہ بندی کی تو ابو طالب برابر ان تکالیف جھیلنے میں ان کے شریک رہے۔

علاوہ ازیں لفظ حضرت کا استعمال ایک لفظی اور زبانی اعزاز ہے۔ اگرچہ ارشاد خداوندی ہے: لا تنفعھم شفاعۃ الشافعین مگر اس نص صریح کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شفاعت فرمائیں گے۔ اس شفاعت کی تخصیص ایک گرامی قدر اعزاز ہے۔

(ب) لفظ کتاب اللہ کا متبادر معنی قرآن کریم ہے۔ ذالک الکتاب - کتاب انزلنا، مطلق کتاب منزل کہ تورات وانجیل کو شامل ہو۔ یہ معنی غیر متبادر ہے۔ نیز حدیث حضرت ابن عباس بخاری جلد۲ ص ۱۰۰۹ میں واضح ہے کہ مراد کتاب اللہ قرآن مجید ہے۔

Marfat.com

ان اللہ بعث محمداً بالحق وانزل علیه الکتاب فکان ممانزل اللہ أیة الرَّجم فقرانا هاو عقلنا ها ووعینا هارجم رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ورجمنا بعده فاحشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل واللہ مانجد أیة الرَّجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترك فریضته انزلها اللہ قال العینی أیة الرجم الشیخ والشیخوخة اذازنیا فا رجرهما وفیه انه کان قرأنا نسخت تلاوته دون حکمه وقال تحت قوله الرّجم فی کتاب اللہ حق الی فی قوله تعالیٰ اویجعل اللہ لهن سبیلا الایة

بین النبی صلی اللہ علیه وسلم ان المراد رجم الشیب وجلد البکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

خذواعنی خذواعنی فقد جعل اللہ لهن سبیلا البکر بالبکر جلد ماة ونفی سنة والشیب بالشیب جلد ماة والرجم

اس آیت سے استنباط رجم فبهدا ہم اقتدہ اگرچہ عموم الفاظ کے مناسب ہے لیکن کسی مفسر سے منقول نہیں۔ ہاں آیت مذکورۃ الذیل سے حکم مذکور ثابت ہے۔ فان ماقص اللہ تعالیٰ و رسوله من شرع الامم السابقه من غیر نکیر شرع لنا۔

وهی قوله تعالیٰ و کیف یحکمونك وعند هم التوراة فیه حکم اللہ ثم یتولون من بعد ذالك وما اولئك بالمومنین۔

۳۔ فرعون کی لاش کے بارہ میں پھر اظہار خیال کیا جائے گا۔ اہل علم کو بھی خامہ فرسائی کی دعوت دی جاتی ہے۔

(مولانا) عبدالرحیم مردانی، استاذ اعلیٰ دارالعلوم حقانیہ

(الحق - اکوڑہ خٹک - ستمبر ۱۹۸۱ء

Marfat.com

افکار واخبار

مکتوب فرانس:

آپ فاضل ہیں۔ آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر لیکن ابھی تشفی نہ ہوئی۔ حضرت کا لفظ ہماری زبان میں پیغمبروں، صحابہ، اولیاء اور ائمہ کبار ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس کا جہنم میں ہونا حدیث صحیح سے ثابت ہو تو اس کے لیے بھی یہ لفظ............واللہ اعلم

امام محمد کی ولادت ۱۳۴ھ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ امام محمد نے آٹھ سال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کیا۔ پھر امام ابو یوسف سے تکمیل کی۔ میں امام ابوحنیفہ کے ۱۴۶ھ میں وفات پانے یا امام محمد کے ۱۳۵ھ میں پیدا ہونے کے ماخذوں سے بھی ناواقف ہوں اور ہونے کی دلیلوں سے بھی۔ کیا آپ کے دروس میں کوئی دس بارہ سالہ بچہ آ کر بیٹھا کرے تو آپ اسے ڈانٹ کر باہر کر دیں گے؟ یا اس کے سوالات کا جواب دینے سے انکار کریں گے؟

امام محمد کی المبسوط (یا کتاب الاصل) اور چیز ہے اور سرخسی کی المبسوط اور آخر الذکر چھپ گئی ہے اول الذکر دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں چھپ رہی ہے۔ دونوں میں کوئی یکسانی نہیں۔ سرخسی کا مبسوط کو حافظے سے لکھنا بے معنی بات ہے۔ وہ قید تھے۔ ان کے شاگرد المختصر الکافی لا کر پڑھتے اور سرخسی سن کر اس کی شرح لکھاتے۔ ان میں کیا اشکال ہے؟ میں رفیع الدین شہاب صاحب کے مضمون سے ناواقف ہوں۔ دیکھے بغیر جواب مناسب نہیں۔

نیاز مند۔ محمد حمید اللہ پیرس

الحق: شہاب صاحب نے ایک مضمون میں امام محمد کا امام اعظم سے تلمذ سے انکار کیا ہے۔ احقر نے ڈاکٹر صاحب کو اس طرف توجہ دلائی تھی یہ سطور اسی بارہ میں ہیں۔ (ادارہ)

(الحق۔ اکوڑہ خٹک۔ نومبر و دسمبر ۱۹۸۱ء)

Marfat.com

فرعون کی غرقابی کا مسئلہ

پاریس-۷رذی قعدہ۱۴۰۲ھ

استاذ محترم مدفیضکم-السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک سفر سے چند دن ہوئے واپس آیا۔ایک اور قریب میں پیش نظر ہے۔واللّٰہ علیٰ مایشاء قدیر. آپ کی دو نوازشوں کا جواب ذمے ہے۔تعویق پر معذرت خواہ ہوں۔الاول فالاول۔

۱۔ آپ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق وہاں کے ناقد کے بیانات کی جواب دہی چاہی تھی۔کاش آپ تحریر فرماتے کہ ناقد موصوف کا مضمون کہاں چھپا ہے تا کہ کسی اور دوست کو لکھ کر اس کا نقل یا فوٹو کاپی ہو سکتا۔ایک بات صحیح ہے اور مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین فقہ کی جو انجمن سی بنائی تھی اس میں امام محمد کا زیادہ حصہ نہیں ہونا چاہیے۔اس کے سکریٹری امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ممکن ہے امام محمد نے معمولی کاتب یا نقل نویس کا یا کوئی اور اسی طرح کا علمی کام اس میں انجام دیا ہو کیونکہ ابھی وہ کم عمر تھے لیکن دیگر بیانات کی دلیلیں پڑھے بغیر کچھ رائے زنی نہیں ہوگی۔

۲۔ الحق (رمضان شوال ۱۴۰۲ھ) ابھی ابھی آیا ہے اس کے صفحہ ۷۵/۱۷ پر اس ناچیز کا بھی ذکر معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر عبدالروف معلوم نہیں زیڈ صاحب کے قلم سے نکلا ہے یا آپ کے کاتب کی غلطی ہے۔بہرحال عرض ہے کہ قرآن مجید کا یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا انکار بالکل نہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔زیڈ صاحب کا ”دریا“ آیا دریائے نیل ہے، یا بحرِ قلزم (بحرِ احمر)؟ دریائے

نیل بھی اپنے دہانے کے پاس بہت چوڑا اور گہرا ہے۔ براہِ کرم زیڈ صاحب بھی قرآن، حدیث یا کسی اور مستند چیز کا حوالہ دیں کہ لاش دریا نے خود اس کے بعد کہیں ساحل پر پھینک دی۔ یہ بیان کہ مسلمہ امر یہ ہے دعوٰی ہے اور ہر دعوٰی ثبوت چاہتا ہے۔ میں نے جو گمان ظاہر کیا ہے وہ انسانی فطرت کے تقاضے پر مبنی ہے۔ میرا آپ کا بچہ یا رشتہ دار ڈوب جائے تو ہم کیا کریں گے؟ ہمراہ غوطہ خور موجود ہو، یا تیرنا جاننے والے ساتھ ہوں تو کیا وہ غوطہ لگا کر ڈوبے ہوئے شخص کو نہیں نکالیں گے؟ دنیا عالمِ اسباب ہے خدا اسباب پیدا کرتا ہے۔ ماخذ معلومات میں سکوت ہو تو تصور یہ ہوگا کہ عالمِ فطرت کے مطابق بات ہوئی ہوگی۔

مزید برآں یہ نہ بھولیے کہ سورۃ طٰہ میں حضرت موسیٰ کو ان کی ماں ''یم'' میں ڈالتی ہے تو فرعون بھی ''یم'' ہی میں غرق کیا جاتا ہے۔ اس سے میرے گمان کو تقویت ہوتی ہے۔ کہ دونوں جگہ دریائے نیل مراد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ناچیز - حمیداللہ پاریس (فرانس)

(الحق-اکوڑہ خٹک-اگست ۱۹۸۲ء)

Marfat.com

(مکتوب)

غرقِ فرعون

پیرس ۵/ربیع الانور ۱۴۰۳ھ

مخدوم ومحترم زادفیضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' یہ دیکھ کر حقیقی مسرت ہوتی ہے کہ الحمدللہ ''الحق'' کا علمی معیار روز بروز بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس میں ناظرین کے ہر طبقے کے لیے کچھ نہ کچھ دلچسپی کی چیزیں مل جاتی ہیں۔

فرعون کے مقامِ غرقابی کے متعلق جواب ہی نہیں جواب الجواب بھی ہو چکا ہے۔ اگر آپ کے اصول اجازت دیتے ہوں تو دو ایک لفظ مزید عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

محترم ایڈووکیٹ صاحب نے قرآن مجید کی وہ ساری آیتیں نقل فرمائیں جن میں فرعون کے ڈوب مرنے کا ذکر ہے۔ لیکن کیا انہوں نے غور فرمایا کہ ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں کہ سمندر نے فرعون کی لاش کو ساحل پر پھینکا۔ یہ دعوٰی ہے جس کا ثبوت چاہیے۔

ممدوح نے آیات کے نقل کرنے میں سورہ طٰہٰ سے سکوت برتا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ

۱۔ فاقذفیه فی الیم (اے موسیٰ کی ماں اس بچے کو یم میں پھینک دے۔ سورہ ۲ آیت ۳۹ (۲) اور فغشیهم من الیم ماغشیهم فرعون اور اس کی فوجوں کو ''یم'' نے جیسا ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا، سورہ ۲ آیت ۷۸) ایک ہی لفظ ''یم'' دونوں جگہ ہے کیا حضرت موسیٰ کو ان کی ماں نے بحرِ احمر میں پھینکا تھا؟

Marfat.com

شاید الحق کے ناظرین کو یہ معلوم کر کے دلچسپی ہو گی۔ عبرانی تورات میں بھی دونوں جگہ ''سوپ یام'' کا لفظ ہے۔ ''یام'' وہی لفظ ہے جو عربی میں ''یم'' بن گیا ہے جب تورات کا عبرانی سے ''روح القدس کی نگرانی میں اولیاء اللہ نے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ جیسا کہ کیتھلک عیسائی عقیدہ ہے تو انہوں نے فرعون کے سلسلے میں سوپ یام یعنی بحر القصب (گنے کے جیسی بڑی گھاس کے پانی کی جگہ بحرِ احمر استعمال کیا۔ اب جدید ترجموں میں نیز قدیم پرائسٹنٹ تراجم میں بحر القصب ہی ترجمہ ہوا ہے۔

حقیر و جاہل محمد حمید اللہ

(الحق - اکوڑہ خٹک - جنوری ۱۹۸۳ء)

پیرس ۲۶ رجمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم ومحترم زاد مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں نوازش نامہ ملا، اور سرفراز کیا، چالیس (۴۰) پینتالیس (۴۵) سال ہو گئے، آپ سے دارالمصنفین میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، اور آپ کی نوازش اور مہمان نوازی بھولی نہیں، تب کی ملنساری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر وقت کی ہے، معظکم اللہ وعافاکم،

آپ کی فرمایش سر آنکھوں پر، لیکن مستشرقین کی شکایت کے ارادے سے اس ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں، اگر محترم علی میاں نے مجھ سے اس پر پیشگی گفتگو کی ہوتی تو میں ادب سے عرض کرتا کہ ایسا نہ کریں! ان میں سے ہر فرد پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا اور جو اِکا دُکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے، (جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آرہا ہے)۔

ہم اپنے بچوں کو انہی کے ہاں بھیجتے ہیں، اور اُن کے پُرزۂ کاغذ (ڈاکٹری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں؟ اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتے، وہ مسلمان نہیں ہیں، اُن سے توقع کرنا کہ وہ سو فی صد ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے۔ اُن کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں اور تنقیدیں نہیں کرتے؟

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ ''مخلص'' ہوتے ہیں، یعنی اپنے علم اور اپنی فہم کے مطابق تاثر لیتے اور بتاتے ہیں، اور گالی گلوچ کے ساتھ نہیں، خالص علمی انداز میں ان کو ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں، ایک تجربہ عرض کرتا ہوں، شاخت آنجہانی سے آپ ناواقف نہیں، ایک مرتبہ انقرہ میں امام سرخسی کا جشن منایا گیا، پہلے شاخت صاحب کی تقریر تھی، پھر میری باری آئی، انہوں نے اپنی رائے بیان کی، اس سے پیشگی واقف ہوئے بغیر میں نے ان

Marfat.com

چیزوں کی تردید کی، جشن کے صدر نے بعد میں مجھ سے بیان کیا کہ شاخت نے اپنی پڑھی ہوئی تقریر واپس مانگ لی اور بہت سی ترمیموں کے بعد دی، کہ آپ اسے چھاپ سکتے ہیں، یہی تجربہ مجھے اٹلی کے سب سے بڑے مستشرق ''لیوی دملا ویدا'' سے رہا۔ جزیہ اور ذمیوں سے دگنی چنگی کی وجہ سے میری بحث پڑھ کر مجھے خط لکھا، کہ تمہاری ان دلیلوں پر تو کوئی یہودی ربی بھی زبان نہیں کھول سکے گا۔

غرض اس ناچیز کی رائے میں ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دُور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر، زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دُور ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محنت چاہتی ہے تو زیادہ صحیح اور زیادہ مفید ہوگا۔

معارف میں خطبات بہاول پور کی تحلیل دیکھی، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی، معلوم نہیں اس کا ۲۲ صفحوں کا غلط نامہ آپ کو ملا یا نہیں، کئی دفعہ کافروں کو بھی ''حضرت...... رضی اللہ عنہ لکھ ڈالا ہے، خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں، حال میں سلمان صاحب یہاں آئے تھے، دعوت دی ہے۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۸۳ء)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا شمار علمی اور اسلامی دنیا کی معروف ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ قارئین فاران کے لیے تو وہ کسی طرح بھی محتاج تعارف نہیں، ان کے بارے میں کوئی نادرست یا غیر صحیح بات کسی حلقے سے آئے تو فوراً اس کی اصلاح ہو جانی چاہیے کیونکہ ایسے اکابر ملت کی ذات بہت محترم ہوتی ہے۔ اسی قبیل کی ایک غلط فہمی کی اصلاح و تصحیح کے لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ مکتوب شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ (تسنیم مینائی)

مخدوم و محترم اڈیٹر صاحب فاران

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک حالیہ سفر کراچی کے وقت مجھے جو گراں قدر تحفے کرم فرماؤں نے دیئے، ان میں مولانا دریابادی مرحوم کی کتاب تاثرات دکن بھی ہے۔ دیگر مشغولتیوں اور سفروں کے باعث کل شام تک اس کے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ ورق گردانی پر دو ایک جگہ اس بدنام کنندہ وطن کا بھی ذکر ملا۔ مرتب یا ناشر نے صفحہ (۴۶) پر جو حاشیہ دیا ہے، اس میں دو ایک چیزیں تصحیح طلب ہیں۔

1. یہ صحیح نہیں کہ میں سقوط حیدرآباد کے زمانے میں ہجرت کر کے پاکستان آیا۔ پارلیس میں سال بھر سے مقیم تھا جب حکومت پاکستان نے مجھے ایک سال کے

Marfat.com

لیے بلایا۔ اس مدت کے اختتام پر (نہ کہ تقریباً دو سال کے بعد) میں واپس ہو گیا۔

2. یہ بھی صحیح نہیں کہ میں ''کچھ دل برداشتہ ہوکر'' واپس پاریس گیا جیسا کہ عرض کیا، اک معین مدت کے لیے دعوت آئی تھی۔ اور بس۔

3. میں سقوط حیدر آباد کے بعد نہیں۔ بلکہ اس سے پہلے ہی اپنی حکومت کے احکام پر وطن سے نکلا تھا اور فرائض منصبی کے لیے پاریس میں تھا۔ بعد میں وہیں رہ جانے میں کچھ تو مجبوری تھی کہ کہاں جاؤں اور کچھ علمی ضرورت تھی کہ وہاں کے کتب خانے جنگ جرمنی میں بھی محفوظ رہے تھے، جرمنی اور انگلستان وغیرہ کی طرح بمباری کا شکار نہیں ہوئے تھے۔

الخير فيما اختاره الله

خادم احباب
محمد حمید اللہ

(ماہ نامہ فاران- کراچی- جون ۱۹۸۴ء)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

(۱)

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمبر کی چاروں جلدیں کل شام پہنچیں۔ عنایت کے بوجھ سے گھل گیا۔ خدا آپ کو حسناتِ دارین سے نوازے۔

(۲)

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں مرسلہ گراں مایہ تحفہ پہنچا۔ یعنی رسالہ نقوش کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمبر جلد ۵ تا ۱۰...... میں کہہ نہیں سکتا کتنا متاثر ہوا اور آپ نے کتنی محنت اٹھائی ہے! اللہ آپ کو حسناتِ دارین عطا فرمائے۔

(نقوش رسول نمبر (جلد سیزدہم)
جنوری ۱۹۸۵ء

Marfat.com

ڈاکٹر حمید اللہ کا مکتوب گرامی

آپ ازراہ عنایت اس ناچیز کو الحق بھیج رہے ہیں اور میں اس سے مستفید ہوا کرتا ہوں جزاکم اللہ خیر الجزاء شعبان کا شمارہ ابھی ابھی آیا ہے۔ دو باتیں عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

۱۔ مجھے عسکری زندگی کا بدقسمتی سے ذرا موقع نہ ملا۔ ورنہ سیرت النبی اور غزوات مبارکہ کو بہتر سمجھ سکتا اور ان کی بہتر قدر کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ میجر افضل صاحب کو جزا دے وہ اس پر توجہ کر رہے ہیں۔ انہیں ان جنگوں کے میدانوں کو برسر موقع بھی مطالعہ فرمانا چاہیے۔ میری کتاب "عہد نبوی کے میدان جنگ" اُردو اور انگریزی دونوں میں گویا نقش اولین ہیں۔ اس دفعہ میجر صاحب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنگ ہائے جمل و صفین کا مختصر ذکر فرمایا ہے۔ معلوم نہیں ان کے مطالعہ سے گزرا یا نہیں کراچی کے جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے اکتوبر ۱۹۸۲ء میں ان جنگوں کے پس منظر پر ناچیز نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "جنگ ہائے جمل و صفین کا یہودی پس منظر" اس پر میجر صاحب تنقید فرما سکتے ہیں۔

۲۔ الحق کے زیر نظر شمارہ مئی ۱۹۸۵ء شعبان ۱۴۰۵ھ ص ۶۰، ۶۱ میں ترجمہ و تفسیر قرآن کے آغاز کا ذکر آیا ہے مگر واضح نہ ہو سکا کہ آیا ایک نئے اُردو ترجمے کا آغاز ہو رہا ہے یا مراد محض طلبہ کی تدریس ہے۔ اول الذکر بات ہے تو مجھے اس سے یوں دلچسپی ہے کہ مترجمین قرآن کی فہرست مدون کر رہا ہوں۔ بینوا توجروا۔

حفظکم اللہ وعافاکم

الفقیر الی اللہ محمد حمید اللہ

(الحق - اکوڑہ خٹک - جولائی ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

(مکتوب)

قرآن مجید میں عجائبات نباتی

کل شام ''الحق'' کا ذی الحجہ نمبر پہنچا، ممنون بھی ہوا اور مستفید بھی۔ اس میں قرآن حکیم اور علمِ نباتات کو خاص دلچسپی سے پڑھا۔ ظاہر ہے کہ کسی رسالے کے ایک مختصر مضمون میں ساری متعلقہ چیزیں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اجازت ہو تو ادب کے ساتھ صرف ایک چیز کی طرف محض اشارہ کروں (حکم ہو آئندہ ان شاء اللہ) تفصیل بھی مہیا کرسکتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں ایک نادر نباتی ذکر ہے جس کو فاضل مقالہ نگار چاہتے تو مجھ سے زیادہ بہتر بیان فرماسکتے۔

وہ یہ کہ سورہ یٰسین کے اواخر میں ایک آیت ہے۔

"الذی جعل لکم من الشجر الاخضر ناراً فاذاانتم منه تو قدون"

جس نے تمہارے لیے ہرے درخت سے آگ کا انتظام کیا پھر تم اس سے چولھے سلگاتے ہو۔

یہاں سوکھی لکڑی نہیں بلکہ ہری ٹہنیوں کا ذکر ہے۔ ہمارے پرانے مفسر شروع ہی سے یہ بیان کرتے آئے ہیں کہ اس سے مراد مرخ اور عفار نامی درخت ہیں جن کے رگڑنے سے چقماق کی طرح چنگاریاں نکلتی ہیں جن کو آتش گیر چیز کی مدد سے آگ بنالیتے ہیں۔

اس کی بہت زیادہ تفصیل کتاب النبات للدینوری میں کئی جگہ ہے چنانچہ اس کی قسم قاموس ابجدی میں لفظ عفار اور لفظ مرخ کے تحت بھی اور اسکی جلد سوم میں ''باب الزناد'' میں اس سلسلے میں پرانے عرب شاعروں کے کلام میں بھی دلچسپ چیزیں ملتی ہیں اور حضرت ابن عباس وغیرہ صحابہ کے بیانات میں بھی۔

Marfat.com

اس سال یورپ اور کینیڈا میں جنگلوں میں آگ لگنے سے بڑے نقصان ہوئے ہیں۔ دینوری نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض درختوں سے گوند نکل کر خشک ہو جاتا ہے اور جب اس پر سورج کی شعاعیں گرتی ہیں آئینے کی طرح اس سے بھی آگ سلگ جاتی ہے اور سارا جنگل اس سے جل جاتا ہے۔

چند سال قبل سعودی حکومت نے مجھے ریاض وغیرہ میں کچھ لکچر دینے کی دعوت سے سرفراز فرمایا اور وزیر توعیہ (تعلیم) کے امیں عام (سکرٹری) کو وفورِ نوازش سے میرا سفر میں رہنما مقرر فرمایا۔ ان کا نام تھا شیخ حمد، میں نے ان سے شجر اخضر اور مرخ وعفار کا ذکر کیا تو کہا دریافت کر کے بتاؤں گا۔ پھر ایک دو دن بعد کہا کہ یہ صحیح ہے اور بدویوں میں اس کا اب بھی رواج ہے اور متعدد دیگر جنگلی درختوں سے بھی تا حال وہی کام لیا جاتا ہے۔

(الحق - اکوڑہ خٹک - اکتوبر ۱۹۸۵ء)

Marfat.com

حضرت امِ ورقہ رضی اللہ عنہا
کے بارے میں ایک استفسار

ڈاکٹر احمد حسن

مارچ ۱۹۸۰ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے زیر انصرام عالم اسلام کے ممتاز محقق جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے، مختلف اسلامی موضوعات پر بارہ خطبات ارشاد فرمائے، جو پہلی مرتبہ ۱۹۸۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں اس مجموعہ کی اشاعت دوم کا اعزاز ادارہ تحقیقات اسلامی کو حاصل ہوا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے خطبہ اول ''تاریخ قرآن مجید'' ص ۳۵ پر حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کی امامت سے متعلق حدیث نقل فرمائی اور اس کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا، جس پر علمی حلقوں میں ایک بحث چل پڑی۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے فاضل محقق جناب ڈاکٹر احمد حسن صاحب نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی رائے سے اختلاف فرمایا اور ایک تفصیلی نوٹ لکھ کر شعبہ فکر و نظر کو اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا۔ ہم نے ڈاکٹر احمد حسن صاحب کا نوٹ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو اس گذارش کے ساتھ بھیجا کہ وہ اس استفسار سے متعلق اپنی رائے سے نوازیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے از راہ عنایت جواب سے نوازا۔ ہم جناب ڈاکٹر احمد حسن صاحب کا استفسار اور جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا جواب دونوں قارئین فکر و نظر کے مطالعے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

(مدیر)

Marfat.com

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد نے حال ہی میں دور حاضر کے نامور مورخ و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی ایک کتاب ''خطباتِ بہاولپور'' کا جدید ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس کے سرورق پر یہ الفاظ درج ہیں: ''نسخہ مصححہ مؤلف'' یعنی یہ نسخہ مؤلف کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ اگر پچھلے نسخوں میں کچھ اغلاط سہواً رہ گئی تھیں تو ان کو بھی درست کر دیا گیا ہے۔ ان خطبات کی خصوصیت یہ ہے کہ خطبہ دیتے وقت ڈاکٹر صاحب کے سامنے تحریری شکل میں کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ آپ نے یہ خطبے محض اپنی حیرت انگیز قوت حافظہ اور یادداشت کی بنیاد پر دیئے۔ کتاب کے آخر میں علمی و تحقیقی مسائل سے متعلق حوالوں کے لیے مختلف زبانوں میں اپنی جملہ تصانیف و مقالات کی ایک طویل فہرست شامل کر دی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں زیر بحث موضوعات پر موصوف اپنی ان تصانیف میں تحقیق فرما چکے ہیں۔ یہ سب بجا و درست ہے۔ اول تو ڈاکٹر صاحب کی جملہ تصانیف ہر کتب خانہ میں موجود نہیں ہیں۔ نیز یہ نہیں معلوم کہ کس مسئلہ کے بارے میں آپ نے کس کتاب میں تحقیق فرمائی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظر ثانی کے بعد بھی اس میں بعض چیزیں تصحیح طلب ہیں۔ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھا ہے کہ آپ کو ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے۔ اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ اس لیے ہمیں سوچنا پڑے گا۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہوگا'' (ص ۳۵)۔ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کسی محلہ کی مسجد میں امامت فرماتی تھیں۔ اور وہاں عام مساجد کی طرح عام مردان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت تک آپ رضی اللہ عنہا اپنے فرائض انجام دیتی رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ حکم استثنائی ضرورت کے پیشِ نظر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حدیث کے حوالہ کے لیے سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل کا ذکر کیا ہے۔ جب ہم نے اس حدیث کو اصل مآخذ سے ملا کر دیکھا تو ہمیں کسی کتاب اور کسی روایت میں بھی یہ بات نہیں ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا۔ ذیل میں ہم اس سے متعلق احادیث کے عربی الفاظ اور ان کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

سنن ابی داؤد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبدالرحمن بن خلاد الانصاری عن ام ورقه بنت نوفل ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم لما غزا بدرا قالت: قلت له یارسول اللّٰه، ائذن لی فی الغزو معك، امرض مرضاکم، لعل اللّٰه ان یرزقنی شهادة – قال قری فی بیتك، فان اللّٰه عزوجل یرزقك الشهادة۔ قال: فکانت تسمی الشهیدة – قال؛ وکانت قد قرأت القرآن۔ فاستأذنت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ان تتخذ فی دارها مؤذنا، فاذن لها۔ قال: وکانت دبرت غلاما وجاریة۔ فقاما الیها باللیل فغمّاها بقطیفة لها حتی ماتت۔ وذهبا۔ فاصبح عمر۔ فقام فی الناس: فقال: من عنده من هذین علم او من رأهما فلیجئنی بهما۔ فامر بهما۔ فصلبا۔ فکانا اول مصلوب فی المدینة۔

اس سے آگے دوسری روایت میں ہے:

کان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یزورها فی

Marfat.com

بیتها وجعل لها مؤذنا یؤذن لها وامرها أن تؤم اهل دارها۔ قال عبدالرحمن: فانا رأیت موذنها شیخا کبیرا (۱)

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن خلاد انصاری حضرت ام ورقہ بنت نوفل رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کیلیے تشریف لے جانے لگے تو وہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ سے کہا یا رسول اللہ! مجھے اپنے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دیجیے۔ میں آپ کے مریضوں کی تیمارداری کروں گی۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت سے نوازے گا۔ آپ نے جواب میں فرمایا: اپنے گھر میں قیام کرو۔ اللہ تعالیٰ (یہیں) تمہیں شہادت عطاء کرے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے انہیں شہیدہ کہا جاتا تھا۔ اور انہوں نے قرآن پڑھا ہوا تھا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ اپنے گھر میں ہی ایک مؤذن رکھیں۔ آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اپنے ایک غلام اور باندی کو مدبر کردیا تھا یعنی ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی دفات کے بعد وہ آزاد ہوں گے۔ چنانچہ ایک رات کو وہ ان کے پاس گئے اور ان کے ایک ریشمی کمبل یا چادر سے ان کو ڈھانپ کر دبادیا اور وہ انتقال کر گئیں۔ اسکے بعد یہ دونوں فرار ہو گئے۔ صبح کو حضرت عمر کو جب اسکی خبر ہوئی تو آپ نے جلسہ عام میں اعلان فرمایا: ان دونوں کے بارے میں جس کو کچھ علم ہو، یا کسی نے ان کو دیکھا ہو، تو ان کو وہ حاضر کرے۔ چنانچہ جب ان دونوں کو ان کے پاس حاضر کیا گیا تو آپ نے انہیں سولی دینے کا حکم دیا اور انہیں سولی دی گئی۔ مدینہ میں سب سے پہلے سولی پانے والے یہی دونوں تھے۔

دوسری روایت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو ان کے یہاں اذان دیتا تھا آپ نے ان کو حکم دیا تھا کہ اپنے گھر والوں کو وہ نماز پڑھایا کریں۔ راوی عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے ان کے مؤذن کو دیکھا تھا۔ وہ بہت بوڑھے آدمی تھے۔

ابنِ خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس حدیث کو صحیح بتلایا ہے (۲)۔ مستدرک حاکم میں یہ روایت اس طرح ہے:

عن ليلى بنت مالك و عبدالرحمن بن خلاد الانصاری عن ام ورقة الانصارية ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول: انطلقوا بنا الى الشهيدة فنزورها وامر ان يؤذن لها۔ وتقام وتؤم اهل دارها فى الفرائض (۳)

ترجمہ: لیلی بنت مالک اور عبدالرحمٰن بن خلاد انصاری حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے: ہمیں شہیدہ کے پاس لے چلو، تاکہ ہم اسکی زیارت کریں۔ اور آپ نے حکم فرمایا کہ ان کے لیے اذان دی جائے، اور اقامت کہی جائے۔ اور یہ کہ وہ اپنے گھر والوں کی فرض نمازوں میں امامت کریں۔

ابن قدامہ نے المغنی میں اس روایت کو اس طرح نقل کیا ہے:

وقد روى عن ام ورقة ان النبى صلى الله عليه وسلم اذن لها ان يوذن لها ويقام وتؤم نساء اهل دارها (۴)

ترجمہ: حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دی تھی کہ ان کے لیے اذان دی جائے، اور اقامت پڑھی جائے۔ اور وہ اپنے گھر کی خواتین کی امامت کیا کریں۔

افسوس کہ ابن قدامہ نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے یہ روایت حدیث کی کس کتاب سے نقل کی ہے۔ تاہم یہ روایت ان تمام احادیث کے مخالف ہے جن میں اہل دارھا کے الفاظ ہیں۔ ابن قدامہ کی اس روایت میں نساء کا اضافہ ہے۔ جب تک ہمیں اسکا ماخذ معلوم نہ ہو اسکے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ابن سعد نے صحابیات کے حالات میں ان کا نام اسطرح نقل کیا ہے: ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث۔ اسی کے بعد یہ روایت نقل کی ہے:

Marfat.com

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزورها ويسميها الشهيدة۔ وكانت قد جمعت القرآن۔ وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم حين غزا بدرا قالت له: تأذن لى فاخرج معك اداوى جرحاكم و امرض مرضاكم۔ لعل الله يهدى لى شهادة۔ قال: ان الله مهد لك شهادة۔ فكان يسميها الشهيدة۔ وكان النبى صلى الله عليه وسلم قد امرها ان تؤم اهل دارها وكان لها موذن۔ فقتلاها فى امارة عمر۔ فقيل ان ام ورقة غمها غلامها وجاريتها فقتلاها۔ وانهما هربا۔ واتى بهما فصلبهما۔ فكانا اول مصلوبين بالمدينه۔ وقال عمر: صدق رسول الله صلى الله عليه وسلم، كان يقول: انطلوا بنا۔ نزور الشهيدة۔ (۵)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے جایا کرتے اور آپ ان کو شہیدہ کے نام سے پکارتے۔ آپ نے قرآن حفظ کیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو ام ورقہ نے آپ سے کہا کہ آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کے ساتھ چلوں۔ آپ کے زخمیوں کا علاج کروں گی اور مریضوں کی تیمارداری کروں گی۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کی سعادت سے نوازے۔ آپ نے جواب میں فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت سے نوازیں گے۔ اسکے بعد سے آپ ان کو شہیدہ کے نام سے پکارتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں، اور اذان دینے کے لیے آپ نے ان کے لیے ایک موذن متعین فرمایا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کی امامت فرماتی تھیں، یہاں تک کہ ان کے ایک غلام اور لونڈی نے جن کو انہوں نے مدبر کر دیا تھا، کپڑے سے ڈھانپ کر دبایا اور حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں ان کو قتل کر دیا۔ پھر ان کے بارے میں یہ کہا گیا

Marfat.com

کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے ایک غلام اور لونڈی نے ان کو کپڑے سے دبا کر قتل کر دیا۔ پھر دونوں فرار ہو گئے۔ بعد میں ان کو گرفتار کر لیا گیا اور سولی دے دی گئی۔ مدینہ میں پہلی بار ان دونوں کو سولی دی گئی۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ آپ کہا کرتے تھے۔ ہمیں شہیدہ کی زیارت کے لیے لے چلو۔

مسند امام احمد بن حنبل کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن الولید بن عبداللّٰہ بن جمیع قال حدثنی عبدالرحمن بن خلاد الانصاری وجدتی عن ام ورقة بنت عبداللّٰہ بن الحارث ان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کان یزورها کل جمعة وانها قالت: یا نبی اللّٰہ یوم بدر، اتاذن فاخرج معك امرض مرضاکم واداوی جرحاکم، لعل اللّٰہ یهدی لی شهادة۔ قال: قری – فان اللّٰہ عزوجل یهدی لك شهادة، وکانت اعتقت جاریة لها۔ وغلاما عن دبر منها فطال علیهما۔ فغماها فی القطیفة حتی ماتت وهربا۔ فاتی عمر فقیل له: ان ام ورقة قد قتلها غلامها وجاریتها وهربا۔ فقام عمر فی الناس فقال: ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کان یزور ام ورقة یقول: انطلقوا نزور الشهیدة۔ وان فلانة جاریتها وفلانا غلامها غماها ثم هربا۔ فلا یؤویهما أحد۔ ومن وجدهما فلیات بهما۔ فاتی بهما۔ فصلبا۔ فکانا اول مصلوبین۔

دوسری روایت:

عن الولید حدثتنی جدتی عن ام ورقة بنت عبداللّٰہ بن الحارث الانصاری وکانت قد جمعت القرآن۔

وكان النبي صلى الله عليه وسلم قد امرها ان تؤم اهل دارها۔ وكان لها مؤذن۔ وكانت تؤم اهل دارها (٦)

ترجمہ: ولید بن عبداللہ بن جمیع عبدالرحمٰن بن خلاد انصاری اور اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں، اور یہ دونوں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جمعہ کو ان سے (ام ورقہ سے) ملنے تشریف لے جاتے تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ بدر کے موقع پر یہ کہا تھا کہ اے اللہ کے نبی کیا آپ مجھے اسکی اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ جنگ میں شرکت کے لیے چلوں، میں آپ (مسلمانوں) کے بیماروں کی تیمارداری کروں گی، اور ان کے زخمیوں کا علاج کروں گی۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے بھی شہادت نصیب فرمائیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔ یہیں ٹھہری رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور شہادت کی دولت سے نوازیں گے۔ انہوں نے اپنے ایک غلام اور ایک لونڈی کو مدبر کیا تھا۔ یعنی اپنی وفات کے بعد انہیں آزاد کرنے کا ان سے معاہدہ کیا تھا۔ لیکن یہ مدت بہت لمبی ہوگئی۔ چنانچہ انہوں نے ان کو ایک چادر سے ڈھانپ کر سختی سے دبایا۔ یہاں تک کہ وہ انتقال کر گئیں۔ وہ دونوں خود بھاگ گئے۔ حضرت عمر تشریف لائے تو ان سے کہا گیا کہ حضرت ام ورقہ کو ان کے ایک غلام اور لونڈی نے قتل کر دیا اور خود فرار ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر نے مجمع عام میں فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ سے ملنے تشریف لے جایا کرتے تھے اور فرماتے تھے: چلو ایک شہید خاتون سے ملاقات کریں۔ ان کی فلاں لونڈی اور فلاں غلام نے دبا کر ان کو قتل کر دیا ہے اور فرار ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں میں سے کوئی شخص بھی ان کو پناہ نہ دے۔ جس شخص کو وہ مل جائیں انہیں یہاں حاضر کرے۔ چنانچہ انہیں پکڑ کر حاضر کیا گیا۔ اور دونوں کو سولی دے دی گئی۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے سولی پانے والوں میں یہی دونوں تھے۔

دوسری روایت:

ولید اپنی دادی سے اور وہ ام ورقہ بنت عبداللہ بن الحارث انصاری کے بارے میں کہتی ہیں کہ انہوں نے قرآن حفظ کیا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا

Marfat.com

تھا کہ وہ نماز میں اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں، اور ان کے ایک موذن بھی تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کی امامت فرماتی تھیں۔

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے یہی حالات جو حدیث کی ان روایات سے معلوم ہوئے ہیں ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب اور الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں، ابن الاثیر نے اسد الغابہ فی معرفتہ الصحابہ میں، اور ابن عبدالبر نے استیعاب فی معرفتہ الاصحاب میں ذکر کیے ہیں۔ وہاں بھی مسجد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہر روایت میں یہی بات کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کو نماز پڑھاتی تھیں۔ ان سب روایات کے سامنے آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے، محل نظر ہے۔ مردوں سے مراد اگر ان کا موذن اور غلام مراد ہے تو یہاں تک تو یہ بات درست ہے لیکن اگر وہ کسی محلہ میں مسجد کی امام تھیں اور اس محلہ کے عام مردان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو اس کی تصدیق کسی حدیث سے نہیں ہوتی۔ اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کی امامت کرنا، جن میں مرد بھی شامل تھے، اور مسجد میں عام مسلمانوں کی امامت کرنا، ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذکورہ بالا تمام روایات میں واضح الفاظ موجود ہیں کہ "امرھا ان تؤم اھل دارھا" (آپ نے ان کو حکم دیا تھا، یا اجازت دی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں) مسجد کا ذکر کسی ایک روایت میں بھی موجود نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب محترم سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ مدینہ کی وہ کونسی مسجد تھی جس میں آپ امامت فرماتی تھیں؟ اور اس مسجد کا ذکر کس حدیث میں آیا ہے؟ موصوف نے سنن ابی داؤد اور مسند امام احمد بن حنبل کا حوالہ دیا ہے۔ ان کتابوں سے ہم نے دونوں روایات اوپر نقل کر دی ہیں۔ ان میں اور دوسری کتابوں میں بھی کہیں، دُور دُور مسجد کا ذکر نہیں ہے ادارہ تحقیقات اسلامی نے خطبات بہاولپور کا نیا ایڈیشن خود فاضل مؤلف کی نظر ثانی اور تصحیح کے بعد شائع کیا ہے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ تصحیح کے وقت ڈاکٹر صاحب کی نظر اس حدیث پر بھی ضرور پڑی ہوگی اور موصوف کے پاس ضرور اسکی کوئی

Marfat.com

دلیل موجود ہوگی کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی کسی مسجد کا امام مامور فرمایا تھا۔ اور عام مسلمان مرد بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالیں گے اور اسکی وضاحت فرمائیں گے۔

درحقیقت ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد سے کہ حضرت ام ورقہ ایک مسجد میں امامت فرماتی تھیں، اور موصوف کے بقول حضرت عمر کے زمانہ تک وہ یہ فریضہ انجام دیتی رہیں، غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ترقی پسند مسلمان صحافی اور دانشور موصوف کے اس بیان سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ عہد نبوی میں تو خواتین مساجد میں امامت بھی کرتی تھیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کو مردوں کے مساوی حقوق دیئے تھے متاخر دور میں ان کے یہ حقوق سلب کر لیے گئے۔

جہاں تک فرض اور تراویح کی نماز میں خواتین کا مردوں کی امامت کرنے کا تعلق ہے تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی اس واقعہ کو استثنائی حکم قرار دیا ہے۔ جمہور فقہاء کے دلائل احادیث اور تعامل صحابہ کی روشنی میں حدیث و فقہ کی مبسوط کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن امام ابوثور اور امام مزنی نے حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے استلال کرتے ہوئے خواتین کو فرض اور نفل نمازوں میں مردوں کی امامت کی اجازت دی ہے۔ اور ان کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں، امام طبری صرف تراویح کی نماز میں عورتوں کی امامت کی اجازت دیتے ہیں، بشرطیکہ کوئی مرد حافظ موجود نہ ہو۔ ایسی صورت میں مرد بھی ان کی اقتدا کر سکتے ہیں۔

حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ خواتین کی امامت فرض اور نفل نمازوں میں کیا کرتی تھیں اور درمیان صف میں کھڑی ہوتی تھیں (۷) تاہم اس استفسار میں خواتین کی امامت کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس امر کی تحقیق مقصود ہے کہ کیا واقعی حضرت ام ورقہ مدینہ منورہ میں کسی مسجد میں نماز پڑھاتی تھیں جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں ذکر فرمایا ہے یا صرف اپنے گھر میں اپنے اہل خانہ کو نماز پڑھاتی تھیں، جیسا کہ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں۔

Marfat.com

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ابوداؤد۔ سنسن ابی داؤد مع شرح عون المعبود۔ دارالکتاب العربی۔ بیروت تاریخ طباعت درج نہیں۔ ج ۱۔ ص ۲۳۰

۲۔ صنعانی۔ محمد بن اسمعیل کحلانی۔ سبل السلام۔ قاہرہ۔ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ تاریخ طباعت درج نہیں۔ ج ۲۔ ص ۳۵

۳۔ الحاکم۔ المستدرک۔ ریاض۔ مکتبۃ المعارف۔ تاریخ طباعت درج نہیں ج ۱۔ ص ۲۰۳

۴۔ ابن قدامہ۔ المغنی۔ قاہرہ۔ دارالمنار۔ ۱۳۶۷ھ ج ۱۔ ص ۴۲۲

۵۔ ابن سعد۔ طبقات ابن سعد۔ لیڈن۔ ۱۳۲۱ ھ ج ۸۔ ص ۳۳۵

۶۔ احمد بن حنبل۔ مسند احمد بن حنبل۔ بیروت۔ دارصادر۔ تاریخ طباعت درج نہیں۔ ج ۶۔ ص ۴۰۵

۷۔ شمس الدین عظیم آبادی۔ عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد۔ بیروت دارالکتاب العربی تاریخ طباعت درج نہیں۔ ج ۱۔ ص ۲۳۰ - ۲۳۱۔ نیز ملاحظہ ہو: صنعانی سبل السلام محولہ بالا ایڈیشن۔ ج ۲۔ ص ۲۸ - ۲۹ - ۳۵۔

Marfat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا جواب

۲۴ ربیع الآخر ۱۴۰۸ھ

۱۶ دسمبر ۱۹۸۷ء

مخدوم ومحترم متعنا اللہ بطول حیاتکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ کرم نامہ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۸۷ء آج پہنچا، سرفراز کیا۔ میں ایک ناچیز خادم علم ہوں اور اپنے متعلق ہمیشہ سے یہ عقیدہ اور یہ تجربہ رکھتا آیا ہوں کہ دُور کے ڈھول سہانے۔ الحق یعلو ولا یعلی علیہ۔

فاضل محترم احمد حسن صاحب کے مضمون کی مجھے غالبًا اصل نہیں، نقل بھیجی گئی ہے کیونکہ اس میں املاء وعبارت کی بہ کثرت غلطیاں ہیں (مثلاً ص ۲: ''فاصبحا عمر فقاما في الناس'') ترجمے میں بھی بغیر صراحت کے اضافے ہیں (مثلاً ص ۲: جب ان دونوں قاتلوں کو ان کے پاس حاضر کیا گیا تو'') وغیرہ۔ مگر اسے اہمیت نہیں۔

فاضل مقالہ نگار کا اصل سوال یہ ہے کہ روایتوں میں ''مسجد'' کی صراحت نہیں ہے۔ جواب سے قبل یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ''مسجد'' سے کیا مراد ہے؟ رسول اکرم کی زندگی میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ کچھ نہیں تو دس پندرہ اور مسجدوں کا پتا چلتا ہے۔ ان کی وسعت کے اندازے کے لیے مسجد القبلتین، جو تا حال باقی ہے، کافی ہوگی۔ یہ مسجدیں ہر کالونی میں تھیں اور بعض کا قبلہ وغیرہ خود رسول اکرم بتاتے اور متعین فرماتے رہے۔ روایتوں میں ''بیت'' (گھر) کا لفظ نہیں ہے بلکہ ''دار'' یعنی بستی، کالونی کا ذکر ہے جو ہم قبیلہ، قریبی رشتہ داروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جب ایک مرد اذان دے اور بستی کا کوئی رشتہ دار شخص نماز گاہ میں آ جائے (ہلکہ اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست ملاقاتی بھی ہو) تو

نہ وہاں آنے میں دشواری ہو، اور نہ کوئی اسے روکے۔

میں نے جنوبی افریقا کے شہروں میں، گورے محلوں میں دیکھا ہے کہ وہاں کی مسجدوں میں صرف تین وقت کی نمازیں ہوتی ہیں۔ فجر اور عشا کے وقت کالوں اور ساونلوں کو، جو دن میں کاروبار کے لیے وہاں آسکتے ہیں، وہاں رات میں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

مسجد سے میری مراد ہر وہ مقام ہے جہاں پابندی سے پنج وقتہ نمازیں ہوتی ہوں، اور اذان اور اقامت کا بھی مستقل انتظام ہو۔ ایسی ''نماز گاہ'' کو ''مسجد'' فرض کرنا اسی طرح ضروری معلوم ہوتا ہے جتنا حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے قاتلوں کو گرفتار کر کے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس، سولی کے حکم سے پہلے، لایا جانا ضروری تھا۔

خود مسجد نبوی میں شروع میں چھت نہ تھی۔ گرمی کے موسم میں ظہر وعصر کے وقت تکلیف ہونے کی شکایت کی گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھت بنانے کا حکم دیا تھا۔

غرض یہ میرا استنباط ہے۔ ممکن ہے غلط ہو۔ مگر اہمیت اس قصے میں نماز گاہ کو نہیں، بلکہ اس کو ہے کہ ایک عورت، مردوں کی بھی امام بن کر، نماز پڑھاتی ہے۔ خطبات بہاولپور میں ایسی مثالیں بھی دی گئی ہیں کہ خود آج بھی، اسلام آباد میں نہیں، پاریس میں اس کی ضرورت پیش آ رہی ہے کہ بہ کثرت نومسلم گورے مرد، مادر زاد مسلمان لڑکیوں سے نکاح کر رہے ہیں۔

جواز اور وجوب میں فرق ہے۔

مجھے اس بیان سے اتفاق نہیں کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر (بیت) میں نماز پڑھاتی تھیں۔ بلکہ وہ اپنی کالونی (دار) کی نماز گاہ میں امام تھیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

المفتقر الی اللہ

محمد حمید اللہ

(فکر ونظر۔ اسلام آباد)۔ جولائی، ستمبر ۱۹۸۸ء)

Marfat.com

ڈاکٹر حمید اللہ (فرانس)

بسم اللہ

اسلام آباد

چہارشنبہ ۱۸/ربیع الانور ۱۴۰۰ھ

مخدوم و محترم زاد فیضکم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ توقع ہے میرا جوابی عریضہ مل گیا ہوگا۔ میں یہاں گزشتہ جمعہ کو آیا تھا اور آئندہ جمعہ کو ایک ہفتے کے قیام کے بعد واپس جا رہا ہوں۔ پاکستانی پریس اتاچی (پاریس) سے معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت عموماً ہر سال چند تعلیمی وظیفے طلبہ کو دیتی ہے اور یہ پاکستانی وزارتِ تعلیم سے متعلق ہے۔ کبھی پاریس کے سفارت خانے سے اور کبھی اسلام آباد کے فرانسیسی سفارت خانے سے یہ مابین کا کام لیا جاتا ہے۔

ترجیح ان طلبہ کو دی جاتی ہے جو بعد میں فرانسیسی زبان کے معلم بننا چاہتے ہیں اور کبھی کبھار استثنائی طور پر دیگر علوم کے لیے بھی کسی کو لیا جاتا......

ان سرکاری وظائف کے سوا میرے علم میں وہاں فی الوقت کوئی اور ایسی چیز نہیں ہے جو طلبہ کے گزر اوقات کا انتظام کرتی ہو۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(ماہ نامہ قومی زبان - کراچی، ستمبر ۱۹۹۰ء)

Marfat.com

ماہ صفر کا شمارہ "الحق" یہاں ابھی ابھی پہنچا ہے۔ اس میں آپ کا گراں قدر مقالہ ازواجِ مطہرات کے مکانات کے جالب نظر رہا۔ پڑھ کر استفادہ کیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

شاید دس بارہ سال ہوئے ہوں گے اسی موضوع پر اس ناچیز جاہل نے بھی ایک مقالہ شائع کیا تھا اور اس میں مسجد نبوی اور ان متبرک مکانوں کا نقشہ بھی شامل کیا تھا۔ یہ اعظم گڑھ کے رسالہ الرشاد میں چھپا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ اس کی غلطیاں مجھے بتائی جا سکیں اور ان کی اصلاح کی جائے تو کیا کہنے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرانس

(ماہ نامہ الحق - اکوڑہ خٹک - فروری، مارچ ۱۹۹۲ء)

Marfat.com

باسمہ تعالیٰ، حامدا ومصلیا

پاریس یوم معراج مبارک ۱۴۱۲ھ

سلام مسنون! موقر ماہنامہ الحق کا شمارہ رجب ۱۴۱۲ھ ابھی ابھی پہنچا ہے ممنون بھی ہوا اور مستفید بھی خاص کر مولانا تصدق بخاری صاحب کا مقالہ بعنوان ''جبیں کروٹ ہے یا ماتھا؟'' غور سے پڑھا خاص کر اس لیے کہ اس ناچیز ہیچ داں نے بھی قرآن مجید کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے جس کے اکیسویں ایڈیشن کے پروف بھی اتفاق سے انہیں دنوں تصحیح کے لیے آئے ہوئے ہیں اور ضرورت ہے کہ الحق يعلو ولا يعلى عليه کے بمصداق اس ترجمے میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو اسے درست کریں۔ اس لیے کچھ حقیر رائے زنی کی جسارت کرتا ہوں۔

شروع میں دو چھوٹی چیزوں کا بھی ذکر کروں گا جن کا اصل بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے یہ کہ مقالہ مذکور کے آغاز (صفحہ ۳۹، سطر ۶) میں کاتب نے کلا وھاشا لکھا ہے جسے آپ کے پروف خوان فاضل نے درست نہیں کیا ہے یہ ''ھاشا'' نہیں ''حاشا'' ہونا چاہیے۔ دوسرے مقالے کا آغاز جو سطر ۹ سے ہوا ہے ایک ناقابل فہم عبارت سے ہوا ہے یعنی ''بقرار زیر علم وعرفاں'' معلوم نہ ہو سکا کہ مولف نے کیا لکھنا چاہا ہے۔

اصل بحث کے متعلق ماقل وذل ، لاما طالَ وأملَّ پر عمل کر کے بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس مقالے کی رائے سے اتفاق نہ ہو سکا۔

حیرت ہوئی کہ محترم مقالہ نگار نے لغت کی کتابوں کو کیوں نظر انداز فرمایا، یا کیوں نامکمل اقتباس دیے ہیں۔ تاج العروس، اور لسان العرب میں مثلاً کوئی معین متفق علیہ بات نہیں بیان کی گئی ہے اور یہاں تک بھی لکھا ہے کہ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے'' تاج العروس کا یہ جملہ جو بہت اہم ہے، یہاں قابل ذکر نظر آتا ہے۔ قال شيخنا رحمة الله عليه: وقد وردالجبين بمعنى الجبهة لم لعلاقته الجاورة، في قول زهير۔

Marfat.com

جب لغت میں کسی لفظ کے دو معنی بیان ہوتے ہیں تو روایت کے ساتھ درایت کی بھی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمائش، جانچ اور ابتلاء کے لیے حکم دیا کہ اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کو "ذبح" کے ذریعے سے قربان کرو۔ تو دیکھنا یہ ہوگا کہ عادۃً ذبح کس طرح کرتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ذبح سر کچلنے یا پھانسی پر چڑھانے کے ذریعے سے نہیں ہوتا بلکہ مذبوح ہونے والے کو چت لٹا کر حلق پر چھرا پھیرا جاتا ہے لیکن قرآن مجید خود تصریح کرتا ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے باپ نے نوعمر بچے کو جبین پر لٹایا۔ مفسرین کا یہ بیان معقول معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوف ہوا کہ کہیں محبت پدری کے جوش میں ذبح کرتے وقت بچے کی آنکھوں اور چہرے میں موت کی تکلیف دیکھیں تو کہیں احکام خداوندی کی تعمیل اور فریضے کی ادائی میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ اس لیے چت کی جگہ پٹ لٹایا۔ اس میں ایک مزید اضافہ یہ ہے کہ گدی کی طرف سے ذبح کریں تو حرکت قلب جلد تر بند ہو جاتی ہے اور خون زیادہ نہیں بہتا اور مذبوح زیادہ نہیں تڑپتا۔

قربانی کے لیے جب "ذبح" کرنا ہو تو کروٹ لٹانا بے سود سا معلوم ہوتا ہے انسان کو ذبح کرنا ہو یا کسی عام جانور کو۔

والله اعلم بالصواب ربنا اهدنا الصراط المستقيم۔

(الحق - اکوڑہ خٹک - مئی ۱۹۹۲ء)

Marfat.com

مکتوب پیرس

مخدوم ومحترم زاد مجدکم، سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج الحق ۱۰/۲۷ بابت محرم ۱۴۱۳ھ پہنچا۔ میرے دل میں اس رسالے کی بڑی عزت ہے۔ گستاخی معاف ہو، اس میں ایک غلطی نظر آئی، اِطلاعاً عرض کرتا ہوں۔ ویسے آپ کو کامل آزادی ہے، مجھے ہمہ دانی ذرا بھی نہیں۔

اس میں صفحہ ۲۵ ومابعد پر ثمرقند و بخارا کا ایک تازہ سفرنامہ چھپا ہے۔ میں نے ثمرقند کبھی نہ پڑھا ہے اور نہ سنا ہے یہ سمرقند ہے۔ "سمر" ایک آدمی کا نام بتایا جاتا ہے اور "قند" کے معنی ہیں "شہر" مضمون کے اندر بھی اس املاء کو کئی بار دہرایا گیا ہے۔ خود "نقش آغاز" میں بھی یونہی لکھا ہے۔ (صفحہ ۴ سطر ۴)

واللہ اعلم بالصواب

ناچیز

محمد حمید اللہ پیرس

(الحق - اکوڑہ خٹک - ستمبر ۱۹۹۲ء)

Marfat.com

عورت کی حکمرانی
صرف حالتِ اضطرار میں جائز ہے

مدیر تکبیر اور ڈاکٹر حمید اللہ کے درمیان
ایک اہم مسئلہ پر فکرانگیز مراسلت

عالمِ اسلام کے ممتاز مفکر، فرانسیسی زبان میں قرآن حکیم کے مترجم و مفسر اور انگریزی، اردو اور ترکی زبانوں میں سیرت طیبہ اور متعدد دوسرے موضوعات پر ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ آج کل پیرس میں علیل ہیں اور وہاں سے آمدہ اطلاعات کے مطابق ایک مقامی اسپتال میں داخل ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی جلد صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں اور حکومت، بالخصوص وزیراعظم ان کے مناسب علاج معالجہ پر خصوصی توجہ فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب گزشتہ سال اپریل میں وزیراعظم پاکستان محمد نواز شریف صاحب کی دعوت پر بحیثیتِ سرکاری مہمان پیرس سے پاکستان تشریف لائے تھے اور یہاں دو ہفتے قیام کیا۔ انہوں نے اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں جامعات اور دوسرے علمی اداروں اور اجتماعات میں جن موضوعات پر خطاب کیا اور سوالات کے دوران اپنے موقف کی وضاحت کی ان میں ایک اہم موضوع ''اسلامی ریاست میں عورت کی سربراہی'' کا تھا۔

اہلِ علم نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب پیرانہ سالی، گراں گوشی اور ضعفِ حافظہ کے باعث اب پہلے کی طرح رواں اور مربوط تقریر نہیں کر پاتے اور گفتگو میں بھی کسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے عموماً نسیان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ متاثر کرنے والی اصل بات

Marfat.com

یہ تھی کہ ۸۶ سال کی عمر میں اور تنِ تنہا کسی سہارے کے بغیر زندگی بسر کرنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب اپنے علمی کام اور تعلیم و تربیت کے مشاغل میں پورے انہماک سے مصروف ہیں اور اس وقت وہ اپنی فرانسیسی تفسیر کے ۱۹ ویں ایڈیشن پر نظرِ ثانی کا کام انجام دے رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے ان کے تازہ سفرِ پاکستان کے بعد میری خاصی مراسلت رہی ہے، عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر ان سے خاص طور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے قیامِ پاکستان کے دوران عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جو کچھ کہا تھا اس سے ان کی رائے کے بارے میں متعدد غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ انتخابی مہم کو گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ ان کے ارشادات پر ایک طرف عورت کی سربراہی کے مخالف حلقوں اور بالخصوص علماء اور دیندار طبقوں میں شدید ردعمل ہوا، راقم پر بھی بہت خفگی کا اظہار ہوا جو ڈاکٹر صاحب کے اس سفرِ پاکستان کا اصل محرک بنا تھا، دوسری طرف عورت کی سربراہی کے جواز میں ان اہلِ قلم کو بڑا مستند حوالہ بلکہ فتویٰ ہاتھ آ گیا جو بے نظیر کی انتخابی مہم کے دوران ان کے حق میں اردو اور انگریزی اخبارات میں مضامین کے انبار لگا رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب پیرس روانگی کے لیے کراچی پہنچے تو یہ مسئلہ فاران کلب اور دوسرے اجتماعات میں یہاں بھی زیرِ بحث آیا میں انہیں رخصت کرنے ایئرپورٹ گیا تو روانگی کے وقت الوداع کہتے ہوئے اپنی کتاب ''عورت کی سربراہی - آدم تا ایں دم'' ان کی خدمت میں پیش کی اور یہ درخواست کی کہ وہ سفر کے دوران اس کا مطالعہ فرما لیں اور مجھے اپنے تبصرے سے بھی نوازیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''آپ بڑے ہوشیار صحافی ہیں، کتاب ایسے موقع پر پیش کی ہے جب اس کا مطالعہ یقینی ہو جائے، میں ان شاء اللہ دورانِ سفر ہی اس کا مطالعہ کروں گا اور اپنی رائے سے آپ کو مطلع کروں گا''۔ ڈاکٹر صاحب کا پہلا تبصرہ مجھے ان کے خط مورخہ ۵ ذی قعدہ ۱۴۱۲ھ (ڈاکٹر حمید اللہ اپنے خطوط پر بالعموم ہجری تاریخ ہی درج کرتے ہیں) کی صورت میں ملا۔ یہ خط ان کی انکساری اور محبت و شفقت کا بڑا دل آویز مرقع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

Marfat.com

جمعہ ۵ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ

''مخدوم ومحترم زادمجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ جب سے گھر پہنچا ہوں متعدد پریشانیوں میں ہوں۔ اللہ کی مرضی۔

میں نے آپ کا رسالہ ''آدم تا ایں دم عورت کی سربراہی'' ہوائی جہاز ہی میں پڑھ لیا۔ اگر میں علمی نہیں، سیاسیات کا آدمی ہوتا تو ایئر پورٹ ہی پر آپ کو جواب دے دیتا۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اخباروں میں اشاعت کے لیے اس مقامی سیاسی ضرورت کی چیز پر کچھ لکھنا پسند نہیں کرتا۔

آپ نے تحقیق کی اور بہ کثرت معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ کافی ہیں۔ مجھ ناچیز جاہل کے خیالات کی آپ کو ضرورت بالکل نہیں ہے۔ کرم ہوگا اگر آپ مجھے معاف فرمائیں۔

جو لوگ ''عورت کی سربراہی'' کا فتویٰ دیتے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خاص ضرورت پر کبھی کبھی اس سے استفادہ فرمائیے، یہ نہیں کہ ہمیشہ یا بہ کثرت اس کی طرف رجوع کریں۔ آپ کی کرم فرمائیوں کا مکرر دلی شکریہ۔

ناچیز خادم

محمد حمید اللہ

میں نے اپنے جوابی خط مورخہ ۸ جولائی ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب کی طرف سے حوصلہ افزائی اور ان کی وضاحت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

''محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے دو خط مورخہ ۱۹ ذیقعدہ اور ۱۶ ذی الحجہ موصول ہوئے۔ سلطنتِ عمان کو

Marfat.com

اومان لکھنا واقعی غلط تھا، اس کی تصحیح شائع کی جا چکی ہے۔ آپ کے توجہ دلانے کا بہت شکریہ! پورا پرچہ چونکہ خود ایڈیٹر مرتب نہیں کرتا، اس لیے بعض رپورٹروں یا سب ایڈیٹروں سے ایسی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔

آپ کو ہم نے اپنے پرچہ میں متنازعہ نہیں بننے دیا ہے، البتہ بعض اخبارات نے عورت کی سربراہی سے متعلق آپ کے موقف کو ایک طویل بحث وتمحیص کا موضوع بنا دیا ہے۔ آپ اس سلسلہ میں کوئی وضاحتی مضمون ارسال فرمانا چاہیں، تو تکبیر کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں.......... آپ کو سیاست میں گھسیٹنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم تو آپ کے علمی اور تحقیقی کام کے حوالے سے آپ کا تعارف چاہتے تھے، خدا کا شکر ہے، آپ کی یہاں آمد سے یہ مقصد پورا ہو گیا۔ اللہ آپ کو ہر طرح کی پریشانیوں سے محفوظ رکھے اور خدمتِ دین کا جو کام آپ زندگی بھر انجام دیتے رہے ہیں، اس کی مزید توفیق عطا فرمائے۔"

والسلام

طالب دعا

محمد صلاح الدین

مدیرِ اعلیٰ "تکبیر"

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے جو خط لکھا، افسوس وہ اور میری جانب سے اس کے جواب کی نقل کا منسلک سیٹ کہیں کاغذات کے انبار میں گم ہو گیا ہے اور فوری طور پر دستیاب نہیں ہو سکا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی دیگر اور فوری نوعیت کی علمی مصروفیات کے باعث کسی طویل مضمون سے معذرت کر لی تھی البتہ مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ کوئی متعین سوال آپ کے ذہن میں ہو تو ارسال فرمائیے، میں اس کی حد تک اپنا موقف بیان کر دوں گا۔ میں نے اپنے خط میں عرض کیا تھا کہ ماضی کی تمام مثالیں توارث پر مبنی سربراہی سے متعلق ہیں، یہ کسی مجبوری، مصلحت یا حالتِ اضطرار کے ضمن میں آتی ہیں، ان سے عورت کی سربراہی کا کوئی عمومی جواز نہیں نکلتا اور بالخصوص آزادانہ انتخابات کے مواقع

Marfat.com

پر ایسی کوئی مجبوری نہ ماضی میں لاحق ہوئی اور نہ حال میں اس کا کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔ انتخابات کے ذریعہ سربراہی کے منصب پر تقرر کی واضح مثال خلافتِ راشدہ میں یکے بعد دیگرے چار بار قائم ہوئی مگر کسی مرحلے میں بھی امہات المومنینؓ سمیت کسی خاتون کا نام زیرِ غور نہ آیا۔ بعد میں عورت کو جہاں کہیں یہ منصب ملا کسی نرینہ وارث کی عدم موجودگی میں یعنی مجبوری یا اضطرار کی حالت میں ملا۔ آج آزادانہ انتخابات کے ذریعہ سربراہِ حکومت کے تقرر کا اصول جن مسلم ممالک میں رائج ہو چکا ہے وہاں ایسی حالت کا پایا جانا محال اور ناقابلِ تصور ہے کہ سرے سے کوئی مرد نامزدگی کے لیے موجود ہی نہ ہو اور رائے دہندگان عورت کے انتخاب کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی انسانی معاشرے کی قیادت و رہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے طویل سلسلہ میں کہیں بھی یہ منصب کسی عورت کے سپرد نہیں کیا۔ اس خط کے جواب میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ نے میرے ۲ نومبر ۹۲ء کے خط کا (جس کا خلاصہ اوپر بیان کیا گیا ہے) حوالہ دیتے ہوئے اپنے ۱۹ نومبر کے خط میں ارشاد فرمایا:

مخدوم و محترم زاد مجدکم

''حالتِ اضطرار و مجبوری میں آپ تسلیم کرتے ہیں کہ عورت کی حکمرانی جائز ہے اور بیگم بھوپال کے متعلق آپ بتاتے ہیں کہ خانوادہ والی وراثت میں عورت حکمرانی پر آتی ہے۔ یہ ایک مثال ہے۔ ایک فرضی مثال دیتا ہوں اگر (خدا کرے) انگلستان کی ملکہ ایلیزابت آج مسلمان ہو جائے اور حکمراں رہنا چاہے تو کیا آپ اسے معزول کریں گے؟ بھائی نالائق ہوں، رضیہ سلطانہ کو ولی عہد بنانا آپ بھی جانتے ہیں۔ ایک اور مثال دیتا ہوں۔ عصرِ حاضر کی اسلامی حکومتوں میں مرکزیت پیدا کرنے اور جماعتی خلافت قائم کرنے کے لیے میں نے جو تجویز پیش کی ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے اصول پر باری باری سے صدر بنیں۔ اگر یہ ایک دن پسند ہو جائے اور اتفاق سے کوئی مسلمان عورت کسی پارلیمانی ملک میں صدر جمہوریت بن گئی ہے تو بھی مجبوری ہوگی کہ اسے قبول کریں، غرض ''مجبوری'' کی ہر صورت کو قبول کرنا پڑے گا اس پر میرے اور آپ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

Marfat.com

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ اللہ نے عورت کو رسول بنا کر نہیں بھیجا اور یہ بھی صراحت ہے کہ سب کے قصے قرآن میں نہیں ہیں صرف بعض کے ہیں۔ بعض وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ بائبل کا بیان بے وجہ نہیں ہے کہ یہودیوں کے ہاں ہلڈا نامی ایک عورت نبی تھی۔ رسول نہیں، نبی تھی!

میرے کسی خط کو آپ چھاپنا چاہتے ہیں تو یہ بالکلیہ آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ مجھے عذر کیا ہوسکتا ہے؟ مذاق کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے شکایت اہل صحافت ہی سے ہے کہ جو میں نے نہ کہا، وہ میری طرف من گھڑت منسوب کیا۔ اللہ کی مرضی۔ قرآن میں ہے کہ یمن میں (بلقیس) ایک عورت ملکہ تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی۔ اسے بادشاہت سے معزول نہیں کیا گیا۔ آپ کوئی معین سوال کریں تو جواب دے سکوں۔

خادم

محمد حمید اللہ

Marfat.com

اس خط میں ڈاکٹر صاحب نے جو مثالیں قرآن حکیم اور برصغیر کی تاریخ سے دی ہیں ان پر میری رائے ''عورت کی سربراہی..... آدم تا ایں دم'' کے زیرِ عنوان کتاب میں آ چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو مفروضہ صورتیں آج کی ہمعصر دنیا سے متعلق دی ہیں وہ سب مجبوری اور اضطراری کے ذیل میں آتی ہیں اور بائبل کے حوالے سے جس ہلدا نامی عورت کی ''نبوت'' کا ذکر کیا گیا ہے اس کی مثال ہمارے ہاں حجت قرار نہیں دی جا سکتی۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اس پر اصرار نہیں کیا اور ابتداء ہی میں یہ کہہ کر ''گمان'' کی صورت دے دی ہے کہ ''بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے'' میرا محدود مطالعۂ قرآن و حدیث و تاریخ مجھے اس اصرار پر مجبور کرتا ہے کہ نبوت کا منصب اللہ نے عورت کو کبھی عطا نہیں فرمایا۔ اس کی جسمانی ساخت اور ماہانہ و سالانہ رخصتیں اور عدت و رضاعت وغیرہ کی مجبوریاں اس ذمہ داری کو تسلسل سے ادا کرنے میں مانع ہیں اور امامت یا قیادت میں ایک لمحہ کا انقطاع و تعطل ممکن نہیں ہوتا۔ یہ تسلسل صرف مرد ہی کی قیادت میں ممکن ہے۔ عورت کی نبوت کا

کوئی تاریخی ثبوت اگر قرآن وسنت سے کوئی محقق ثابت کر سکے تو ہم اسے شکریہ کے ساتھ نہ صرف شائع کریں گے بلکہ اپنی رائے سے رجوع کر لیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس قدرے طویل خط کے جواب میں ۱۳ جنوری ۱۹۹۳ء کو میں نے اس موضوع پر اپنا جو آخری خط ارسال کیا، اس کا متن یہ ہے:

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا ۱۹ نومبر کا خط مجھے ۲۱ دسمبر کو موصول ہو گیا تھا لیکن اپنے بیرونی سفر اور پھر طویل علالت کی بنا پر جلد جواب نہ دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

عورت کی سربراہی کے سلسلہ میں ماضی کی جتنی بھی مثالیں ہیں، وہ سب نظام بادشاہت اور موروثی سربراہی کے ضمن میں آتی ہیں۔ مجھے اس رائے کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ استثنائی صورتوں میں ایک عورت سربراہِ حکومت ہو سکتی ہے۔ یہ مطلق حرام نہیں ہے، لیکن میرا متعین سوال یہ ہے کہ ملکہ بلقیس یا بیگم بھوپال یا آج کی ملکہ برطانیہ کی طرح اگر مسئلہ موروثی نہ ہو بلکہ انتخابی ہو، جہاں وارث والی کوئی مجبوری نہ ہو اور مسلمانوں کے عام ووٹوں سے سربراہِ حکومت کا انتخاب ہونا ہو کیا وہاں ایک عورت کا امیدوارِ حکومت ہونا اور عام رائے دہندگان کا اس کے حق میں ووٹ دینا جائز اور مباح ہے یا نہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں کہیں بھی مجبوری یا استثنیٰ کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ براہِ کرم آج کے جمہوری معاشرے میں کسی عورت کی سربراہی کے معاملہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ۲۷ جنوری ۱۹۹۳ء کا تحریر کردہ یہ خط موصول ہوا:

"محترمی زاد مجدکم
سلام مسنون ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔ آج آپ کا ۱۳ جنوری کا خط پہنچا شکریہ۔ یہ

Marfat.com

معلوم کر کے تاسف ہوا کہ آپ علیل تھے۔ اللہ صحت عاجل و کامل عطا فرمائے۔

مسلمان عورت کے سربراہِ مملکت ہونے کے متعلق میرا سادہ جواب یہ ہے کہ عام حالتوں میں اس کی ضرورت نہیں۔ کوئی مجبوری ہو تو قرآنی آیت "الا من اضطر" کے باعث وہ جائز ہوگا۔ وہ حالتِ اضطرار، قیامت تک کس کس قسم کی ہوگی کہنا ناممکن ہے۔

فرض کیجیے کہ پارلیمنٹ کے انتخابوں میں:

۱۔ دیندار عورت کے بالمقابل ایک بددین، منافق ہو۔

۲۔ پارلیمنٹ میں غیر مسلم ارکان بھی ہیں تو اس کے نتائج پر بھی غور کرنا پڑے گا۔

غرض قیامت تک سارے پیش آنے والے امکانوں کی پیش بندی نہیں ہو سکتی۔

اسی لیے عام رائے:

''عام امن و سکون کے حالات میں عورت کا انتخاب نہ کیا جائے۔ خصوصی اضطراری حالت میں وہ جائز ہے۔'' کیا یہ کافی ہے؟

نیازمند

محمد حمید اللہ

اس جواب کو کافی اور شافی سمجھ کر اظہارِ تشکر کے ساتھ بحث کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس آخری خط میں اپنا موقف پوری طرح واضح کر دیا اور تمام شکوک و شبہات دُور کر دیے۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشادات پر مخالفت یا حمایت میں مضامین کا طومار باندھا تھا وہ غور سے اس عبارت کا مطالعہ فرمالیں۔ عورت کی سربراہی صرف ''حالتِ اضطرار'' میں یعنی ایسی صورت میں جب لحم خنزیر یا شراب جیسی حرام اشیاء بھی تحفظِ جان کی خاطر صرف محدود مدتِ اضطرار میں حلال ہو جاتی ہیں، جائز ہو سکتی ہے۔ اس کا جواز پیش کرنے والے جب تک ''حالتِ اضطرار'' کی موجودگی ثابت نہیں کریں گے۔ عورت کی سربراہی عام حالات میں جائز نہیں ہو سکتی۔ اب ڈاکٹر صاحب کے، ہمارے اور علمائے دین کے موقف میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ہمارے درمیان کامل اتفاق رائے ہے۔ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا انتہائی شکرگزار ہوں جنہوں نے میرے

Marfat.com

خطوط اور سوالات کی گرانباری کو برداشت کیا اور اپنی شدید مصروفیات کے باوجود مجھے اپنے خطوط سے نوازا، اس مراسلت نے مجھے بھی شرح صدر عطا فرمایا اور ڈاکٹر صاحب کے موقف کے سلسلہ میں تمام شکوک و شبہات بھی دُور ہو گئے۔ اللہ انہیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور اپنے دین کی خدمت کے لیے انہیں صحت کے ساتھ تا دیر سلامت رکھے۔

(ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی ۸/اپریل ۱۹۹۳ء)

Marfat.com

مکتوب فرانس

مخدوم ومحترم زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ماہِ صفر ۱۴۱۴ھ کا شمارہ الحق آپ کی عنایت سے ابھی ابھی ملا ممنون ہوا۔ گستاخی معاف ہو ایک چھوٹی سی چیز عرض طلب معلوم ہوئی۔

اس شمارے کے صفحہ ۶۲ پر ''تفصیل آیات القرآن'' پر تبصرے کے سلسلے میں اس کے مؤلفِ اصلی کا نام چول لابوم بتایا گیا ہے، عربی میں وہ آواز نہیں ہے جسے ہم (ژ) لکھتے ہیں۔ ہمارے عرب بھائی اسی کو (چ) لکھنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم اس فرانسیسی مستشرق کا نام (ژول لابوم) لکھیں تو صحیح تر ہوگا۔ ورنہ اُردو میں غلط فہمی پیدا کرے گا۔ اسے تبصرے میں ذرا نیچے (ادوار موفتیہ) کا نام آیا ہے اس نومسلم فرانسیسی کے نام کا تلفظ (ایدوود ار مونتے اِی) اصل سے قریب تر ہوگا۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

۱۸-۹-۱۹۹۳

مخدوم ومحترم زاد مجدکم

سلام مسنون: ابھی ابھی ایک خط محترم کے نام روانہ کیا۔ اس میں سہواً چھوٹی ہوئی باتوں کے لیے یہ تتمہ گزران رہا ہوں۔

موقر رسالہ الحق کے شمارہ صفر ۱۴۱۴ھ کے صفحہ ۶۲ میں اگر یہ نظر آیا کہ بعض فرانسیسی

ناموں کا اُردو املاء مطابق اصل نہیں ہے تو صفحہ ۶۱ پر یہ نظر آیا کہ جرمن ناموں کا بھی یہی حال ہے۔ کشاف اصطلاحات الفنون کے ناشر اول کا نام سپرنگر لکھا ہے۔ یہ جرمن تھا اور کلکتہ میں انگریزی ملازمت میں کام کرتا تھا۔ اس نام کا صحیح تلفظ شپرنگر ہوتا ہے (س سے نہیں، ش سے)

بہت دن ہوئے کراچی کے اخبار قومی زبان کے شمارہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں گزارش کی تھی کہ ''ایک موتمر رسم الخط و اعراب کی ضرورت'' ہے کیونکہ ایک ہی غیر عربی آواز کو اردو میں ایک طرح لکھا جاتا ہے تو ایران میں افغانستان میں مصر میں الجزائر میں عربی رسم الخط والی زبانوں ہی میں باہم اختلاف ہوتا ہے) پھر بدرجہ اقل قومی زبان (کراچی) ہی کے شمارہ ۱۶ جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان زبانوں کا رسم الخطی وفاق کے عنوان سے مضمون لکھا۔ یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ ۱۹۴۵ء میں جب میں نے ''جدید قانون بین الممالک کا آغاز'' نامی کتاب کا فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کتاب میں سینکڑوں فرنگی نام پائے گئے تو کتاب کے پیش لفظ میں فرنگی زبانوں سے مستعملہ ناموں کے لیے اردو میں املاء اور اعراب سے بحث کی۔ ایک مثال پر اکتفاء کرتا ہوں۔

انگریزی یعنی لاطینی خط میں حرف (J) لیجیے۔ اس کا تلفظ انگریزی میں (ج) ہوتا ہے فرانسیسی میں (ژ) جرمنی میں (ی) اسپینی میں (خ)۔

تبارک اللہ احسن الخالقین

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(الحق، اکوڑہ خٹک۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

Marfat.com

باسمہ تعالیٰ

4, Rue de Tournon,
Paris - 6 / France

لیلۃ القدر ۱۴۱۲ھ

محترم ومکرم زادمجدکم

سلام مسنون ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ۔ رمضان مبارک، عید مبارک۔ میں انجمن کے دفتر کو ہفتے میں صرف ایک بار جا سکتا ہوں اس لیے ڈاک کے پہنچنے میں دیری ہو جاتی ہے۔ قصور معاف۔

نامکمل تفسیر کے اوراق پڑھے۔ خط مشرقی ہے یعنی کسی اسپین اور افریقہ والے کی تالیف یا نقل کردہ کتاب نہیں ہونی چاہیے۔ میرے پاس گھر میں صرف تفسیر ابن کثیر ہے۔ عربی تفسیروں کا جو سیکڑوں ہیں، ذخیرہ کہاں ملے؟

آپ کے ذاتی مبارک ذخیرۂ مخطوطات سے ممکن ہے کبھی آپ کی زحمت فرمائی سے کم از کم نوادر کی حد تک، واقفیت ہو سکے اور باعث استفادہ۔

خادم
محمد حمید اللہ

(یادنامہ داؤدی - مرتبہ تحسین فراقی - جعفر بلوچ
دار التذکیر، اردو بازار لاہور ۲۰۰۳ء)

Marfat.com

بسم اللہ

H.R. - 75 Paris VI

۴ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ چہار شنبہ

مکرمی سلام مسنون

دسمبر کے ''فاران'' میں ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' مؤلفہ ابوسلمان شاہ جہان پوری پر تنقید چھپی ہے اور صفحہ ۵۸-۵۹ پر مولانا ابوالکلام کے سفرِ عراق پر لوئی ماسینیوں کے بیان سے استدلال کا ذکر ہے۔

ماسینیوں اب آنجہانی ہو چکے ہیں، آٹھ دس سال کی بات ہے، ایک دن وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا ابوالکلام کبھی بغداد گئے تھے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو پریشانی کے انداز میں کہنے لگے کہ کوئی صاحب مجھ سے دریافت کر رہے ہیں اور ایک بیان سے استدلال کرنا چاہتے ہیں، مگر مجھے اس کا کچھ علم نہیں اور غالباً یہ بھی کہا کہ ''اب سے کوئی بیس سال قبل میں نے کچھ کہا تھا، تو اب یاد نہیں''۔

ممکن ہے یہ ابوسلمان [1] صاحب ہی کے خط کا معاملہ ہو، اگر ایسا ہے تو مناسب ہو گا کہ وہ ماسینیوں کے تازہ ترین بیان کو بھی شائع کریں محض کسی پرانے بیان پر اکتفا نہ کریں۔ ابوالکلام عراق گئے تھے تو، نہ گئے تھے تو، اُن کی عظمت میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔''

مخلص

حمیداللہ

قلمی معرکے۔ ماہر القادری۔ مرتبہ طالب ہاشمی۔ القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۴ء

---

[1] میرے خیال میں یہ ابوسلمان نہیں کوئی اور صاحب ہوں گے۔ (ماہر)

Marfat.com

Marfat.com

بیکن بکس کی چند ایمان افروز کتابیں

• خطبات بہاولپور	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
• پیغمبر اسلامؐ	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ / مترجم: پروفیسر خالد پرویز
• محمد رسول اللہؐ (سیرت پاک)	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ / مترجم: پروفیسر خالد پرویز
• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی و جانشینی	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ / مترجم: پروفیسر خالد پرویز
• دنیا کا قدیم ترین مجموعہ حدیث (صحیفہ ہمام بن منبہ)	ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ / تزئین: پروفیسر خالد پرویز
• نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (اول)	مرتب: محمد عالم مختار حق
• ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی بہترین تحریریں	مرتب: سید قاسم محمود
• مختلف مذاہب میں تصور خدا	ڈاکٹر ذاکر نائیک / مترجم: سید خالد جاوید مشہدی
• اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات اور ان کے جوابات	ڈاکٹر ذاکر نائیک / مترجم: سید خالد جاوید مشہدی
• قرآن اور جدید سائنس	ڈاکٹر ذاکر نائیک / مترجم: سید خالد جاوید مشہدی
• حیات و عہد نبوی	جنرل سر جان گلب پاشا / مترجم: حبیب حیدر آبادی
• گناہ کی تاثیر	امامؒ حافظ ابن قیم / مترجم: مولانا ہدایت اللہ ندوی
• حکمت کے موتی (ماخوذ مثنوی مولانا روم)	تالیف: فاروق الحسن چشتی
• کیمیائے ہدایت	شاہد زبیر
• کیمیائے سعادت (تلخیص)	امام غزالیؒ / شاہد زبیر
• حکایات اولیا	شاہد زبیر
• حاجت مطلوب	شاہد زبیر
• آگہی	شاہد زبیر
• ترغیب	شاہد زبیر

بیکن بکس
• غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-7351662
• گلگشت ملتان فون: 061-6520790,6520791
E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com
E-mail:beacon_books_pakistan@yahoo.com
BEACON BOOKS

Marfat.com

نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

(دوم)

گردآوردہ

محمد عالم مختارِ حق

BEACON BOOKS

Marfat.com